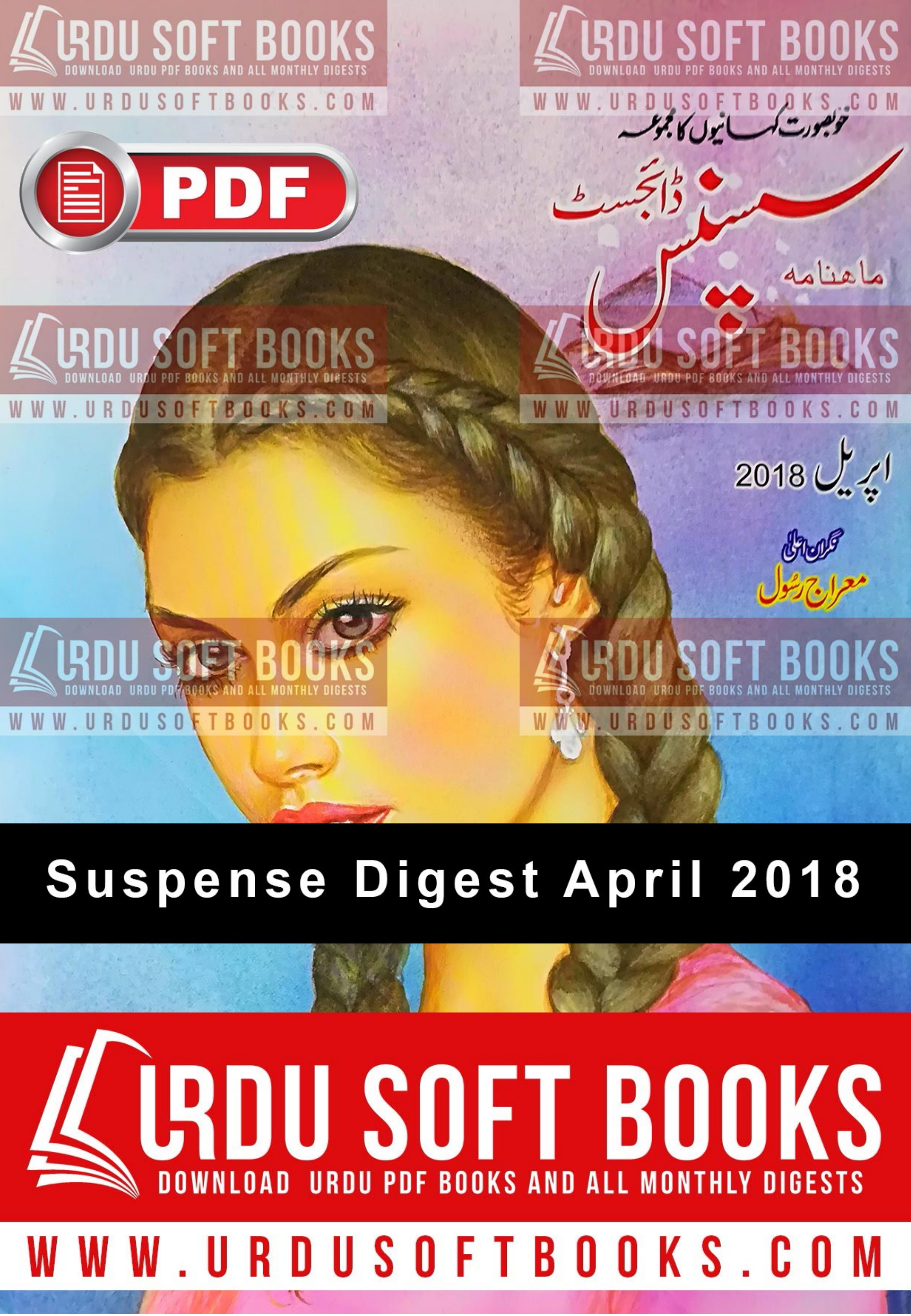

Suspense Digest April 2018

PDF
URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تاکہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تاکہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تاکہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تاکہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تاکہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سسپنس ڈائجسٹ
CPNE
MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07
انشائیہ
جون ایلیا
ایک دانش مند فقیر منش کی چشم کشا گفتگو قوم کی قوتِ برداشت کا مخصوص انداز میں تذکرہ

08
آپ کے خط
مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

16
بے پناہ
ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

61
شرط
تنویر ریاض
زیست کی بساط پر جان کی بازی لگانے والے ایک کھلاڑی کی روداد

72
رنگِ آسماں
اے آر راجپوت
مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

103
رقیب
منظر امام
رقابت اور چاہتوں کے بیچ دوست اور رقیب کی رسّا کشی

جلد 47 • شمارہ 04 اپریل 2018 • زرِ سالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

124 — اجنبی محسن
ملک صفدر حیات
ملک صاحب کی ڈائری سے
ظلم وستم اور عدل وانصاف
پر مشتمل ایک اور داستان

155 — راز
اعتزاز سلیم وصلی
دو پیار کرنے والے
دلوں کے ارمانوں کے
قتل کی عجیب روداد

163 — عبرت
صداقت حسین ساجد
مکافات عمل کے زندان سے
خوفزدہ کچھ لوگوں کی
شرمندگی کا قصہ

166 — محفلِ شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک
انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند
آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

169 — دیوانگی
انجم فاروق ساحلی
ایک ماہر فلکیات کے علم کی
وسعت اور مفاد پرستی
کے درمیان تصادم

182 — وقت
حسام بٹ
ایک پرعزم بازی گر کی بازی
گری...... سنسنی خیز واقعات
پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

219 — ہم سفر
شاہ زین رضوان
کٹھن حالات میں
بھی خوشی کے متلاشی
انسانوں کا ماجرا

229 — حضرت موسیٰؑ
رضوانہ ساجد
مصر کی سرزمین
پر فرعونی سازشیں اور
پیغمبر کے معجزات کا احوال

243 — اصل کھلاڑی
عمیر علی
زندگی کی دوڑ میں زندگی
کے رموز کو سمجھنے والے اصل
کھلاڑی کی پہچان

249 — جرم وفا
ثمر عباس
محبوب کے لیے جان
دینے اور جان لینے والے
ایک دیوانے کا قصہ

256 — امید صبح
ناہید سلطانہ اختر
دل کے سچے رشتوں میں گندھی
ایک عبرت اثر داستان......جس
کی ہر سطر سوچنے پر مجبور کردے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

www.urdusoftbooks.com

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

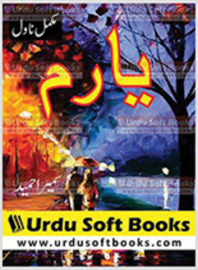

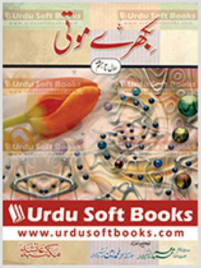

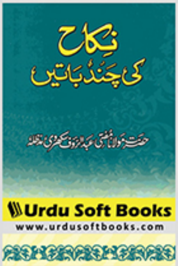

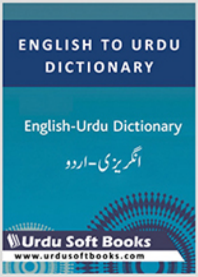

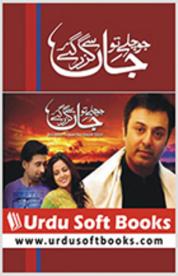

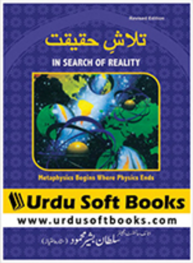

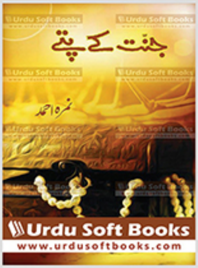

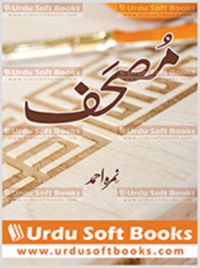

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

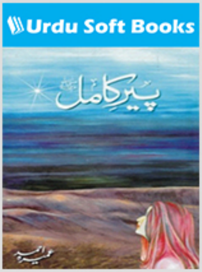

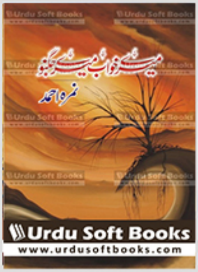

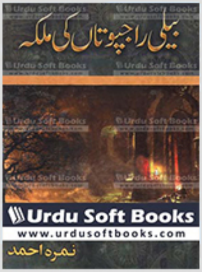

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

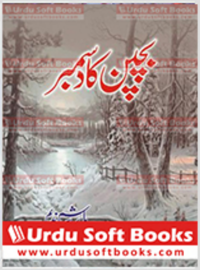

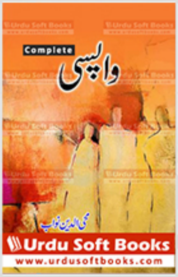

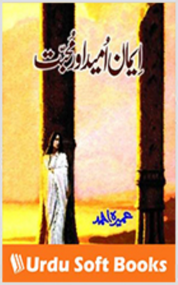

www.urdusoftbooks.com

انشائیہ

جون ایلیا

اندازہ

جو سماج افلاس اور جہالت کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو وہ زندگی کا کوئی صحت مند خواب نہیں دیکھ سکتا اور نہ شاید اس کا حق ہی رکھتا ہے۔ ہم بار بار تعمیر و ترقی کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ تعمیر و ترقی کی باتیں اسی قوم کو زیب دیتی ہیں جو معاشی استحکام اور تعلیمی ترقی کے ایک خاص نقطے تک پہنچ چکی ہو۔ اس سے پہلے تعمیر و ترقی کے امکانات پر غور کرنا دماغی عیاشی اور ذہنی بدکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہم قومی حیثیت سے افلاس اور جہالت کے جس نقطے پر کھڑے ہیں، وہاں سے تعمیر و ترقی کی منزل اتنی دور ہے، اتنی دور ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اپنے آپ کو ہمت شکنی اور زبوں ہمتی کے آزار میں مبتلا کرنا ہے۔ ہم اپنی اس پسماندگی و درماندگی کے سلسلے میں قابلِ ملامت بھی ہیں، قابلِ رحم بھی اور ایک حد تک قابلِ معافی بھی کیونکہ ہماری موجودہ زندگی کے پس منظر میں صرف غلامی ہی کی ایک صدی نہیں، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی انحطاط کی بھی کئی صدیاں شامل ہیں اور ہمیں ماضی کے اس زبردست نقصان کی تلافی کے لیے جو مہلت ملی ہے وہ یقیناً بہت مختصر ہے اور اسی مختصر مہلت میں ہمیں صدیوں اور نسلوں کے قرضے چکانا ہیں لیکن اس معقول عذر کے باوجود ہم اپنی غیر ذمے داریوں کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔ یہ عذر صرف اسی صورت میں قابلِ سماعت تھا جب ہم نے اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کیا ہوتا، اصلاحِ حال کے لیے ہر وہ کوشش کی ہوتی جو ممکن تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ قوم کے بعض طبقوں نے تو اس نازک دور میں وہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اختیار کیے ہوئے ہیں جس کو سہہ لینا ایک، پسماندہ اور پریشان حال قوم کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اس موقع پر کس کس سے مواخذہ کیا جائے۔ کس کس کا نام لیا جائے کہ یہ سیاہ نامہ بہت طویل الذیل ہے مگر ایک خاص طبقے کا ذکر کیے بغیر چارہ بھی نہیں۔ ہمارا اشارہ قوم کے دولت مند طبقے کی طرف ہے۔ ہمارے اس رعایت یافتہ اور برگزیدہ طبقے نے آزادی کے بعد جس مجنونانہ اور مجرمانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ان حضرات نے لکھ پتی سے کروڑ پتی بننے کی جو شاندار مہم تھوڑے ہی عرصے میں سر کر لی ہے، اسے دوسرے شاید صدیوں میں بھی سر نہیں کر سکتے۔ پاکستان میں اگر کسی طبقے نے اپنے غیر معمولی اور قابلِ رشک صلاحیتوں سے دنیا کو مبہوت کر ڈالا ہے تو وہ یہی طبقہ ہے، اس کی موجودگی میں جو لوگ علمی و ادبی تہذیبی اور سماجی میدانوں میں پاکستانی قوم کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں اور انہیں اس ہونہار قوم کا کوئی عرفان حاصل نہیں۔ اگر اس قوم کی استعداد اور کارکردگی کا اندازہ لگانا ہے تو اس کے لیے دولت کشی اور منفعت اندوزی کے شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے کہ یہی تو ایک شعبہ ہے جس میں ہماری قوم نے حیران کن فتوحات انجام دی ہیں اور محیر العقول معجزے دکھائے ہیں۔ سماج کا یہی وہ ادارہ ہے جس کے حوصلہ مند نمائندوں نے ایک ایک رات میں بنجر زمینوں سے محل اگائے ہیں اور ایک ایک دن میں دولت و ثروت کی فصلیں کاٹی ہیں۔ یہ بات انہی لوگوں نے ثابت کی کہ آزادی ایک نعمت ہے اور غلامی ایک لعنت اگر یہ ارجمندانِ دولت نہ ہوتے تو پاکستان میں کوئی بھی آزادی کی نعمتوں اور برکتوں کا قائل نہ ہوتا۔ ہمیں اس موقع پر عبارت آرائی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس ضمن میں پوری متانت اور سنجیدگی سے کام لیں، اس گروہ نے سماج کی صحت مند قدروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ یہ لوگ ”زرگری“ اور زر پرستی کے علاوہ کوئی قدر نہیں مانتے، ان کا صرف ایک نصب العین ہے۔ یعنی دولت کھینچنا قوم جہنم میں جائے۔ انہیں تو اپنے کام سے کام ہے۔ زندگی میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار دولت ہے اور سب سے مضبوط سپر جہالت۔ ان کے نزدیک تعمیر و ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ کوٹھیوں کے نئے نئے ڈیزائنوں اور کاروں کے نئے نئے ماڈلوں کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جائے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستان کی فاقہ کش فلاکت زدہ اور درماندہ قوم ان مجنونانہ حرکات اور مجرمانہ رجحانات کی آخر کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے۔ واقعی ہمیں اپنی قوتِ برداشت کا اندازہ لگانا چاہیے۔

☆☆☆

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

آپ کا خط

عزیزان من!
السلام علیکم!

2018ء کا چوتھا شمارہ ماہِ اپریل میں حاضرِ خدمت ہے۔ بہار اپنے جوبن پر ہے۔ ہر سمت ہریالی اور رنگ برنگے پھولوں کے نظارے ہیں۔ قدرت تو اکثر موسم کے رنگ بکھیر ہی دیتی ہے مگر...... اربابِ اختیار کے گرد ہمیشہ ایک ہی موسم کا حصار رہتا ہے ''بے حسی اور مفاد پرستی'' کا۔ پچھلے دنوں سینیٹ کے الیکشن کا دنگل ہوا اور سیٹوں کا کاروبار اپنے عروج پر رہا۔ کسی نے کسی کی تھالی سے اپنا حصہ اٹھالیا تو کسی نے اپنا رخ کسی اور سمت موڑلیا۔ سیاست میں کاروباری نقطہ نظر اچھا ہے بشرطیکہ ذاتی مفاد کے بجائے ملکی مفاد میں ہو تب...... اب دیکھیے اس الیکشن کا پھل عوام کے حق میں میٹھا آتا ہے یا کڑوا کسیلا...... سب عوام کی باتیں کرتے ہیں مگر ذاتی دوام کے خواب دیکھتے ہیں۔ خواب تو پاکستان بالخصوص کراچی کے شہریوں اور شہر کی حالتِ زار بدلنے کے بھی دکھائے گئے ہیں مگر شہر کی سڑکوں کو ادھیڑ کر بے چارے عوام کی بے بسی پر خاموشی اختیار کرلینا کون سی ہمدردی ہے، جس کی وجہ سے آئے دن شدید حادثات میں اضافہ ہورہا ہے۔ نہ صرف گاڑی چلانے والے بلکہ پیدل مسافروں کو بھی بہت مشکلات کا سامنا ہے۔ ٹریفک کے اژدحام کو دیکھ کر ایک بات ہم والدین سے بھی کہنا چاہتے ہیں کہ جو ابھی ٹھیک سے سنِ بلوغت کو بھی نہیں پہنچ پاتے، ان بچوں کے ہاتھوں میں موٹر سائیکل یا کار محض کسی کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور بالآخر کسی نہ کسی حادثے کی زد میں آکر بہت بڑے نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے مگر والدین خاص طور پر اس بات کا نوٹس لیں کہ ان کے بچے کہیں اس سہولت کا غلط استعمال تو نہیں کررہے۔ تیز رفتار ٹریفک کے درمیان یہی جوشیلے بچے جس طرح ون وہیلنگ اور کبھی لیٹ کر مختلف کرتب دکھاتے ہوئے سفر کرتے ہیں تو دیکھنے والے بے اختیار خوف سے دانتوں تلے انگلی داب لیتے ہیں۔ حکومتی فرائض اور بااختیار طبقے کی ذمے داریاں اپنی جگہ مگر ہم پر بھی انفرادی طور پر بہت سی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں جن کی ادائگی سے کم از کم پچاس فیصد مسائل پر تو ہم خود قابو پاسکتے ہیں۔ جہاں دورِ حاضر میں بے شمار مسائل کا سامنا ہے وہیں ہمیں اپنے بچوں پر بھی اسکول، مدرسے، راستے اور ان کی بیٹھک ہر پہلو پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ضرورت تو اوپر سے لے کر نیچے تک تمام معاشرتی نظام کی تربیت و تزئین کی بھی ہے۔ بہرحال جسے جہاں موقع ملے اپنے حصے کا حق لازمی ادا کرنا چاہیے۔ حصہ تو ہم اپنی اس پُررونق بزم کے بھی ہیں جو ہمارے بغیر بھی ادھوری ہے اور آپ کے بنا بھی مکمل نہیں ہوتی۔

☩ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے تشریف لارہے ہیں ''سسپنس ڈائجسٹ برائے مارچ ہمیشہ کی طرح خوب سے خوب تر تھا۔ سرورق بھی حسبِ منشاء تھا۔ انشائیہ دانائی سے بھرپور تھا۔ خطوط کی دنیا میں وارد ہوئے۔ سرفہرست محمد رفاقت تھے۔ پرانے تبصرہ نگار کچھ عرصے سے بدستور غیر حاضر ہیں۔ امید ہے جلد ہی محفل میں رونق بڑھائیں گے۔ تاریخ کے جھروکوں سے علی اختر صاحب نے متعارف کرایا۔ سکھ حکمراں مہاراجا رنجیت سنگھ کے حالات و واقعات سے کماحقہ آگاہی ہوئی۔ آگے تنویر ریاض کی نفع نقصان پڑھی جس میں لارا نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا اگر وہ تحمل سے حالات کا مشاہدہ کرتی تو ایک بڑی جائداد کی وارث بن جاتی۔ دوسری کہانی التجا پُراثر کہانی تھی۔ اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے کامیابی سے جاری ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی جسٹس دلوں کو جھنجوڑ دینے والی کہانی تھی۔ ان کی ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے جو بے حس معاشرے کو کچھ دیر کو جگاتی ہے مگر بے ضمیر انسان پھر خوابِ غفلت میں سوجاتے ہیں، سوتے رہتے ہیں تاآنکہ پھر کوئی ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوتا۔ ثمر عباس کی مہلت بھی اچھی لگی۔ خلش بھی اچھے انداز میں لکھی گئی کہانی تھی۔ امانت بہتر تھی۔ محفل شعر و سخن میں اچھے اور معیاری اشعار نے محظوظ کیا۔ حبس زدہ، دیدہ دلیری، انتقام بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ دل کو روشنی سے منور کرنے والی داستان حضرت موسیٰ علیہ السلام جاری ہے۔ ناکام میں منظر امام اپنے انداز میں کامیاب رہے۔ تنہائی اور سرورق کی آخری کہانی حریف نے آخری صفحات کا حق ادا کیا۔ کتر نیں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بھی بہت عمدہ تھیں۔ سارے نئے پرانے دوستوں کو سلام۔“

✠ زرین خان آفریدی، حیدرآباد سے محفل کی رونق بنی ہیں ”مارچ 2018ء کا شمارہ اپنی خوبصورتی اور انفرادیت کے ساتھ 15 فروری کو مل گیا۔ سرورق حسینہ چلبلی ہیر جیسی ہی اپنے تبصرے کا انتظار کرتی چوری چوری دیکھ رہی تھی۔ انشائیہ اور اداریہ دونوں لاجواب رہے۔ سندیسوں کی محفل میں داخل ہوئے تو محمد رفاقت صاحب کو صدارت پر پایا، مبارک باد۔ تبصرہ تو مختصر تھا اور کسی تبصرہ نگار کو بھی یاد نہیں کیا۔ ہماری محفل کی نیو انٹری چلبلی ہیر واقعی چلبلی ہے، کافی اچھا لکھا ہے۔ یہ تو نئی بات ہوئی کہ میرے دونوں تبصرے مطلب جنوری، فروری کے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ (محکمۂ ڈاک کی کرامت ہے بھئی) شاہانہ سلطان، ایمانے زارا شاہ اور اوشا راٹھی سب کے تبصرے زبردست ہیں۔ محمد خواجہ صاحب، صفدر معاویہ صاحب، خلیق ربانی صاحب اور راجہ ثاقب محمود صاحب بھی بہترین تبصروں کے ساتھ شریکِ محفل تھے۔ کہانیوں کی ابتدا سلسلے وار داستان وقت سے کی۔ حسام بٹ صاحب اتنے دلچسپ اور خوبصورت انداز میں لکھتے ہیں کہ ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لیتے ہیں۔ نادر شاہ یا چنگیز خان کی اب خیر نہیں۔ رنگِ آسماں بھی بہت بہترین اور ہماری دلچسپی و تجسس بڑھائے ہوئے جاری ہے۔ ویلڈن۔ علی اختر صاحب تاریخی کرداروں کو بہت ہی عمدہ طریقے سے پیش کر رہے ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر لاجواب ہے۔ اس بار وہ موراں اور رنجیت سنگھ کو لائے۔ رنجیت سنگھ تاریخ کا ایک اہم دور اور شخصیت۔ اس کے دور کے معاشی، عسکری اور مذہبی معاملات خوب اجاگر کیے۔ موراں بھی کمال تھی۔ اس کی خوب صورتی اور قسمت نے عرش پر بٹھا دیا۔ محترمہ رضوانہ ساجد صاحبہ کو اللہ پاک اجرِ عظیم دے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی بہت شاندار انداز میں پیش کر رہی ہیں۔ جسٹس میں ناہید سلطانہ اختر نے آج کل کے گھناؤنے ٹاپک پر قلم اٹھایا۔ اللہ سائیں ہمارے بچوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ سنگدل اور ظالم لوگوں کا خاتمہ ہو۔ آوازِ حق میں مرزا امجد بیگ نے بہت عمدگی سے فراڈ ریکروٹنگ ایجنٹ شیر افضل کو بے نقاب کیا اور نوید باری کے دو لاکھ بھی وصول کر لیے۔ دیدہ دلیری شاکر لطیف صاحب نے بہت بہترین اسٹوری دی۔ سمندر خان جیسا ظالم باپ اور بہادر خان جیسا بزدل شخص...... عورت جائے تو کہاں جائے۔ نشور ہادی اپنے مزاج کی طرح منفرد موضوع کے ساتھ آتے ہیں۔ اس بار بھی بہترین حریف کے ساتھ حاضری دی۔ صدف اور شیراز کے گرد گھومتی یہ داستان دل جیت گئی۔ مراسلے اور شعر و سخن کی محفل عروج پر تھی۔ خاندان میں شادیوں کی وجہ سے زیادہ ٹائم نہیں ملا۔“ (ہوں...... تو اس کا مطلب پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے آج کل)

✠ چلبلی ہیر کی چلبلاہٹ، جھنگ صدر سے ”اس بار سسپنس ڈائجسٹ خریدنے کی جتنی جلدی تھی، شاید کبھی نہیں تھی کیونکہ اپنا محبت نامہ اپنے ہی نام دیکھنے کا بہت شوق اور انتظار تھا۔ اللہ اللہ کر کے فروری کی 16 تاریخ کو ہمیں خوشیوں کا چاند نظر آ گیا، خود ہی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ڈائجسٹ لینے چلی گئی اور بک اسٹال پر اپنی محفل میں چلبلی ہیر کے درشن ہو گئے۔ خوشی سے اُڑتی ہوئی گھر آئی اور اپنے لکھے ہوئے الفاظ تبصرے کی صورت میں پڑھے تو بہت عجیب اور اچھا لگا۔ بہت شکریہ مدیرہ جی! ٹائٹل کافی خوب صورت اور منفرد سا تھا۔ مہندی لگے ہاتھوں سے ایک آنکھ جھانک رہی تھی۔ زبردست۔ انشائیہ میں جون ایلیا جی، مشرق قائم دائم ہے کہ چشم بددور...... مشرق میں طول، عرض اور عمق پایا جاتا ہے۔ خدا اس کو قائم و دائم رکھے۔ آمین۔ اداریہ بہت تسلی بخش اور بہترین تھا۔ (تسلی بخش...... کا مطلب؟) محفل میں محمد رفاقت صاحب صدارت پر تھے، مبارک باد۔ تبصرہ دلچسپ تھا۔ اس بار ہم پانچ فیمیل اور 9 میل تبصرہ نگار رونقِ محفل تھے۔ تبصرے بھی سبھی اعلیٰ معیار کے تھے۔ تمام تبصرے میں دو بار ضرور پڑھتی ہوں۔ (کیوں بھئی...... کیا پہلی بار میں سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے) ایمانے شاہ، اوشا راٹھی اور زرین خان کے تبصرے اے ون ہوتے ہیں۔ شاہانہ سلطان بھی اچھا لکھنے لگی ہیں۔ باقی انکل حضرت تو ویسے ہی تجربہ طویل رکھتے ہیں۔ بابر عباس انکل کی باتوں میں ٹھنڈی جگتیں ہوتی ہیں۔ یہ لگتے تو فیصل آبادی نہیں لیکن ہیں کھاریاں کے۔ علی اختر صاحب کی موراں میں رنجیت سنگھ کے حالاتِ زندگی اور موراں کے متعلق تفصیل سے پہلی بار پڑھا ہے۔ بہت خوب لکھتے ہیں۔ نشور ہادی اس بار حریف لے کر آئے۔ یہ مصنف بہت کم آتے ہیں مگر بہترین تحفے کے ساتھ آتے ہیں۔ مطلب دیر آید درست آید۔ صدف کی زندگی میں جتنی مشکلات آئیں وہ اتنی آسان ہو گئیں۔ جسٹس، ناہید سلطانہ اختر کو سیلیوٹ پیش کرتی ہوں، جو وہ اتنے نازک اور معاشرتی برائیوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ درندہ صفت لوگوں کو اللہ پاک نیست و نابود کرے۔ وقت حسام بٹ صاحب اور اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں دونوں سپر ڈوپر جا رہی ہیں۔ آوازِ حق میں مرزا امجد بیگ نے شیر افضل کو خوب ذلیل و خوار کیا۔ مراسلے اور محفل شعر و سخن اے ون تھیں۔ ویلڈن۔“

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

✠ دوست محمد کی قلمی معاونت پشاور سے ”مارچ کا چاند سا سسپنس ڈائجسٹ ہمیں 18 تاریخ کو ملا اور کیوں نہ ملے کیونکہ اس کے آنے کی تاریخ ہمیں ایسے یاد ہوتی ہے جیسے بھوکے کو کھانے کا انتظار ہوتا ہے۔ (اس محبت کا شکریہ) مارچ کا مہینا میرا ویسے ہی پسندیدہ مہینا ہوتا ہے کیونکہ اسی مارچ کے مہینے میں ہم نے سسپنس ڈائجسٹ کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ یعنی اس کو ہاتھ لگائے ہوئے 25 سال ہو گئے۔ یعنی اس مارچ کو ہم اس کی سلور جوبلی منا رہے ہیں۔ (ارے واہ...... مبارک ہو) ایسا ہی سنجیدہ پاکیزہ اور معیاری پرچہ نکالنے پر ہم انکل معراج اور پوری ٹیم کو سلام پیش کرتے ہیں۔ 23 مارچ کو قرارداد پاکستان پوری قوم مناتی ہے۔ میری طرف سے پوری قوم کو مبارک باد قبول ہو .... اور میری دعا ہے کہ علامہ اقبال نے جو خواب دیکھا تھا، خدا اس کو پورا کرے۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی، جہاں حسینہ ہاتھ چہرے پر رکھے ایک آنکھ سے بائیں طرف دیکھ رہی ہے۔ ہمیں تو اس کا یہ ہاتھ اپنا نہیں لگا۔ اس دفعہ ٹائٹل کچھ واجبی سا تھا۔ اس کے بعد جون ایلیا کی مشکل باتوں کی طرف آئے۔ جون صاحب ہمیں اپنی اوقات یاد دلا کر اپنی تہذیب اپنانے کو کہہ رہے تھے کہ ہمیں مشرقی روایات، مشرقی معاشرہ اپنانا چاہیے۔ خطوط کی دنیا میں پہنچے تو یہاں ہمیں صدارت کی کرسی پر محمد رفاقت نامی ایک شخص ملا۔ بھئی آپ جو کوئی بھی ہو صدارت کی کرسی ملنے پر مبارکباد۔ دوسرے نمبر پر ریاض بٹ صاحب کا خط بھی بہت جاندار تھا۔ آپ جیسے حضرات ہی محفل کی شان ہیں۔ دوسرے خطوط میں رمضان پاشا اوشاراشجی، چلبلی ہیر، زرین خان آفریدی، ایمانے زاراشاہ، محمد صفدر معاویہ، انکل بابر عباس، فضل عباس کے خط زبردست تھے۔ محمد خواجہ صاحب ہم آپ کو نہیں بھولے۔ علی اختر کی تاریخی موراں پڑھی۔ رنجیت سنگھ پنجاب کا سکھ حکمران۔ ایسا حکمران پنجاب کی تاریخ میں کم گزرا ہے اور پھر موراں کی زندگی کے حالات، واقعی معلومات سے بھرپور تحریر تھی۔ علی اختر صاحب کے قلم کی کاٹ بھی اچھی ہوتی جا رہی ہے۔ پھر ناہید سلطانہ اختر کی جسٹس پڑھی۔ حساس موضوع پر لکھی گئی کہانی۔ ایسے درندے نما انسان ہمارے آس پاس اور گلی محلوں میں پھرتے رہتے ہیں لیکن ہمیں ان درندوں سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔ نفع ونقصان تنویر ریاض، التجا محمد شوکی، رنگِ آسماں، اے آر راجپوت، مہلت، ثمر عباس، خلش، نعمان اسحاق، امانت، شاہ زین رضوان، تنہائی، نادیہ نورا چھی کہانیاں تھیں۔ مرزا امجد بیگ کی آوازِ حق بیرون ملک جانے والے خواہش مندوں کی تحریر۔ اگر ہم اپنے ملک پر توجہ دیں تو ہمارے ملک سے زیادہ خوب صورت ملک دنیا میں کہیں نہیں ہوگا۔ (بے شک۔ بالکل درست کہا) انکل آپ نے ساری اچھی کہانیاں مارچ کے شمارے کے لیے رکھی تھیں۔ عرصہ ہوا آصف ملک صاحب نظر نہیں آئے۔ ان سے دیدار کرانے کی التجا ہے۔ ایک اچھی اسٹوری کے ساتھ۔ (جی ضرور) شمارے میں خاص کر شاکر لطیف صاحب کو میرا بہت سارا سلام۔ آپ کی کہانیاں انتہائی جاندار ہوتی ہیں۔ آپ ابھی ابھی آئے ہیں اور سب پر چھا گئے۔ میرا چھوٹا بھائی جو شمارہ دلچسپی سے پڑھتا ہے، اس نے مجھ سے کہا کہ تم جب بھی خط لکھو تو شاکر لطیف کی زبردست تعریف کرنا۔ محفل شعروسخن میں مہتاب، کمال انور، کراچی، راجا ثاقب محمود جنجوعہ، ماہین بابر، فضل عباس، راولپنڈی، زرین خان آفریدی، حیدرآباد، رمضان پاشا، کراچی، اشفاق شاہین، لاہور، عبدالجبار رومی انصاری، ذیشان انصاری، جہلم اور جاوید اختر رانا پاکپتن شریف کے اشعار اچھے تھے۔ کترنیں بھی اچھی تھیں۔“

✠ رمضان پاشا، گلشنِ اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”مارچ 2018ء کا سسپنس بہت خوب تھا۔ انشائیہ حسب معمول فکر انگیز تھا۔ خطوط کی محفل میں پہلے نمبر پر آنے والے محمد رفاقت صاحب کو مبارکباد، موصوف کا تبصرہ بھی قابلِ تعریف تھا۔ دیگر تبصرہ نگاروں میں ریاض بٹ، محمد خواجہ، زرین آفریدی، بابر عباس کے تبصرے قابلِ داد تھے۔ نفع نقصان نے ہمیں خوب نفع بہم پہنچایا۔ التجا مختصر اور حیرت انگیز۔ رنگِ آسماں اور وقت سسپنس کو بڑی تقویت بہم پہنچا رہی ہیں۔ میں انہی کو پہلے پڑھتا ہوں تاکہ گزشتہ قسط کا مزہ برقرار رہے۔ جسٹس پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس موضوع پر ان کی تیسری کہانی ہے۔ غیر ملکی کہانیوں میں مہلت بہت عمدہ کہانی تھی۔ بہت لطف آیا۔ آوازِ حق اس بار مرزا صاحب کا کیس بہت خوب تھا۔ حسب معمول عدالتی کارروائی میں بہت مزہ آیا۔ امانت پسند نہیں آئی۔ خلش ایک متاثر کن کہانی تھی، حاصل مطالعہ عورت ہی بے وفائی کی مرتکب ہوتی ہے۔ مرد نہیں۔ بے شک اپنی ماں کے کہنے پر ایسا کیا، لیکن دوسری طرف آفاقی جذبہ محبت کی خصوصیات کی نفی ہو گئی۔ حبس زدہ، اس کہانی میں وہ مزہ نہیں آیا جو اس قسم کی کہانیوں میں آتا ہے۔ شاکر لطیف کی دیدہ دلیری تو دیکھو، ایسی دبنگ دیدہ دلیری پر میں شاکر لطیف کو داد دیتا ہوں۔ انتقام بہت مختصر اور بہت دلچسپ۔ ناکام، آخرکار منظر امام صاحب اپنے پرانے ٹریک پر واپس آ گئے۔ تنہائی، میں خوب خوب مزہ آیا۔ حریف، نشور ہادی نے ہمیشہ طویل اور پھڑک دار کہانیاں ہمیں پڑھنے کو دیں۔ اس بار بھی انہوں نے ہمیں ہلا جلا کے رکھ دیا۔ ان کی کہانی میں خوب لطف آیا۔“

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

✠ محمد رفاقت، واہ کینٹ، نواب آباد سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”وقت دیکھو کس تیزی سے گزر رہا ہے۔ 2018ء کا مارچ بھی آ گیا اور آپ کا رسالہ سسپنس بھی ہاتھوں میں ہے۔ جسے پڑھ رہا ہوں مکمل تو ابھی نہیں ہوا مگر کچھ کہانیاں ضرور پڑھ لی ہیں جس میں سب سے پہلی کہانی موراں، محترم جناب علی اختر صاحب کی پڑھی۔ اسی طرح جون ایلیا کا انشائیہ مشرق بھی پڑھا جو کچھ کچھ سمجھ میں آیا، انسان اپنے آپ کو کیا سے کیا سمجھنے لگتا ہے۔ آخر ایک دن خاک ہو جاتا ہے۔ محفلِ خطوط میں آپ نے میرے خط کو پہلے نمبر پر جگہ دی جس کے لیے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ محترم خلیق ربانی انجم صاحب نے اور دوسروں نے میرے خط کو پسند کیا جس کے لیے میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ رمضان پاشا، اوشا راشی، چلبلی ہیر، زرین خان آفریدی، محمد زبیر ساگر، ایمانے زارا شاہ، خلیق ربانی انجم، محمد صفدر، راجہ ثاقب محمود جنجوعہ، بابر عباس اور شاہانہ سلطان سب نے بہت اچھے اور تفصیل سے خط لکھے۔ سب کو میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ کہانیوں میں جو میں نے پڑھ لی ہیں ان میں موراں، انتقام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، ناکام، خلش، امانت، تنہائی، باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ خط جلد لکھ رہا ہوں کوشش ہوگی کہ... آپ کو جلد مل جائے تاکہ میری حاضری برقرار رہے اور آپ سے دور رہ نہیں سکتا۔“ (ویسے رسالے سے متعلق بھی آپ تفصیلی رائے دے سکتے ہیں کہ مزید کیا اچھا ہونا چاہیے)

✠ منشی محمد عزیز میئے، ضلع وہاڑی سے محفل کی رونق بنے ہیں ”چوبارے پر چڑھا کر سیڑھی کھینچنا، سنتے آئے تھے لیکن آپ نے تو میرے ہی ساتھ یہ سلوک کر ڈالا کہ ایک ماہ کرسیِ صدارت پر بٹھا کر کک آؤٹ ہی کر دیا۔ ایمان سے آپ لوگوں نے تو میرا دل ہی توڑ دیا۔ (کمال ہے بھئی...... اگر وقت پر مل جاتی تو ضرور لگاتے رپورٹ) مارچ کا شمارہ افسردہ ہونے کے باعث خاصی تاخیر سے یعنی اکیس فروری کو حاصل پور سے خریدا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ مجھے جاسوسی، سسپنس وغیرہ کا ایک شمارہ ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ میں پڑتا ہے کیونکہ کم از کم 80 یا سو روپے کرائے کی مد میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ سالانہ خریدار بن جائیں تو عرض ہے کہ سرگزشت کا سالانہ خریدار بن چکا ہوں۔ اس کے بعد سسپنس کی باری ہے، جاسوسی کا آخری نمبر ہے (ہمتِ مرداں...... مددِ خدا...... ذرا ذرا سی بات پر دل چھوٹا کرنا کوئی فخر کی بات نہیں ہوتی) 2018ء کے لیے ان تینوں کی رپورٹ مرتب کر رہا ہوں۔ اگر آپ کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی تو...... (بالکل بھیجیے گا...... مگر وقت پر) 2017ء میں کل 170 خطوط شائع ہوئے، جن میں سے 125 خطوط مرد حضرات کے تھے جبکہ چالیس خطوط خواتین کے تھے۔ پانچ خطوط مشترکہ تھے۔ سال بھر کے بارہ شماروں کے ٹاپ 12 خطوط کی ترتیب کچھ یوں رہی۔ رانا بشیر احمد ایاز، جنوری۔ فضا شاہ، لاہور، فروری۔ بلقیس خان، مارچ، اکتوبر۔ طاہرہ گلزار، اپریل۔ عامر خان آفریدی، مئی۔ دوست محمد خان، جون۔ پائندہ خان، سلیمان خیل، جولائی۔ عادل عباسی، اگست۔ ڈاکٹر نائلہ نصر، ستمبر۔ عبدالجبار رومی انصاری، نومبر اور حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی، دسمبر کرسیِ صدارت پر تشریف فرما تھے۔ تبصرہ نگار حضرات میں ادریس احمد خان اور محمد صفدر معاویہ گیارہ گیارہ خطوط کے ساتھ ٹاپ پر رہے۔ دوسری پوزیشن بھی مشترکہ طور پر عبدالجبار رومی انصاری اور رمضان پاشا نے فی کس نو خطوط کے ساتھ حاصل کی اور تیسری پوزیشن پر اشفاق شاہین آٹھ خطوط کے ساتھ رہے۔ خواتین تبصرہ نگار کی کارکردگی کچھ یوں رہی۔ بینش صدیقی، زرین آفریدی نے آٹھ خطوط کے ساتھ پہلی پوزیشن حاصل کی۔ طاہرہ گلزار چھ خطوط کے ساتھ دوسری پوزیشن پر رہیں اور تیسری پوزیشن پانچ خطوط کے ساتھ ناہید یوسف نے حاصل کی۔ مارچ کے شمارے پر احتجاجاً تبصرہ نہیں کر رہا، نہ اس بار محفل شعر و سخن میں حصہ لے رہا۔ ویسے اس بار کترنوں نے بہت مزہ دیا۔“ (جس طرح آپ نے احتجاجی رویہ اختیار کیا...... اگر ہم بھی کر لیں تو سوچیے کیا ہوگا...... بہرحال یہ سب آپ لوگوں کی محبت کا انداز ہے...... اور ہم آپ کے قدردان ہیں۔ شکریہ جناب)

✠ اشفاق شاہین، لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں ”سسپنس اس بار بھی بروقت مل گیا۔ سرورق پر حسینہ جس سے بچنا چاہ رہی تھی وہی اس کی سوچوں کے ساتھ ساتھ اس کے وجود کو بھی جھانکتا نظر آ رہا ہے، اچھا لگا۔ اداریہ واقعتاً ہم غلام ہی تو ہیں ذہنی غلام، جانے کب آزاد ہوں گے ہمارے ذہن اس بوجھ سے۔ آپ کی محفل میں پہنچے، محفل خوب جمی ہوئی تھی۔ محمد رفاقت سب سے پہلے براجمان تھے، مختصر تبصرے کے ساتھ۔ چلبلی ہیر کا خط بھی دلچسپ تھا۔ ایمانے، محمد خواجہ اور بابر عباس کے تبصرے محفل کی جان تھے اور باقی احباب کے خطوط بھی بہت خوب اور لاجواب تھے۔ چلتے ہیں تبصرے کی طرف۔ حسب معمول سب سے پہلے وقت سے دو دو ہاتھ کیے۔ کہانی کچھ آگے بڑھتی نظر آ رہی ہے اب، ایکشن بھی۔ جو سستی سی چھائی ہوئی تھی چنگیز خان کے آنے سے دور ہو گئی۔ نادر شاہ شاید ہاتھ سے نکل گیا۔ بہرحال کہانی بہت دلچسپ ہوتی جا رہی ہے اب۔ رنگِ آسماں میں فی الحال تو ایکشن بھی نظر نہیں آ رہا، مشن بھی وہیں کا وہیں ہے الٹا راج محل سے دیس نکالا ہو گیا، بور کر رہی ہے کہانی۔ آخری صفحات کی کہانی نشور ہادی کی حریف

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے مزہ دوبالا کر دیا۔ لاجواب۔ صدف، اپنوں میں چھپے دشمن اور دشمنوں میں چھپے اپنوں کو نہ پہچان پائی۔ زبردست کردار، سسپنس سے بھرپور کہانی زبردست رہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات وواقعات سے آگاہی ہوئی، روح خوش ہوگئی۔ مختصر کہانی، جسٹس ناہید سلطانہ دکھی کر گئیں، متاثر کن تحریر تھی۔ نعمان اسحاق کی خلش مختصر کہانیوں میں بلاشبہ ماہِ مارچ کی خوب صورت ترین کہانی تھی بہت پسند آئی۔ انجام سے ہوسکتا ہے کچھ لوگ متفق نہ ہوں، مجھے بہرحال اچھا لگا اینڈ۔ زبردست۔ مظہر سلیم ہاشمی کی حبس زدہ بھی بہت اچھی لگی۔ محفل شعروسخن میں انتخاب بہت عمدہ رہا خصوصاً حسان احمد، اوشا راٹھی اور ایس سجاد کا انتخاب لاجواب رہا۔'' (پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

✠ ریاض بٹ کی دعائیں حسن ابدال سے ''یقین کریں آپ کے ادارے کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ کیونکہ اس بار سترہ فروری کو ہی مارچ کا شمارہ مل گیا۔ (بہت شکریہ...... آپ کی دعائیں ہمارا سرمایہ ہیں) حسینہ سرورق مہندی لگے ہاتھ سے کچھ چہرہ اور ایک آنکھ چھپائے ہوئے گویا ایک آنکھ سے سب کو دیکھ رہی ہے۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیے کو دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ ان کی ایک ایک بات سونے میں تولنے کے قابل ہے۔ ویسے بھی ہیرے زمین میں بونے سے ہیروں کا درخت نہیں اُگ سکتا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو مدیرہ صاحبہ سیاستدانوں کے متعلق بتا رہی تھیں۔ ویسے ایک بات ہے کہ ہمارا اپنا قصور ہے جس میں برسرِاقتدار پارٹی نے دو دفعہ ایک ماہ میں پیٹرول کی قیمت بڑھائی۔ اس کے امیدوار کو ضمنی الیکشن میں ایک لاکھ سے بھی زیادہ ووٹوں کی سلامی دی گئی (انہی فیصلوں پر سوچنے کی ضرورت ہے) خیر ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ الیکشن کی بات کرتے ہیں۔ دل جلانے کی بات کرتے ہیں کیونکہ الیکشن سے کچھ بھی نہیں بدلنے والا۔ رمضان پاشا بھائی آپ کی سسپنس سے محبت بہت پرانی اور پائیدار ہے اور آپ کے تبصرے بھی جاندار ہوتے ہیں۔ اوشا راٹھی کا تبصرہ اور دعائیں بھی قابلِ قدر ہیں۔ چلبلی ہیر، ہم انکل نما...... بلکہ انکل تمہارے لیے دعا گو ہیں۔ اچھا تبصرہ لکھا ہے۔ لگتا ہے کہانیاں غور سے پڑھ کر تبصرہ لکھا ہے۔ زرین خان آفریدی بہن آپ کا تبصرہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ محمد زبیر ساگر، ایمانے زارا شاہ، خلیق ربانی انجم، محمد صفدر معاویہ، راجہ ثاقب محمود جنجوعہ، بابر عباس، شاہانہ سلطان کے خطوط اور تبصرے بھی محفل کی جان ہیں۔ محفل شعروسخن میں ایک سے بڑھ کر ایک شعر ہے اور آپ کے انتخاب کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ اس دفعہ تاریخ کے جھروکوں سے آشنا کروانے علی اختر آئے ہیں۔ رنجیت سنگھ کے متعلق پوری تفصیل سے لکھا ہے اور جن کتابوں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے، وہ بھی اپنی جگہ مستند کتابیں ہیں۔ ویسے رنجیت سنگھ کے دور میں مغلیہ عہد کی کئی خوب صورت اور دیدہ زیب عمارات کو نقصان بھی پہنچایا گیا تھا۔ موراں کا کردار اس کہانی میں صحیح طریقے سے اجاگر کیا گیا ہے۔ تنویر ریاض کی نفع نقصان عورت کی عیاریوں میں لپٹی داستان ہے۔ لیکن جلد بازی میں لارا اپنا نقصان کر بیٹھی۔ التجا بھی محمد شوکی کی ایک اوسط درجے کی کہانی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر ہمیشہ حساس موضوعات پر لکھتی ہیں اور ان کا لکھا ہوا حرف حرف سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔ اس ماہ کی ان کی کہانی جسٹس بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ شیطان صفت انسان آج بھی اپنا شیطانی کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ درندہ صفت تو پکڑا گیا تھا لیکن آج بہت سے واقعات ایسے ہیں جن کے مجرم دندناتے پھر رہے ہیں۔ اللہ رحم کرے۔ آمین...... اب بات ہوجائے مرزا امجد بیگ صاحب کی کہانی آوازِ حق کی۔ اس بار وہ جعلی ریکروٹنگ ایجنٹ شیر افضل، کا اصلی چہرہ دکھاتے نظر آئے۔ ان کا ہر کام پکا تھا۔ آخر میں شیر افضل کا بینک بیلنس عدالت کے سامنے لاکر اپنے مؤکل نوید باری کو دو دن کے اندر اس کی ڈوبی ہوئی رقم واپس دلادی۔ اسے کہتے ہیں تابوت میں آخری کیل ٹھونکنا۔ سلسلے وار کہانیاں رنگِ آسماں اور وقت کی اس ماہ کی قسطیں میرے خیال میں تیزی سے آگے بڑھی ہیں۔ ان کہانیوں کے آخر میں باقی اگلے ماہ کا بورڈ ہمیں انتظار کی سولی پر لٹکا دیتا ہے لیکن انتظار میں تو اصل مزہ ہے۔''

✠ ایمانے زارا شاہ، اسلام آباد سے تبصرہ کر رہی ہیں ''ٹائٹل کو دیکھ کر ایسے لگ رہا ہے جیسے ٹائٹل نہ ہو کسی خاتون کی پروفائل پکچر کے لیے لی گئی سیلفی ہو۔ مارچ کا مہینا صرف قراردادِ پاکستان کے حوالے سے یادگار نہیں ہے بلکہ اب تو پاکستان سپر لیگ اور مارچ بھی لازم وملزوم ہوچکے ہیں...... اور ہمیں اتنا ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ ظلم آخر ظلم ہے جو بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے اس لیے پاکستان میں بھی شبِ ظلمت کا خاتمہ ہوکر ہی رہے گا، انشاءاللہ۔ تبصرے تو سب کے بہت اچھے ہوتے ہیں مکھن لگاتے ہوئے...... لیکن کچھ لوگوں کے زیادہ اچھے ہوتے ہیں جیسے زرین کے۔ اوشا راٹھی اتنا مشکل نام...... اس کا مطلب بھی بتا دیجیے گا۔ باقی جو لوگ نئے ہیں، انہیں ویلکم اور جو پرانے واپس آئے انہیں ویلکم بیک۔ رنگِ آسماں کی قسط اس مرتبہ بھی تیر کی طرح سیدھی رواں دواں رہی۔ نہ کوئی ٹوئسٹ نہ کوئی لیفٹ رائٹ۔ کہاں وہ نازک اندام رینا جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی، کہاں جنگل میں خیمہ زن ہونے کو تیار بیٹھی ہے۔ مہارانی نے معاملہ تو اپنے بیٹے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کے سپرد کرنے کی اچھی کوشش کی لیکن اس کے بعد ایش صاحب تو منظر نامے میں کچھ بھی قابلِ ذکر کام کرتے دکھائی نہیں دیے جس سے ان کے ہونہار ہونے کا ثبوت ملتا...... اور یہ رینا تو کل تک شوکت کی محبت کا دم بھر رہی تھی اور آج ایک لمحے میں کایا پلٹ گئی۔ قسط کا اختتام ایک جھٹکے پر ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے گلاس چینج ہو گیا ہوگا سونجنا اور پرتاب کا...... آئی گیس سو...... اور پتا نہیں ٹرین میں علی ریحان نے کس عفریت کو کمبل تلے دیکھ لیا اور اگلی قسط کے لیے بے چینی بھی۔ وقت...... وقت...... وقت...... حالیہ قسط میں کافی کچھ کھلتا جا رہا ہے۔ نادر شاہ تو مجھے خود ایک مہرہ لگ رہا ہے۔ قطعی طور پر ذمے دار نہیں لیکن جو اس کے پیچھے فی الوقت نظر آ رہے ہیں وہ بھی محض دھوکا ہیں ان سے پیچھے بھی کوئی کارفرما ہے۔ خط والی ذہانت کارگر رہی مگر علی جس کو ساتھ لیے گھوم رہا ہے جگہ جگہ مجھے تو اب بھی شک ہے اس محترمہ پر...... جی ایم سر کی باتیں حیران...... پریشان...... یعنی جلد یا بدیر علی اسکل اینڈ بونز کا چاروناچار حصہ بن جائے گا۔ پھر آئے گا اصل مزہ...... جسٹس موجودہ دور کے حالات کی عکاسی کرتی دماغ پر ہتھوڑا برسا گئی۔ نعمان اسحاق کی خلش تھی تو روایتی سی کہانی جس کا آغاز و اختتام معلوم ہی تھا لیکن ان کا اندازِ بیاں اچھا لگا۔ کیپ اٹ اپ...... حریف کو جب پڑھنا شروع کیا تو اس سے امیدیں کافی آسمان پر تھیں لیکن اس نے زور سے زمین پر پٹخا۔ کہانی میں تجسس و سنسنی تو وافر مقدار میں تھی۔ پراسراریت والی داستان بھی خوب رہی اور آخری لمحات میں دلچسپ انکشافات نے کہانی کو فلمی ساٹچ دے دیا۔ منظر امام ناکام میں ہنستے ہنستے کافی اچھا سبق دے گئے۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں مجھے تنہائی اور مہلت سب سے عمدہ لگیں۔ زبردست۔ التجا پڑھتے ہوئے لگا یہ خوفناک عمارت کدھر سے آ گئی ہے بالکل ہارر فلم کی طرح...... لیکن بہت سبق آموز تحریر تھی۔"

✠ کامران احمد انصاری کا راولپنڈی سے مختصر نامہ۔ "میں آپ کے ڈائجسٹ کا عرصہ دراز سے قاری ہوں۔ آپ کا ڈائجسٹ ایک معیاری اور بہترین ڈائجسٹ ہے۔ سر! میں مختلف رسالوں اور میگزین میں کالج کے زمانے سے ناولز اور آرٹیکلز وغیرہ لکھتا رہا ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ مجھے آپ اپنے ڈائجسٹ میں لکھنے کا موقع عنایت فرمائیں۔ میں مستقل طور پر آپ کے رسالے کا رائٹر بننا چاہتا ہوں۔" (تو اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے۔ اگر آپ میں لکھنے کی بہترین صلاحیت ہے تو ضرور قسمت آزمائیے)

✠ بابر عباس، فضل عباس، گلیانہ روڈ، کھاریاں سے محفل میں زینت افروز ہیں۔ "سر جی! سسپنس کا نیا شمارہ جو ماہ مارچ کی شکل میں تھا بڑی تگ و دو اور جاں گسل انتظار کے بعد سترہ فروری کو ایسے ملا جیسے کراچی والوں کو پانی ملتا ہے۔ سرورق کی حسینہ..... شاید یک چشمی تھی اسی لیے ایک آنکھ سے دنیا کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ جون ایلیا مرحوم کو سلام کرتا ہوا سیدھا اپنی پیاری سی محفل میں پہنچا تو اپنے خط کو 13 ویں نمبر پر پا کر ایک دھچکا لگا، ویسا ہی دھچکا جیسے پاکستانیوں کو ٹرمپ کے اس فیصلے سے لگا ہے کہ پاکستان کو واچ لسٹ میں ڈالا جائے۔ سر جی! یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ اس بار کرسیِ صدارت پر محمد رفاقت صاحب موجود ہیں اور بڑے زبردست انداز میں دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کھی کھی کھی کر رہے ہیں۔ محمد رفاقت صاحب خط تو ایویں ہی تھا مگر آپ کا دل رکھنے کے لیے میں..... مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ رمضان پاشا بھائی نیکی کر دیا میں ڈال لکھ کر بھول جایا کریں۔ باقی میرا ذکر کیوں نہیں کیا۔ میں رانجھا تخت ہزارے دا سن، ہیرے نی۔ اے جھنگ کی... ہیر اب آپ اتنی بھی چلبلی نہیں ہیں۔ محمد صفدر صاحب اتنا مختصر سا خط۔ راجہ ثاقب محمود جنجوعہ صاحب آپ تو محمد صفدر سے بھی بازی لے گئے بھایا مزہ نہیں آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شروعات ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر کردہ رنگِ آسماں سے کی۔ کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی جا رہی ہے تجسس کا عنصر بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ بہت اچھے ڈاکٹر صاحب تسی چھا گئے۔ خدا آپ کے قلم کی روانی کو یونہی برقرار رکھے۔ آمین۔ وقت کرتا جو وفا حسام بٹ بھی ہم کو پیارے ہوتے۔ وقت کے ذریعے ہم بٹ صاحب کو واہ واہ سنا رہے ہوتے 'وقت بڑا بے رحم ہے، وقت کسی کا نہیں ہوتا۔ وقت بڑا ظالم ہے۔ وحید مراد کی فلم کا نام بھی وقت تھا۔ حسام بٹ صاحب کچھ خیال کریں۔ بچوں کی الف لیلہ سنا رہے ہیں۔ آخر صفحات پر اس بار نشور ہادی حریف کو لے کر آئے۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کی جسٹس نے بالکل اسی طرح متاثر کیا جس طرح زینت کیس نے متاثر کیا تھا۔ موجودہ حالات پر ایک پراثر کہانی بہت اچھے ناہید صاحبہ، ویل ڈن۔ آپ کو تو نوبل انعام ملنا چاہیے۔ نعمان اسحاق صاحب کی خلش ایک اچھی اور خوب صورت تحریر تھی، ضروری نہیں انسان جس چیز کی خواہش کرے وہ پوری بھی ہو۔ یہی اس کہانی کی تھیم تھی۔ نعمان اسحاق صاحب کہانی اچھی لگی۔ علاقہ غیر کے تناظر میں لکھی ہوئی شاکر لطیف کی کہانی دیدہ دلیری نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ وہی رسم و رواج میں گندھی ہوئی کہانی۔ ترجموں کی شکل میں سب رائٹر نے بھی اپنا اپنا حصہ ڈالا اور کوشش کی کہ سسپنس کے معیار کو برقرار رکھا جائے۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

✠ انجم فاروق ساحلی کا خط لاہور سے ”اس بار ٹائٹل خوب صورت رومانوی منظر پر مشتمل ہے۔ کہانی شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ جن قارئین نے خطرناک کو سراہا ان کا بے حد مشکور ہوں۔ موراں، مہلت، تنہائی اچھی کہانیاں ہیں۔ دیدہ دلیری کا انداز بیاں خوب ہے۔ آوازِ حق بھی اچھی رہی۔ حبس زدہ بھی خوب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نا کام اچھی کاوشیں ہیں۔ خطوط کی محفل والہانہ جذبات پر مشتمل تھی۔ ریاض بٹ کا مشکور ہوں انہوں نے حوصلہ افزائی سے نوازا۔ کچھ تحریریں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ سسپنس کی کہانیاں زندگی کے ہر رنگ اور ہر زاویے کو پیش کرتی ہیں۔“ (آپ کی بعض تحریریں بہت بے جان ہیں لہٰذا اس طرف توجہ دینے کی خاص ضرورت ہے۔ جو بالخصوص فکشن آپ نے لکھا موضوع کے اعتبار سے کمزور تھا)

✠ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال سے فرمارہے ہیں ”ایک وقت تھا کہ جاسوسی ہو یا سسپنس، موصول ہوتے ہی ساری مصروفیات ترک کر کے ایک دن میں پڑھ لیا جاتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ چیدہ چیدہ کہانیاں ہی پڑھی جاتی ہیں۔ کئی کئی دن گزر جانے کے بعد بھی رسالے کو ہاتھ لگانے کی فرصت تک میسر نہیں ہوتی ایسے میں تبصرہ لکھنا محال ہو جاتا ہے (کیوں بھئی ایسی بھی کیا مصروفیات...... یا آپ کی رسالے سے محبت کم ہوگئی ہے) سرورق شادیوں کے سیزن کی مناسبت سے مہندی لگی حسینہ سے سجا تھا۔ حسینہ کسی کو دیکھ کر منہ چھپا رہی تھی یا شرما رہی تھی۔ محمد رفاقت واہ کینٹ سے کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ چلبلی ہیر کسی انکل نما تبصرہ نگار کا ہی کارنامہ ہے مدیرہ جی! خلیق ربانی کی انٹری بھی اچھی رہی۔ شاکر لطیف میرے لیے ایک نیا نام ہے۔ ان کی تیسری کہانی پڑھی، سمندر خان اور شیر خان کی اولاد کا جرم ایک ہی تھا لیکن سزا کمزور کو ہی ملی۔ ہمارے معاشرے کے دہرے معیار کو آشکار کرتی دلچسپ تحریر۔ آخر میں سمندر خان کی غیرت کا خوب پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ وقت میں میڈم سلمیٰ کی موت میرے لیے غیر متوقع تھی لگتا یہی ہے کہ نادر شاہ اس میں ملوث ہے۔ بینا کا کردار ابھی تک صرف زیب داستاں کے لیے ایڈ لگتا ہے کہ تحریر میں رنگینی رہے...... جی ایم ایک اور مافوق الفطرت کردار کی صورت سامنے آیا ہے۔ بہت سے اعتراضات ...... کے باوجود تحریر پڑھتا ضرور رہوں۔“

✠ ناہید یوسف کی مصروفیت اسلام آباد سے ”اف! ایک فرصت ہے جو لگتا ہے ہم سے روٹھ کر نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ کب سے سوچ رہے ہیں کہ اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ میں حاضری دیں مگر کچھ نہ کچھ مصروفیت آڑے آجاتی ہے۔ شوہر صاحب دفتری کام کے پیشِ نظر بیرون ملک گئے ہوئے ہیں اور ہم گھر سنبھالنے میں لگے ہوئے ہیں۔ خیر دیکھیں ہم نے پھر بھی ”سسپنس“ کے لیے ٹائم نکال ہی لیا (مہربانی جناب کی) کیا کریں اس کے بغیر رہا بھی تو نہیں جاتا۔ سسپنس ہے ہی ایسا کہ ہر دلعزیز ہے۔ پچھلے شماروں پر تو تبصرہ نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے پچھلے شمارے زبردست رہے۔ مارچ کا سسپنس دیکھا۔ ٹائٹل بڑا اچھا لگا۔ ذاکر صاحب اگر لڑکی کا پورا چہرہ دکھاتے تو یقیناً وہ خوب صورت ہوتا۔ سب سے پہلے رفاقت حسین صاحب کو پہلے نمبر پر آنے پر مبارکباد۔ مختصر تبصرہ اچھا تھا۔ باقی تمام ساتھیوں کے خطوط بھی بہترین تھے۔ اپنا نام بلیک لسٹ میں دیکھا، یقین جانیں برا نہیں لگا کیونکہ ہمیں پتا تھا کہ ہمارا خط ٹائم پر نہیں پہنچ پائے گا کیونکہ مصروفیت کے باعث دیر سے لکھا تھا اور اس امید پر بھیج دیا کہ شاید...... خیر نام تو آگیا نا! نام ہی کافی ہے......! جون ایلیا کا ”مشرق“ پڑھا۔ کیا گہرائی ہوتی ہے ان کے انشائیے میں۔ جون صاحب نے وقت سے پہلے ہی تمام حالات کی منظر کشی کر دی تھی۔ یہی بڑے دانشور کی پہچان ہے کیونکہ وہ کوئی نجومی نہیں مگر اپنے علم و فراست کے بل بوتے پر ایک دوربین کے مانند ہوتا ہے۔ اللہ پاک جون صاحب کو جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین۔ سب سے پہلے وقت سے اسٹارٹ لیا۔ وقت میں وہ تیزی نہیں جو کہ ہمارے خیال میں ہونی چاہیے تھی۔ کہانی میں فی الحال ایکشن کم اور لفاظی زیادہ ہے۔ رائٹر صاحب کو کہانی کا ٹیمپو تیز کرنا چاہیے۔ اے آر راجپوت کی رنگِ آسمان بھی فی الحال ساکت ہے۔ کہانی میں لگتا ہے غیر ضروری طوالت ہے۔ بس چلے جارہی ہے، واقعات میں کوئی دلچسپی لینے سے قاصر ہیں۔ حالانکہ بعض کہانیاں قاری کو ایسے جکڑ لیتی ہیں کہ اختتام کیے بغیر کہانی سے نظر ہٹانے کو دل نہیں چاہتا۔ ہماری نظر میں یہ دونوں سلسلے اس طرح نہیں چل رہے جس طرح انہیں چلنا چاہیے۔ یہ ہماری رائے ہے۔ ضروری نہیں کہ سب لوگ اس سے متفق ہوں۔ بہرحال ہماری ادارے کے توسط سے رائٹر حضرات سے گزارش ہے کہ کہانی کو غیر ضروری طوالت سے بچائیں اور کہانی میں دلچسپی کا مواد شامل کریں۔ تاریخی کہانی موراں پسند آئی۔ موراں کا کردار بہت پسند آیا اور تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ نشور ہادی کی حریف کہانی پسند نہ آسکی۔ معذرت کے ساتھ۔ کہانی حقیقت سے دور لگی۔ اس لیے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس پر تبصرہ نہیں کریں گے۔ آپ کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تو ہر کہانی پر تنقید کر رہی ہے۔ تو جناب جو ہمارے دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمیں ہر کہانی اوسط لگے۔ مگر مذکورہ کہانی سسپنس کے معیار پر پوری نہیں اتری۔ خیر چھوٹی کہانیوں میں تنویر ریاض کی نفع نقصان بہترین کہانی تھی۔ لارا نے بے وقوفی کی جو دھوکا کیا اور اپنا نقصان کر بیٹھی۔ محمد شوکی کی التجا بھی زبردست کہانی تھی۔ روحوں نے خود پر ہوئے ظلم کا انتقام لے لیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی جسٹس نے دل غمگین کر دیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ لگ رہا تھا کہ دل پھٹ جائے گا۔ نہ جانے ہم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ہم بے حسی کے اول درجے پر پہنچ گئے ہیں اور غلط اور صحیح کی پہچان کھو بیٹھے ہیں۔ واہ بھئی...... اس دفعہ تو لگتا ہے چھوٹی کہانیاں بازی لے گئیں۔ جو بھی کہانی پڑھی وہ شاندار لگی۔ ثمر عباس کی مہلت بھی کافی اچھی کہانی تھی۔ آوازِ حق مرزا امجد بیگ نے عدالتی معاملات نہایت خوش اسلوبی سے نبا ہے۔ کہانی بہتر تھی۔ قصہ حضرت موسیٰ...... ایمان تازہ ہو گیا۔ ہم نے طاہر صاحب کی کئی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ہمیں ان کا اندازِ بیاں بہت پسند ہے۔ ایک گزارش ہے کہ طاہر جاوید مغل صاحب کی کوئی کہانی لگائیں۔ ان کی تحریر میں اثر ہوتا ہے۔ انجم فاروق کی انتقام بھی بہترین کہانی تھی۔ شاکر لطیف کی دیدہ دلیری نے تو کمال کر دیا۔ ہمارے معاشرے کی ٹھیک عکاسی کی گئی۔ نہ جانے ہم کب جہالت کے اندھیروں سے نکلیں گے۔ اپنی ہی اولاد کو ختم کر کے وہ نامعقول باپ فخر کر رہا تھا۔ بہت افسوس ہوا کہ ہمارے ہاں ایسے رسم و رواج قائم ہیں جو انسانیت سوز ہیں۔ جس کی مثال پوری دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ منظر امام کی کہانی نے تھوڑا دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ہلکی پھلکی تحریر نے مزہ دیا۔ محفل شعر و سخن بھی خوب تھی۔ مجموعی طور پہ شمارہ بہترین تھا۔"

⌘ شاہانہ سلطان، جامع کلاتھ کراچی سے اپنی رائے سے نواز رہی ہیں "مارچ کا شمارہ پڑھا اور دل بڑا خوش ہوا کہ اس بار ہر کہانی لاجواب رہی..... بالخصوص جسٹس نے تو کمال کر دیا۔ ناہید باجی کے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ کہاں سے لاتی ہیں ایسے موضوعات جو سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ التجا نے بھی کافی متاثر کیا۔ محمد شوکی نام تو نیا ہے مگر کام نے واقعی کام کر دیا۔ بہت زبردست اندازِ تحریر رہا۔ نفع نقصان بھی تنویر ریاض نے اچھی مغربی کہانی لکھی۔ لارا کی چالاکی نے اسے کتنے بڑے نقصان سے دوچار کر دیا۔ اس کا اندازہ اسے تمام عمر نہیں ہو سکے گا انسان لالچ میں خود کو کتنی پستی میں گرا لیتا ہے۔ اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں نے بھی اب آسمان سر پر اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ کہانی میں دھیرے دھیرے سسپنس کی مار ہوتی جا رہی ہے جو کہانی اور قارئین کے درمیان تعلق مضبوط کر رہی ہے۔ ویری گڈ۔ آوازِ حق مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے ایک اور مزیدار قصہ۔ بہت ہی دلچسپ رنگ لیے آگے بڑھا اور احساس دلایا کہ برے کام کا انجام اچھا رکھنے کی توقع ایک حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ ثمر عباس کی مہلت نے بھی محظوظ کیا۔ شاہ زین رضوان سسپنس کی فہرست میں ایک پُربہار اضافہ ہیں۔ اب تو تسلسل سے شاہ زین رضوان کی کہانیاں لگ رہی ہیں اور قاری کو اپنے سحر میں مبتلا کرتی جا رہی ہیں۔ اس بار بھی امانت لے کر آئے اور قاری کے دل کو مسحور کر دیا۔ اس ماہ کی بہترین کہانی نادیہ نور کی تنہائی رہی۔ جس کی ہر سطر نے ہماری نظر کو کہیں اور بھٹکنے نہیں دیا۔ کرسٹی نے بہت ہوشیاری سے ایک تیر سے دو شکار کھیلے اور کامیاب رہے۔ ایک طرف تو ظالم شوہر سے چھٹکارا مل گیا اور دوسری جانب شوہر کی محبوبہ سے بھی جان چھوٹ گئی۔ ویل ڈن۔ وقت بھی اپنے انداز سے دھیرے دھیرے چل رہی ہے کبھی کوئی بہت اچھا ٹوئسٹ آ جاتا ہے اور کبھی انتہائی بوریت کا شکار کر دیتا ہے۔ بہرحال آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ محفل شعر و سخن میں ہر شعر دل میں اتر گیا۔ بھئی واہ کیا لاجواب انتخاب ہوتا ہے۔ اب ذرا قاری بھی سنجیدگی سے اشعار کو منتخب کرتے ہیں۔ یہ محفل اب کچھ بڑی بڑی سی ہو گئی ہے۔ حضرت موسیٰ کے حالاتِ زندگی سے آگاہی دلا رہی ہیں رضوانہ ساجد۔ جزاک اللہ۔ بہت سے ایسے پہلوؤں کا ادراک ہوا جن کا ہمیں پہلے علم نہیں تھا۔ شاکر لطیف کی دیدہ دلیری بھی خوب رہی۔ انجم فاروق ساحلی کی انتقام نے بھی لطف دوبالا کر دیا۔ منظر امام کی ناکام بھی کامیابی سے مزہ دے گئی۔ البتہ نشور ہادی کی حریف نے کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا۔ آخری صفحات میں اتنی طوالت کے باوجود کہانی کچھ خاص نہیں لگی۔ تبصرے تمام کے تمام اچھے لگے میرے خط کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔" (رسالے کی پسندیدگی کے لیے آپ کا بھی بے حد شکریہ)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

غلام محمد، سرگودھا۔ محمد ارشد، خانیوال۔ مہرین ناز، حیدرآباد۔ رانیہ فردوس، ساہیوال۔ راحیل احمد، ناظم آباد، کراچی۔ محمد ریاض، تحصیل علی پور۔ سعود احمد لاشاری، نوشہرو فیروز۔ سید افتخار حسین، مظفرآباد، آزاد کشمیر۔ رشید علی خان، پشاور۔ مقصود الحسن طاہر، قصور۔ محمد ارشاد تبسم، لیہ۔ صابر علی، دادو۔ سائرہ امتیاز، پھالیہ۔ سجاد عباسی، مری روڈ، راولپنڈی۔ راحیلہ شعیب، ملتان۔ عاشق بلوچ، حب۔ نصر اللہ منگی، کندھکوٹ۔ زمان باجوہ، سکھر۔ نصر اللہ شیخ، فیصل آباد۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بے پناہ

ڈاکٹر ساجد امجد

انسان بے پناہ کی تلاش میں بعض اوقات اپنی اصل پناہ گاہ سے بہت دور نکل آتا ہے... اور پھر پلٹنے میں اسے مزید ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے مرکز پر پہلے جیسی زندگی گزار نہیں پاتا... دنیا کے عظیم فاتح سکندر اعظم... کے ساتھ بھی تقدیر نے کچھ ایسا ہی کھیل کھیلا... جو پوری دنیا دیکھنا اور اس کے رازوں سے واقف ہونا چاہتا تھا لیکن زندگی کے دن پورے ہوجانے کے سبب اس کی یہ خواہش ادھوری رہ گئی، اس کے باوجود وہ آج بھی تاریخ میں ایک عظیم فاتح کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اگرچہ اس تمام سفر اور فتوحات میں اس کی بہادر فوج کی دلیری اور وفاداری کا بڑا ہاتھ ہے لیکن ان کے حوصلوں کو مہمیز کرنے کا فن سکندر کی زبان وبیان میں پوشیدہ تھا... اتنی کم عمری میں اس کے قدموں نے بے پناہ وسیع اس کائنات کی زمین کو چھوا اور وہ اپنا نام ہر جگہ چھوڑ آیا... بے حساب دولت اور ممالک کا حکمران... خالی ہاتھ دفن ہوکر جاتے جاتے بھی انسان کو سبق دے گیا کہ ساری کائنات کی دولت ہاتھ لگ جائے پھر بھی انسان کو خالی ہاتھ ہی رخصت ہونا پڑتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

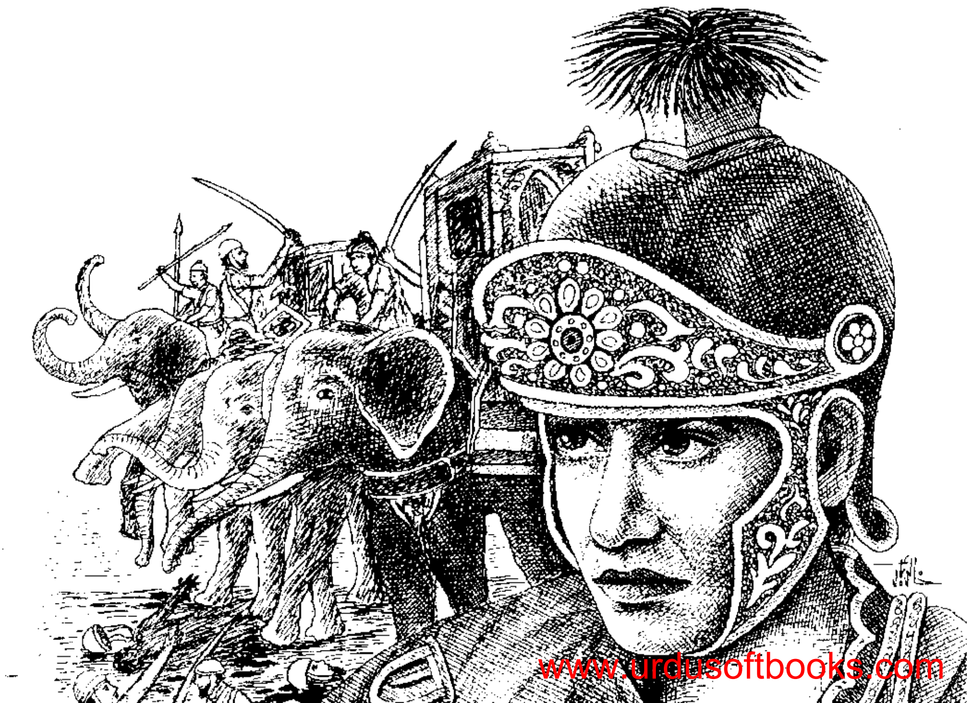

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ایک، دو، تین..... مسلسل تین جنگوں میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد شہنشاہِ ایران دارا کے غصے کی انتہا نہیں رہی تھی لیکن اب اس کے پاس فرار کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا کیونکہ اس کی فوج تتر بتر ہوگئی تھی اور بہت تھوڑے سے لوگ اس کے ساتھ رہ گئے تھے۔ دارا بہادر تھا لیکن اب تو اس کا حال یہ تھا کہ ہارے ہوئے لشکر میں تھا۔

"میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں۔"

گزشتہ تین جنگوں سے پہلے اس کے پاس کثیر تعداد میں فوج موجود تھی۔ ہتھیاروں سے لیس بھی تھی اور بہادر بھی لیکن یونانی جنگجو سکندر کے آتے ہی یہ فوج تنکا تنکا ہوکر بکھر گئی اور اب یہ حال تھا کہ دارا جان بچانے کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف بھاگتا پھر رہا تھا۔

مقدونوی افواج مسلسل پیش قدمی کررہی تھیں۔ سکندر کے جاسوس پل پل کی خبریں پہنچا رہے تھے اور سکندر ان خبروں کے نشان ڈھونڈتا ہوا برابر آگے بڑھ رہا تھا۔

کئی پہاڑوں پر چڑھنے اترنے کے بعد سکندر کو معلوم ہوا کہ دارا ایک شہر "پرسی پولس" میں پناہ گزیں ہے۔

چار مرکزی شہروں میں سے جہاں شاہی خزانہ رہتا تھا

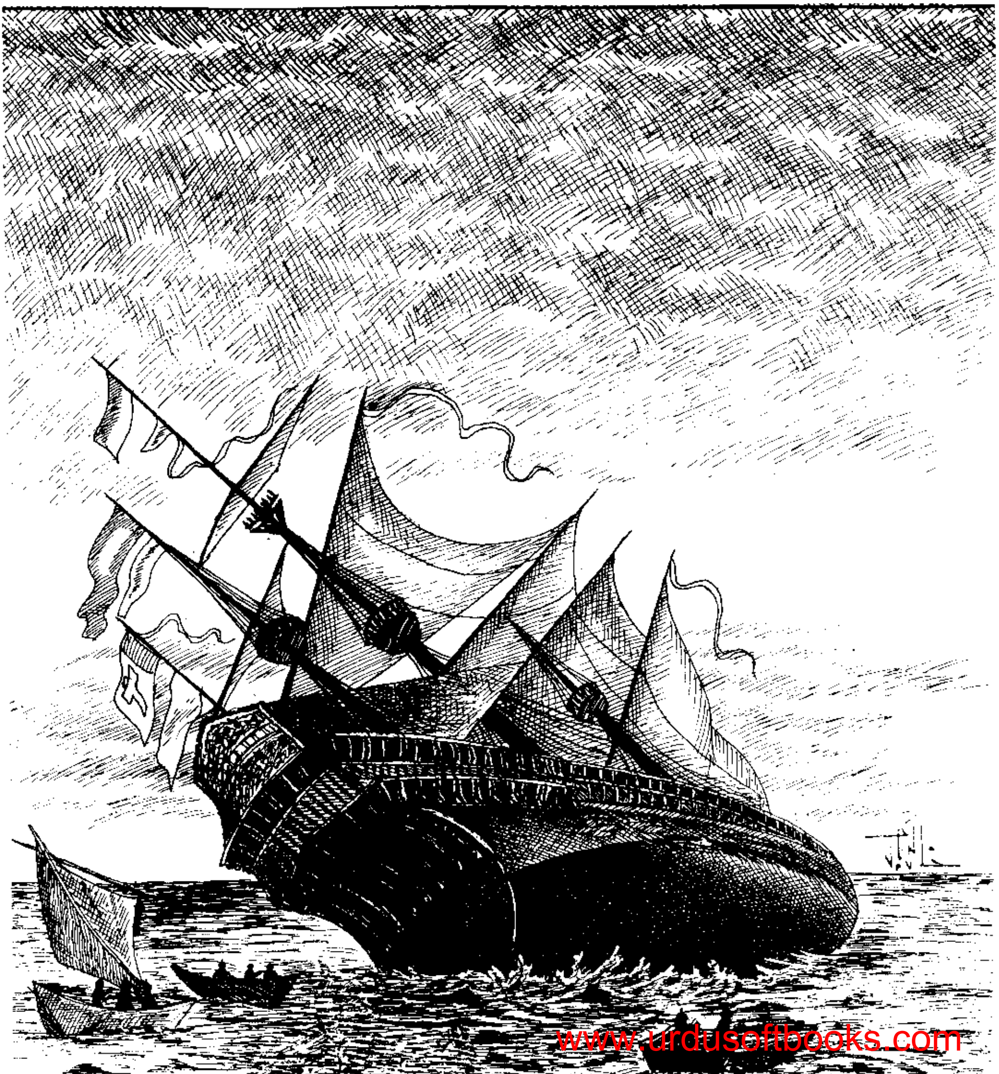

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پرسی پولس سب سے زیادہ دولت مند سمجھا جاتا تھا۔ یہی شہنشاہِ ایران کا محفوظ ترین مقام تھا۔

تعاقب ضروری تھا۔ اب مقدونوی افواج انتہائی تیزی سے قلب ایران کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سکندر کو امید تھی کہ وہ دارا کو نئی فوجیں فراہم کرلینے کا موقع دیے بغیر اس پر جا پڑے گا۔ اس وقت وہ ایک اور ایرانی شہر ''شوش'' میں تھا۔ اس نے اپنی افواج کو حکم دیا اور اس سیلاب کا رخ ''پرسی پولس'' کی طرف ہوگیا۔

شوش کے اردگرد نشیبی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سکندر کی فوج پہاڑی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ایک لمبی وادی میں داخل ہوگئی۔ یہاں کئی خودمختار قبائل آباد تھے۔ وہ ان تمام لوگوں سے راہداری وصول کرتے تھے جنہیں ان علاقوں سے گزرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ انہوں نے سکندر کے پاس بھی پیغام بھیجا۔

''گزر کی اجازت اس وقت تک نہیں دی جائے گی جب تک راہداری کی رقم ادا نہ کی جائے۔''

''تم لوگ بلندیوں سے اتر کر وادی میں آجاؤ اور اپنی رقم لے جاؤ۔''

اس وقت رات تھی لہٰذا یہ طے تھا کہ اب جو کچھ ہوگا صبح ہی ہوگا۔ رات کو دن میں بدلنے کا فاصلہ مقدونوی افواج کے لیے بہت تھا۔ قبیلے کے لوگ یہ جانے بغیر کہ رات بھر میں کیا ہوگیا ہے سڑک پر جمع ہوگئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مقدونوی فوج کے دستے سڑک کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ کھڑے ہیں اور سڑک کے آس پاس کے جتنے دیہات ہیں ان سب پر مقدونوی قابض ہیں۔ راتوں رات وہ یونانیوں کے نرغے میں آچکے تھے۔ ان لوگوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو گرتے پڑتے دور افتادہ بلند چوٹیوں پر پہنچ گئے اور بچے کھچے ریوڑ بھی ساتھ لے گئے۔

ایک پہر نہیں گزرا تھا کہ قبیلے کے کچھ لوگ پہاڑ سے نیچے اترتے ہوئے دکھائی دیے۔ فوراً سکندر کو خبر کی گئی۔ وہ اپنے کیمپ سے نکلا، گھوڑے پر سوار ہوا اور اس مقام پر پہنچ گیا جہاں کچھ اجنبی لوگوں کو اس کی فوج گھیرے کھڑی تھی۔ ان لوگوں نے سکندر کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

''ہم آپ کے مخالف نہیں لیکن ہمارا گزارہ ہی اس پر ہے کہ ہم ہر آنے جانے والے سے راہداری کی رقم وصول کرتے ہیں۔''

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اب پورے ایران پر میرا قبضہ ہے۔ میرا نام سکندر ہے۔ یونان کا سکندر۔''

''ہمیں تو شہنشاہِ ایران بھی یہاں سے گزرنے کی رقم ادا کرتا ہے۔''

''تم اس رقم کی سکندر سے امید نہ رکھنا۔''

''آپ مالک ہیں لیکن آپ کی فوج نے ہماری جن زمینوں پر قبضہ کرلیا ہے، ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں ہمارے حق میں چھوڑ دیں۔''

''تمہیں اس کے بدلے میں خراج ادا کرنا ہوگا۔''

''آپ مالک ہیں۔''

''ہر سال ایک سو گھوڑے، پانچ سو مویشی اور تیس ہزار بھیڑیں بطور خراج دیا کرو گے۔''

یہ قبائل کھیتی باڑی کرتے تھے لہٰذا خراج جانوروں کی صورت میں لیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ان قبائل کی بھی مجبوری تھی کہ انہیں اپنی زمینیں واگزار کرانا تھیں لہٰذا یہ شرط منظور کرنا پڑی۔

اس مقام سے روانگی کے لیے اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا۔ ایک حصے کو اپنے ایک سردار پارمینو کے حوالے کیا کہ وہ بڑی فوج کے ساتھ چکر کھاتا ہوا سڑک پر سے آہستہ آہستہ آئے اور خود فوج کے منتخب دستے لے کر بلند راستے سے ''پرسی پولس'' کی جانب روانہ ہوا۔

ابھی اس نے کوئی قابلِ ذکر فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ اسے ایک بھرپور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ راستے میں ایک تنگ گھاٹی آگئی جس سے گزر کر درّے میں پہنچنا تھا۔ اس گھاٹی کو مزاحمت کرنے والوں نے بند سے مسدود کردیا اور مقابلے پر فوج بٹھا دی۔ مقدونیوں نے بند پر حملہ کیا لیکن خلافِ توقع انہیں پسپا ہونا پڑا۔ مجبور ہوکر انہیں گھاٹی سے الگ ہٹ کر قیام گزیں ہونا پڑا تاکہ آئندہ کے لائحہ عمل کے لیے حکمتِ عملی طے کریں۔ چند قیدی ان کے ہاتھ آگئے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ پہاڑوں کے دائیں بازو سے ایک راستہ گزرتا ہے جو درّے کے اس پار دریا پر پہنچا دیتا ہے۔ سکندر نے ان قیدیوں کو بطور راہبر ساتھ لیا اور راتوں رات بارہ میل کا فاصلہ طے کرلیا۔ پہاڑوں کی بلندی پر پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ راستے کا باقی حصہ بھی رات کی تاریکی میں طے کرے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دن کے اجالے میں ایرانیوں کی اس پر نظر پڑے البتہ اتنا کیا کہ اپنے کچھ لوگوں کو سواروں اور انجینئروں کے ساتھ آگے بھیج دیا کہ وہ دریا پر پہنچ کر پل تعمیر کریں۔

دوسری رات آئی تو مقدونوی فوج پہاڑ سے نیچے اتری اور درّے پر پہنچ گئی۔ ایرانی پہرے داروں کی تین قطاریں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

درے کی حفاظت کے لیے کھڑی ہوئی تھیں۔ انہیں یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یونانی یہاں پہنچ چکے ہیں۔ بے خبری کے عالم میں سب کے سب گرفتار ہو گئے۔ ایرانی فوج نیچے کیمپ میں موجود تھی۔ اسے خبر تک نہ ہو سکی۔ اس سے پہلے کہ دن کی روشنی آنکھوں کو روشن کرے، یونانی فوج ایرانی کیمپ کے عقب میں پہنچ کر حملہ آور ہو گئی۔ ایرانی فوج گھبرا کر دریا کی طرف بھاگی مگر یہ کیا؟ دریا پر یونانی فوج کے وہ دستے کھڑے تھے جنہیں سکندر نے پہلے ہی پل کی تعمیر کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ ایرانی دستے گاجر مولی کی طرح کٹ کر رہ گئے۔ سکندر جب تک وہاں پہنچا میدان صاف تھا۔ پُل تیار ہو چکا تھا۔ اس نے بہ آسانی دریا عبور کر لیا۔

پرسی پولس اب صرف پینتالیس میل دور رہ گیا تھا، بس ایک جنگل اور کچھ کھیت، چند گاؤں عبور کرنے تھے۔ مزاحمت کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ سکندر سواروں کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ میدانی علاقے میں پہنچ گیا۔ اس زرخیز وادی کے سامنے ہی پرسی پولس تھا۔ اس شہر کی پتھریلی دیواریں سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

اور پھر وہ اس شہر کے سامنے پہنچ گیا۔

یہاں معمولی سی مزاحمت اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ ایران کے کمانچی راستہ روکے کھڑے تھے لیکن جوش سے بھرے یونانیوں نے انہیں چند لمحوں میں تتر بتر کر کے رکھ دیا۔ اور پھر یہ حال تھا کہ یونانیوں کے قہقہوں سے پرسی پولس گونج رہا تھا۔ انہوں نے ایران کے قلب پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ صد ستون ایوان کے دروازے توڑ ڈالے۔ ان کے سامنے دہشت زدہ خدام کی ایک جماعت کھڑی تھی۔ انہوں نے دارا کے محلات اور اردشیر کی چھوٹی سی عمارت کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ انہیں احساس تھا کہ کامیابی یعنی پرسی پولس کی پوری دولت ان کے ہاتھ آ گئی ہے۔

ذرا سی چھان بین کے بعد یہ دکھ ضرور ہوا تھا کہ دارا یہاں سے بھی فرار ہو چکا ہے۔ بہرحال شراب پینے اور دولت سمیٹنے کے خوب مواقع تھے۔

پرسی پولس میں جو دولت ان کے ہاتھ آئی اس نے ہوش و حواس گم کر دیے۔ شوش کے مال غنیمت کے بعد انہوں نے اپنے دل میں جو تصور قائم کیا تھا یہ دولت اس سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔

فوج کے ساتھ جو زمین کی پیمائش کرنے والے ساتھ آ رہے تھے، ان کے نقشوں سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ گزشتہ دس مہینوں میں یہ فوج بہت بڑے علاقے سے گزر چکی تھی جس کا

گھمنڈ

ایک صاحب کو اپنی اس ہوشیاری پر بڑا گھمنڈ تھا کہ اس کی جیب کوئی نہیں کاٹ سکتا۔

اس کو ثابت کرنے کے لیے ایک دفعہ اس نے اپنی جیب میں جعلی نوٹ رکھے اور اپنے دوست پر یہ بات ثابت کرنے کے لیے اس کو ساتھ لے کر سفر پر روانہ ہوا۔

جب وہ گاڑی سے اترے تو فخر سے وہ صاحب اپنے دوست کو جیب سے نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے بولے۔

"یہ دیکھو......"

جب دوست نے نوٹ دیکھے تو اسے سب سے اوپر والے نوٹ پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا ہوا نظر آ گیا۔

"شرم نہیں آتی۔ جعلی نوٹ جیب میں ڈال کر سفر کرتے ہو۔"

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

رقبہ تین لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل سے کم نہ تھا۔ یہ اتنا بڑا علاقہ تھا کہ مقدونیہ جیسے بارہ ملک اس میں سما سکتے تھے۔

سکندر ابھی پرسی پولس میں ہی تھا کہ اسے دارا کے بارے میں اطلاع مل گئی۔ دارا "مادہ" کے پہاڑوں میں تھا اور برف پڑ جانے کے باعث کہیں جا نہیں سکتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ خود سکندر کو بھی سردی کا موسم پرسی پولس ہی میں گزارنا تھا۔

وہ برف پگھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

دارا نے تین بار شکست کھانے کے بعد بھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ وہ فرار کی راہوں کو اپنے نیزے کی انی سے چیر ضرور رہا تھا لیکن اس فکر میں بھی تھا کہ اپنی فوجوں کو اکٹھا کرے۔ مقدونیوں کی پیش قدمی کی خبر ملتے ہی وہ "مادہ" سے بھاگ نکلا۔ اب اس کے ساتھ دو ہزار تنخواہ دار ایرانیوں اور معمولی سواروں کے سوا کوئی جمعیت نہ تھی۔ وہ ایران کی سطح مرتفع سے گزرتا ہوا مشرق کی سمت چلا گیا تاکہ اپنی جان بچا سکے اور ممکن ہو تو نئی فوج بھرتی کر سکے۔ اس دربدری کے عالم میں اسے کسی بیرونی وسیلے کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے اردگرد نظر دوڑائی تو ہندوستان کے طاقتور راجا پورس کا خیال آیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پورس

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کتنا طاقتور تھا۔ دارا کو اس کا خیال آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ پورس عظیم تھا۔ جب دور ونزدیک کوئی مددگار نہ رہا تو اس نے راجا پورس کے نام خط لکھا۔

''شہنشاہ دارا کی طرف سے شاہ ہند پورس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار۔ اس سے پہلے میں اپنی سلطنت میں قوت اور عالیشان انداز میں حکومت کرتا تھا لیکن اب میں تم سے مدد اور تعاون کا درخواست گزار ہوں کیونکہ ایک طاقتور جنگجو شخص (سکندر) نے ہم پر جنگ مسلط کردی ہے۔ اسے کوئی خوف وخطر نہیں۔ اس کا حوصلہ زبردست اور جسم تنومند ہے اور میں نے اس جیسا شخص پہلے کسی بادشاہوں یا انسانوں میں نہیں دیکھا۔ سن لو اس نے ہماری کشتی کا باعث بننے والی عورتیں بھی چھین لی ہیں۔ یہ بھی سنو کہ متعدد بار یونانیوں کے مقابلے میں اترا لیکن انہیں شکست دینے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ مجھ پر غالب آ گیا اور ذلت آمیز گہرائیوں میں پھینک دیا کیونکہ ایرانیوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس سے جنگ کرسکتا۔ اس طرح اس نے میری سلطنت چھین لی۔ میری ماں، میری ملکہ اور بیٹی کو باندی بنا لیا۔ میرے پاس موت کے سوا کچھ نہیں بچا۔ شاید میرے لیے اس کا غلام بننے سے مرنا ہی بہتر ہے۔

اے پورس! میری مدد کرو اور اس محبت کا اظہار کرو جو ہمیشہ ہمارے درمیان رہی ہے۔ مجھے تمہاری ہندوستانی فوج کی ضرورت ہے جو سکندر اور اس کی فوج کے آہنی ہاتھوں سے نمٹ سکے۔ یہ فوج میری کمان میں دو تاکہ میری امید اور اعتماد کو نئی روح مل سکے۔

میں تمہارے پیغام تک تمہارا منتظر رہوں گا۔ اس کے بعد میں دشمن فوج پر ٹوٹ پڑوں گا اور انہیں اپنا علاقہ چھوڑنے پر مجبور کردوں گا۔ اگر میں سکندر پر فتح یاب ہوا تو میں نصف مالِ غنیمت تمہارے حوالے کردوں گا۔''

اس خط کے ملتے ہی پورس نے دارا کی درخواست کا فوری جواب دیا اور اس کی مدد کے لیے اپنی فوج کے ساتھ ہاتھیوں کا دستہ بھیجا۔ بھاری ڈیل ڈول کے ان ہاتھیوں کو افغانستان کے پہاڑی اور دشوار گزار راستوں کو پار کر کے ایران تک پہنچنا تھا۔

سکندر اتنا بے خبر نہیں تھا کہ اس خبر سے بے خبر رہتا۔ اسے دارا کی فوجی تیاریوں کی اطلاع مل گئی۔ اس نے فوراً طبلِ جنگ بجایا اور دارا کا تعاقب ازسرِنو شروع کردیا۔ پہاڑوں پر برف پگھل چکی تھی۔ وہ شمالی ومغربی سمت میں اونچے پہاڑوں پر چڑھے اور بلندی پر پہنچ گئے۔ وہاں جو قبیلے آباد تھے ان سے غذائی اجناس بہ افراط ملتی رہیں۔ سکندر نے ان پہاڑی علاقوں کے نظم ونسق کا بندوبست بھی کردیا۔

پھر فوج نے رفتار تیز کردی اور اس وادی تک پہنچ گئے جو ایکتبانہ جاتی تھی، یہی وہ مقام تھا جہاں دارا کی موجودگی کی اطلاع تھی۔ مقدونی نہایت اطمینان سے ایکتبانہ میں داخل ہوگئے لیکن یہ محنت اس وقت اکارت چلی گئی جب انہیں معلوم ہوا کہ دارا ''دماوند'' کی طرف نکل گیا ہے۔

دارا کو پورس کا انتظار تھا اور وہ بے تحاشا اپنی سرحد کے آخری کنارے کی طرف بھاگے چلا جارہا تھا۔

سکندر ایکتبانہ سے نکلا اور گیارہ دن میں تین سو میل دور نکل گیا۔ شمالی سمت میں اسے وہ پہاڑ نظر آیا جسے مجوسی کوہ ارزق (دماوند) کہتے تھے۔

سکندر نے دماوند کے پاس قدیم شہر کی فصیل کے اندر قیام کیا۔ اسے اطلاع ملی کہ دارا کئی روز پیشتر وہاں سے گزر چکا ہے۔ وہ فوراً یہاں سے روانہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے پیچھے رہ جانے والے دستوں کا انتظار تھا۔ اسی دوران اسے یہ نئی اطلاع ملی کہ دارا کو اس کے ایک ماتحت حاکم نے گرفتار کرلیا ہے۔ سکندر نے یہ سنتے ہی رسالے اور پیادہ دستوں کو ساتھ لیا اور دوروڈ کا راستہ لے کر تیزی سے روانہ ہوگیا۔ تعاقب کرنے والی فوج رات بھر چلتی رہی۔ صبح ہوئی تو اس نے ایک ندی پر قیام کیا تاکہ سپاہی ستا لیں اور چند گھنٹوں کے لیے سوجائیں کیونکہ وہ رات بھر چلتے رہے تھے۔ سفر اتنا طویل تھا کہ بعض گھوڑے تکان کے باعث مر چکے تھے۔

مقامِ لطف یہ کہ یہی وہ مقام تھا جہاں ڈیڑھ دن پیشتر ایرانی شہنشاہ نے قیام کیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اطلاع ملی کہ حاکم نے مقابلہ کرنے والی فوج کی کمان سنبھال لی ہے اور اس کا قصد یہ ہے کہ شہنشاہ کے ساتھ مشرقی سمت ہٹ جائے اور باختر پہنچ کر نئی فوج تیار کرے۔

سکندر نے اپنی فوج کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سونے دیا اور روانہ ہوگیا۔ ایک دن اور ایک رات برابر چلتا رہا۔ بجلی کی سی رفتار سے چلا اور اس مقام پر پہنچ گیا جہاں مفرورین بیس گھنٹے پیشتر موجود تھے۔ اب تک وہ اس راستے پر چل رہا تھا جس سے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ یہ راستہ کم دشوار تو تھا لیکن طویل تر بھی تھا۔ اس کے دائیں جانب صحرا تھا۔ وہ اگر اس صحرا سے گزرتا تو بہت جلد منزل تک پہنچ سکتا تھا البتہ اس میں پانی نہیں ملتا۔ اس نے یہ دشواری قبول کرلی۔ ایک نظر اپنے فوجیوں پر ڈالی۔ پانچ سو فوجیوں کو وہیں چھوڑا جو بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے اور ان

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کی جگہ قوی پیادوں کو سوار کرلیا۔ دوپہر کی تیز دھوپ میں وہ سکندر کے ساتھ بندھے جارہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو سکندر کو بتائے بغیر راستے میں سے واپس ہو گئے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا تعداد میں کمی آتی جارہی تھی۔ پانی بالکل ختم ہو چکا تھا۔ بعض طلایہ گرد سوار چمڑے کے کسی مشکیزے میں چٹانوں سے پانی تلاش کر کے لائے اور سکندر کی خدمت میں پیش کیا۔

''یہ پانی تم کس کے لیے لائے ہو؟'' سکندر نے پوچھا۔

''آپ کے لیے۔''

سکندر کے آس پاس سیکڑوں آدمی کھڑے تھے اور ان کی نظریں پانی پر جمی ہوئی تھیں۔ سکندر نے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تنہا ایک آدمی کا پانی پی جانا قطعی مناسب نہیں۔'' اور پانی ریت پر گرادیا۔

دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ پیاس سے برا حال تھا۔ یہ فکر بھی تھی کہ تھوڑی دیر میں رات ہو جائے گی۔ اگر نزدیک پانی ہوا بھی تو دکھائی نہیں دے گا۔ اسی وقت ایک واقعہ ظہور میں آیا۔ یہ لوگ دو پہاڑوں کے درمیان سے گزر رہے تھے کہ ایک طرف گردوغبار اڑتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ مفرورین کا نشان تھا۔ دوسری طرف حالت یہ تھی کہ صحرائی سفر میں سینتالیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ فوجی اس حالت میں نہ تھے کہ لڑائی شروع کر سکتے لیکن سکندر کو کسی امید کی خوشبو آگئی تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کو برابر آگے بڑھاتا گیا۔ اسے راستے میں کچھ ایرانی فوجی ملے جنہیں پیاس کی شدت نے بے حال کردیا تھا اور وہ پیچھے رہ گئے۔ سکندر نے بھی ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ ان کے پاس رکا تک نہیں۔ اسے تو دارا کی تلاش تھی۔ ان تھکے ماندہ ایرانیوں کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ دارا قریب ہی کہیں ہوگا۔

اب وہ صحرا سے نکل آئے تھے۔ طلایہ گردوں نے کچھ فاصلے پر ایک چشمے کی موجودگی کی اطلاع بھی دے دی تھی۔ اسی وقت انہیں ایک گاڑی نظر آئی جسے دو خچر کھینچ رہے تھے۔ بظاہر اس میں کوئی سوار نہیں تھا۔ اسے کوئی چلا بھی نہیں رہا تھا۔ غالباً ان خچروں کو پانی کی خوشبو آگئی تھی لہٰذا بے تحاشا چشمے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ مقدونوی فوجیوں نے بھی چشمے پر دھاوا بول دیا۔ جب خوب سیر ہو کر پانی پی چکے تو انہیں اس چھکڑے کی فکر ہوئی جسے خچر کھینچتے ہوئے یہاں تک لائے تھے۔ دیکھا تو جائے اس میں کون سوار ہے؟ انہوں نے جھانک کر دیکھا تو کسی کی لاش نظر آئی۔ کچھ لوگ دارا کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے تصدیق کردی کہ یہ لاش دارا کی ہے۔ سکندر کو اطلاع ہوئی تو اس نے بھی پہچان لیا اور اپنا سفید لبادہ مقتول شہنشاہ کی لاش پر ڈال دیا۔

دارا کو اس کے سرداروں نے قتل کردیا تھا اور بعد میں سکندر کی اطاعت قبول کرلی۔

اس سے پیشتر کہ پورس کے ہاتھیوں کا دستہ وہاں پہنچتا، بہت دیر ہو چکی تھی۔ مدد کی درخواست کرنے والا بادشاہ خود اپنی جان سے جا چکا تھا۔

جب دارا نے مدد مانگی\
میں نے اس کی دلجوئی کی اور اس کی مایوسی کو محسوس کیا\
اسے حوصلہ افزائی کا پیغام پہنچایا\
جب اس کے غلاموں نے اسے قتل کردیا\
ایرانیوں کی بدقسمتی پر مہر ثبت ہوگئی\
اور دارا کا سرتن سے جدا کردیا گیا\
(شاہنامہ فردوسی)

دارا کا قتل سکندر کے لیے اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ یہ خیال کہ ایک راجا ایسا بھی ہے جو اس کے دشمن کی مدد کے لیے آیا تھا۔ یہ الگ بات کہ دارا اس کے آنے سے پہلے ہی قتل کردیا گیا۔ اس خیال نے تو اسے پاگل ہی بنادیا کہ اگر پورس کی شکل میں سرزمین ہند پر اس کا دشمن زندہ رہا تو وہ ہمیشہ ایران کے معاملات میں دخل اندازی کرتا رہے گا۔ کچھ غصہ، کچھ مصلحت۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ پیش قدمی جاری رکھے گا اور راجا پورس کو سبق سکھائے گا لیکن اس سے پہلے ایران کے انتظامی معاملات کو کسی نتیجے تک پہنچانا ضروری تھا۔ اسے کسی مرکزی مقام کا انتخاب کرنا تھا جہاں بیٹھ کر وہ سردار انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کرسکیں جنہیں وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر جائے گا۔

یہ مرکزی مقام ایکتبانہ ہی ہو سکتا تھا۔ مادی اور طبعی لحاظ سے یہ مقام سکندر کے نزدیک زیادہ موزوں تھا۔ اس کے اردگرد سات فصیلیں تھیں جو شاہراہ سے شروع ہو کر اندر تک جاتی تھیں۔ بالا حصار پر سنہری رنگ پھرا ہوا تھا اور خوب چمکتا تھا۔ اس کا طرز تعمیر یونانیوں کے فن تعمیر سے مشابہ تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ایتھنز تباہی کی آغوش سے اٹھ کر ازسرنو کھڑا ہو گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایکتبانہ کے پاس سے بلند پہاڑوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا تھا جس کے سامنے یونان کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بے حقیقت معلوم ہوتی تھیں۔ مقامی لوگوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہاڑوں میں بے تحاشا کانیں موجود ہیں جن سے اب تک دھاتیں نہیں نکالی گئیں۔ اردگرد ارمن اور کرد قبیلے آباد

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھے جو زرتشت کا مذہب قبول کر چکے تھے۔ زرتشت امن پسندانہ طرزِ عمل کے نتیجے میں نہایت پُرامن تھے اور لڑائیوں کو بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ انہوں نے بلندترین مقامات پر آتش کدے تعمیر کر رکھے تھے۔ یہاں کے مجوسیوں نے سکندر کو بتایا کہ حکمرانی طور طریقے کیا ہیں اور ایران میں کس طرح حکمرانی کی جاسکتی ہے۔

ان مجوسیوں نے اسے بتایا کہ قدیم شہنشاہوں نے ہر حصے کے لیے ایک گورنر مقرر کیا تھا۔ انہوں نے نہروں کے ذریعے دریاؤں کو سمندروں کے ساتھ ملایا تھا۔ شہروں کو سمندروں سے قریب تر لانے کے لیے سڑکیں تعمیر کی تھیں۔ محلات کی چھتیں چاندی سے بنائیں۔ عرب سے خوشبوئیں آئیں تاکہ کمرے معطر ہوں۔ امن وامان کو زندگی کی بقا سمجھا۔ جنگوں سے گریزاں رہے البتہ دارا کے زمانے تک بہت تبدیلی آچکی تھی۔ شروع میں وہ حکمرانی کے کام انجام دینے کے لیے شہر بہ شہر جاتے تھے لیکن جب حکومت کا دائرہ وسیع ہوا تو جگہ جگہ دورے کا طریقہ چھوڑ دیا۔ دولت کے انبار لگے تو اپنی حفاظت کے لیے محافظ فوج کا تقرر کیا۔

مقامی لوگوں نے دبے لفظوں میں سکندر سے یہ بھی کہا۔ ”مقدونیوں کی آمد تک کسی قوم کو ان شہنشاہوں کے مقابلے پر کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ ہوا۔“

سکندر نے یہاں کے نظام پر غور کیا تو اس کی اہمیت اس پر واضح ہوگئی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مختلف فوجوں کی یہ متحدہ دولت جو ایک مرتبہ کامیاب ہو چکی ہے بدستور جاری رکھی جاسکتی ہے۔ اس کے سامنے صوبہ داروں اور... مشیروں کا پرانا طریقہ موجود تھا۔ اس نے صرف ایک تبدیلی کی اور وہ یہ کہ سیاسی نظم ونسق میں صوبہ داروں کے اختیارات محدود کردیے اور بیت المال کے لیے جگہ جگہ عمارات تعمیر کرنے کا حکم دے دیا۔

ایکتبانہ میں سکندر کے پاس تھوڑے سے دانش مند تھے جو نیا نظامِ حکومت تخلیق کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ یونانی اہلِ علم نے اب کلدانیہ کے ریاضی دانوں اور مجوسیوں کے گروہ ـــ سے مشورے شروع کیے۔ اس نے پہلی مرتبہ مشرقیوں کو اجازت دی کہ اسے شہنشاہ بہت سے بادشاہوں اور روئے زمین کا فرماں روا قرار دیں۔

چاندی کے نئے سکوں کے لیے سکندر کے چہرے کا خاکہ تیار کیا گیا۔ بت سازی کے ایک ماہر نے اس پر شیر کی گردن کی طرح لمبے لمبے بال بنا دیے تھے اور ٹھوڑی کے نیچے شیر کے پنجے کی شکل بھی تھی لیکن سکندر نے اچانک یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال یہ نئے سکوں پر استعمال نہ ہو۔ اس وقت اس کے سامنے اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ فوجیوں کی بڑی تعداد اس مسلسل سفر سے اکتا چکی تھی جو انہوں نے ایران کی طویل شاہراہوں پر طے کیا تھا۔ وہ ہر جنگ کو آخری جنگ کہہ کر انہیں بہلاتا رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب ان سے کیا کہا جائے۔ وہ ایکتبانہ میں آخری جنگ لڑ چکا تھا۔ اس نے یہ مسئلہ یوں حل کیا کہ جو جیش گھر واپس جانے کے لیے تیار ہو وہ چلا جائے جو لوگ ایشیا میں رہنے کے لیے تیار ہوں وہ دوسرے جیشوں میں شامل ہو جائیں۔ جو لوگ واپسی کے لیے تیار ہوئے ان کی تنخواہیں ادا کردی گئیں اور یہ انتظام کردیا گیا کہ ساحل پر پہنچ کر گھوڑے فروخت کردیں اور نئے جہازوں میں بیٹھ کر یونان چلے جائیں۔ دوسرے جیشوں کو ایکتبانہ میں ٹھہرنے کی اجازت مل گئی لیکن اس وقت تک سکندر مشرقی جانب حرکت کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے ایک سردار کلائٹس کو حکم بھیج دیا کہ اپنے سواروں کو لے کر پارتھیا میں فوج کے ساتھ شامل ہوجائے۔ ان دنوں وہ بیماری کے باعث پرسی پولس میں ٹھہرا ہوا تھا۔

وہ فیصلہ کر چکا تھا لیکن بعض آدمی یہ رائے دے رہے تھے کہ اب کسی مقصد کے بغیر آگے بڑھنا پاگل پن ہے لیکن سکندر کی روزافزوں کامیابیوں سے فائدہ اٹھانے والوں کے پُرجوش نعروں میں ان کی شکایت دب گئی۔

خزانے میں جتنی رقم جمع ہو چکی تھی اس کا حساب کیا گیا تو خاص کارکنوں کی توقع سے بہت زیادہ نکلی۔ سکے، سونا، چاندی بیش قیمت جواہرات وغیرہ ہر چیز شامل تھی۔ چار سال پیشتر جب وہ مقدونیہ سے نکلا تھا اس وقت دولت کے اس انبار کا کسی کو خیال تک نہیں آسکتا تھا۔

دولت کا یہ انبار ایران کی زوال پذیر حکومت نے زرِمحفوظ کے طور پر رکھ چھوڑا تھا۔ سکندر اسے بدستور محفوظ رکھنا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اس سے نظام حکمرانی کی نئی ترتیب میں کام لے۔ یہ سارا مال ایکتبانہ کے خزانے میں تھا اور اس کا انتظام اس نے ”پارمینو“ کے سپرد کردیا تھا جس پر وہ بے انتہا بھروسا کرتا تھا۔

اب اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ سارے انتظامات مکمل ہونے کے بعد اسے مشرق کی طرف بڑھنے کی جلدی تھی جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ خزانے کا سب سے زیادہ قیمتی حصہ سونے کے وہ ذرات تھے جو دریائے سندھ کی سرزمینوں سے حاصل ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

یہ سرزمینیں وہاں واقع ہیں جہاں دریائے سندھ پہاڑوں سے نکل کر بہتا ہے۔ وہی مقام اب اس کا نصب العین تھا۔
سکندر کے دل میں یہ خواہش تیزی سے پیدا ہوئی کہ اسے اس خط کا سراغ لگانا چاہیے۔ ممکن ہے وہ اس خواہش پر کچھ دنوں کے لیے قابو پالیتا لیکن ایک مجوسی نے ایک عجیب وغریب انکشاف کر کے اس کی خواہش کو بڑھا دیا۔
''دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ دوسرے آریائی قبیلے رہتے ہیں۔ اس طرف راستے میں باب قزوین کے اوپر ایک زمین بند سمندر پھیلا ہوا ہے۔''
سکندر کے ساتھیوں نے بھی اسے اکسایا۔ ان کی خواہش تھی کہ سکندر ایران میں رہ کر اپنے مجوزہ منصوبے کو پورا نہ کرے بلکہ نئے علاقوں کی دولت سمیٹنے پر متوجہ ہوجائے۔
وہ ایکتبانہ سے اس عجلت کے ساتھ نکلا کہ نئی حکومت کا جو نظام مقدونوی افسر اور ایرانی کارندے سنبھالے بیٹھے تھے وہ بھی پوری طرح تشکیل پذیر نہ ہوا تھا۔
اس کی یہ عجلت ہی اس کے لیے مصیبت بن گئی۔ مجوسیوں نے اس کا اشتیاق بڑھا دیا تھا۔ اسے باور کرادیا تھا کہ اگر وہ معروف راستے کو چھوڑ کر آگے بڑھے گا تو وہ ان خطوں سے گزرے گا جس پر آج تک کسی فاتح نے قدم نہیں رکھا۔
اس کا اشتیاق نئے نئے انکشافات کا خواہاں تھا۔ وہ زمین بند سمندروں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ سطح مرتفع کے کنارے معلوم ہوجائیں اور وہ نئی پہاڑی دیواروں کو پھاندے۔ اسی شوق میں اس نے غیر معروف شمال میں جست لگادی۔ یہ راستے خطرناک تھے لیکن اس کی بہادری کے سامنے نہیں۔ یہ راستے اس وقت مزید خطرناک ہوگئے جب عیش وعشرت میں ڈوبی ہوئی فوج اس کے ہمراہ ہوئی۔
سکندر کی بخشی ہوئی دولت نے فوج کے چھوٹے چھوٹے افسروں کو بھی دولت مند بنا دیا تھا۔ ایک رجمنٹ کے کماندار کے پاس بھی اتنا روپیہ جمع ہوگیا تھا جس سے وہ ایک پورا گاؤں خرید سکتا یا دریائی کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کرلیتا۔ فوجی افسر اپنی چپلوں میں چاندی کی کیلیں لگواتے تھے۔
جب فوج شہروں میں ٹھہرتی تو مختلف افراد سے ملازموں کے ہجوم کو الگ کرنا مشکل ہوجاتا۔ فوج جہاں قیام کرتی نوکر چاکروں کا لشکر اسی جگہ جمع ہوجاتا۔ ترجمان اپنے بوڑھے والدین کو ساتھ لے لیتے۔ جن ایرانیوں کو ساتھ لیا گیا تھا ان میں سے ہر ایک کے پاس فنی معاونوں کی ایک جماعت ہوتی۔ پارتھیا اور ہرکینیا کے گورنر نئے بادشاہ کے رکبِ سلام کے لیے حاضر ہوتے تو مشیروں، طبیبوں، اصطبل کے منتظمین، محاسیوں اور قاصدوں کی بڑی بڑی جماعتیں ان کے ساتھ آتیں۔
جب نئے علاقوں کی طرف فوج کے کوچ کی نوبت آتی تو سکندر کو اندازہ ہوتا کہ اس کے ساتھ لاؤلشکر کتنا وسیع ہوچکا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے یہ تو نہ کہتا کہ ملازموں کو چھوڑ دو لیکن کوچ کے دوران میں جگہ جگہ ان تمام افراد کو الگ کرتا جاتا جن کی ضرورت نہ ہوتی۔ راستے کے مختلف مقامات پر رجمنٹوں کو بھی چھوڑنا پڑتا، تاکہ وہ پہاڑی سلسلوں کو کاٹ کر راستہ بنائیں اور گردوپیش کے علاقوں کی چھان بین کریں۔ اس کے باوجود اسے دقتوں کا سامنا تھا۔
نئے فوجی مرکزوں سے کوچ کے احکام اور معمولی رپورٹیں آتیں تو انہیں پڑھنے میں گھنٹوں لگ جاتے۔ اسے درست مشورے دینے والا کوئی نہ تھا۔ اس کا دوست پارمینو پیچھے رہ گیا تھا۔ دوسرے پرانے فوجی بھی ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ نیا کماندار بہترین تھا لیکن ان دونوں کا نعم البدل نہیں بن سکتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک اور الجھن درپیش آگئی۔ مقدونوی فوج کا وہ حصہ جو سکندر کے ساتھ پیش قدمی کررہا تھا، عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ فوج کو یہ معلوم تھا کہ وہ سطح ارض پر کہاں ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ خود وہ مقام کس جگہ ہے۔ جس نقشے پر وہ چلتے آئے تھے اس کی حد ختم ہوگئی تھی اور اب وہ ایسے حصے میں سفر کررہے تھے جو ابھی تک نقشے پر نہ آیا تھا۔
وہ اب مشرق ومغرب کے درمیان اس بڑی تجارتی شاہراہ پر جارہے تھے جس کے کنارے ایک ایک دن کی مسافرت پر گاؤں بکھرے ہوئے تھے۔ جنوبی سمت میں صحرائی میدان واقع تھا جہاں دوپہر کے وقت دھوپ کی تیزی میں شہر نظر آتے اور غروب آفتاب کے ساتھ غائب ہوجاتے۔ شمالی سمت میں دماوند کی پہاڑی دیوار کھڑی تھی۔ پھر وہ ایک خم دار ندی پر نمودار ہوئے جس کا پانی حد درجہ ٹھنڈا اور کنارے پر بہت سے درخت کھڑے تھے۔
اس ندی کے ساتھ ساتھ شمالی جانب مڑے تو مقامی لوگوں نے بتایا کہ اس پہاڑی دیوار سے گزر کر وہ اس بڑے زمین بند سمندر پر پہنچ جائیں گے جو خدا جانے شمالی سمت میں کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ سکندر نے یہ سنتے ہی تجارتی شاہراہ چھوڑ دی اور غیر معلوم سمندر کی طرف چل دیا اور کچھ دور جاکر چیڑ کے جنگلوں میں سے گزرا جہاں کے جنگلی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

باشندے بلند پہاڑیوں پر کھڑے گزرتی ہوئی فوج کو دیکھ رہے تھے۔ اسی طرح چلتے ہوئے وہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں بحری پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ موجود تھے اور ماہی گیری کے لیے چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھیں۔ یہ دراصل بحیرۂ قزوین کا جنوبی کنارہ تھا لیکن اہل مقدونیہ کے پاس اس کا صحیح نام معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد اس نے پہاڑی سلسلے کے ساتھ ایک دیوار دیکھی جو سرخ پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کے متعلق اسے بتایا گیا کہ یہ دیوار تباہ کار یاجوج ماجوج کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھی۔

سکندر نے فوج کو ٹھہر کر ستانے کی اجازت دے دی۔ اس اثنا میں وہ خود مشرقی سرزمینوں کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا۔ اسے جو معلومات ملیں ان سے اس کے دل میں آگے بڑھنے کا جوش پیدا ہوگیا۔

جب اس کی فوج خوب ستا چکی تو وہ مشرقی سمت کی طرف روانہ ہوا۔ اسے گھوڑے پالنے والے قبیلے نظر آئے، لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ جب یہاں سے آگے بڑھے گا تو اس راستے پر جائے گا جہاں سے آریا آئے تھے۔ یہاں اسے دو دریا ملیں گے، ایک دریائے ریگ اور دوسرا دریائے بحر اور اسی طرح بڑھتا چلا گیا تو عظیم الشان پہاڑوں کے سلسلے پر پہنچ جائے گا جن کی چوٹیوں پر درختوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔

مصلحت تو یہ تھی کہ وہ ایکتبانہ واپس جاکر اپنے نظام حکومت کو مکمل کرتا لیکن اس پر تو دنیا کے آخری حصے کی طرف جانے کی دھن سوار تھی حالانکہ اس کے فوجی اسے دیوانگی سے تعبیر کر رہے تھے۔

جب وہ بلندیوں پر پہنچ گئے تو رسد ٹھٹھر گئی۔ سردی کا زمانہ تھا۔ سردی سے ہر چیز جم گئی تھی۔ اب ان کا گزارہ جو، پنیر اور خچروں کے گوشت پر تھا۔ اس مہم کے دوران یہ پہلی مرتبہ تھا کہ انہیں بھوک اور کم خوراکی سے سابقہ پڑا تھا۔ شہر اور باشندے مویشی اور کتے ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ ہر وقت کی بھوک اور من پسند کھانا نہ ملنے کی وجہ سے طبیعتوں میں غصہ اور چڑچڑاپن پیدا ہوگیا جو آئے دن کے جھگڑوں کا سبب بن رہا تھا۔

وہ دنیا کے انتہائی بالائی حصے میں تھے اور مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان مسائل میں اس وقت اور اضافہ ہوگیا جب نادیدہ قوتوں نے ان پر حملے شروع کردیے۔ حملہ آور ندی نالوں کی گہرائیوں سے اچانک گھوڑوں پر نمودار ہوتے اور نقصان پہنچا کر غائب ہوجاتے۔ ان قوتوں سے بچنے کے لیے سکندر نے سڑک پر چوکیاں قائم کردیں۔ صبح دیکھا تو سارے پہریدار مردہ حالت میں ملے۔ کسی نے حملہ کیا تھا اور سب کو قتل کردیا تھا۔ کوئی نشان نہیں تھا البتہ زمین پر آدمیوں کے چلنے کے نشان تھے۔

دراصل یہ مقامی باشندے تھے۔ یہاں وہی آریا رہتے تھے جنہوں نے کسی فوجی قوت کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا تھا۔ ان حملوں کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سکندر کو یہ معلوم ہوگیا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ ''رے'' سے جو سلطنت ایران کا آخری بڑا شہر تھا، کوئی ایک ہزار میل آگے نکل آئے تھے۔

ان نادیدہ حملہ آوروں سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا کہ یہاں سے کوچ کیا جائے۔ وہ یہاں سے چل کر ایک دریا پر پہنچے جس کا پانی گدلا تھا۔ کنارے پر برف کی گہری تہ جمی ہوئی تھی۔ اسی برف پر سے گھوڑے اور آدمی گزرتے رہے۔ کسی جاندار کی شکل ہرگز نظر نہ آتی تھی۔ سکندر نے کچھ سوچا اور مغرب کی طرف مڑ گیا۔

برف پگھل گئی تو اس نے جنوب کا رخ اختیار کیا اور ہلمند جھیل پر پہنچا۔ یہاں مقدونیوں کو ایک تجارتی شاہراہ ملی جو دریائے سندھ سے پرسی پولس کی طرف جاتی تھی۔ اس نے اسے کوئی اہمیت نہ دی اور آگے بڑھتا گیا۔

موسم بہار میں جب برف پگھل گئی اور گھاس اگ آئی تو وہ ایک مرتبہ پھر پہاڑی علاقے کے قلب کی طرف مڑا۔ اس نے مزاحمت کو توڑا اور جگہ جگہ نوآبادیاں قائم کیں۔ اس نے ان نوآبادیوں میں اپنے ساتھ آئے لوگوں کو آباد کیا۔ جو تاجر فوج کے ساتھ آرہے تھے انہیں بھی یہیں آباد کردیا۔

تسخیر کے اس عمل میں اسے دو سال لگے۔

اس نے بہت پہلے کسی مقام سے اپنے ایک برق رفتار سوار کو یونان اپنے استاد ارسطو کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس کے جواب میں ارسطو نے اپنے بھتیجے ہی کو بھیج دیا۔ اس نے دوران سفر کے جو حالات بتائے سکندر اسے سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ یونان کے فنکار سنگتراش، جوہری، موسیقی اور زبان کے معلم کثیر تعداد میں جہازوں پر سوار ہوکر مشرق کی نئی دنیا میں پہنچ رہے ہیں۔ جزیروں میں جنگ ختم ہوچکی ہے اور غلاموں کی تجارت دوگنی ہوچکی ہے۔ دوآبہ دجلہ و فرات میں جو یونانی کاشتکار آئے ہیں انہوں نے اپنے گھر بنالیے ہیں اور بابل کے باب اشتر سے تھوڑے فاصلے پر ایک یونانی تھیٹر زیر تعمیر ہے۔ سکندر کا بت بنا کر چوک میں رکھا گیا ہے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

یہ سب وہ علاقے اور شہر تھے جنہیں سکندر فتح کرتا چلا آیا تھا۔

اس بھتیجے کا آنا خوشگوار ہوا کے جھونکے کی طرح تھا لیکن بہت جلد یہ تعلقات کشیدگی میں بدل گئے۔ سکندر، وہ اور اس کے چند ساتھی دسترخوان پر بیٹھے تھے کہ فتوحات کا ذکر نکل آیا۔ ارسطو کے بھتیجے نے عجیب سی بات کہہ دی۔

''اہلِ مقدونیہ نے مواقع سے حیرت انگیز طور پر فائدہ اٹھایا لیکن وہ اتنی تیزی سے جابجا پھرتے رہے کہ اپنے پیچھے بے یقینی کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔''

سکندر اس کی اس رائے سے اختلاف رکھنے کے باوجود خاموش رہا لیکن جب اس نے یہ کہا کہ جب بدامنی ہو تو ایک دہقان بھی بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سکندر برداشت نہ کر سکا۔

''اگر تمہارا قول درست ہے تو تم یہاں دہقانوں میں کیوں رہتے ہو اور تمہارے آنے کی غرض کیا ہے۔'' یہ بھتیجا بھی خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ایسا جواب دیا جو سکندر کی ساری محنت پر پانی پھیر سکتا تھا۔

''میں اس لیے یہاں آیا ہوں کہ میرے ملک کی آبادی گھٹ گئی ہے اور میں جلاوطنوں کو واپس لے جانا چاہتا ہوں۔'' سکندر کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔

''جلاوطن سے تمہاری مراد کیا ہے۔ میں نے تمام لوگوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی ہے۔ ایتھنز کے تنخواہ دار بھی چلے گئے ہیں۔ اب کون جلاوطن ہے؟''

سکندر کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر کچھ کہے بغیر دسترخوان سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد سکندر نے اس سے کوئی مشورہ نہیں لیا، دونوں میں بول چال تقریباً بند ہو گئی۔

☆☆☆

گرمی کا موسم تھا۔ مقدونوی ایک دریا پر پہنچے۔ انہیں یقین تھا کہ اس دریا کا چشمہ دنیا کی بلندترین چوٹیوں پر واقع ہے۔ یہ بہت تیزی سے بہہ رہا تھا اور دریائے نیل سے اس کا عرض زیادہ تھا، اس لیے تیر کر عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اسے عبور کر لیا گیا، جگہ جگہ مزاحمت کا سامنا تھا۔ سکندر کی فوج تھک چکی تھی اس لیے سخت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ ایرانیوں کے بچے کھچے عناصر ہر قدم پر مزاحمت کر رہے تھے۔ اس کامیاب مزاحمت کا روحِ رواں ایک ایرانی امیر تھا جو ایرانی فوج میں سالار رہ چکا تھا۔ اس نے جنگی قوت جمع کر لی تھی۔ وہ شمالی علاقوں کے باشندوں ''ستھیوں'' کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

سکندر نے اپنے ساتھیوں سے بھاری سامان رکھوا لیا تاکہ وہ زیادہ ہلکے پھلکے ہو کر ان یورشوں سے عہدہ برآ ہو سکیں لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔ اس نے تنگ آ کر آگے بڑھنے کے بجائے خود ستھیوں کے علاقے میں پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا۔

وہ بلاخوف وخطر سیاہ رنگ کی ریت کے صحرا میں داخل ہو گیا اور ایک ایسے خطے میں پہنچ گیا جس کی مٹی زردی مائل چکنی تھی اور سرخ رنگ کے تودے کھڑے تھے۔ وہ مشرقی سمت کی پہاڑیوں میں چلا آیا۔ یہاں اسے ایک دریا ملا جس کے کنارے پر میوہ دار درخت کھڑے تھے۔ یہاں شہر مرکنڈ (موجودہ سمرقند) کے سنگی قلعے میں اس نے فوج کے ایک حصے کو بٹھا دیا اور خود ستھیوں کے تعاقب میں آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور جا کر اسے ایک اور دریا ملا۔ یہ دریائے ریگ کہلاتا تھا۔ وہ اس وقت زمین کے انتہائی بلند حصے سے قدرے شمال کی جانب تھا جو ''ہندوستان کا پہاڑ'' کہلاتا تھا۔ دریائے ریگ کے کنارے اس نے سکندریہ شہر کی بنیاد رکھی۔ دریا کے پار سے دہشت انگیز ستھیوں کی چوکیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہاں پہنچتے ہی اسے یہ بھی اطلاع ملی کہ وہ جس فوج کو شہر مرکنڈ میں چھوڑ آیا تھا اس پر ایرانی امیر نے حملہ کر دیا ہے اور وہ قلعے میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ اب سکندر چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پھنس گیا تھا۔ ایک طرف اس کے حریف ''ستھی'' تھے تو دوسری جانب مرکنڈ میں اس کی محصور فوج تھی جس کی مدد کے لیے اسے جانا تھا۔ اگر وہ یہاں سے ہٹ جاتا تو ستھی سوار دریا پار کر کے تعاقب میں نکل پڑتے۔ دریا عبور کر کے ستھیوں کی طرف بڑھتا تو اپنی محصور فوج سے دور ہو جاتا۔ خود سکندر کا حال یہ تھا کہ اس کے سر پر پتھر کی ضرب لگی تھی جس کی وجہ سے دردِسر کے دورے پڑتے رہتے تھے۔ دریا کے گدلے پانی کی وجہ سے پیچش ہو گئی تھی جس نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ بظاہر وہ مایوس سا ہو گیا تھا۔ پھر اس کے اندر کا سکندر جاگ اٹھا، وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھا اور عبورِ دریا کا حکم دے دیا۔ انجینئروں نے عبورِ دریا کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ ادھر اپنی فوج کو حکم دیا کہ جشن کا ماحول بناؤ۔ زور زور سے باجے بجاؤ۔ خوب اچھلو کودو۔ گھڑ دوڑ کے مقابلے کرو۔ جب انہوں نے یہ حرکتیں شروع کیں تو ''ستھی'' یہ تماشا دیکھنے کے لیے دوسرے کنارے پر آ گئے۔ اب سکندر نے حکم دیا کہ دوسرے کنارے کی طرف ستھیوں پر تیر برساؤ۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی دے دیا کہ ان تیروں کی چھاؤں میں دریا عبور کرتے رہو۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مسلسل تیراندازی سے ستھی کنارہ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سکندر کی فوج دریا عبور کرنے لگی۔ سکندر سب سے پہلے دریا سے گزرا۔ اگلے کنارے پر پہنچتے ہی وہ تیرانداز اور نیزہ باز ستھیوں پر حملہ آور ہوگئے۔ اس نے دو ہزار آدمیوں کو ستھیوں کی طرف آگے بھیجا۔ ستھیوں نے انہیں نرغے میں لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بڑی فوج آگے بڑھی تو ستھی تیر چلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ اتنی تیزی سے نکلے کہ مقدونوی رسالہ ان کا تعاقب نہ کرسکا اور ستھی چکر لگا کر مقدونیوں کے عقب میں آگئے۔

سکندر کی ذہانت اور تجربے نے اس وقت عجب کام دکھایا۔ اس نے رسالے کو غنیم کے ایک بازو کی طرف بھیجا۔ ان کے پیچھے دوسرا رسالہ بھیجا۔ پھر اس نے اپنی خاص فوج کی کمان سنبھالی اور اسے چکر دے کر حلقہ سا بنا لیا۔ اس طرح ستھی مقدونوی فوج کے حصار میں آگئے اور دونوں طرف سے ہلاکت کی بارش ہونے لگی۔ ستھی گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ دو حبشیوں نے ان کا پیچھا کیا۔ اس چال نے ستھیوں کو تباہ کر دیا۔ ہزاروں مارے گئے سیکڑوں گرفتار ہوگئے اور ستھیوں نے بالآخر سفیر بھیج کر صلح کرلی۔

اس بے جا مشقت نے اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ اسے پالکی میں ڈال کر دریا پر لایا گیا۔ اس وقت اس کی کمزوری میں مزید اضافہ ہوگیا جب اسے یہ خبر ملی کہ اس نے جو فوج مرکنڈ میں محصور فوج کی کمک کے لیے بھیجی تھی، وہ پوری کی پوری تباہ کر دی گئی۔ یہ حرکت اس کے ایرانی حریف، ایرانی امیر سپاما کی تھی اور ستھیوں نے اس کی مدد کی تھی۔ اب اسے اندازہ ہوا کہ ستھیوں نے کیوں اسے خود ساختہ جنگ میں گھیرے رکھا تھا۔ سکندر اپنی بیماری کے باوجود تیز رفتار سواروں کے ہمراہ مرکنڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ اتنی تیزی سے روانہ ہوا تھا کہ 135 میل کا فاصلہ تین دن میں طے کر کے چوتھے دن وادی میں اتر گیا۔ محاصرین کو اس کی آمد کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی لہٰذا سکندر کے پہنچنے سے قبل ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ سکندر نے یونانی مقتولین کو دفن کرایا۔

اب موسم سرما آگیا تھا اور اونچے پہاڑی درے برف نے بند کر دیے تھے۔

اسے اس کے حریفوں نے اتنا پریشان کر دیا تھا کہ وہ غصے سے بے قابو ہوگیا۔ اس نے بھی اپنے حریفوں کے تباہ کاریوں کے طریقے اپنا لیے۔ اب وہ خود اونچی سطح کے علاقوں میں پھرنے لگا اور دیہات کے دیہات ویران کر دیے۔ باشندوں کو مجبور کیا کہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جا بیٹھیں جہاں ان کے جانوروں کو چارا نہیں مل سکتا تھا۔ جانور چارے کی تلاش میں نیچے اتر آئے۔ مقدونوی سپاہی ریوڑ کے ریوڑ ہانک کر اپنی نوآبادیوں میں لے آئے۔ باشندے یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ جب تک وہ سکندر کا ساتھ نہیں دیں گے اس وقت تک یونہی خراب و خوار ہوتے رہیں گے۔

دو سال پیشتر تک یہ لوگ سکندر کے خلاف تھے اب ایرانی امیر سپاما کے دشمن بن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سپاما کو خود اس کے آدمیوں نے قتل کیا اور اس کا سر کاٹ کر سکندر کے قدموں میں رکھ دیا اور صلح کے لیے درخواست گزار ہوئے۔

سپاما کے خاتمے کے بعد مقدونیوں نے مقامی باشندوں کی دلداری شروع کر دی۔ صرف ایک قصبہ تھا جو ایک بلند ٹیلے پر واقع تھا۔ خیال تھا کہ اسے فتح نہیں کیا جاسکتا لیکن مقدونوی اسے بھی فتح کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

سکندر کی فوج مخالفین کے گروہ کا تعاقب کرتی ہوئی ایک ایسے قلعے کے سامنے پہنچ گئی جو ایک بلند پہاڑ پر بالکل سیدھا، مینار کی طرح کھڑا تھا۔ مخالفین اس قلعے میں داخل ہوگئے تھے اور یہ ظاہر تھا کہ اس قلعے کو فتح نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خبر سکندر تک پہنچی تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے اگریانی سواروں کو اپنے پاس بلایا جو چٹانوں پر چڑھنے میں بڑے مشاق سمجھے جاتے تھے۔

”میں نے سنا ہے تم بلند سے بلند چٹانوں پر پرندوں کی طرح چڑھ جاتے ہو۔“

”آپ نے غلط نہیں سنا۔“

”تم اگر اس چوٹی پر چڑھ کر دکھاؤ تو جو شخص سب سے پہلے اس چوٹی پر پہنچے گا اسے بارہ ٹیلنٹ انعام دیا جائے گا اور آخری آدمی کو بھی ضرور چند اشرفیاں ملیں گی۔“

”میری تجویز یہ ہے کہ رات کے وقت اس ٹیلے پر اس طرف سے چڑھو جس طرف سے یہ بالکل سیدھا کھڑا ہے اور بظاہر اس طرف سے چڑھنا ناممکن ہے۔“

”اسی طرف سے کیوں۔ نسبتاً آسان راستے بھی ہیں۔“

”اس طرف سے چونکہ چڑھنا ممکن نہیں ہے اس لیے کوئی حفاظتی تدبیر بھی اختیار نہیں کی گئی ہے۔ نظر آرہا ہے کوئی پہرے دار تک موجود نہیں۔“

تین سو تجربہ کار کوہ نوردوں نے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کر دیں۔ انہوں نے چٹان کے اس

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

حصے کا گہرا معائنہ کیا، اپنے ساتھ خیموں کی آہنی میخیں اور رسّے لے گئے۔ موسم سرما کی خنک رات میں وہ اوپر چڑھنے لگے۔ جہاں ممکن ہوتا، میخیں ٹھونک لیتے جہاں ممکن ہوتا رسّے باندھ لیتے۔

تیس آدمی رات کی تاریکی میں نیچے گر گئے باقی تمام آدمی طلوع آفتاب کے بعد چوٹی پر پہنچ گئے اور اشاروں سے اپنی کامیابی کا اعلان کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ پرچم لے کر گئے تھے۔ ان پرچموں کو لہرا کر اپنی کامیابی کا اعلان کر دیا۔ ان پرچموں کو دیکھ کر باختریوں کو یقین ہو گیا کہ سپاہی اوپر پہنچ گئے۔ قلعے کا سردار حوالگی کے لیے مجبور ہو گیا۔

قلعہ حوالہ ہو گیا تو سکندر بھی معائنے کے لیے اوپر پہنچ گیا۔ وہ قلعے کے مختلف حصوں میں گھومتا پھر رہا تھا کہ ایک مکان میں سے ایک لڑکی نکل کر آئی۔ وہ اس کے حسن کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس کے سنہری گیسو دونوں جانب گندم کی بالیوں کے انداز میں گندھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کی روشن آنکھوں میں بھی کئی خواب سے نظر آ رہے تھے۔ باریک لب کسی بھی جنبش سے بے خبر تھے۔ وہ شاید اتنی خوف زدہ بھی کہ قاعدے کے مطابق سکندر کے سامنے جھکنا بھی بھول گئی تھی۔ تنہا اطمینان سے کھڑی رہی۔

''''اے حسین دیوی...... تیرا نام کیا ہے؟''

''روشنک!''

''بہت خوب صورت نام ہے بالکل تیری طرح حسین۔'' سکندر نے کہا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ نہ تو پیچھے ہٹی اور نہ ہی اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ اس لیے کہ قواعد جنگ کے مطابق وہ اپنے آپ کو فاتح کا مال سمجھتی تھی اور تیار ہو چکی تھی کہ اس کے متعلق جو فیصلہ چاہے کیا جائے۔

سکندر نے اپنی کلائی سے ایک کڑا اتارا۔ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر روشنک کے بازو میں پہنا دیا۔

''اسے پہنے رہو۔ اس لیے کہ میں تم سے شادی کروں گا۔''

اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور روشنک سے شادی کر لی۔ اگرچہ فوج نے اس باختری شادی کو پسند نہیں کیا۔

مسلسل مشقتیں اٹھاتے ہوئے اسے تین سال گزر چکے تھے۔ اس کے زخم تکلیف دینے لگے تھے البتہ اتنا ہوا تھا کہ اس کی فتوحات مکمل ہو گئی تھیں۔ شمالی سرحدوں پر امن قائم ہو گیا تھا۔ نئے شہر بن گئے تھے اور نقل وحمل کے سلسلے قائم ہو گئے تھے۔ اب اس پر تکان غالب آ گئی تھی۔ اس کی نیند تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ رات کا بڑا حصہ نئے نظام حکومت کے متعلق رپورٹیں سننے میں گزار دیتا تھا۔ بے پناہ شراب پینے لگا تھا۔ نشے میں چور ہو جاتا۔ یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ اس دوران محافظ فوج کے سپاہی اور طبیب اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ وہ مقدونیوں کے بجائے ایرانیوں کی صحبت پسند کرنے لگا تھا۔ جو لوگ اب تک قریب تر تھے ان سے چڑنے لگا تھا۔ اس کے غصے میں ہلاکت خیزی کا انداز پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے کئی سردار اس کے غصے کا شکار بن گئے۔ بہرحال سکندر کو یقین ہو گیا تھا کہ مشرقی سمت میں زمین کیسی بھی ہو وہ اس کی آخری حد تک پہنچ جائے گا۔ اس آخری حد کو اس نے اپنی منزلِ مقصود بنا لیا تھا اور مسلسل فوجیوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ حالانکہ مقدونی کہتے تھے کہ صرف غیر فانی لوگ ہی اتنی دور پہنچ سکتے ہیں۔

327 ق م میں نقل وحرکت شروع ہوئی تو باختر اور سغدیا کے نئے رسالے بھی فوج میں شامل ہو گئے۔ ایسا لامتناہی ہجوم ہوا کہ وہ تردد میں پڑ گیا۔ پروہت، صراف، عورتیں بھی شامل تھیں۔ بچوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ ہر فوج ایک متحرک نو آبادی بن گئی تھی۔ اپنی فوجوں کے سازوسامان کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس نے فوجیوں کو تلقین کی کہ اس طرح بے شمار چیزیں ساتھ لے جانا فضول ہے۔ بھاری سامان کو آگ کی نذر کر دو۔ تھوڑی ہی دیر میں سڑکوں پر دور تک الاؤ جلنے لگے۔

اتنی بڑی فوج کو متحد رکھنا کارنامے سے کم نہیں تھا۔ وہ اتنی بڑی فوج کو قبض وتصرف کے لیے نہیں بلکہ دریائے سندھ کے آریائی لوگوں کو ہم نوا بنانے کے لیے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس نے خط کتابت شروع کر دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وادی سندھ کے لوگ اس کی پیشوائی کے لیے تیار ہیں۔

مشرق کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اس نے معمول کے مطابق فوج کے مختلف حصے کر لیے اور ہر حصے کے الگ الگ کماندار بنا دیے۔ بطلیموس کو اپنا نائب بنایا۔ نقل وحرکت کا کام کریٹرس کے حوالے کیا۔ وہ خود شمال مشرق کی طرف مڑا، اس طرح وہ اس بلند درے کی طرف بڑھا جہاں ہندو کوہ ہمالیہ کے عظیم الشان سلسلے سے مل جاتا ہے۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ سکندر کے ہاتھ میں ارسطو کی کتاب مابعدالطبیعات تھی۔ سکندر نے سوچا سفر میں مجھے طبعی اشیا کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سوا کچھ نہیں ملے گا۔ استاد پہلے علم سے زیادہ عمل اور استدلال سے زیادہ انکشاف پر زور دیتا تھا لیکن اب وہ نظریات کا شارح بن گیا ہے۔ اس کے برعکس سکندر مشاہدے اور انکشاف پر تلا ہوا تھا۔ اس تلاش میں وہ تنہا تھا۔ بطلیموس کو صرف ایک خیال تھا اور وہ یہ کہ مصر واپس چلا جائے۔ جو فلسفی وطن میں تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ اس کی کامیابیاں خوبیِ تقدیر کا کرشمہ ہیں۔ جب تقدیر ساتھ چھوڑ دے گی تو اس کا انجام نہایت دردناک ہوگا۔

مئی 327 ق م میں سکندر نے ہندوستان کی طرف پیش قدمی کا آغاز کیا تھا۔ اس نے پہلے ہی ایرانی مملکت پر اپنا قبضہ مستحکم کر کے اپنا عقب محفوظ بنالیا تھا۔ سرحدی ریاستوں کے حکمرانوں نے اسے اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا تھا حالانکہ یہ لوگ حملہ آور فوجوں کی صفوں میں گھس کر لوٹ مار کرنے کے عادی تھے۔ دوسری طرف ٹیکسلا کے راجا امبھی جیسے شمال مغرب کے بادشاہوں نے پورس کی ممکنہ چیرہ دستیوں کے خوف سے سکندر کے ہاتھ مضبوط کرنے کا فیصلہ کیا۔ امبھی نے سکندر کی خدمت میں بھرپور مدد کے وعدے کے ساتھ سفارت بھیجی۔

سکندر کا غصہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ہندوستانی فرماں روا پورس نے اس کے حریف دارا کی مدد پر آمادگی ظاہر کی تھی اور اس لیے بھی کہ وہ اپنی عظیم الشان حکومت کے ہمسائے میں کسی اور طاقت ور بادشاہ کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے مقدونوی فوجیوں کا جذبہ مدھم پڑنے سے پہلے پنجاب پر چڑھائی کی منصوبہ بندی مکمل کرلی تھی۔

درے کو پار کرنے کے بعد سکندر نے سرزمین ہندوستان پر قدم رکھ دیا اور دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گیا۔ دریائے سندھ پر کشتیوں کا پل بن چکا تھا۔ وہ آیا تو پل پر تختہ بندی کے لیے جنگل کے بے شمار درخت ساتھ لایا۔ اس کی فوج خاص کی روپہلی ڈھالیں سورج کی روشنی میں درخشاں تھیں۔ سیتھی سوار جو اس سے پہلے پہنچ گئے تھے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ یہ روشنک کے جلو میں چل رہے تھے۔ اس کے پہنچنے کی خبر کے ساتھ ہی شمالی ہند کے راجا کی طرف سے بے شمار تحفے آئے۔ چاندی کے انبار گاڑیوں میں لدے ہوئے تھے۔ ہزاروں بیل اور بھیڑیں غذا اور قربانی کے لیے بھیجی گئی تھیں۔ ہندوستانی سواروں کا ایک لشکر اور جھولوں والے تیس ہاتھیوں کی ایک قطار سکندر کی خدمت کے لیے بھیجی گئی تھی۔

وہ پہاڑیوں سے نکل کر کھلے میدان میں آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی روشنک ایشیائی دربار کی شان و شوکت کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے شامیانے کے اردگرد احاطہ کھینچ دیا جاتا جس پر وہ سوار ہوتی۔ روشنک بے پردہ ہو کر گھوڑے پر سوار ہونے کی عادی تھی لیکن ہندوستان میں ایسی سواری کو خلافِ وقار سمجھا جاتا تھا۔ اس شان و شوکت کے باوجود بھی اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ وہ اپنے وطن کی خنک سطح مرتفع پر بہت خوش تھی۔ وہ اس بات پر بھی متفکر رہتی تھی کہ سکندر کے وقتی رجحانات نہ جانے اسے کہاں لے جائیں گے۔ اس کی یہ فکر بے جا نہیں تھی کیونکہ وہ دوسرے ہی لمحے ہندوستانیوں کی راہبری میں ہاتھیوں کے شکار کے لیے نکل گیا۔

مقدونیوں کو پہلے خیال تھا کہ سندھ پر پہنچتے ہی دریائے نیل کا منبع مل جائے گا اور نیل کی طرح سندھ میں بھی کسی سبب کے بغیر طغیانی آجاتی تھی۔ ارسطو کا عقیدہ تھا کہ نیل کا پانی سندھ سے آتا ہے۔ چھان بین کے بعد پتا چلا کہ دریائے سندھ میں طغیانی کا سبب یہ ہے کہ پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بلندیوں پر کثرت سے بارش ہوتی ہے۔ سندھ کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی طرف نہ تھا بلکہ یہ جنوبی سمت میں بہتا ہوا سمندر میں گرتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ دریائے سندھ کا منبع دور مشرق کی جانب ہے۔ ان حقائق سے ظاہر ہو گیا کہ سندھ کا نیل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نیل اور سندھ کے درمیان خشکیوں، صحراؤں اور خلیجوں کی ایک وسیع دنیا حائل ہے جس کا تصور بھی یونانیوں کو نہیں۔ فوجیوں کی خواہش یہ تھی کہ جہازوں میں سوار ہو کر پانی کے راستے سکندریہ پہنچ جائیں جہاں سے بحیرۂ روم کا نیلا پانی نظر آتا تھا۔ انہیں امید تھی کہ سکندر مشرقی جانب پیش قدمی روک کر دریائے سندھ کے راستے واپس روانہ ہو جائے گا لیکن سکندر ایسی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اپنی کشتیاں اور پل لے کر مشرق کی طرف چلو۔

ملاحوں نے بتایا کہ سندھ سے آگے بڑھیں گے تو چار اور بڑے دریا راستے میں آئیں گے۔ اس صورت میں ظاہر ہے ہندوستان زمین کا تنگ خطہ نہیں بلکہ مشرق کی طرف بہت پھیلا ہوا ہے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ چوتھے دریا کے آگے کیا ہے۔ ممکن ہے آگے سمندر ہو۔

سکندر اس بارے میں یقینی علم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ فوج اس کے سامنے مجبور تھی۔ اس نے حکم دیا اور فوج

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بادلِ ناخواستہ مشرق کی جانب روانہ ہوئی۔ وہ اب چپ چاپ چلی جارہی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سکندر کی پیش قدمی اسے ہرگز پسند نہیں۔ سکندر سے انہیں ایک شکایت یہ بھی تھی کہ راجا امبھی کے ساتھ عزیز دوست کا سا سلوک کیوں کیا۔ بے شک امبھی نے بیش قیمت تحفے دیے تھے لیکن امبھی نے جتنی چاندی دی تھی سکندر نے اس سے کہیں زیادہ سونا اسے دے دیا تھا اور ملک بھی اس کے حوالے کردیا تھا۔ فوجیوں کو یہ شکایت تھی کہ اس سے پیشتر مشرق کے کسی حاکم کو یہ عزت نہ دی گئی۔

جب سکندر دریائے سندھ پار کر کے دوسری جانب پہنچا تو اس نے یونانی روایت کے مطابق قربانی دی۔ اس کے بعد پیش قدمی کر کے وہ ٹیکسلا پہنچا۔ یہ شہر بلاشبہ عروس البلاد، تمام شہروں سے عظیم اور دریائے جہلم اور سندھ کے درمیان واقع تھا۔ شہر کے گورنر، باشندوں اور دیگر ہندوستانیوں نے اس کا دوستانہ انداز میں استقبال کیا جس پر سکندر نے اتنا مفتوحہ علاقہ ان کی سلطنت کے ساتھ ملا دیا جتنے کی ٹیکسلا والوں نے خواہش ظاہر کی۔ سکندر نے یہاں بھی قربانیوں کی رسم ادا کی۔ اس موقع پر جسمانی کرتب اور سرکس کا مظاہرہ کیا گیا۔

ان کھیل تماشوں سے نمٹنے کے بعد وہ پورس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اپنا ایلچی پورس کی طرف روانہ کیا اور اسے پیغام بھیجا۔

”پورس! اطاعت قبول کر کے اپنی سلطنت کی سرحدوں پر آ کر مجھ سے ملاقات کرو۔“

پورس نے جواب دیا۔ ”ہاں میں ضرور ملاقات کروں گا لیکن یہ ملاقات میدانِ جنگ میں ہتھیاروں کے سائے میں ہوگی اور تم میری سرحدوں میں ہتھیار بند ہو کر آنا۔“

سکندر تو یہ سوچ رہا تھا کہ دیگر بادشاہوں کی طرح پورس بھی اس کا نام سن کر رعب میں آجائے گا لیکن جواب اس کے برعکس آیا۔ اب کوئی نہیں تھا جو ہندوستان کی سرزمین کو کشت و خون سے روکتا۔ سکندر نے جہلم کی طرف چڑھائی کا مصمم ارادہ کرلیا لیکن چنگھاڑتا ہوا دریائے جہلم اس کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھا۔

پورس اپنی بھاری فوج کے ساتھ دریا کے دائیں کنارے پر خیمہ زن ہوگیا۔

اس منصوبے کا علم ہوتے ہی سکندر نے اپنے جرنیل کوئنوس کو حکم دیا کہ دریائے سندھ عبور کرنے کے لیے بنائی گئی سیکڑوں کشتیاں توڑ کر دریائے جہلم پر لائی جائیں تاکہ انہیں دوبارہ جوڑ کے دریا پار کرنے کے قابل بنایا جاسکے۔

جب یہ کشتیاں دریائے جہلم کے کنارے منتقل ہوگئیں تو انہیں دوبارہ کشتیوں کی شکل دے کر دریا پار کرنے کے لیے بیڑا تیار کیا گیا۔

یہ انتظامات مکمل ہونے کے بعد اس نے امبھی کے سواروں کو اپنی فوج کے ہمراہ رکھا اور جہلم کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بارشوں کے تھمنے اور دریا اترنے کا انتظار کرسکتا تھا لیکن وہ اس انتظار کے لیے تیار نہ تھا۔

سکندر نے مناسب یہ سمجھا کہ پورس کو حیران کرنے کے لیے ہر سمت نقل و حرکت شروع کردے اور کچھ پتا نہ چلے کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔

دریا چاروں سمتوں میں آٹھ سو گز سے زیادہ علاقے پر پھیلا نظر آرہا تھا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زیادہ پھیلاؤ سے اس کی تیزی میں فرق آگیا تھا۔ جہلم ایسا تندخو، جوشیلا دریا محسوس ہو رہا تھا جسے دونوں طرف سے تنگ کناروں میں قید کردیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ کئی مقامات پر ڈوبی چٹانوں کی وجہ سے پانی کے اندر ڈھلوانیں سی بن گئی تھیں۔ کناروں پر ایک اور دنیا آباد تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی وہاں توپ خانے، شہ سواروں کے دستے دکھائی دے رہے تھے۔ سکندر مسلسل اپنی فوج کو حرکت میں رکھے ہوئے تھا۔ وہ کبھی ایک جگہ پڑاؤ کرتا، کبھی دوسری جگہ۔ اس طرح اس نے اپنے حریف کو مستقل الجھاؤ میں ڈال دیا۔ پورس اس کے عزائم جاننے میں مشکل کا شکار تھا۔ اس نے اپنے لشکر کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کرلیا اور مختلف افسروں کے ماتحت یہ حکم دے کر پھیلا دیا کہ دشمن کے علاقوں کو لوٹتے رہو اور یہ معلوم کرتے رہو کہ دریا کہاں کہاں سے قابلِ عبور ہے۔ یہ منصوبہ اتنا کامیاب رہا کہ پورس تنگ آگیا۔ جب وہ دیکھتا کہ کشتیاں دریا میں تیر رہی ہیں اور مشکیزے تیار کر کے دریا میں سے گزرنے کے انتظامات کیے جارہے ہیں۔ جب وہ اپنی فوج کو دفاع کے لیے ایک جگہ جمع کرتا تو دوسری جانب سرگرمیاں جاری ہوجاتیں۔ خصوصاً رات کے وقت مقدونوی جن جن مقامات پر جنگ کا نعرہ بلند کرتے یا ہنگامہ برپا ہوتا، پورس کو ہاتھی لے کر اس طرف متوجہ ہونا پڑتا۔ یہ ایسا مشغلہ تھا کہ جس نے پورس کو تھکا دیا۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ جنگ کے نعروں کے سوا کچھ نہیں ملتا تو وہ یہ سمجھا کہ سکندر نے خوفزدہ ہو کر جنگ کا ارادہ ملتوی کردیا ہے۔ وہ کیمپ جما کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ایک رات سکندر کا شہ سوار

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دستہ اپنے پڑاؤ سے نکلا تو پورس نے کوئی جوابی اقدام نہیں کیا بلکہ اس کے فوجی اپنی صفوں میں رہے تاہم اس کے جاسوس دریا کے نسبتاً کم چوڑے مقامات پر بدستور تعینات دشمن پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

اسی دوران جنگی کشتیاں مسلسل دریا کے بہاؤ اور مخالف سمت میں گشت کرتی رہیں جن میں گھاس پھوس اور اسلحے سے لیس فوجی سوار تھے۔ یہ فوجی اپنی تلواریں ہاتھوں میں بلند کرکے دریا کے بیچوں بیچ کہیں کہیں جزیروں پر بڑھتے ہوئے چڑھ جاتے اور آپس میں مقابلہ کرتے۔ ان کی کامیابی اور ناکامی سے دریا کے کنارے فوجوں میں خوشی یا مایوسی کا تاثر پھیلتا رہتا۔ ایک روز اس کے کچھ مہم جو کمانڈر کچھ سپاہیوں کو لے کر ایک چھوٹے سے جزیرے پر چڑھ گئے جہاں پورس کے فوجی موجود تھے۔ ان مقدونوی حملہ آوروں نے جزیرے پر اترتے ہی چند مخالف فوجیوں کو ہلاک کردیا تاہم پورس کی طرف سے زیادہ فوجی آنے پر ان میں سے بعض مارے گئے اور کچھ جان بچا کر واپس آگئے۔

ایسے چند واقعات اور بھی ہوئے۔

اس طرح کی تگ و دو کرتے ہوئے سکندر کو بالآخر اپنے پڑاؤ سے سترہ میل دور ایک مناسب مقام دریا پار کرنے کے لیے مل گیا۔ اس جگہ پر دریا نے کافی حد تک ایک موڑ لیا ہوا تھا۔ اس جگہ کنارے پر درختوں سے ڈھکا ہوا ایک ابھار تھا جس نے توپ خانے اور شہ سواروں کو چھپانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس ابھرے ہوئے مقام کے سامنے دریا میں ایک جزیرہ تھا جو گھنے جنگل سے بھرا ہوا تھا۔

دریا پار کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے کے بعد سکندر نے محتاط طریقے سے اپنی نقل و حمل کی منصوبہ بندی کرلی۔ اس کے افسروں میں ایک جس کا نام اطلوس تھا، کی شکل و صورت اور قد و قامت بالکل اس سے مشابہ تھی۔ سکندر نے نہایت چالاکی سے اطلوس کو پڑاؤ میں رکھا تاکہ وہ ظاہر کرے کہ سکندر بدستور فوج کے اندر موجود ہے اور فی الحال اس کا دریا پار کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں۔ اس نے اطلوس کو شاہی تاج، لباس پہننے اور اپنے خیمے میں رہنے کا اختیار دیا۔ اس کی حفاظت کے لیے شاہی دستہ تعینات کرکے شاہی پھریرا بھی پوری طرح لہرا دیا گیا۔

دریا کی دوسری طرف پورس مطمئن تھا کہ اس کے سامنے مقدونوی فوج بدستور خیمہ زن ہے اور سکندر بھی اس کے درمیان موجود ہے۔ سکندر نے اس اثنا میں اپنے گھڑسواروں کے کمانداروں اور ہندوستانی پانچ ہزار فوجیوں سے کہا کہ وہ اس وقت تک دریا کے اس طرف کھڑے رہیں جب تک وہ جہلم کے دوسری جانب جاکر پورس کے ہاتھیوں کو جنگ میں مصروف نہ کرلے کیونکہ یہ ہاتھی گھوڑوں کو خوفزدہ کرتے تھے۔ جب فوجیں لڑائی میں اچھی طرح مصروف ہوں تو وہ دریا پار کرکے پہنچ جائیں۔

اس نے بالکل کنارے کے ساتھ پیش قدمی کے بجائے کافی فاصلے سے نقل و حرکت جاری رکھی تاکہ مخالف فوج کو اس کی پیش قدمی کا اندازہ نہ ہوسکے۔

اس رات موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ آسمانی بجلی دل دہلا رہی تھی۔ پانی کے ریلے خوفناک آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ کوئی گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس طوفانی رات میں کوئی دریا پار کرنے کی جسارت کرے گا۔ سکندر نے اپنی فوج کو دریا پار کرنے کا حکم دیا۔

وہ کشتیاں جو مختلف حصوں میں تقسیم کردی گئی تھیں، دوبارہ جوڑ لی گئیں اور انہیں درختوں میں چھپا دیا گیا۔ فوجیوں کے جسم پر حفاظتی کھالیں چڑھا کر انہیں احتیاط سے سی دیا گیا۔ اس وسیع پیمانے کی تیاریوں کے بعد یونانی دستوں نے دریا پار کرنا شروع کردیا۔

جہلم کے اس پار قدم رکھنے والا پہلا شخص سکندر تھا۔

شہ سواروں کی کشتیوں سے اترتے ہی صف بندی شروع کردی گئی، تاہم علاقے سے اپنی لاعلمی کی وجہ سے وہ اصل ہدف کے بجائے ایک بڑے جزیرے پر جا اترا۔ یہ ٹکڑا اتنا بڑا تھا کہ پہلی نظر میں اس کے اصل کنارے نہ ہونے کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ دریا کی ایک شاخ نے اسے کنارے سے الگ کر رکھا تھا۔ یہاں عام حالات میں پانی اتنا گہرا نہیں ہوتا لیکن رات بھر جاری رہنے والی بارش سے طغیانی آچکی تھی۔ ہر گھڑسوار اپنے گھوڑے کی گردن کے سوا پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور اسے کنارے پر پہنچنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔

دریا پار کرنے کے بعد سکندر نے صفیں درست کیں اور توپ خانے کے ساتھ اڑھائی میل آگے روانہ ہوا۔ ابھی سکندر کی فوجیں سنبھلنے نہ پائی تھیں کہ پورس کے بیٹے کی کمان میں پنجابی سپاہیوں کے ایک دستے نے ان پر دھاوا بول دیا۔ ہندوستانی فوجیوں نے اسے تلواروں اور نیزوں پر لے لیا۔ سکندر جو شہ سواروں کی کمان کر رہا تھا خود شہزادے کے ہاتھوں زخمی ہوا جبکہ اس کا چہیتا گھوڑا مارا گیا۔

پورس کے بیٹے کا حملہ بظاہر ناکام ہوگیا کیونکہ اس کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کبھی کیچڑ میں دھنس گئی جس کی وجہ سے وہ نئی مصیبت میں پھنس گیا۔ یوں بھی وہ پوری تیاری سے نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ جاسوسی کے نقطۂ نظر سے گشت کررہا تھا کہ حادثاتی طور پر سکندر کی فوج سے جا ٹکرایا اور دشمن کی فوج کی قوت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔

جب ذرا آسمان کچھ صاف ہوا تو پورس نے اپنے بھائی کی کمان میں چار ہزار گھڑسوار اور ایک سو بگھیاں بھیجیں اور انہیں ہراول پیش قدمی کا حکم دیا۔ سکندر نے اپنے جرنیل کو حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ وہ خود اپنے گھوڑے پر سوار دائیں طرف سے کارروائی کے لیے چل پڑا۔ دونوں طرف کی فوجیں ٹکرائیں تو لڑائی میں نہایت تیزی آگئی۔

اس دوران پورس اپنے لشکر کو جنگی حالت میں ترتیب دیتا رہا۔ اس نے دریا پار مقدونوی کماندار کراتروس کی مخالف سمت میں تھوڑے سے فوجی چھوڑے جو دشمن کی نقل وحرکت پر نظر رکھ سکیں۔ باقی فوج کے ساتھ اس نے ایک ہموار میدان کا انتخاب کیا۔

صرف دیوہیکل ہاتھی نہیں، یونانی فوج پورس کو دیکھ کر بھی ششدر رہ گئی۔ فوجی صفوں کے درمیان کھڑے ہاتھی دور سے دیکھنے پر بھاری ستونوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ پورس کا ہاتھی سب سے طویل قامت اور عظیم الجثہ تھا، خود پورس بھی لمبے قد کا آدمی تھا لیکن عظیم الشان ہاتھی کی سواری نے اس کی شخصیت میں عجیب ہیبت پیدا کردی تھی۔

اسے دیکھ کر سکندر نے ایک تاریخی فقرہ کہا۔

''آخر کار میرے روبرو ایسا خطرہ ہے جو میری ہمت اور حوصلے کے شایانِ شان ہے۔ مجھے وحشی ہاتھیوں اور غیر معمولی دلیری کے حامل فوجیوں سے بیک وقت مقابلہ کرنا ہے۔''

لشکر کے دائیں سے بائیں جانب سکندر کی اپنی گھڑسوار فوج تھی۔ اس کے بعد برق رفتار دستہ پھر زرہ بند تیار کھڑے تھے۔ لشکر کے اردگرد ہتھیاروں سے لیس سپاہی تعینات کیے گئے تھے۔ جہلم کے اس پار پڑاؤ میں اور دوسری طرف لشکر میں فرق یہ تھا کہ اس جانب گھڑسواروں کی بڑی تعداد موجود تھی جبکہ پڑاؤ میں بہت کم شہ سوار چھوڑے گئے تھے۔ اس فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصے کی کمان سکندر نے اپنے ہاتھ میں رکھی دوسرا حصہ اپنے ایک جرنیل کی کمان میں دے دیا۔

ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ پورس کی جانب سے ایک سوار آتا دکھائی دیا۔ جنگ کا قاعدہ یہ تھا کہ اکیلے سوار پر حملہ نہ کیا جائے۔ اس سوار کو بھی بہ حفاظت آنے دیا گیا اور جب وہ قریب آگیا تو اسے حصار میں لے کر سکندر تک پہنچا دیا گیا۔

''کیا پیغام لے کر آئے ہو؟''

''ہمارے عظیم راجا نے آپ کے لشکر کی جان بخشنے کا وعدہ کیا ہے۔''

''اس کا فیصلہ تو ہماری تلواریں کریں گی۔''

''ذاتی رنجشوں میں لشکر کا نقصان کیوں ہو۔''

''تو کہنا کیا چاہتا ہے، صاف صاف کہہ۔''

''ہمارے راجا نے پیغام بھیجا ہے کہ میری دشمنی سکندر سے ہے اس کے لشکر سے نہیں۔''

''تو پھر؟''

''اگر آپ خود کو راجا کے حوالے کردیں تو لشکر کو... بہ حفاظت واپس جانے دیا جائے گا۔''

''اگر تو پیغامبر نہ ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔'' سکندر نے اپنی تلوار پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اپنے راجا سے کہنا کون کس کے حوالے ہوتا ہے اس کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا۔ اب تم جاسکتے ہو۔''

اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پیغامبر واپس چلا گیا۔ کچھ دیر سکوت طاری رہا پھر سکندر کی آواز گونجی۔

''حملہ کیا جائے۔''

یہ حکم سنتے ہی تریوں (ایک قسم کا جنگی ساز) والوں نے تریاں بجائیں۔

ایک ہزار تیراندازوں نے پورس کی فوج کے بائیں حصے پر مہلک حملہ کیا۔ یہ حصہ دریا کے انتہائی قریب تھا۔ سکندر خود بھی خواص شہ سواروں کے ساتھ پورس کے اسی طرف حملہ آور ہوا۔ حملہ اس وقت کیا گیا جب پورس کے سپاہی صفوں میں تھے اور ابھی ایک قطار میں تعینات نہ ہوسکے تھے۔ سکندر کا ایک سردار اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ اس نے بھی بائیں حصے پر شدید چڑھائی کردی۔ شہ سواروں کے ان تابڑتوڑ حملوں سے قبل بگھیوں کو پیچھے ہٹا دیا گیا کیونکہ بھاری بھرکم بگھیاں کیچڑ میں تیزی سے حملہ کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوتی تھیں البتہ شہ سوار دستے دائیں بائیں آگے پیچھے چاروں سمت سے دشمن پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ٹھیک اسی وقت سکندر کا سردار (کوئنوس) دائیں طرف سے آگے بڑھا اور پورس کے شہ سوار دستے پر عقب

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے حملہ کر دیا۔ اس طرح ہندوستانی لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔ ایک حصے پر سامنے کی طرف سے دھاوا بولا گیا تھا۔ دوسرے کو عقب سے حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ گھبرائے ہوئے شہ سوار جب اپنی قطاریں اور سمتیں تبدیل کر رہے تھے تو سکندر نے پوری قوت سے ان کے سامنے والی سمت سے حملہ کر دیا۔ کوئنوس پچھلی طرف سے ہندوستانی فوج کو مسلسل مشکل میں ڈالنے میں مصروف تھا۔ اس صورتِ حال میں پورس کے سپاہی دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ گھڑسوار فوجی توپ خانے کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔ وہ اب پیادہ فوج کی کارروائی کے منتظر تھے۔ وہ وقتی طور پر میدانِ جنگ سے باہر ہو گئے۔

یونانی شہ سواروں کو غضب ناک حالت میں دیکھتے ہوئے پورس نے اپنی فوج کے اہم ہتھیار ہاتھیوں کی پیش قدمی کا حکم دیا۔ دیوہیکل ہاتھی چیختے چنگھاڑتے آگے بڑھے اور حملہ آور گھوڑوں کو دہشت زدہ کر دیا۔ ان وحشی جانوروں کی پیش قدمی کے ساتھ ہی پورس کا توپ خانہ دشمن پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس دوران گھڑسواروں کو پھر سے حریف کے خلاف کارروائی کرنے کا موقع مل گیا۔

مقدونوی شہ سواروں نے ایک مرتبہ پھر پورس کے گھڑسواروں کو ہاتھیوں کے پیچھے پناہ لینے پر مجبور کر دیا تاہم ہاتھی ایسی بلا تھے جن کا توڑ یونانیوں کے پاس نہیں تھا۔ وحشی جنگجو بری طرح مخالف فوجوں میں گھستے چلے جاتے۔ انہیں ہلاک کرنے کے علاوہ سارا نظم تہس نہس کر دیتے۔ یونانی فوج اس صورتِ حال میں زبردست خوف و دہشت کا شکار نظر آ رہی تھی۔ توپ خانہ اس بے ترتیبی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن فوج پر آتشیں گولے اور تیر پھینک رہا تھا۔ وہی یونانی فوجی جو چند لمحات قبل فتح مندی کے نعرے لگانے کے لیے پر تول رہے تھے ان کو اب چھپنے کی جگہ تلاش کرنا پڑ رہی تھی۔ سکندر نے حالات بگڑتے دیکھ کر ہلکے ہتھیاروں سے لیس ایک دستے کو ہاتھیوں کے مقابلے میں اترنے کا حکم دیا۔ یہ فوج اچانک دست بہ دست لڑائی میں نہایت مہارت رکھتی تھی۔ انہوں نے ہاتھیوں اور مہاوتوں پر آتشیں میزائلوں کی بارش کر دی۔ زخم خوردہ ہاتھیوں نے اشتعال میں آ کر یونانی فوجیوں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ جب کئی سپاہیوں کا کچومر نکل چکا تو جرنیلوں نے انتہائی احتیاط سے کام لینے کا حکم دیا۔ اس کے باوجود حال یہ تھا کہ ہاتھی یونانی سپاہیوں کو سونڈوں میں لپیٹ کر مہاوت کے پاس پھینک رہے تھے۔ اسی کشمکش میں دن کا بڑا حصہ گزر گیا۔ جنگ کا نتیجہ مشکوک نظر آیا تو یونانیوں نے کمال مہارت سے ہلکے نیزے استعمال کیے۔ بڑی بڑی کلہاڑیوں سے ہاتھیوں کے پیر کاٹنے لگے، سونڈوں پر خمدار تلواروں سے حملے کیے۔ زخمی ہاتھی پلٹے اور اپنے ہی سپاہیوں کو کچل کر رکھ دیا۔ اس تمام صورتِ حال سے پورس کے جرنیلوں میں بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کے باوجود پورس نے جنگ کا توازن خراب نہیں ہونے دیا۔ حاضر دماغی کا ثبوت دیا، اس نے چالیس ہاتھیوں کا دستہ اپنی کمان میں لیا اور نئے حوصلے سے دشمن پر زبردست لشکر کشی شروع کر دی۔ اس نے خود اپنے ہاتھ سے کئی یونانی فوجیوں کو ٹھکانے لگایا۔

پورس بدستور بری طرح لڑائی میں مصروف تھا اور اپنے تیروں سے دشمن فوج میں تباہی پھیلا رہا تھا۔ حریف فوج نے پوری توجہ اس پر مرکوز کر دی اور اسے گھیرنے کا منصوبہ بنایا۔ تیراندازوں اور ہلکے ہتھیاروں سے لیس سپاہیوں نے اسے تیروں پر رکھ لیا۔ اس کے جسم پر کئی زخم آئے لیکن وہ اب بھی لڑ رہا تھا۔

جب ان ہاتھیوں میں کسی کو روند ڈالنے کی سکت باقی نہ رہی تب سکندر نے اپنے تمام گھڑسواروں کو اکٹھا کیا اور توپ خانے کو اشارہ کیا۔ ہندوستانی شہ سوار کئی ٹکڑوں میں تقسیم تھے۔ یہی حالت توپ خانے کی ہو گئی۔ پورس کی فوج کو جس طرف سکندر کے سپاہیوں میں کہیں خلا نظر آتا، وہ وہاں حملے کی کوشش کرتی۔

یہ کشمکش جاری تھی کہ یونانی کمانڈر کراتروس جہلم عبور کر کے جنگ میں شامل ہو گیا۔ اس کے آنے کے بعد فتح یقینی تھی کیونکہ یہ فوجی تازہ دم تھے۔ انہوں نے ہندوستانی سپاہیوں کے قتلِ عام میں کوئی کمی نہ رہنے دی۔

جنگ نے اتنی طوالت اختیار کر لی کہ سکندر کی فوج کی بڑی تعداد تباہ ہو گئی۔ باقی ماندہ فوج نے اکٹھے ہو کر سکندر سے بغاوت اور پورس سے اظہارِ یکجہتی کا ارادہ کر لیا۔

سکندر نے مان لیا تھا کہ پورس ایک عظیم جنگجو ہے۔ وہ خود بہادر تھا اور بہادروں کی قدر کرتا تھا۔ وہ اسے جنگ میں مرتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی جانب سے کوئی بھی اڑتا ہوا تیر کسی وقت بھی پورس کی جان لے سکتا تھا جبکہ وہ جنگ میں کوئی احتیاط برتنے کا بھی قائل نہیں تھا۔ سکندر اپنے فوجیوں سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پورس پر کوئی حملہ نہ کرے، بالآخر اس نے اپنے ایک ایلچی کو پورس کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

”ٹیکسلیس! تمہیں پورس کے پاس جانا ہے۔“

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''اس خونخوار بھیڑیے کے پاس؟''

''وہ خونخوار بھی ہے اور بہادر بھی لیکن تمہیں اس کے پاس جانا ہوگا۔ اس سے جا کر کہو کہ وہ لڑائی کے معاملے میں انتہائی قدم تک نہ جائے بلکہ سکندر کی اطاعت قبول کر لے۔''

''میں آپ کے حکم سے دور نہیں لیکن پورس سے میری پرانی رنجش ہے، وہ میری بات بھی نہیں مانے گا۔''

''اس کی حالت اس وقت ایسی ہے کہ وہ ہماری ہر بات ماننے کو تیار ہو جائے گا۔ وہ بہادر ہے، بے وقوف نہیں۔''

ہندوستانی ٹیکسلیس سکندر کے حکم کے مطابق گھوڑے پر سوار ہوا اور صفوں کو چیرتا ہوا پورس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا تاہم اس کے لیے ہاتھی کو روکنا اور سکندر کا پیغام اس تک پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ دوسری طرف پورس نے دیکھا کہ اس کے قریب پہنچنے والا اس کا پرانا دشمن ہے وہ اس کی طرف مڑا اور لمبے نیزے سے حملے کی تیاری کی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اسے ٹھکانے لگا دیتا کہ ٹیکسلیس نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے پورس کی پہنچ سے دور محفوظ مقام کی طرف چلا گیا۔

وہ سکندر کی خدمت میں پہنچا تو سخت گھبرایا ہوا اور خوف زدہ تھا۔ اس نے پوری داستان کہہ ڈالی۔ اس کے باوجود بھی سکندر کے دل میں پورس کے خلاف عداوت کا جذبہ بیدار نہیں ہوا۔ وہ ایک کے بعد دوسرا پیغامبر بھیجتا رہا۔ آخر میں ایک اور ہندوستانی میروس کی باری آئی۔ سکندر کو پتا چلا تھا کہ میروس اور پورس آپس میں دوست ہیں۔

سکندر کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ پورس کو رام کرنا آسان نہیں۔ اس نے مزاحمت ترک کرنے والے ہندوستانی فوجیوں کے لیے معافی اور دیگر مراعات کا اعلان کر دیا۔ اس دوران متعدد یونانی سپاہیوں نے پورس اور اس کے توپ خانے کو نیزوں کے ساتھ چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جب پورس کو معلوم ہوا کہ وہ زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکتا تو اس نے اپنے ہاتھی سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ مہاوت نے دیکھا کہ بادشاہ ہاتھی سے نیچے اتر رہا ہے تو اس نے معمول کے مطابق اسے زمین پر گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ یہ دیکھ کر باقی ہاتھی بھی نیچے بیٹھ گئے کیونکہ انہیں تربیت دی گئی تھی کہ جیسے ہی شاہی ہاتھی زمین پر بیٹھے، باقی ہاتھی بھی احتراماً ایسا ہی کریں۔ ان حالات میں پورس اور اس کے فوجی مکمل طور پر یونانی سپاہیوں کے رحم و کرم پر آ گئے۔

سکندر نے ایک مرتبہ پھر پورس کے پاس اپنے ایک ایلچی کو بھیجا۔

''اے عظیم انسان!

ہم دونوں کی فوجیں لڑائی سے تھک ہار گئی ہیں۔
جنگلی درندے (ہاتھی) انسانی کھوپڑیاں پیس رہے ہیں۔
گھوڑوں کے پاؤں سپاہیوں کی ہڈیاں توڑ رہے ہیں۔

ہم دونوں ہیرو، دلیر اور جوان
دونوں ذہین، ہم پلہ اور زبردست
تو پھر سپاہیوں کا قتلِ عام کیوں؟
پھر لڑائی کے بعد ان کی زخمی زندگی کس کام کی

(فردوسی)

''اے پورس! شہنشاہِ ہند سنو! مجھے تمہاری بے پناہ قوت اور طاقت کا بخوبی اندازہ ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں تمہاری حکمتِ عملی نے مجھے سخت متاثر کیا ہے۔ میرا دل شکست خوردہ ہے۔ مجھے اپنی تھکن کا احساس ہے، معلوم نہیں ہم کہاں آ کر خوار ہو رہے ہیں۔ اب اگرچہ میں خود اپنی زندگی ختم کرنے کی کیفیت سے دوچار ہوں تاہم میں اپنے سپاہیوں کو اس پر مجبور نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یونانی جوانوں کو ایسے حالات کا شکار کرنے کا ذمے دار میں ہوں اور ایک وفادار بادشاہ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ وفادار فوج کی جان کی قیمت پر اپنی زندگی بچائے۔ آؤ ہم دونوں فوج کو لڑائی بند کرنے کا حکم دے کر خود مقابلہ کر لیں۔''

اس کے بعد اس نے پورس کے تعاقب میں خود جانا چاہا لیکن زخموں سے چور گھوڑا اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا تاہم اس نے منہ کے بل گرنے کے بجائے اپنے سوار کو نہایت آرام سے زمین پر اتارا۔ اس طرح گھوڑا تبدیل کرنے کا عمل تعاقب میں رکاوٹ ثابت ہوا۔

سکندر نے پلٹ کر دیکھا تو پورس کو ہاتھی پر سوار نہ دیکھا کیونکہ اس کے مہاوت نے اسے زمین پر اتار دیا تھا۔ اسے مردہ سمجھ کر سکندر نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ہندوستانی فرماں روا کی لاش کو پورے احترام سے دفنایا جائے۔ اتنی دیر میں شور مچا کہ پورس ابھی زندہ ہے اور دوبارہ اپنے ہاتھی پر آ گیا ہے۔ قوی الجثہ ہاتھی اور لمبے قد کا پورس اسے دور سے نظر آ گیا۔ اتنی دیر میں سکندر نے گھوڑا بھی بدل لیا تھا۔ وہ پورس کے ہاتھی کے قریب پہنچ گیا۔ پورس نے بھی کمال فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ سکندر کو دیکھتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہاتھی سے نیچے اتر گیا۔ وہ زخمی تھا اور اس وقت بظاہر قید میں بھی تھا لیکن اس نے کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نہ سکندر کے سامنے جھکا، نہ قاعدے کے مطابق گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا گیا بلکہ برابری کی سطح پر ملاقات کی۔ سکندر نے بھی دشمنی کو بھول کر رحم دلی کے گہرے جذبے کے ساتھ ملاقات کی۔

”کس بلا نے، کس مصیبت نے، کس پاگل پن نے تمہیں میرے مقابلے پر اترنے پر مجبور کیا۔ کس نے تمہیں میرے بارے میں گمراہ کرنے کی کوشش کی حالانکہ میں اطاعت کرنے والوں سے اچھا سلوک کرتا ہوں۔“

پورس نے بھی بے باکی سے جواب دیا۔ ”اے سکندر! تم نے ایک سوال پوچھا ہے میں اسی آزادی سے جواب دوں گا جس آزادی سے تم نے سوال دریافت کیا۔“

”میں سننے کو تیار ہوں۔“

”اے سکندر! میرا خیال تھا کہ دنیا میں کوئی مجھ سے زیادہ بہادر نہیں۔ مجھے اپنی طاقت کا اندازہ ضرور تھا لیکن میں نے اسے آزمایا نہیں تھا۔ جنگ نے مجھے سبق دیا ہے کہ تم مجھ سے زیادہ بہادر ہو۔ رتبے میں تم سے نیچے ہونے کے بعد بھی میں خود کو انتہائی خوش قسمت سمجھتا ہوں۔“

اس ملاقات کے دوران ہی دونوں فوجوں نے جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اب معاہدۂ امن کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سکندر نے پورس کی مردانہ وجاہت کو ایک مرتبہ پھر دیکھا۔ اس کی بہادری کا وہ پہلے ہی قائل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے اس قیدی سے وہ سوال کیا جو اس وقت کیا جا سکتا تھا۔

”تم کس قسم کے سلوک کے طلب گار ہو؟“ سکندر نے پوچھا۔

”اے سکندر! جو ایک بادشاہ کے شایانِ شان ہو۔“

”بالکل بجا لیکن اور کیا چاہتے ہو؟“

”میرے پہلے جواب میں سب کچھ آگیا۔ اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔“

”فی الحال تم میری قید میں ہو۔“

”مجھے اطمینان ہے کہ ایک بہادر آدمی دوسرے بہادر آدمی کی قید میں ہے۔“ پورس نے بے پروائی سے کہا۔

سکندر نے اسے اپنی فوج کے کچھ افسروں کے حوالے کر دیا اور خود پیچھے کی طرف لوٹ گیا جہاں اس کی فوجیں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ پورس کو قریب لگے ایک کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ اردگرد فوجی پہرا بٹھا دیا گیا۔ سکندر نے اس کے پاس طبیب بھیجے لیکن اس نے علاج کرانے سے انکار کر دیا۔

وہ اپنی شکست سے اتنا دلبرداشتہ تھا کہ کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ اس کا احوال سکندر تک پہنچا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اسے ابھی پنجاب کے بہت سے علاقے فتح کرنے تھے جس کے لیے اسے پورس کی حمایت کی ضرورت تھی۔ وہ پورس سے دوستی بڑھا کر آگے پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور پورس کے پاس پہنچ گیا۔ پورس نے سکندر کو اندر آنے کی اجازت دے دی لیکن اس کے احترام میں کھڑا نہیں ہوا۔ سکندر نہایت منتقم مزاج انسان تھا۔ کسی کی ذرا سی غلطی پر چراغ پا ہو جاتا تھا لیکن پورس کے معاملے میں اس کا رویہ بالکل دوسرا تھا۔ وہ اس وقت بھی خوش دلی سے مسکرا رہا تھا۔

”میں دارا کو بھی زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔ یہ الگ بات کہ دارا کو اسی کے اپنے لوگوں نے قتل کر دیا۔ تم بھی بہادر ہو۔ اسی لیے میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”مگر میں ذلت کی زندگی نہیں چاہتا۔“

”میں تمہاری دوستی پر فخر کروں گا۔“

”دوست ہو تو اپنے وعدے کا پاس بھی کرو۔“

”کیسا وعدہ؟“

”تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میرے ساتھ وہی سلوک کرو گے جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔“

”میں اپنے کہے پر قائم ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھے بادشاہ تسلیم کرتے ہو۔“

”ایک ایسا بادشاہ جو مجھ سے شکست کھا چکا۔“

”میں نے شکست نہیں مانی تھی۔ میرے اور تمہارے درمیان امن معاہدہ ہوا ہے۔“

”میں اس امن کو برقرار رکھوں گا۔“

”پنجاب کی دوسری طاقتیں اس امن کو بحال نہیں رہنے دیں گی۔“

”دوستی کا تقاضا ہے کہ میرا دشمن تمہارا دشمن ہو۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“

”پھر تمہیں راجا ابھشیریس کے خلاف قدم اٹھانا چاہیے کیونکہ وہ میرا اتحادی تھا لیکن بروقت میری مدد کو نہیں پہنچا۔ اگر تم اسے میری شکست کہتے ہو تو اس کا سبب وہی نابکار ہے۔“

”ابھشیریس ہے کون؟“

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''اس کی حکومت راجوڑی، چنبل، پونچھ اور نوشہرہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے پایۂ تخت میں کشمیر کے اہم مقامات بھی آتے ہیں۔''

''تمہارا دشمن، میرا دشمن ہے۔ میں جلد اس کا سر کچلنے کے لیے نکلوں گا۔''

''اس کے علاوہ پنجاب میں دوسری طاقتیں بھی ہیں جو تمہارے عزائم کو پورا نہیں ہونے دیں گی۔''

''اگر تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہاری سلطنت کو برقرار رکھوں گا۔''

اس گفتگو کے بعد پورس کی دشمنی، دوستی میں بدل گئی۔ سکندر نے اسی وقت شراب منگوائی۔ دونوں نے جی بھر کر شراب پی۔ اس دوران سکندر اردگرد کے علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا پھر اس نے کھانا منگوایا۔ دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

اب سکندر کا زیادہ وقت پورس کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ اس کا وقت اچھا گزر رہا تھا لیکن اس کے فوجی افسر اس میل جول کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ عام فوجیوں کے لیے یہ ملاقاتیں تشویش کا باعث بن رہی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سکندر کے فوجی اب تنگ آ چکے تھے۔ اب انہیں گھر کی سمت جانا تھا اور سکندر تھا کہ اسے مہم جوئی سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔

پورس کی ریاست میں تیس روزہ قیام کے بعد سکندر نے کنکوئی قبائل کے خلاف لشکر کشی کی اور ان کے 73 شہروں پر قبضہ کر لیا۔ سب سے چھوٹے شہر کی آبادی پانچ ہزار مکینوں سے کم نہ تھی جبکہ اکثر شہر دس ہزار سے زیادہ آبادی پر مشتمل تھے۔ یہ تمام علاقے فتح کرنے کے بعد سکندر نے اپنے دوست راجا پورس کی عمل داری میں دے دیے۔

ان فتوحات نے ابھشیریس کے کان کھڑے کر دیے۔ وہ سکندر کے عزائم سے خائف ہو گیا۔ اس کی فتوحات کا سلسلہ میرے علاقوں تک پہنچ گیا تو کیا ہو گا۔ اب مجھے کیا کرنا ہو گا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے صبح سے شام ہو گئی تھی لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پھر اس نے اپنے وزیر کو بلایا جو نہایت دانش مند تھا۔

''میں جس پریشانی میں ہوں اس کا علاج تمہارے پاس ہو تو بتاؤ۔''

''مہاراج! پریشانی معلوم ہو تو کچھ اُپائے کروں۔''

''تم دیکھ رہے ہو کہ یونان کے سکندر نے علاقے میں کیا تباہی مچا رکھی ہے۔ پورس نے اس موقع پر غداری کا مظاہرہ کیا ہے اور اب وہ سکندر کے ساتھ مل کر پنجاب کو فتح کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ پورس کو سب سے زیادہ شکایت مجھ سے ہے۔ وہ میرے علاقے ہڑپ کرنے کے لیے سکندر کو ضرور ورغلائے گا۔ میں چاہتا ہوں سکندر اس ارادے سے باز رہے۔''

''کیا ہم اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ سکندر کی تھکی ہوئی فوج کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔''

''میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے کہ کشت و خون کے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل نکالو۔''

''یہ جو بیرونی حملہ آور ہوتے ہیں انہیں علاقوں سے زیادہ مال و دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ قیمتی تحائف سکندر کی خدمت میں پیش کریں اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔''

''کیا وہ ان نذرانوں سے بہل جائے گا؟''

''تحائف روانہ کرنے کا مطلب اس کی اطاعت قبول کرنا ہو گا اور وہ یہی چاہتا ہو گا۔''

''تو کیا میں اس کا مطیع بن کر رہوں گا؟''

''اس کے روانہ ہوتے ہی یہ زنجیریں کٹ جائیں گی۔ اس کے بعد ہم پورس سے نمٹ لیں گے۔''

یہ مشورہ ابھشیریس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے چاپلوسی اور اطاعت کی حکمتِ عملی اختیار کرتے ہوئے اپنے بھائی کی کمان میں چالیس ہاتھی سکندر کی خدمت میں بھجوائے۔

سکندر پر اس خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا۔

''میں تحائف اور ہاتھی جمع کرنے نہیں آیا ہوں، فاتح کہلانے آیا ہوں۔ اگر وہ مجھے دوست رکھنا ہی چاہتا ہے تو وہ میری خدمت میں خود حاضر ہو۔'' سکندر نے ابھشیریس کے بھائی سے کہا۔ ''اگر وہ حاضر نہ ہوا تو اپنی فوج کے ساتھ میں خود پہنچوں گا۔''

سکندر نے ابھشیریس کو اتنا خوفزدہ کر دیا کہ وہ ملاقات کو تیار ہو گیا لیکن پورس کے خوف سے آنے سے گریز کیا اور ایک سفارتی مشن بھیجا جس نے سکندر کو قائل کر لیا۔ اس نے کہلوا بھیجا۔

''آپ سے ملاقات میرے لیے فخر کا باعث ہوتی لیکن پورس کو ہرگز یہ برداشت نہیں ہو گا کہ میں آپ سے ملاقات کروں حالانکہ میں اپنی پوری سلطنت آپ کے سامنے سرنگوں کرنے کو تیار ہوں۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سکندر نے اس کے اس جذبے کی قدر کی اور جذبۂ خیرسگالی کے اظہار کے بعد اس مشن کو واپس بھیج دیا۔

اسی دوران چناب اور راوی کے دوآبے میں حکمرانی کرنے والے پورس کے ہم نام بھتیجے پورس جونیئر کے ایلچی سکندر کے پاس آئے لیکن اس کا چچا پہلے ہی سکندر کے پاس تھا۔ ایسی صورت حال میں اس کی سکندر نوازی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سکندر سے زیادہ پورس جونیئر اپنے مربی چچا پورس کے خوف سے اپنی سلطنت سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ساتھ فوج کی کثیر تعداد بھی لے لی تاکہ اسے اس کے تعاقب کے لیے استعمال نہ کیا جاسکے۔ وہ ''نندوں'' کی سلطنت میں جاکر چھپ گیا اور سکندر اور پورس کی پہنچ سے دور ہوگیا۔

سکندر کے لیے یہ صورت حال دل برداشتہ کردینے والی تھی لیکن وہ اتنے خطروں سے لڑتا چلا آیا تھا کہ یہ صورت حال اس کے لیے کسی بڑی تکلیف کا باعث نہیں بن سکتی تھی۔ اس نے پورس جونیئر سے نمٹنے کے لیے پورس کو ساتھ لیا اور جرنیل کراتروس کو پورس کے دارالحکومت میں چھوڑا اور نکل گیا۔

سکندر اور پورس دریائے چناب تک پہنچے تھے کہ سکندر نے پورس کو واپس بھیج دیا۔

''یہاں تک تم نے میرے سفر کو آسان کیا۔ اب تم واپس جاکر بہادر ہندوستانیوں پر مشتمل ہاتھی بردار فوج جمع کرو اور دوبارہ میرے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے مجھ سے آملو۔''

پورس کو واپس بھیجنے کے بعد وہ آگے بڑھا اور دریا پار کرنے سے پہلے وزیرآباد سے چند میل کے فاصلے پر پہاڑی گھاٹیوں سے گزرا۔ کہا جاتا ہے اس کی فوج سیالکوٹ اور گورداسپور سے ملنے والی ریاست کشمیر کی سرحد کے پاس سے گزری۔ وہ جہاں جہاں سے گزرا اس نے مناسب ترین مقامات پر چھاؤنیاں قائم کیں تاکہ جرنیل کراتروس جو دارالحکومت میں مقیم تھا اور کوئنوس جس کا پڑاؤ دریائے چناب پر تھا، اگر ان علاقوں کو فتح کریں تو انہیں سہولت رہے۔

ان انتظامات کے بعد اس نے اپنے ایک کمانڈر ہیفائشن کی قیادت میں توپ خانے کی دو ڈویژن فوج پورس جونیئر سے نمٹنے کے لیے بھیجی جس کے ساتھ مشہور دستے کی ایک رجمنٹ اور تیراندازوں کی نصف یونٹ بھی تھی۔

ہیفائشن ہیبت کی تصویر بن کر نندوں کی سلطنت میں پہنچ گیا۔ نندوں میں یہ طاقت نہیں تھی کہ مقابلہ کرتے۔ انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ دوستی کو بالائے طاق رکھ کر پورس جونیئر کو حوالے کردیں اور اپنی جان چھڑا لیں لیکن جونیئر پورس اس سے پہلے ہی وہاں سے نکل گیا۔ اس کی فوج بھی اس کے ساتھ تھی۔ معلوم ہوا وہ اپنی فوج سمیت قبائلی علاقے کی طرف بھاگ گیا۔

پورس، جہلم اور راوی کے درمیانی تمام علاقے کا مختارکل بن گیا۔

دریائے راوی کے بائیں کنارے پر آباد اویسطائی قبیلے نے اطاعت قبول کرتے ہوئے اپنا شہر پمپارا ما سکندر کے حوالے کردیا تاہم کاٹھیانوں نے اپنے مضبوط گڑھ سانگلہ پر مقدونوی فوج کا استقبال طبل جنگ بجا کر کیا۔

دریا پار کرنے کے تیسرے روز سکندر نے سانگلہ کی طرف پیش قدمی کی جہاں کاٹھ قبائل اپنے اتحادیوں کے ساتھ بیل گاڑیوں اور جنگی بگھیوں کی فصیل کے پیچھے مورچا زن تھے۔ ان کے باقی اطراف میں پہاڑیاں تھیں جن سے وہ محفوظ بھی ہوگئے تھے اور مضبوط بھی۔

سکندر کے توپ خانے نے تیز حملہ کیا لیکن کاٹھوں نے اسی شدت سے جوابی کارروائی کرکے انہیں پسپا کردیا۔

سکندر نے پہاڑی چوٹیوں کا جائزہ لیا جو ان قبائل کو محفوظ بنائے ہوئے تھیں اور اپنے بہترین تجربے کو کام میں لاتے ہوئے ہلکے ہتھیاروں سے لیس دستے کو پیش قدمی کا حکم دیا، جس نے تیزی سے حملہ کرکے گاڑیوں پر سوار پہلی قطار کا صفایا کردیا مگر یہ عجیب لوگ تھے۔ یہ لوگ اس عمل سے قطعی خوفزدہ ہوئے بغیر دوسری صف میں منظم ہوگئے اور نہایت آسانی سے اس دستے کا بھی منہ موڑ دیا لیکن وہ یہ بھول گئے کہ پہلی قطار اور دوسری قطار کے درمیان خلا پیدا ہوگیا ہے۔ سکندر کے توپ خانے نے اس سے فائدہ اٹھایا اور تیسری قطار میں گھستے چلے گئے۔ انہوں نے کاٹھ سپاہیوں کو فصیل کی طرف دھکیلنا شروع کردیا جہاں سکندر اپنے فوجیوں کے ساتھ خود موجود تھا۔ فصیل کے ساتھ ایک جھیل تھی جو فرار کا راستہ تھا لیکن وہاں سکندر نے پہلے ہی بھاری مقدار میں فوجی متعین کردیے تھے۔ کاٹھ قبیلے کے لوگ اس حکمت عملی سے قطعی بےخبر تھے۔ انہوں نے فرار کے لیے جھیل کا رخ کیا اور بےخبری میں سکندر کی فوج کے ہتھے چڑھ گئے۔ سکندری فوج نے انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا، جو بچ گئے وہ واپس شہر کی طرف بھاگے۔

اسی دوران پورس پانچ ہزار ہندوستانی فوجیوں اور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہاتھیوں کی کمک کے ساتھ آن پہنچا۔ اس کے بعد سکندر کی ایجاد کردہ منجنیقوں کو شہر کی دیوار کے قریب لایا گیا لیکن قبل اس کے کہ دیوار پر بھاری پتھر برسائے جاتے یونانیوں نے کمندیں پھینک کر فصیل چڑھی اور شہر میں گھس کر مزاحم قبائلیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ اس قتلِ عام میں سترہ ہزار مخالف فوجی قتل کر دیے گئے اور ہزاروں گرفتار ہو گئے۔

سانگلہ کا حشر دیکھ کر دو دیگر شہر جنہوں نے مزاحمت کا فیصلہ کیا تھا خوفزدہ ہو گئے۔ ان شہروں کے مکین یونانی فوج کی آمد سے قبل فرار ہو گئے۔

اس نے پورس کی سرکردگی میں یونانی فوج، اطاعت قبول کرنے والے دو شہروں کے لیے بھیجی اور وہاں چھاؤنیاں قائم کیں اور سکندر خود باقی فوج کے ساتھ دریائے بیاس کی طرف وہاں مقیم ہندوستانیوں کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا۔

☆☆☆

جہلم سے بیاس تک مقدونیوں نے اڑتیس پہاڑی شہروں پر قبضہ جمایا۔ وہ بارشوں میں کوچ کرتے رہے۔ سکندر کشمیر کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ وہ شمالی ہند کی سرزمینوں میں سے گزرے۔ اس سے آگے کے متعلق راجا پورس کو بھی کچھ معلوم نہ تھا اور .... پانچویں دریا (پنجاب کے پانچ دریا) کے پار مقدونیوں کو ہاتھیوں اور ہمالیہ کی ہر لحظہ بلند ہوتی ہوئی دیوار، اس کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ زمین کی پیمائش کرنے والوں نے بتایا کہ اس سے آگے اس دریا کی غیر معروف زمینیں ہیں جس کا نام گنگا ہے، وہ سندھ اور نیل سے بھی بڑا ہے۔

اب سکندر دریائے بیاس کے کنارے کھڑا تھا۔ پھنکارتا دریا یونانی فوج کے لیے کڑا امتحان بن گیا۔ اس کے فوجی دریا پار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جنرل کوئنوس نے باغی فوج کا ترجمان بنتے ہوئے سکندر کا حکم رد کر دیا اور دریا پار کرنے کی صورت میں فوج کی عبرت ناک حالت کی تفصیلی تصویر پیش کر دی۔

"دیکھو اے سکندر! ہمارے جسم بے جان ہو چکے ہیں۔ ہم زخم خوردہ اور لہولہان ہیں۔ ہمارے ہتھیار کند ہو چکے ہیں۔ ہماری زرہیں استعمال کے قابل نہیں رہیں۔ ایرانی سلطنت فتح کرنے کے بعد ہمیں اپنے ملک یونان سے کوئی کمک نہیں پہنچی جس کی وجہ سے ہم غیر ملکی لباس پہننے پر مجبور ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جن کے تن پر کپڑا سلامت ہے۔ کتنوں کے پاس گھوڑے ہیں۔ کتنے سپاہیوں کے لیے غلام ہیں۔ جب ہم ایران سے چلے تھے تو ہماری فوج خوش حالیوں کا شہر معلوم ہوتی تھی اور اب؟ مالِ غنیمت میں سے اب کیا باقی بچا ہے۔ ہم نے پوری دنیا فتح کر لی لیکن ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ کیا تم اپنی فوج جیسی عظیم سپاہ کا تصور کر سکتے ہو۔ یہ سب کھلے آسمان تلے غیر محفوظ ہیں۔ ہماری زندگیاں جنگلی جانوروں کے رحم و کرم پر ہیں۔

اس لیے ہماری درخواست پر غور کرو۔"

سکندر خلافِ معمول سر جھکائے یہ گزارشات سنتا رہا۔

"کوئنوس! یہ بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں چاہتا۔ میں نے تو وہ خیالات بیان کر دیے جو فوج سوچ رہی ہے۔"

"فوج تو وہ سوچتی ہے جو اس کے کماندار سوچتے ہیں۔"

"کبھی کبھی اس کے برخلاف بھی ہوتا ہے اور وہ وقت شاید آ گیا ہے۔"

"کوئنوس! یہ تو تم کہہ رہے ہو۔ باقی کماندار کیا کہتے ہیں؟"

"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں لیکن یہ طے ہے کہ وہ بھی یہی کہیں گے۔"

"پھر ان سب کو میرے پاس بھیجنے کا بندوبست کرو۔"

اس نے مختلف لشکروں کے سالاروں کو اکٹھا کیا۔ اسے اپنی قوتِ استدلال پر بھروسا تھا۔ وہ پہلے بھی اس قسم کی نافرمانیوں کو ختم کر چکا تھا۔ اسے اب بھی یقین تھا کہ وہ اب بھی فوجیوں کو راضی کر لے گا۔ لشکروں کے کماندار تیار ہو گئے تو فوجی بھی ساتھ دینے سے انکار نہیں کر سکیں گے، خواہ انہیں کتنی ہی شکایات ہوں۔

تمام کماندار اس کے خیمے میں جمع ہو گئے۔ کمانداروں نے اسے بتایا کہ فوجیوں کو شکایت یہ ہے کہ اس رزم و پیکار کا خاتمہ نظر نہیں آتا۔

سکندر نے جواب دیا۔ "بہادروں کی محنت و مشقت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ کیا تم آگے بڑھنے سے اس لیے ڈرتے ہو کہ اور لوگ تمہارے مقابلے پر کھڑے ہو جائیں گے لیکن یہ بھی سوچو کہ اگر ہم اب واپس ہو گئے تو یہ خوف ہے کہ جن قوموں کو ہم نے مطیع کر لیا ہے غیر مطیع قومیں انہیں مقابلے پر آمادہ کر دیں۔"

"آپ کا یہ خوف اپنی جگہ لیکن فوجی تو یہ معلوم کرنا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

چاہتے ہیں کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی؟'' کمانداروں نے کہا۔
''اگر تم لوگ ختم جنگ کا وقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو میں بتا دیتا ہوں۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر دریائے گنگا بہتا ہے اور اس سے ذرا آگے مشرقی سمندر ہے۔ بس وہاں پہنچ کر جنگ ختم ہو جائے گی۔ سمندر کے پاس پہنچ کر بیڑا تعمیر کریں گے اور ہندوستان کے اوپر سے گزر کر مصر پہنچ جائیں گے۔ پھر لیبیا کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہرقل کے ستونوں تک جائیں گے۔ کیا تم شکر گزار نہیں ہو کہ ہم نے کتنی بڑی دنیا فتح کر لی ہے۔ یہ سب فوجیوں کے استقلال کی بدولت ہوا ہے۔ انہیں سمجھاؤ کہ اگر تھوڑا سا اور استقلال دکھائیں گے تو مزید فائدے حاصل ہوں گے۔ ہم نے مل جل کر محنت کی ہے۔ میں تمہارے ساتھ تکلیفیں اٹھاتا رہا اور جو کچھ حاصل ہوا اس سے ہم ایک ساتھ فائدہ اٹھائیں گے، ہمت نہ ہارو۔ ہم واپس جا کر کیا کریں گے۔ جو جانا چاہتا ہے واپس چلا جائے لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ جو میرے ساتھ رہیں گے وہ اہل وطن کے لیے رشک کا باعث بن جائیں گے۔''

سکندر کا خیال تھا کہ اس کا ایک ہی جواب ملے گا۔ تمام سالار بیک زبان کہیں گے کہ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے لیکن دوسری طرف خاموشی تھی۔ یہ خاموشی اقرار کی نہیں انکار کی تھی۔ کسی چہرے پر بھی اطمینان نظر نہ آتا تھا۔ اس خاموشی نے سکندر کو برہم کر دیا۔ اس نے غصے سے چیخ کر کہا۔

''جسے یہ باتیں منظور نہیں وہ صاف صاف بتا دے۔''

بالآخر کوئنوس نے اس خاموشی کو توڑا۔
''فوج کی پختہ رائے ہے کہ اس کی محنت و مشقت اور خطرات کا کہیں نہ کہیں خاتمہ ہونا چاہیے تاکہ جو کچھ حاصل ہو چکا ہے اسے اپنے قبضے میں رکھ سکیں۔ فوج بری طرح تباہ ہو چکی ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ جو مقدونوی اور یونانی ہمارے ساتھ چلے تھے ان میں سے صرف چند رہ گئے ہیں۔ باقی یا تو جنگوں میں مارے گئے یا زخمی ہو کر کسی قابل نہ رہے اور آپ نے انہیں نئے آباد کردہ شہروں میں ان کی مرضی کے خلاف چھوڑ دیا جہاں ان کی حالت بہت خراب ہے۔''
سکندر نے پھر وہی سوال پوچھا جو وہ بار بار پوچھ چکا تھا۔

''تم مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟''
''ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے ماں باپ

کیا آپ لبوب مقوّی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ اپنے بچوں کے لیے مضطرب ہیں۔ اے سکندر! اب ہمیں اپنی مرضی کے خلاف آگے نہ لے جا۔ اگر اب ہمیں وطن لے چلو گے تو دوبارہ تمہارے ساتھ آنے پر تیار ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے مقدونوی اور یونانی مل جائیں گے جو انعامات کے لیے تمہارا ساتھ دیں گے اور جنگ ان کے لیے خوف کا باعث نہ ہوگی اس لیے کہ انہوں نے خطرات دیکھے نہ ہوں گے۔"

ایک کوئنوس پر ہی منحصر نہیں تمام سپہ سالاروں نے اس کی تائید کی اور چیخ کر کہا کہ وہ بھی اس رائے کے ساتھ ہیں۔

سکندر غصے میں بھرا ہوا مجلس سے اٹھ گیا اور اپنے خیمے میں چلا گیا۔

اسی دوران یہ اطلاع ملی کہ مگدھ کا راجا اگرامس بیس ہزار شہ سواروں، دو لاکھ آتشیں ہتھیاروں سے لیس سپاہی اور سب سے بڑھ کر تین ہزار جنگی ہاتھیوں کی زبردست فوج کے ساتھ ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سکندر نے اسے افواہ سے زیادہ اہمیت نہ دی پھر بھی ضروری سمجھا کہ پورس سے مشورہ کرے۔ پورس نے اس اطلاع سے اختلاف نہ کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا۔

"اگرامس کے پاس زبردست قوت ضرور ہے لیکن وہ نہایت کمینہ خصلت ہے۔ اسے عوام میں غیر مقبولیت کی بنا پر شکست دینا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔"

شکست تو جب ہو جب مقابلہ ہو۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ اپنی بکھرتی ہوئی فوج کو جمع کر سکے لیکن اس کی فوج اس کا حکم ماننے کو قطعی تیار نہیں تھی۔

سکندر نے نا امیدی کے عالم میں خود کو اپنے خیمے میں بند کر لیا۔ کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ملازم اس کے پاس کھانا لے جاتے۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے فوجی اس کے اس اقدام سے اپنا فیصلہ تبدیل کر لیں گے لیکن اس مرتبہ اس کا اندازہ غلط نکلا۔ کسی کو اس پر رحم نہ آیا۔ کوئی اس کے قریب نہ گیا۔ کسی سالار نے بھی اس کے خیمے میں نہ جھانکا۔ اس نے سپاہ کے نام حکم بھیجا۔

"میں آگے جا رہا ہوں، جو میرے ساتھ چلنا چاہے وہ چلے۔"

اس کی فوج نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ صرف ایک بات کی خواہاں تھی کہ سکندر انہیں واپس لے جائے۔

تین دن تک کشمکش کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر اس نے بوڑھے مقدونوی افسروں کو اپنے خیمے میں بلایا۔ اندر کیا باتیں ہوئیں کسی کو معلوم نہیں تھا لیکن یہ بزرگ باہر آئے تو عقدہ کھلا۔ طے یہ ہوا تھا کہ عبور دریا کے لیے شگون نکالے جائیں۔ اگر شگون خلاف نکلے تو فوج کو واپسی کا حکم مل جائے گا چنانچہ دستور کے مطابق بھیڑ ذبح کی گئی اور اس کا جگر دیکھا گیا۔

اس سے پہلے ہی اس شخص کو اعتماد میں لے لیا گیا تھا جو بھیڑ کا جگر دیکھ کر پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔ اس شخص نے بھیڑ کا جگر دیکھ کر بتایا کہ بیاس کو عبور کیا گیا تو بہت بڑی آفت نازل ہوگی۔ یہ سنتے ہی لوگ خوشی سے .... چلاتے ہوئے سکندر کے خیمے کی طرف بھاگے۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی انہوں نے دعا کی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اب مقدونیہ پہنچیں گے۔

سکندر نے بارہ ستون بیاس کے کنارے کھڑے کرنے کا حکم دیا جنہیں وہ اپنی مراجعت کا نشان بنانا چاہتا تھا۔ اب اس نے واپسی کا اردہ کر لیا تھا۔

اس کے بعد دریائے بیاس کے مغرب میں تمام ملک پورس کی عمل داری میں دیا اور دریائے راوی کو روانہ ہوا جہاں سے اس نے چناب کا رخ کیا اور وہاں ایک نیا شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا۔

اب اس کی منزل جہلم تھی۔

جہلم پہنچ کر اس نے اپنے امراء اور ہندوستان کے سفیروں کی موجودگی میں دربار لگایا۔ ان سب کی موجودگی میں اس نے اپنے فتح کیے ہوئے تمام علاقوں کو باقاعدہ طور پر پورس کے حوالے کر دیا۔ اس سلطنت میں دو ہزار شہر اور سات قومیں شامل تھیں۔

اب اسے جہلم پار کر کے مغرب کی طرف روانہ ہونا تھا۔ اس موقع پر بغیر جوڑ کی کشتیاں تیار کی گئیں جن پر بھاری بھرکم سامان لاد دیا گیا۔ سکندر نے لکڑی کے بجرے پر کھڑے ہو کر پانی کے دیوتا سے محفوظ سفر کی دعا کی جس کے بعد قافلہ روانہ ہو گیا۔

سکندر مشرق سے روانہ ہوا تو وہ کس نقصان سے دوچار ہوا اس کا اندازہ اس کے فوجی نہیں لگا سکتے تھے۔ سکندر کے بہت سے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ یہ خوشی کی نہیں مجبوری کی واپسی تھی۔ اسے محض فتوحات کی کشش اتنی دور نہیں لائی تھی بلکہ وہ تو اس لیے آیا تھا کہ زمین کے آخری اسرار معلوم کر لے اور اب وہ اپنی خیالی دنیا کی شان و شوکت سے دست بردار ہو رہا تھا۔ وہ برسوں تک کتابوں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کے مطالعے میں جو عجیب و غریب خواب دیکھتا رہا تھا، اب انہیں پیچھے چھوڑے جا رہا تھا۔ وہ بحرالکاہل تک نہ پہنچ سکا تھا جو اس کے تخمینے سے بہت دور مشرق میں واقع تھا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی واقعہ تھا کہ وہ بیاس تک پہنچا۔ رومی لشکر... بہ مشکل اس مقام سے اٹھارہ سو میل پیچھے تک داخل ہو چکے تھے۔

وہ آٹھ سال تک مشرق کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ اب اس پیش قدمی سے دست بردار ہوتے ہی اس کی خوش دلی رخصت ہو گئی، اعتماد کم ہو گیا۔ اسے یہ دکھ کھائے جاتا تھا کہ اس کی فوج نے وفاداری کا حق ادا نہ کیا۔ وہ اب صرف یہ کر سکتا تھا کہ جس فوج کو وہ مشرق کی طرف لایا تھا اور جس راستے سے لایا تھا اسے زیادہ مشکل راستے سے واپس لے جائے۔ اس طرح وہ آمدورفت کے نئے راستے دریافت کر سکتا تھا اور اپنی اس انا کو تسکین بھی پہنچا سکتا تھا کہ فوج کو نئی مشکلوں میں ڈالے۔

اس کے فوجی واپسی کی خوشی میں نعرے لگا رہے تھے۔

روانگی کے وقت یہ انتظام کیا گیا تھا کہ دریائے جہلم کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ باربرداری کی گاڑیاں چلیں۔ ایک جانب کی کمان اس کے کمان دار ہیفاسٹن کے سپرد تھی، دوسری کی کریٹرس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ایک فوج آس پاس کے علاقے میں بھیج دی تاکہ جو لوگ لڑائی کے لیے تیار ہو رہے ہوں انہیں منتشر کر دیا جائے۔ اسی طرح صحرائے تھر کے کنارے کے قریب علاقہ ملی میں پہنچ گئے۔ اس حصے کے لوگ بہت بہادر تھے۔ ان میں سے تھوڑے ہی حوالگی پر آمادہ ہوئے۔ وہ ایک مقام کو فتح کر کے آگے بڑھتے تو دوسرے مقام پر مزاحمت شروع ہو جاتی۔

خود سکندر کا یہ حال ہوا کہ جس جگہ جہلم دریائے سندھ سے مل رہا تھا وہاں پانی بہت تیز تھا۔ تیز لہروں نے دیکھتے دیکھتے دو جہازوں کے تختے اکھاڑ پھینکے۔ جو جہاز کم گہرے تھے ان میں پانی بھر گیا۔ سکندر نے یہاں اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ ہندوستان کے وسطی میدان میں سے ہوتی ہوئی آگے بڑھے۔ اب سکندر خود بھی خشکی پر تھا۔ اس کی تلخی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ جس مقام سے گزرے مزاحمت کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ اس کے اس جذبے نے مختلف آبادیوں میں قتلِ عام کا بازار گرم کر دیا۔

وہ ایک قلعے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سکندر غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کی بے صبری نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔ اس نے دیوار کے ساتھ ایک سیڑھی لگوائی اور اوپر چڑھ گیا۔ اس کے دو محافظ اور دو اور بہادر اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ اردگرد کے برجوں سے آتش بازی ہو رہی تھی لیکن سکندر سمیت چاروں محافظ دیوار پر پہنچ گئے۔ اسے دیکھ کر سپاہیوں کا ریلا سیڑھی کی طرف بڑھا۔ کئی پاؤں ایک ساتھ سیڑھی کی طرف بڑھے تو وہ ٹوٹ گئی۔ اب سکندر آتش بازی سے بچنے کے لیے سیڑھی کے ذریعے دوبارہ واپس نہیں آسکتا تھا۔ وہ اندر کی طرف کود گیا۔ اس کے محافظوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ دیوار سے پشت لگا کر حملہ آوروں سے مقابلہ کر رہے تھے۔ آنے والے تیروں کو اپنی ڈھالوں پر روک رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک تیر سکندر کے پیٹ میں لگا۔ یہ تیر ایسا کاری تھا کہ وہ بے بس ہو کر زمین پر گر گیا۔ اس نازک وقت میں غیب سے اسے امداد مل گئی۔ قلعے کا دروازہ ٹوٹا اور مقدونوی سپاہی اندر آ گئے۔ سکندر کو اٹھا کر باہر لائے۔ سکندر کو لگنے والے تیر نے اس کے ایک پھیپھڑے کو متاثر کیا تھا۔ اس کے زخم سے ہوا باہر نکل رہی تھی۔ اس کی وجہ سے افواہ پھیل گئی کہ وہ مارا جا چکا۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے رونا شروع کر دیا۔ انہیں سکندر کی موت سے زیادہ یہ فکر تھی کہ فوج کی قیادت اب کون کرے گا اور وطن واپسی کس طرح ممکن ہو گی۔ اس اندیشے کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سکندر ان کے درمیان نہ رہا تو جنگجو قوم میں بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گی۔ کوئی انہیں یہاں سے نکلنے نہیں دے گا۔ وہ اجنبی دریاؤں میں گھرے بیٹھے تھے اور سکندر کے سوا ان کی واپسی کا کوئی نقشہ تک تیار نہیں کر سکتا تھا۔

تفکرات کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ آہ و بکا کا شور جاری تھا کہ اچانک کسی نے چیخ کر کہا۔ ”سکندر زندہ ہے، سکندر زندہ ہے۔“

اس کی محافظ فوج نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

وہ اپنے خیمے میں لیٹا ہوا تھا۔ لشکر میں موجود طبیب اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اسے ہوش آ گیا تھا۔ طبیبوں نے علاج شروع کر دیا تھا۔

ایک دن اور ایک رات اس کی حالت کبھی سنبھلتی کبھی بگڑتی رہی۔ دوسرے دن وہ کچھ بولنے کے قابل ہو گیا۔
”مجھے اٹھا کر کشتی پر پہنچاؤ۔“

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔"

اسے کشتی پر پہنچا دیا گیا۔ وہ ایک ایسی اونچی جگہ بیٹھ گیا کہ کیمپ میں بیٹھی ہوئی فوج کو اچھی طرح نظر آجائے۔ اس نے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ ہلاتا۔ اس کے فوجیوں کو اس کے زندہ ہونے کا ثبوت مل گیا۔ جب یہ ثبوت مل گیا تو لوگ کیمپ چھوڑ کر کنارے پر پہنچ گئے۔ اس کے حق میں نعرے بلند ہوئے تو اس نے اپنی کمزور آنکھیں کئی بار کھولیں اور بند کیں۔ پھر اس نے حکم دیا، گھوڑا لاؤ۔ افسروں کی التجاؤں کے خلاف وہ انتہائی کوشش سے گھوڑے پر سوار ہوا اور آہستہ آہستہ فوج میں سے گزرتا ہوا اپنے خیمے میں پہنچ گیا۔

اس پر کمزوری کا غلبہ تھا۔ آنکھیں بند کیے پڑا تھا کہ اس کے دوست نیارکس نے اس کے خیمے میں جھانکا اور پھر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک کمزور سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"سکندر! میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری حالت اس آدمی جیسی ہے جس پر شراب کا نشہ غالب آچکا ہو۔ ہم لڑائی میں سخت خطرے کے اندر گھس جانے میں بھی تامل نہیں کرتے حالانکہ تمہیں عام سپاہیوں کی طرح خطرے میں نہیں پڑنا چاہیے۔"

سکندر کو یہ تنقید پسند نہ آئی۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے کمزور آواز میں سہی لیکن جواب دینا ضروری سمجھا۔

"بہادروں کو بلند پایہ کارنامے انجام دینے کے لیے تکلیفیں اٹھانا ہی پڑتی ہیں۔"

نیارکس یہ جواب سن کر سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اسے یہ ڈر ہونے لگا کہ شاید سکندر نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا ہے۔ اب وہ واپس نہیں جائے گا بلکہ خطروں سے لڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آیا اور لوگوں میں یہ خبر پھیلا بھی دی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جو نظام حکومت ہندوستان کے مختصر علاقوں کے لیے وہ بنا رہا تھا، اسے اس سے بھی چنداں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

اب اسے یہاں سے آگے چلنا تھا۔ اسے اس کے جہاز میں آرام سے لٹا دیا گیا۔

دریائے سندھ پر جو بیڑا جنوب کی طرف جا رہا تھا، اس پر بابل کے ستارہ شناس اور نجومی موجود تھے۔ اب ان میں ہندوستانی جوگی بھی شامل ہو گئے۔ انہی میں ایک جوگی کیلی ناس بھی تھا جس نے سکندر کے ساتھ جانے پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ بوڑھا آدمی تھا اور کھانے کے برتن اور ایک چٹائی کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ وہ چٹائی پر بیٹھ جاتا اور کھانے کا برتن سامنے رکھ لیتا تاکہ اس میں کھانا ڈال دیا جائے۔ عموماً اکیلا اور خاموش رہتا البتہ سکندر سے بات چیت کر لیتا تھا۔ اس کی باتوں میں مقدونیوں کے لیے نفرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ سکندر کے حملوں کے بھی خلاف ہی نظر آتا تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا۔

"تم نے بہت کچھ حاصل کیا اور بہت کچھ تباہ کیا۔ دیکھو تم نے کیا پہن رکھا ہے۔ کیا حاصل کر لیا؟ یہ دولت، قبضے میں لائے ہوئے علاقے، جانور کچھ بھی تمہارے کام نہیں آئے گا۔ تمہیں کوئی بھی موت سے نہیں بچا سکے گا۔"

مقدونوی بھی اس کی باتوں کی وجہ سے اس کے خلاف ہو گئے تھے اور عام تاثر یہ تھا کہ وہ بدشگونی کی باتیں کرتا ہے۔ بہت سے لوگ تو یہ کہتے تھے کہ اسے اٹھا کر کہیں پھینک دو۔

بڑھتی ہوئی تلخی دیکھ کر ایک دن سکندر نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم ہمارے ساتھ کیوں آئے ہو؟" یہ سن کر اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں تنک کر بولا۔

"بتاؤ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہیں چاہیے تھا کہ اپنی سلطنت میں رہتے۔ لوٹ مار کے لیے یہاں نہ آتے۔"

انہی باتوں میں وقت گزرتا رہا۔ انہیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے ہیں۔ مقدونوی اگرچہ مصائب کے عادی ہو چکے تھے لیکن سمندر نے انہیں دہشت زدہ کر دیا۔ سکندر کے ایک جرنیل ہیفاکشن نے بٹالا کے مقام پر ایک بحری مرکز بنانا شروع کر دیا۔ (بٹالا موجودہ حیدرآباد)

سکندر کی صحت اب اچھی ہو چکی تھی۔ وہ جہازوں کا ایک بیڑا لے کر دریا کی ایک شاخ کے حالات معلوم کرنے کے لیے نکل پڑا۔ بیڑے میں نہ تجربہ کار ملاح تھے نہ انہیں یہ معلوم تھا کہ آگے جا کر لہریں بہت زوردار ہو جائیں گی چنانچہ جب زوردار لہریں آئیں اور بیڑا پانی کی نذر ہونے لگا تو انہوں نے جہازوں کو لنگر انداز کر دیا۔ اسی اثنا میں جزر کا دور شروع ہو گیا اور ان کے جہاز کیچڑ میں دھنس گئے۔ بحیرۂ روم میں انہیں اس قسم کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔

جب "مد" (جزر و مد پانی کا اتار چڑھاؤ) شروع ہوا تو لہروں نے جہازوں کو تھپیڑے مار کر اندر کی طرف دھکیل

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دیا۔ مقدونیوں کا خیال تھا کہ سمندر ان کے خلاف غیظ وغضب کا اظہار کررہا ہے۔ یہ تو مقامی باشندوں نے بتایا کہ لہروں کا مدوجزر انسانوں سے بے پروا ہوکر مسلسل اسی طرح جاری رہتا ہے۔

وہ جنوبی سمت میں سمندر پر پہنچا تھا اور کوئی ہندوستانی ملاح اسے بتا نہ سکا تھا کہ مغرب کی جانب کیا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ عربوں کے جہاز وقتاً فوقتاً دریائے سندھ کے دہانے پر آتے ہیں اور اپنے ساتھ مسالے، ہاتھی دانت اور موتی لاتے ہیں۔ یہ واضح تھا کہ مغربی جانب دجلہ اور فرات کے پانی بھی کسی جگہ سمندر میں گرتے ہوں گے اور ان سے آگے عرب واقع ہوگا۔ اور آگے بڑھیں گے تو مصر کا ساحل آجائے گا لہٰذا اس نے طے کرلیا کہ بیڑا ساحل کے ساتھ ساتھ دجلہ کے دہانے تک جائے گا لیکن مصیبت یہ تھی کہ ساحلی علاقہ سراسر بنجر اور صحرائی تھا اور جہازوں پر صرف تین روز کے لیے پانی یا کھانا رکھا جاتا تھا۔ اس مشکل کے باوجود سکندر اپنے دل میں اس ارادے کو پورا کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ مقدونیوں کو سمندر میں سفر کا تجربہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود سکندر بضد تھا اور بالآخر یہی طے ہوا کہ بیڑے کے ساتھ ساتھ فوج کنارے کنارے خشکی پر چلے۔ جو لشکر ساحل کے ساتھ ساتھ جانے کے لیے تجویز ہوا اس کی تعداد سکندر نے بارہ ہزار سے چودہ ہزار تک رکھی۔ اسے مکران کے صحرا سے گزرنا تھا اور سکندر خود اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ اب بیڑا سمندر سے گزر رہا تھا اور ایک فوج صحرا سے گزر رہی تھی تاکہ بیڑے کو مدد ملتی رہے۔ سکندر کے ساتھ راہبر بھی تھے اور اس نے رسد کا بھی انتظام کرلیا تھا لیکن ایک مہینے کے اندر اندر وہ سب مصائب میں مبتلا ہوگئے۔ بربری قبائل نے حملے شروع کردیے اور جو گاؤں انہیں جابجا راستے میں ملے ان میں خوراک کا کوئی سامان نہیں تھا۔ گرمیوں کے دن نہیں تھے لیکن جس علاقے میں وہ تھے وہ سراسر گرم تھا اور جانوروں کے لیے چارے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس برہنہ میدان میں گزرتے ہوئے ریت کے ٹیلے آگئے جن پر چڑھنا مشکل تھا۔ دن کی گرمی سے بچنے کے لیے رات کے وقت کوچ کیا جاتا۔ صرف یہ امید انہیں آگے لیے جارہی تھی کہ صبح کے وقت پانی کے کسی ذخیرے پر پہنچ جائیں گے۔ اس آزمائش کے وقت فوج اس سے ایک مرتبہ پھر بگڑ گئی اور ایسی حرکتوں کی مرتکب ہونے لگی جو اس کے لیے مزید مشکلیں بڑھانے لگیں۔ اس نے غلے کی بوریاں دے کر ساحل پر بھیجا کہ بیڑے کو ان کی ضرورت ہوگی۔ اس کے آدمی خود غلہ لے کر کھا گئے۔ اب سکندر نے بوریوں پر اپنی مہریں لگا دیں لیکن وہ مہریں بھی توڑ لیتے۔ باربرداروں کی گاڑیاں توڑ ڈالیں اور کہہ دیا کہ چلتے چلتے ٹوٹ گئیں۔ گاڑیاں کھینچنے والے جانوروں تک کو کھانا شروع کردیا۔ سکندر کو ان حرکتوں کا علم تھا لیکن اس نے ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے گریز کیا۔ غرض یہ کہ اس صحرائی علاقے کو عبور کرنا اس کے لیے امتحان بن گیا۔ ان مصائب کے باوجود اس نے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر جاری رکھا۔ ایک اور مصیبت...... سامنے پہاڑ آگیا جس کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہ تھا اور وہ ساحل سے ہٹ کر ملک کے اندر کی طرف مڑنے کے لیے مجبور ہوگیا۔

اب راہبروں کو بھی کچھ خبر نہیں تھی کہ کس طرف جانا ہے۔ وہ سمندر سے دور ہٹ چکے تھے۔ ہندوستان واپس جانے کا سوال خارج از بحث تھا۔ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ جانا کس طرف ہے۔ سکندر نے یونہی اندازے سے فیصلہ کیا کہ بائیں جانب رخ رکھنا چاہیے تاکہ بیڑے کو تلاش کیا جاسکے کیونکہ وہ خود پیدل سفر کررہا تھا اور بیڑا سمندر میں تھا۔ وہ

احتیاط

ایک بار مرزا غالب کے ہاں ایک مہمان آئے۔ ملاقات کے بعد واپس جانے لگے تو مرزا غالب موم بتی لے کر دروازے تک انہیں چھوڑنے گئے۔ مہمان اس حسن سلوک سے بہت متاثر ہوا۔ اور کہا اس زحمت کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مرزا غالب مسکرائے اور بولے۔

”جناب میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ کہیں میرا جوتا نہ پہن جائیں۔“

اصل وجہ

مشہور فلم ”بدصورت“ کے ہدایتکار اپنی کامیاب فلم کی وجوہات بتا رہے تھے۔ ”فلم کی کامیابی کی دو وجوہات تھیں۔ نمبر 1 یہ کہ اس میں ملک کی مشہور ہیروئن نے بدصورت لڑکی کا کردار بہت خوب ادا کیا اور نمبر دوم یہ کہ......“

”انہوں نے یہ کردار میک اپ کے بغیر ادا کیا۔“ پیچھے سے آواز آئی۔

مرسلہ: برہان شکیل، اسلام آباد

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پیدل چلتے رہے۔ سکندر کا اندازہ صحیح نکلا۔ وہ سمندر تک تو نہ پہنچ سکے لیکن ایک شہر میں پہنچ گئے۔ اس شہر کو ''پورا'' کہا جاتا تھا۔

اس شہر میں داخل ہوئے تو فوج کی تعداد گھٹ چکی تھی۔ یہاں انہیں غلہ بھی ملا، گوشت بھی اور شراب بھی۔ یہاں پہنچ کر وہ دوسرے لوگوں کا انتظار کرنے لگے لیکن نیارکس اور اس کے بیڑے کی طرف سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ یہاں سے بھی نکلے اور جنوبی ایران میں ایک مقام ''گلاش کرد'' پہنچ گئے۔

سکندر کو بیڑے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ نیارکس کو کھانے پینے کا سامان نہ ملا ہوگا تو وہ اور اس کے ساتھی مرکھپ گئے ہوں گے۔

اس شہر میں رہتے ہوئے مہینے گزر گئے۔ ایک دن بیڑے کے دیکھے جانے کی افواہ پھیلی لیکن یہ محض افواہ تھی۔ کوئی شخص بھی ایسا نہیں تھا جو کہہ سکتا کہ اس نے جہاز دیکھے ہیں۔

ایک روز سکندر کے کچھ آدمی سڑک پر گھوم پھر رہے تھے کہ انہیں دو آدمی ملے۔ انہیں آدمی نہیں ہڈیوں کا ڈھانچا کہنا چاہیے بلکہ ڈھانچا بھی کہنا ڈھانچے کی توہین ہے۔ ان کے بال چہروں پر فرش کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ ان سے بہ مشکل اپنی جگہ کھڑا ہوا جا رہا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ دونوں یونانی زبان بول رہے تھے۔

''ہمیں سکندر کے پاس لے چلو۔''

یہ لوگ ان دونوں کو سکندر کے پاس لے آئے۔ جو کچھ انہوں نے کہا اسے سن کر سکندر چکرا کر رہ گیا۔

''میں نیارکس ہوں اور میں آپ کو بیڑے کا حال سناؤں گا۔ اور یہ اوکیاس ہے۔'' نیارکس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سکندر کو چند لمحوں بعد یقین آیا کہ وہ نیارکس ہے۔

''نیارکس! یہ تمہارا کیا حال ہو گیا؟''

''سمندر کا کھارا پانی پی پی کر ہمارا یہ حال ہو گیا۔''

''جہازوں اور دوسرے لوگوں پر کیا گزری؟''

''تمام جہاز اور ملاح دریا پر کھڑے انتظار کر رہے ہیں اور جہاز کی مرمت ہو رہی ہے۔ ہم آپ کو تلاش کر رہے تھے۔ ہمیں آپ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔''

''راستے میں غذا بھی ملی؟''

''روانگی کے بعد صرف ایک جگہ غلے کی خاصی مقدار مل گئی تھی اور روٹیاں بھی موجود تھیں۔''

''آدمیوں کی کیفیت کیا رہی؟''

''انہوں نے سمندر کا سفر کبھی نہیں کیا تھا لہٰذا بہت ڈر رہے تھے۔ جو لوگ بہت ڈر گئے تھے انہیں کنارے پر اتار دیا۔ پھر جب اندیشہ ہوا کہ لوگ بھاگ نہ جائیں تو میں جہازوں کو بہت دور ٹھہراتا۔ ملاح بھوک کے باعث کمزور ہو گئے تو انہیں خوراک کے سوا کوئی خیال ہی نہیں رہ سکتا تھا۔''

''اتنی مدت تک غذا کے بغیر گزارہ کیونکر کیا؟'' سکندر نے پوچھا۔

''جب خوراک ختم ہو جاتی تو ہم وقتاً فوقتاً کنارے کے قریب آجاتے اور رومیوں کے دیہات سے روٹی، کھجوریں اور میوے حاصل کر لیتے۔ ان چیزوں کے لیے ہمیں لڑنا پڑتا۔ پھر ماہی خوروں کا ساحل آگیا جو ایک ہزار ایک سو چھہتر میل لمبا تھا۔ وہاں ہم نے لوگوں کو خشک مچھلی غذا کے طور پر استعمال کرتے دیکھا۔ ہم نے بھی اس کی نقالی کی اور مچھلیوں کے علاوہ بحری چوہوں، کیکڑوں اور گھونگوں سے کام لیتے رہے۔ جب جزر کا وقت آتا تو سمندر کے کنارے جہاں جہاں پانی کے جوہڑ سے رہ جاتے ہم ان میں سے مچھلیاں پکڑ لیتے۔ پھر ہم کو بھی کی قسم کی ایک چیز کھانے لگے جو تاڑ کے درختوں کی چوٹیوں پر نظر آتی تھی۔''

خطرات کے متعلق سوال ہوا تو نیارکس نے بتایا۔

''سب سے بڑی مصیبت یہ آئی کہ اچھی لکڑی کے بغیر جہازوں کی مرمت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر جزیرہ ''نزید'' کے پاس پہنچے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ جو آدمی اس جزیرے میں اترتا ہے، وہاں کی ملکہ اسے اپنے پھندے میں پھانس لیتی ہے۔ اس سے شادی کا کھیل رچاتی ہے اور پھر مچھلی بنا کر سمندر میں پھینک دیتی ہے۔ وہاں سے گزرے تو ایک جہاز غائب ہو گیا۔ ایک ملاح کا خیال تھا کہ گم شدہ جہاز شاید اس جزیرے میں جا پہنچا اور اس کے آدمی نزید کے فریب کا شکار ہو گئے لیکن میں ایک کشتی لے کر کنارے پر گیا۔ جہاز کو بہت ڈھونڈا وہاں نزید کا کوئی سراغ نہ ملا۔ کچھ دیر بعد گم شدہ جہاز ہمارے ساتھ آملا۔ اسی طرح ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ ایک جگہ ہمیں بحری عفریتوں سے سابقہ پڑا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ سمندر کا پانی کئی مقامات سے اوپر اچھل رہا ہے لیکن یہ پانی وہی عفریت اچھال رہے تھے جنہوں نے سطح بحر کے نیچے ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ ملاح یہ کیفیت دیکھ کر اس قدر ہراساں زدہ ہو گئے کہ انہوں نے چپو ہاتھ سے رکھ دیے۔ میں خود ان کے پاس جا پہنچا۔ انہیں حوصلہ دلایا اور حکم دیا کہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جہاز ایک قطار میں ہو جائیں جس طرح جنگ کے لیے صف بندی کر لی جاتی ہے پھر ہم ان عفریتوں کی طرف بڑھے۔ ان کے رنگ سیاہ تھے اور قد اتنے بڑے تھے جیسے بارہ چپوؤں والا جہاز۔ جب ہم قریب پہنچے تو خوب شور مچایا، ڈھول بجائے۔ یہ شور سن کر عفریت نیچے تہ میں چلے گئے۔ جب ہم بہت آگے نکل گئے تو وہ وہاں پھر نمودار ہوئے۔ ہم نے وہاں ایسے گھر بھی دیکھے جو وہیل مچھلیوں کی ہڈیوں سے بنائے گئے تھے۔"

سکندر اس وقت تک نہ سویا جب تک نیارکس سے راستے کے تمام حالات سن نہ لیے۔ سکندر نے یہ سارے حالات سن کر نیارکس کو آرام کا مشورہ دیا۔

"اب میں تمہیں کمانداروں کی ذمے داریوں سے فارغ کر رہا ہوں تاکہ تم دلجمعی سے آرام کر سکو۔"

"ایسا کریں گے تو آپ مجھ پر ظلم کریں گے۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ مجھے بدستور بیڑے کے ساتھ دجلہ کے دہانے تک جانے کی اجازت مل جائے۔"

"ٹھیک ہے، تم میں اگر ہمت ہے تو میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔"

جب نیارکس تیار ہو گیا اور اس نے ثابت کر دیا کہ ساحلی علاقے کے ساتھ بیڑا اپنی حفاظت کا انتظام کر سکتا ہے تو سکندر نے فیصلہ کر لیا کہ اب عرب کے گھیرے کی خوب چھان بین کر لینی چاہیے تاکہ حبشہ تک کا راستہ مل جائے اور نیل کے اس حصے تک پہنچا جا سکے جہاں سے یہ دریا نکلتا ہے۔

سکندر کو یوریشیا کے قلب سے نکلے لمبی مدت گزر چکی تھی۔ اس مدت میں کم از کم دو مرتبہ اس کی وفات کی خبر چوکیوں اور تجارتی شاہراہوں کے ذریعے مغربی علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ ان اطلاعات کے پس منظر میں جب یہ اطلاع پھیلی کہ سکندر مختلف اقوام کی فوج کے ساتھ پرسی پولس کے پاس کی پہاڑیوں میں آ گیا ہے تو جن گورنروں کے ہاتھ میں وہ ایرانی شہر پرسی پولس کا انتظام چھوڑ گیا تھا، ان میں سے اکثر حیرت زدہ رہ گئے۔

وہ پرسی پولس پہنچا تو انتظامات مملکت کا نقشہ ہی بگڑا ہوا دیکھا۔ جو اطلاعات اسے ملیں ان سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جن مقدونیوں کو وہ اختیارات سونپ کر گیا تھا انہوں نے اپنا دائرۂ اثر بڑھا لیا ہے۔ مقدونوی فوجی گورنروں نے اکثر معاملات میں ایشیائی نائبوں کے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا اور اپنے لیے الگ دولت جمع کرنے میں لگ گئے تھے۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ مذہبی عبادت گاہوں کو لوٹا گیا ہے اور دیسی سرداروں کو قتل کیا گیا ہے۔ ایرانیوں نے اسے بتایا کہ ایران کی سلطنت کی بنیاد رکھنے والے شہنشاہ کوروش کے مقبرے میں جو قیمتی چیزیں تھیں وہ سب اٹھا لی گئیں۔ صرف معمولی چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔

"میرے لیے گھوڑا منگاؤ۔ میں خود جا کر دیکھوں گا۔"

وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور تنہا نکل کھڑا ہوا۔ محافظ فوج کے سوار اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ کوروش کے مقبرے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ واقعی قبر میں ایک شگاف پڑا ہوا ہے۔ اصل تابوت خالص سونے کا تھا اور اس پر جو قیمتی تحفے رکھے ہوئے تھے وہ سب غائب ہو چکے ہیں۔ صرف کوروش کی لاش رکھی ہوئی ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ حرکت مجوسیوں کی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ تو صدیوں سے اس کے محافظ چلے آ رہے تھے۔ یہ کسی مقدونی کا کام ہو گا۔ وہ اس طرح مرمریں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا جیسے چکرا کر گر پڑا ہو۔ پھر اس کی توجہ ان بوڑھے آدمیوں کی طرف ہوئی جو اس کے انتظار میں نیچے کھڑے تھے۔ ان کے لباس سفید تھے اور کمر سے سرخ رنگ کے پٹکے باندھ رکھے تھے۔ اسے خیال ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ ان سے ملاقات کے لیے نیچے اتر آیا۔ یہ لوگ تعداد میں تین تھے۔ ان تینوں نے اس سے کہا۔

"اے انسان! چونکہ تو اب یہاں آیا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ تو اس کا جانشین ہے جو جا چکا۔ ظاہر ہے کہ نالائقوں کو وراثت نہیں پہنچتی اور نہ ہی اس پر قوت اور زور سے قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ وراثت کوروش سے تمہیں ملی ہے۔ یہ نہ پوچھنا عظمت کہاں سے آئی ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے آخری جملہ کہا اور چلے گئے۔

"جسے بندگان خدا کا بادشاہ چن لیا جاتا ہے اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔" ان کے چلے جانے کے بعد سکندر کو کیلی ناس، اپنے دوست کا کہنا یاد آیا۔

"حقیقت میں تم اتنی ہی زمین کے مالک ہو جس میں موت کے بعد دفن ہو گے۔" کیلی ناس وہی جوگی تھا جو ہندوستان سے اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔

اس مقولے نے سکندر کی آنکھیں کھول دیں۔ اسے اب فتح زمین کے لیے نہیں خدمتِ مخلوق کے لیے کام کرنا تھا کیونکہ اس کے خیال میں اس نے اس سے زیادہ زمین فتح کر لی تھی جو اس کے دفن ہونے کے لیے چاہیے تھی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس نے اعلان کردیا کہ اب کوئی جنگ نہ ہوگی۔ جو جس جگہ ہے وہاں محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سزائیں دینے کا لامتناہی سلسلہ شروع کردیا۔ مجرموں کو بڑی بڑی سزائیں دیں۔ بعض فوجی افسروں اور سرکاری کارداروں کو پھانسی پر لٹکایا۔

عوام الناس محفوظ تھے اور سرکاری افسروں میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

مشرق میں جو افراتفری پھیلی تھی وہ مغرب تک پہنچ گئی۔ جب لوگوں نے سنا کہ سکندر سفر سے واپس آگیا ہے اور بہت سے کارداروں کو سزا دی گئی ہے تو گورنر ہرپالوس بابل کے خزانے لے کر بھاگ گیا۔ اس نے ساری دولت سمیٹی اور فوج اور خزانے کے ساتھ ایتھنز کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوگیا۔

یونان پہنچتے ہی اس نے نعرہ بلند کیا۔ ''حب وطن کا تقاضا ہے کہ ہم بغاوت کریں۔ ہمارا مقصد اس شہر کی عظمت بحال کرنا ہے۔''

انتہا پسند سیاست دانوں کو اس نعرے نے مسحور کردیا اور وہ اس کے ساتھ ہوگئے۔ دوسرے لوگوں کو دولت کے بل بوتے پر ساتھ ملالیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کے مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا سکندر سے جنگ کرنا دیوانگی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایتھنز برباد ہوجائے گا۔

یونان کی بدامنی، ہرپالوس کے چرائے ہوئے خزانے پر ہنگامے اور مقدونیہ کے مختلف گروہوں کی کشمکش کے باعث سکندر نے مناسب سمجھا کہ انٹی پیٹر کی جگہ کریٹرس کو مقرر کردے جو نہایت قابل ناظم تھا۔

انٹی پیٹر سے نظم ونسق لے لیا گیا تو اس کا بیٹا کیسنڈر احتجاج کی غرض سے سکندر کے پاس ایشیا آیا اور سکندر کے سامنے اپنے باپ کی صفائی پیش کی۔ مختصر یہی تھا کہ میرا باپ بے قصور ہے۔ بدامنی کا الزام اس پر غلط لگایا گیا تھا۔ سکندر نے کوئی دلچسپی نہیں لی اور یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا کہ اگر تمہارا باپ مجرم ٹھہرے تو ضرور سزا دی جائے گی لیکن ابھی مجھے معلوم نہیں کہ کون مجرم ہے۔

اس گفتگو کے بعد کیسنڈرا ایسا ڈر گیا کہ اس پر رعشہ طاری ہوگیا۔ پھر اس کی کبھی ہمت نہ ہوئی کہ سکندر کے سامنے آتا۔ سکندر نے بھی اس سے کبھی بازپرس نہیں کی۔

سکندر پرسی پولس کے مقدس مقام سے شوش کا سلسلہ کو طے کرنے کے لیے تیار ہوگیا تاکہ اپنی مملکت کے مغربی حصے سے قریب تر تعلق قائم کرسکے۔

مقدونوی فتوحات کی داستانیں ایتھنز میں بیان ہو رہی تھیں۔ یہ ایسی داستانیں تھیں جن پر اہلِ یونان کو مشکل سے یقین آتا مثلاً ستر نئے شہروں کی تعمیر، بیس ہزار اسٹیڈیا سے آنے والے تجارتی قافلے، جنوبی سمندر میں جہاز رانی، دنیا کا یہ وسیع تر تصور ان کے لیے مسحور کن تھا۔ ایسے وسائل حل کیے گئے تھے جن کے سامنے یونانی شہروں کے مسائل بے حقیقت رہ گئے تھے اور اتنی بڑی آبادی ماتحت آگئی تھی جس میں یونان کی آبادی ایک چھوٹی سی اقلیت کی حیثیت رکھتی تھی۔

شوش پہنچ کر سکندر نے ایک بہت بڑے جشن کا انتظام کیا۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ لمبے کوچ کے بعد اب ہم راحت وآرام کے لیے تیار ہوگئے ہیں لیکن اصل میں مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے ہم قوموں کو ایشیائیوں کے ساتھ شادیاں کرنے پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ چند دن کے آرام کے بعد اس نے تمام افسروں کو بلا کر کہا کہ ایشیائی عورتوں سے شادی کرلو۔ اس نے خود پہل کی اور دارا کی سب سے بڑی لڑکی کو دوسری بیوی کے طور پر منتخب کرلیا۔ کریٹرس کی شادی اپنی پہلی بیوی روشنک کی چھوٹی بہن سے کردی۔ اسی طرح دوسرے افسروں کے لیے ایرانی امراء کی بیٹیاں چن لیں۔ یہ تمام شادیاں ایشیائی طریقے پر ہوئیں۔

ان شادیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے سکندر نے اعلان کردیا تھا کہ مقدونوی رفیقوں کی طرح اب ایشیائی رفیق بھی میرے عزیز اور رشتے دار سمجھے جائیں گے۔

افسروں کے علاوہ دس ہزار سپاہیوں نے بھی شادیاں کیں۔ ان سب کو سکندر کی طرف سے جہیز ملے اور ان کے نام... ایک خاص رجسٹر میں لکھے گئے۔

مقدونیہ کے بزرگ سپاہی مشرقی دلہنوں کے طور طریقوں کی ہنسی اڑاتے تھے لیکن انہیں اصل غصہ اس بات پر آرہا تھا کہ سکندر کو اب پرانی فوج کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ انہیں یہ بھی غصہ تھا کہ سکندر مشرقی بادشاہوں کی طرح مطلق العنان بن چکا ہے۔

بابل کے راستے پر یہ کشمکش آخری راستے پر پہنچ گئی۔

اسے معلوم تھا کہ ''شوش'' مشرقی پہاڑوں کے اندر فاصلے پر واقع ہے لہٰذا اسے دارالحکومت نہیں بنایا جاسکتا۔ بابل شاہراہ پر واقع تھا اس لیے اسے دارالحکومت بنایا جاسکتا تھا اور فرات کے ذریعے آبی راستہ بھی سمندر تک جاتا تھا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی کشش کا باعث تھا کیونکہ سمندر کی چھان بین اس کے خیالات پر چھائی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے اس نے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اصرار کیا کہ دلدلوں سے چکر لگاتے ہوئے چلنا چاہیے۔ پھر دجلہ پر کشتیوں کے ذریعے سے سفر شروع ہوا۔ اس کے اس فیصلے پر مقدونیوں میں ایک مرتبہ پھر شورش کے آثار پیدا ہوئے۔ دجلہ تک پہنچتے پہنچتے یہ آوازیں بہت بڑھ گئیں چنانچہ اس نے سب کو بلایا اور کہا جن کی عمر زیادہ ہوچکی ہے یا جنگی خدمات انجام دینے کے قابل نہ رہے، وہ واپس چلے جائیں۔

وہ خود بھی بیمار تھا۔ اس کے پھیپھڑوں پر جو زخم لگا تھا اس کا علاج ٹھیک طرح نہ ہوسکا تھا۔ وقتاً فوقتاً بخار ہوجاتا تھا لیکن وہ کوئی مہم ترک کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

اس نے مقدونیوں کو واپسی کی اجازت دے دی تھی لیکن مقدونیوں کا اصرار یہ تھا کہ یا تو ہم سب واپس جائیں گے یا کوئی نہیں جائے گا۔

''ہم سب چلے جائیں گے۔ ہمارے بعد سکندر ان ایشیائیوں کو لے کر جنگ کرلے جن کو اس نے سر پر چڑھا رکھا ہے اور ہمیں نظرانداز کررہا ہے۔''

جب یہ آوازیں سکندر کے کانوں تک پہنچیں تو وہ اپنے افسروں کے ساتھ ان کے کیمپ میں پہنچا۔ وہ ایک گاڑی پر چڑھ گیا اور مقدونیوں سے مخاطب ہوا۔

''میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر تم سب جانا چاہتے ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔ تم جب چاہو چلے جاؤ۔''

''ہم تمہارا کوئی حکم سننے کو تیار نہیں۔'' مقدونیوں نے چیخ کر کہا۔

سکندر یہ سنتے ہی گاڑی سے کود پڑا۔ اس کا منہ غصے کی سرخی سے لال ہورہا تھا۔ اس نے آگے کھڑے ہوئے آدمیوں کو باقی لوگوں سے الگ کیا اور اپنی محافظ فوج کو حکم دیا۔

''انہیں ابھی موت کے گھاٹ اتار دو۔ یہ میرا کوئی حکم سننے کو تیار نہیں لیکن یہ حکم ضرور سنیں گے۔'' پھر وہ ان آدمیوں سے مخاطب ہوا۔

''تم چیتھڑا پہنتے تھے۔ بربری قبیلے جب تم پر حملہ کرتے تھے تو تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر چھپ جاتے تھے۔ میرے باپ نے تمہارے لیے لبادے مہیا کیے اور تمہیں شہروں میں آباد کیا۔

''ہم جب وطن سے نکلے تھے تو تمہارے پاس گزارے کا کوئی سامان نہ تھا۔ میں نے جو علاقے فتح کیے وہ تمہارے لیے فتح کیے اور تمہیں دولت سمیٹنے کا پورا موقع دیا۔ لیڈیا، ایران اور ہندوستان کی دولت ہمیں ملی۔ میں نے اس میں تمہیں حصے دار بنایا، میں نے تمہارے لیے پیدل چل کر تکلیفیں اٹھائیں۔ اب بیرونی سمندر بھی ہمارے قبضے میں ہیں۔ جو خوراک تم کھاتے ہو وہی میں نے کھائی اور کم سے کم نیند لی۔ تم میں کون ہے جس نے میرے لیے اتنی تکلیف اٹھائی ہو۔ اگر کوئی ہے تو سامنے آئے۔ تم جانتے ہو کہ کوئی ہتھیار اب تک ایجاد نہیں ہوا جس کے زخم کا نشان میرے جسم پر موجود نہ ہو۔''

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ غالباً یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی بولتا ہے یا نہیں۔ جب مکمل خاموشی رہی تو اس نے اپنی گفتگو کا پھر آغاز کیا۔

''میں اب بھی تمہارا سردار ہوں اور میری وجہ سے تمہیں فاتحوں کی حیثیت ملی۔ میں نے اپنی شادی کے ساتھ تمہاری شادیوں کا بھی جشن منایا۔ میں نے تمہارے بچوں کی دیکھ بھال کا انتظام کیا۔ میں نے تمہارے قرضے اتارے اور کبھی نہیں پوچھا کہ تم کیوں مقروض ہوئے۔ میں تمہیں دریائے سندھ کے پار لے گیا اور اگر پیٹھ نہ موڑتے تو دریائے بیاس سے بھی آگے لے جاتا۔ اب بھی اگر واپس جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ...... سب چلے جاؤ اور وطن جاکر کہو کہ ہم اپنے بادشاہ سکندر کو مفتوح اجنبیوں میں چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔ جاؤ چلے جاؤ۔''

پھر وہ ہجوم میں سے راستہ پیدا کرتا ہوا اپنے خیمے میں چلا گیا اور اعلان کردیا کہ میں اب کسی سے ملاقات نہیں کروں گا۔ کوئی میرے پاس نہ آئے۔

اس کے رخصت ہوتے ہی مکھیوں کی بھن بھناہٹ کی طرح آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں۔ پھر یہ آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ وہ سکندر کے فیصلے پر بحث کررہے تھے۔

''سکندر کی زبان میں جادو ہے۔ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی ایسی باتوں سے دلوں کو مسخر کرچکا ہے۔''

''وہ وعدے کا پکا ہے۔ اس نے جو کہا ہے اسے پورا کرکے رہے گا۔ ہم سب کو انعام دے کر رخصت کرے گا لیکن خود نہیں جائے گا جیسا کہ وہ کہہ چکا ہے۔''

''اگر ایسا ہوا تو ذرا سوچو مقدونیہ پہنچ تو ہمارے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ یہی کہ ہم اپنے بادشاہ کو چھوڑ کر آگئے۔''

ایک اور شخص نے دخل اندازی کی۔

''ذرا یہ بھی تو سوچو کہ ہمیں نظرانداز کرکے ایرانی فوجیوں کو اعلیٰ عہدے دیے گئے ہیں۔ اپنی محافظت کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

لیے ایشیائی رجمنٹوں کو رکھا ہے۔ جسے ہم پر بھروسا ہی نہیں، انہیں روپہلی ڈھالیں دی گئی ہیں۔"

"وہ مقدونوی تھا مگر اب ایشیائی بن گیا ہے۔"

"وہ بالکل بدل چکا ہے۔"

"وہ اپنے دوستوں پر بھروسا نہیں کرتا اور نہ ہی ان دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد رہا ہے جن کے لیے وہ پہلے قربانیاں کیا کرتا تھا۔"

دوسرے دن بھی فوجیوں کے درمیان یہی باتیں ہوتی رہیں۔ مخالفانہ بھی اس کی حمایت میں بھی اور منافقانہ بھی۔ پھر یہ طے ہوا کہ چل کر سکندر سے بات کی جائے۔ بڑے بڑے افسر ہجوم کر کے سکندر کے خیمے پر پہنچے اور پیغام بھیجا کہ جب تک ہماری بات نہیں سنو گے دن ہو یا رات ہم یہاں سے نہیں ہلیں گے۔ یہ حلف بھی اٹھایا کہ جن لوگوں نے ہمیں برافروختہ کیا ہے انہیں حوالے کر دیں گے۔

سکندر کو باہر آنا پڑا۔ اس کے آتے ہی اس کے افسروں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ایک افسر آگے بڑھا اور اپنی صفائی پیش کی۔

"ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں۔ بس اتنی شکایت تھی کہ تم نے ایرانیوں کو اپنا دوست بنالیا اور ہمیں یہ عزت بھی نہ دی۔ شاید یہ بھی ہماری غلط فہمی ہو۔"

"تم نے میرے بارے میں ایسا سوچا بھی کیوں۔ میں نے اگر ایرانیوں کو دوست بنایا تو یہ میری مصلحت تھی ورنہ تم میرے عزیز ہو۔ تم سب عزیز ہو۔"

یہ سننا تھا کہ تمام لوگ نعرے لگانے اور اچھلنے کودنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے وعدہ کرلیا کہ ہم اکٹھے جشن منائیں گے، اس جشن کا نام ہوگا تجدیدِ وفا کا جشن۔

اس نے پرانے طریقے کے مطابق ایک دعوت کا انتظام کیا جس میں مقدونوی افسروں کو اپنے قریب بٹھالیا اور ایرانیوں کو ذرا دور بیٹھنے کا حکم دیا۔ جب شراب کا دور شروع ہوا تو اس نے اس وقت بھی اپنے آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر پینے کو ترجیح دی۔ شراب پینے کے بعد اس نے دونوں قوموں (مقدونی اور ایرانی) کی متحدہ دولت کے لیے دعا کی۔

سکندر اور اس کی فوج کے درمیان پچھلے دو سالوں سے جو کشمکش جاری تھی، دریائے دجلہ کے اس جشن میں ختم ہوگئی لیکن پھر بھی پوری طرح نہیں۔ بس تلخی کی جگہ خوشگواری نے لے لی۔

اس کے بڑے بڑے افسر تو اس کے ساتھ ٹھوکریں کھانے کو تیار تھے لیکن عام سپاہیوں میں اب بھی بے چینی تھی اور وہ اپنے گھروں کو جانے کے لیے ترس رہے تھے چنانچہ یہ معاملہ سپاہیوں پر چھوڑ دیا گیا۔ دس ہزار نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ انہیں تنخواہیں دے دی گئیں۔ جو سپاہی ادائے خدمت میں جاں بحق ہوگئے تھے ان کے کنبوں کو تمام ٹیکسوں سے آزاد کر دیا گیا اور ایسے حقوق دیے گئے کہ وہ اپنا گزارہ بخوبی کرسکیں۔ اس نے صرف ایک شرط پیش کی اور وہ یہ کہ فوجی خدمت سے الگ ہونے والے سپاہیوں کے جو بچے ایشیائی عورتوں کے بطن سے تھے، انہیں ساتھ نہ لے جائیں۔

ان سپاہیوں کو اس نے کریٹرس کی قیادت میں روانہ کر دیا۔

جو فوج سکندر کے پاس باقی رہ گئی وہ قوم کی نہیں اقوام کی فوج تھی۔ جو مقدونوی جنگجو باقی رہ گئے تھے، وہ محض اپنی سابقہ عظمت کا سایہ تھے۔

☆☆☆

زیریں پنجاب اور سندھ میں سکندر کا واجبی سا تسلط تھا لیکن اس کی واپسی کے ساتھ ہی دوپہر کے سائے کی طرح دیواروں سے اتر کر بابل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

مختلف چھاؤنیوں اور پڑاؤ میں جو دستے اس نے چھوڑے تھے انہیں لوگوں نے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ پورا شمال مغربی علاقہ اور پورا پنجاب غیر ملکیوں کے خلاف نفرت کی آگ دلوں میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کا اظہار اسی طرح ہوسکتا تھا۔ دو مقامی سپوتوں چانکیہ اور چندر گپت موریہ کی سربراہی میں یہ تحریک ایسی منظم ہوئی کہ یونانی اثر رسوخ کا خاتمہ ہوکر رہ گیا۔

راجا پورس نندوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مخاصمت رکھتا تھا۔ جب سکندر یہاں تھا تو اسی نے سکندر کو ترغیب دی تھی کہ دریائے گنگا کے میدانی علاقے پر چڑھائی کریں لیکن فوجیوں کی ہچکچاہٹ نے سکندر کو ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ اب جو چندر گپت نے راجا پورس سے رابطہ کیا اور اسے باور کرایا کہ اس کی حمایت کے بغیر ہماری تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی تو اس نے ہامی بھر لی۔ اس باقاعدہ فوج کے علاوہ یونانی، ایرانی، بکتری اور پہاڑی منگول بھی شامل ہوگئے۔

اس کثیر القومی فوج کی قیادت چانکیہ کی راہنمائی میں پورس اور چندر گپت کر رہے تھے۔

اس طاقتور فوج نے ریاست پتالی پتر پر حملہ آور ہوکر نندوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

حملے کی شرط یہ تھی کہ فتح کی صورت میں نندوں کی سلطنت آدھی آدھی تقسیم کرلی جائے گی لیکن فتح حاصل ہوتے ہی چالاک چانکیہ کے دل میں بے ایمانی آگئی۔ وہ راجا پورس ہی سے نہیں چندر گپت کی طرف سے بھی خائف تھا لیکن محسوس کررہا تھا کہ چندر گپت کی بہ نسبت راجا پورس زیادہ طاقتور ہے۔ ممکن ہے وہ کسی روز چندر گپت ہی کا پتا صاف کردے۔ وہ پورس کو راستے سے ہٹانے کے لیے حکمت عملی پر غور کرنے لگا۔ سازشوں کے ایسے جال بنے کہ مگدھ کی فتح کا جشن مناتے ہوئے راجا پورس کی زندگی کا چراغ گل کردیا گیا۔

چندر گپت بلا شرکت غیرے وسیع علاقے کا حکمران بن گیا۔

مگدھ کی مہم میں راجا پورس کا بیٹا ملایا کتو بھی شریک تھا۔ چانکیہ اور چندر گپت کی شہ پر جب پورس کو قتل کردیا تو وہ اپنی فوج کے ساتھ جنگلوں میں نکل گیا اور اس کوشش میں لگا رہا کہ پنجاب کے کسی راجا کی ہم نشینی حاصل کرکے اپنے باپ کا بدلہ لے سکے۔

چانکیہ ہاتھ ملتا رہ گیا کیونکہ اس کی اگلی حکمت عملی اسے بھی راستے سے ہٹا دینے کی تھی کہ کہیں وہ اپنے باپ کا وارث بن کر طے پانے والے معاہدے کے تحت سلطنت کی تقسیم کا مطالبہ نہ کردے اور اپنا حق مانگے۔ اس نے اس کی تلاش میں جنگل چھان مارے مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔

ملایا کتو برے حالوں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔ کبھی پنجاب کی طرف نکل جاتا کبھی واپس اپنے علاقے میں آجاتا۔ رفتہ رفتہ اس کی فوج بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

جب کوئی صورت نظر نہ آئی، کوئی مددگار نہ ملا تو نندوں کے وزیر رقا ساسا کے پاس پہنچ گیا۔ نندوں کے خلاف اس نے اپنے باپ پورس کے ساتھ لڑائی میں حصہ لیا تھا لیکن اب اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ رقا ساسا نے بھی ''دشمن کا دشمن دوست'' پر عمل کرتے ہوئے اسے پناہ دے دی۔ بچی کھچی فوج بھی اس کے ہمراہ تھی۔

چانکیہ کو جب معلوم ہوا کہ ملایا کتو اس کے دشمن کے پاس پہنچ گیا ہے تو سخت پریشان ہوا۔ اس نے فوراً چندر گپت سے ملاقات کی اور اسے منڈلاتے ہوئے خطرے کا احساس دلایا۔ چندر گپت ذرا بھی خائف نہ ہوا۔

''نندوں کو ہم ایک مرتبہ پہلے بھی سبق سکھا چکے ہیں۔ اب تو وہ ہمارے نوکروں کی طرح ہماری عمل داری میں ہیں۔ ہم ان پر پھر حملہ آور ہوں گے اور ان سے حکومت کا حق بھی چھین لیں گے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

''تو کیا ہم ملایا کتو کو ان کے پاس رہنے دیں تاکہ وہ اپنی قوت بڑھا کر کسی بھی وقت ہمارے مقابلے پر آجائے۔''

''ایک راستہ اور بھی تو ہے۔'' چانکیہ نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ ہم ملایا کتو کی حوالگی کا مطالبہ کریں۔ اگر وہ اسے ہمارے حوالے نہیں کرتے تو ہمارے تیران کے غرور کے سر میں سوراخ کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔''

وزیر رقا ساسا اس پیغام کو سن کر ڈر گیا اور ملایا کتو کو حوالے کرنے پر رضامندی ظاہر کردی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس پیغام کی بھنک ملایا کتو کے کانوں تک پہنچ گئی تو وہ یہاں سے بھی فرار ہوجائے گا۔ اس نے اس مکان کے سامنے سخت پہرا لگا دیا جہاں اسے ٹھہرایا گیا تھا۔ ملایا کتو ان انتظامات کو دیکھ کر چوکنا ہوگیا۔ اس نے چاہا کہ اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو اور رقا ساسا سے ملے لیکن پہرے داروں نے اسے باہر نہیں نکلنے دیا۔ اب اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کیا اسے قید کرلیا گیا ہے؟ لیکن رات کے وقت اس کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی جب اسے رقا ساسا نے اپنی رہائش گاہ پر طلب کیا۔

''کیا میں یہ سمجھوں کہ مجھے قید کرلیا گیا ہے؟'' ملایا کتو نے پوچھا۔

''یہ تم نے کیسے جان لیا۔''

''میرے مکان پر پہرے دار مقرر کردیے گئے ہیں۔''

''یہ انتظام تو تمہاری حفاظت کے لیے کیا گیا ہے؟''

''میں اپنی حفاظت خود کرسکتا ہوں اور یہ خیال آپ کو پہلے کیوں نہیں آیا؟''

''اس لیے خیال نہیں آیا کہ اس سے پہلے چندر گپت نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔''

''چندر گپت نے......'' ملایا کتو نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا اس سے تمہاری صلح ہوگئی؟ اس نے نندوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور وہ تم سے رابطہ کررہا ہے۔''

''اس صلح کا سبب تم بنے ہو۔ مجھے تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے۔''

''میں؟''

''ہاں تم۔''

''وہ کس طرح؟''

''اس نے اس شرط پر مجھ سے ہاتھ ملایا کہ میں تمہیں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس کے حوالے کر دوں۔''

''آپ نے کیا جواب دیا؟''

''میں مجبور ہوں۔''

''لیکن میں مجبور نہیں ہوں۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر سپاہیوں نے اسے دوبارہ بٹھادیا۔ اسے اب معلوم ہوا کہ وہ قید ہو چکا ہے۔

''میں گھر جا کر اپنی بیویوں کو تو بتادوں۔''

''جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی یہاں آچکی ہیں۔''

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''تمہیں چندر گپت کے پاس بھیجنے کی تیاری۔''

''آپ مجھے اس کے حوالے کر رہے ہیں جو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''میں نے تمہاری جاں بخشی کے لیے عہد لے لیا ہے۔ اس کے باوجود کہ تمہارے باپ نے چندر گپت کے ساتھ مل کر ہماری ریاست کے تنکے بکھیرے تھے۔ تم بھی شریک تھے۔ تم لوگوں کی وجہ سے ہم خود مختار نہیں رہے۔''

اس گفتگو کے بعد رقاساسا نے زیادہ بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اٹھ کر چلا گیا۔ محافظوں نے ملایا کتو سے ہتھیار رکھوالیے اور اسے رسیوں سے جکڑ دیا۔

یہ رات اس نے اسی حالت میں گزاری اور صبح ہوتے ہی اسے چندر گپت کے پاس روانہ کر دیا گیا البتہ اس کی فوج کو آئندہ احکامات تک کے لیے روک لیا گیا۔

ملایا کتو چندر گپت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ابتدائی گفتگو میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اسے قتل کر دیا جائے گا لیکن یہ شاید اس لیے تھا کہ وہ خوفزدہ ہو جائے اور پھر اس سے ہر شرط منوالی جائے۔

''تمہارا قصور ایسا ہے کہ تمہیں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔''

''میں تمہارے اختیار میں ہوں۔''

گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ چانکیہ نے منصوبے کے مطابق دخل دیا اور ملایا کتو سے مخاطب ہوا۔

''تم اگر یہ شرط مان لو کہ طے پانے والے معاہدے کے تحت سلطنت کی تقسیم کا مطالبہ نہیں کرو گے تو میں چندر گپت سے تمہاری جاں بخشی کی سفارش کر سکتا ہوں۔''

ملایا کتو کی کیا مجال تھی کہ اس شرط سے انکار کرتا۔ وہ جاں بخشی کے عوض اس تقسیم سے دست بردار ہو گیا۔ چانکیہ اپنی حکمت عملی میں کامیاب ہو چکا تھا۔ چندر گپت نے نہ صرف اس کی جان بخش دی بلکہ اسے پنجاب کی حکمرانی پر بھی بحال کر دیا۔

ملایا کتو اپنے ساتھیوں سمیت پنجاب چلا گیا۔

ادھر پورس کی موت کے بعد اس کے خاندان کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ دوسری جانب سکندر کا حال بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس کے زیر نگیں بہت سی قوتیں آچکی تھیں لیکن خود اس کی اپنی قوم اس کے قابو سے باہر تھی۔

مصر حسب معمول نئے فرعون کے ماتحت پُرسکون حالت میں تھا۔ مجوسیوں نے سکندر کو سابق ایرانیوں کا سچا وارث تسلیم کر لیا تھا۔ ہیکل پروشلم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا نے اسے کوروش (بانی ایران) کی طرح اپنا محافظ بنانے کے لیے التجا کی تھی۔ بابل کے پروہت اپنے دیوتا مردوج کے مندر از سرِنو بنا رہے تھے اور سکندر کی مراجعت کا انتظار کر رہے تھے۔ یونانی شہروں سے قاصد اور سفیر چلے آرہے تھے۔ وہ سکندر کے پاس آتے ہی اسے ہار پہناتے اور دیوتا کی طرح اس کا احترام کرتے۔ اس کے جواب میں وہ عموماً اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا اور خاموشی سے ان کی باتیں سنتا۔ اس نے ارسطو سے خط کتابت بھی ترک کر دی تھی۔

وہ بابل میں دربار منعقد کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اس کی تنہائی پسندی کو ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کے سامنے درخواست گزاروں کی قطاریں لگی رہیں۔ اسے بابل کے پہاڑ تک پسند نہیں تھے۔ اب اسے سمندر کی چھان بین کے سوا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس نے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں دیکھ لی تھیں جو زمین کی آخری بڑی فصیل تھی۔ وہ عقابوں کی پرواز دیکھ چکا تھا۔ اس کے قدم مکران کے ریگزار کی پیمائش کر چکے تھے۔

پہلے پورس کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ اب اس کا دوست ہیفائشن رخصت ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی کوئی ذاتی چیز چھن گئی ہو۔

یونان سے نقل وطن کر کے آنے والوں میں ایک خوش فکر فنکار بھی تھا جس کا نام کریٹیزا تھا۔ اس نے سکندر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی یادگار کا ایک عجیب نقشہ بنا رکھا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کے سامنے اہرام مصر بھی بے حقیقت رہ جائے گا۔ اس نے کہا تھا میں چٹان کو کاٹ کر سکندر کا مجسمہ تیار کروں گا۔ دس ہزار باشندوں کا شہر اس کے بائیں جانب ہوگا اور دریا اس کے دائیں جانب سے بہتا ہوا سمندر میں گرے گا۔ یہ مجسمہ رہتی دنیا تک قائم رہے گا لیکن سکندر ایسی باتیں سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ اس نے یہ باتیں ایک کان سے سنیں اور دوسرے کان سے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نکال دیں اور ایکتبانہ سے یہ کہہ کر نکلا کہ ایک مہم پر جارہا ہوں۔ اس نے بطلیموس کو ساتھ لے لیا۔ اس لیے بھی کہ اس کے پرانے دوستوں میں وہی رہ گیا تھا اور اس لیے بھی کہ وہ جغرافیہ داں تھا۔

اس کا یہ سفر جنوب کی طرف تھا۔

اس نے اس سفر کے لیے نہایت کٹھن پہاڑی راستہ اختیار کیا۔ اس راستے کی مشکلات کو دیکھ کر لوگوں نے اس راستے کو چھوڑ دیا تھا لیکن سکندر اس راستے پر چلتا رہا۔ جگہ جگہ برف پوش چوٹیاں اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اشوری بادشاہوں نے پہرے داری کے لیے جابجا برج بنا رکھے تھے۔

جب اسے خبر ملی کہ نیارکس بابل پہنچ گیا ہے تو وہ بھی پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان میں اتر پڑا۔ لوگ اس کے سلام کے لیے ہجوم کی شکل میں جابجا جمع تھے۔ اسی راستے میں اسے پروہتوں کا ایک گروہ ملا۔ ایک پروہت نے آگے بڑھ کر اسے نصیحت کی۔

''خداوند! باب بابل سے اندر نہ جائیے۔ اگر آپ دوبارہ اندر جائیں گے تو آپ پر آفت نازل ہوگی۔''

''پیش گوئی ایک قیاس کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔''

ساتھیوں نے کہا بھی کہ اس انتباہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کو تقدیر کے متعلق بہتر علم ہے لیکن سکندر کی طبیعت میں ضد تھی۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس کی رائے اور ضد کو دیکھتے ہوئے کچھ لوگوں نے پروہتوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

''یہ پروہت مردوج کے مندر دوبارہ بن جانے کے باعث بے حد دولت مند ہو گئے ہیں اور نہیں چاہتے کہ آپ شہر میں پہنچیں اور ان حسابات کی جانچ پڑتال کریں۔''

یہ بات سکندر کے دل کو لگی۔

''میں تو بابل کو اپنی وسیع مملکت بنانا چاہتا ہوں اور یہ لوگ مجھے شہر میں داخل ہونے سے روک رہے ہیں جبکہ نیارکس وہاں میرا منتظر ہے۔ یہ لوگ مجھے کسی نادیدہ آفت سے ڈرا رہے ہیں جبکہ میں تو زندگی بھر ان آفتوں سے ہی لڑتا رہا ہوں۔''

اس نے پروہتوں کی بات نہ مانی اور بابل میں داخل ہو گیا۔ استقبالی ہجوم سے کتراتا ہوا وہ شاہی محل کی چھت پر چلا گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جب بازاروں میں مشعلیں روشن ہو گئیں اور محل کی چھت سے یہ معلوم ہونے لگا جیسے لاکھوں جگنو ایک ساتھ جگمگانے لگے ہوں۔ وہ کچھ دیر اس منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر اس نے امیر البحر نیارکس کو بلا بھیجا۔ اس سے سفر کے حالات اور سمندر کے اسرار کے بارے میں پوچھتا رہا۔ پھر عرب میں مہم بھیجنے کی اسکیم پر تبادلہ خیال کرتا رہا پھر سکندر کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''آرکیاس بھی واپس آ گیا ہے۔ اس نے مغربی ساحل کو ایک جزیرے تک دیکھ لیا ہے اور جیسا کہ تمہارا خیال ہے سمندر نے وہاں خلیج کی سی صورت اختیار کر لی ہے۔ میں نے اس جزیرے کا نام اکاروس رکھا ہے۔''

نیارکس نے بھی اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''ہیرون تو ساحل کے ساتھ خلیج کے اندر تک چلا گیا تھا۔ پھر لوٹا اور کنارے سے جہاز لگا تو اس نے دیکھا کہ ہر طرف صحرا ہی صحرا ہے۔''

''وہ لوٹ کیوں آیا؟'' سکندر نے کہا۔

''آگے جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔''

''کوئی شخص محض ڈر کے مارے بھی لوٹ کر آ سکتا ہے۔'' سکندر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہیرون نے بتایا کہ عرب کی سرزمین ہندوستان جتنی بڑی تو ضرور ہوگی۔'' نیارکس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

''شاباش! یہ تو تم اچھی خبر لائے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا ہے کہ عرب کے اردگرد چکر ضرور لگے گا۔ میں خود ایک مہم خشکی کے راستے لے جاؤں گا۔ تم ساحل کے ساتھ ساتھ جہاز لے کر چلو گے۔ اس طرح ہم دونوں سرزمین نیل میں پہنچ جائیں گے اور صحراؤں کے جنوب میں جن اسرار سے اب تک پردہ نہیں ہٹا، انہیں بے پردہ کر کے رہیں گے۔''

اس مہم پر روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جہاز سازی شروع ہو گئی۔

وہ خود ایک نئے جہاز پر سوار ہو کر امتحان کی غرض سے دریا کی جنوبی سمت میں گیا۔ اس طرح وہ نہروں کا نظام بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

دیکھ بھال کے اس سفر کے بعد وہ دوبارہ بابل میں داخل ہو گیا۔

''نیارکس! تمہیں معلوم ہے جب میں بابل میں داخل ہو رہا تھا تو مردوج دیوتا کے پروہتوں نے مجھے بابل میں داخل ہونے سے روکا تھا اور یہ کہہ کر ڈرانا چاہا تھا کہ اگر میں بابل میں داخل ہوا تو مجھ پر آفات نازل ہوں گی لیکن اب تم خود دیکھ لو کہ مجھ پر کامیابی کے نئے دروازے کھل رہے ہیں۔ اب میں ان منزلوں تک جاؤں گا جہاں کوئی نہیں گیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تاریخ مجھے سکندرِ اعظم کے نام سے یاد رکھے گی۔ بس اب تم تیاری کرو۔ جہاز تیار ہو چکے ہیں۔ برستاس اور سلیوکس کا انتظار ہے۔ اس کے بعد ہم روانہ ہو جائیں گے۔ مروجہ دیوتا کے پروہتوں کا مذاق اڑاتے ہوئے۔"

☆☆☆

برستاس نئی فوج لے کر ایران سے آ گیا تھا۔ سلیوکس اپنے ساتھ ہاتھیوں کی ایک قطار لایا تھا۔ اس رات سکندر صبح تک شراب پیتا رہا لیکن ایک نادیدہ بے چینی تھی کہ اسے سونے نہیں دیتی تھی۔ صبح تک جاگتا رہا۔ کچھ دنوں سے اس پر بے خوابی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ جب اسے نیند نہیں آتی تھی تو وہ صبح کی قربانی کے بعد دریا پر پہنچ جاتا تھا اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر چلا جاتا تھا۔ دوسرے کنارے پر حوض کے پاس شامیانہ لگا ہوا تھا۔ وہاں لیٹ جاتا اور دن کی گرمی سے محفوظ ہو جاتا۔ کبھی کبھی وہ یہاں اپنی نیند بھی پوری کر لیتا لیکن آج جب اس شامیانے میں جا کر لیٹا تو اسے اچانک محسوس ہوا کہ اسے بخار ہو گیا ہے۔ اس نے دوبارہ غسل کیا اور پھر سونے کی کوشش کی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ بخار تیز سے تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اسی حالت میں دریا پار کیا اور محل میں چلا آیا۔ اس نے نیارکس کو بلایا۔

"جہاز تیسرے دن روانہ ہو جانا چاہیے۔"

"آپ کو بخار ہے۔"

"پرسوں تک یہ بخار اتر جائے گا۔"

"جو حکم آپ کا۔ میں تیاری رکھوں گا۔"

اگلے دن قربانی کے وقت اس کے بخار میں مزید تیزی آ گئی۔ وہ نیم مدہوشی کے عالم میں تھا لیکن اس وقت بھی افسروں سے مسلسل باتیں کر رہا تھا۔

"کل ہمیں روانہ ہونا ہے۔ ہر چیز تیار رکھی جائے۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میری طبیعت کو بہانہ مت بناؤ۔ ہمیں ہر حالت میں کل روانہ ہونا ہے۔"

اس کی قوتِ ارادی کہہ رہی تھی کہ وہ کل تک ضرور ٹھیک ہو جائے گا اور عظیم سلطنت کا جو خواب وہ دیکھ رہا ہے، اسے ضرور پورا کرے گا۔

وہ رات بھی بخار میں جلتے ہوئے گزر گئی۔ علاج ہو رہا تھا لیکن بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ صبح جب قربانی کا وقت آیا تو وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اسے قربانی کے لیے پالکی میں بٹھا کر لایا گیا۔

پالکی دروازے پر کھڑی تھی۔ جرنیل اور دیوانی کے افسر جب اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ انہیں پہچان تو رہا تھا لیکن بول نہ سکتا تھا۔ بڑے دکھ کے ساتھ اسے آوازیں دی گئیں لیکن وہ خاموش تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہا ہو۔

یہ خبر باہر پہنچی اور سپاہیوں کو خبر ہوئی تو انہیں خیال ہوا کہ شاید وہ مر گیا ہے اور اس حقیقت کو چھپایا جا رہا ہے۔

دریائے دجلہ کے کنارے بخت نصر کے محل کی دیواریں خاموش تھیں کہ اچانک شور و غل سے بھر گئیں۔ بعض سپاہی روتے ہوئے اس کے محل میں پہنچ گئے اور زبردستی اس کے کمرے میں گھس گئے۔ ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزرے۔ وہ اب بھی بول نہ سکتا تھا البتہ اپنے دائیں ہاتھ سے ان کے سلام کا جواب دیتا تھا اور... بہ مشکل اپنا سر اٹھاتا تھا۔ سپاہیوں کو اطمینان ہوا کہ وہ زندہ ہے لیکن یہ خوشی عارضی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ عالمِ بقا کو سدھار گیا۔ اس کی عمر صرف بتیس سال آٹھ ماہ تھی۔

☆☆☆

پورس کے مرنے کے بعد اس کے خاندان نے انتشار کا منہ دیکھا تھا۔ اس کا خاندان تنکا تنکا ہو کر بکھر گیا تھا۔ یہی حال سکندر کی موت کے بعد اس کے خاندان اور اس کی سلطنت کا ہوا۔ اس نے جس سلطنت کا خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ادھوری رہ گئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے جو کام اپنے ذمے لیا تھا وہ انسانی طاقت سے باہر تھا۔

اس کی سلطنت کے خلاف پہلا ردِعمل خود اس کے وطن مقدونیہ میں ہوا۔ یہ ہونا ہی تھا کیونکہ فتوحات کی مصروفیات میں اس نے مقدونیہ پر بہت کم توجہ دی تھی۔

اینٹی پیٹر نام کا ایک افسر یونان کا نظام چلا رہا تھا۔ اس نے سکندر کی موت کی خبر سنتے ہی فوجی قوت سے کام لے کر پورے یونان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ماتحت اور سکندر کے طرفدار ڈیماستھینز نے یونان کی آزادی بچانے کے لیے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور جان بچا کر بھاگ گیا۔ وہ ایک جزیرے آئی جینا کے ایک مندر میں پناہ گزیں ہو گیا۔ مقدونیہ کے طلایہ گردوں نے بالآخر اسے تلاش کر لیا۔ فوجی دستے وہاں پہنچے۔ اس نے مزاحمت کی اور قید ہونے کے بجائے خودکشی کر لی۔

ارسطو پر لامذہبی کا الزام لگا اور وہ وطن چھوڑ کر ایک صوبے چیلس چلا گیا جہاں ایک سال بعد اس کی وفات ہو گئی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس دور کی تین زبردست ہستیاں سکندر، ڈیما ستھیز اور ارسطو ختم ہو گئیں۔

مقدونیہ کی تقریباً نصف آبادی مشرق کی طرف جا چکی تھی یا قتل ہو چکی تھی۔ جاگیر دار امراء کی تعداد خاصی گھٹ گئی تھی۔ کسانوں میں شعور پیدا ہو چکا تھا اور انہوں نے شاہی خاندان کی غلامی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

سکندر کی جانشینی کے جھگڑوں نے سر اٹھایا۔ جس کے جو ہاتھ لگا لے اڑا۔ حالانکہ اس نے جانشینوں کے لیے واضح نقشہ چھوڑا تھا۔ وہ صرف سکندر کی مثال سامنے رکھ سکتے تھے لیکن یہ کام ان سے نہ ہو سکا۔ بطلیموس نے یہ پسند کیا کہ اسے مصر کا گورنر بنا دیا جائے۔ وہ جاتے جاتے سکندر کا تابوت بھی مصر لے گیا اور اس طرح اپنا اقتدار بڑھا لیا۔ مناسب تو یہ تھا کہ یہ تابوت مقدونیہ بھیجا جاتا لیکن وہ مصر پہنچ گیا۔

سلیوکس نے ان تمام علاقوں کا انتظام سنبھال لیا جو بابل کے مشرق میں تھے اور انہی کو دراصل مشرقی علاقے سمجھنا چاہیے لیکن وہ ان علاقوں کو جو انتہائے مشرق میں واقع تھے، یکجا نہ رکھ سکا۔ وہاں بغاوت ہو گئی۔

ہندوستان کے مفتوحہ علاقے چندر گپت کو دے کر ہاتھیوں کی قطار لے لی۔ سکندر کی محنت کوڑیوں کے دام فروخت کر دی۔

رفتہ رفتہ یہ جانشین الگ الگ ریاستوں کے مالک بن گئے۔ صرف یونانی ثقافت تھی جو ایک دوسرے کو جوڑے ہوئے تھی۔

سکندر نے مقدونیہ اور ایران کی تہذیب کو ملانے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش نے غیر محسوس طریقے پر یونانی وایشیائی معاشرے کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہی معاشرہ پھر یونانی دنیا کے نام سے مشہور ہوا۔ جن امراء کو مقدونیہ کے شاہی دربار میں مصاحبوں کا درجہ حاصل تھا، وہ نئی سلطنت میں بکھرے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ قوی ہوتے گئے لیکن اصل تفرقہ اس خانہ جنگی سے پیدا ہوا جو مقدونیہ سے شروع ہوئی۔

سکندر نے اپنی زندگی میں یونان کا نظم و نسق اینٹی پیٹر سے چھین لیا تھا۔ اس کے بیٹے کیسنڈر نے سکندر سے احتجاج بھی کیا تھا۔ سکندر زندہ تھا لہٰذا وہ ڈر کر چپ ہو گیا تھا لیکن اب سکندر زندہ نہیں تھا۔ اس نے سکندر کے خاندان کی تباہی کا کام شروع کر دیا۔ مقدونیہ میں سکندر کے مخالفوں کی عملداری ہو گئی تھی۔ اینٹی پیٹر بھی یونان واپس آ گیا تھا لہٰذا دونوں نے مل کر سکندر کی ماں اولمپیاس، بیوی روشنک اور بارہ سالہ بیٹے کو گرفتار کر لیا اور ایک تہ خانے میں لے جا کر بند کر دیا۔

اسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ انہیں کسی وقت بھی قید سے نجات مل سکتی ہے لہٰذا اس نے سوچا کہ یہ خدشہ ہی ختم کر دیا جائے اور انہیں قتل کرا دیا جائے لیکن سپاہیوں میں سے کوئی بھی ان تینوں پر تلوار اٹھانے کو تیار نہ ہوا۔

''ہم اس شخص کے اہل خانہ پر تلوار نہیں اٹھا سکتے جسے ہم دیوتا سمجھتے ہیں۔''

اس صاف جواب کے بعد اس نے سکندر کی ماں، بیوی اور بیٹے کے ہاتھ پاؤں باندھے اور انہیں ڈبو کر مار ڈالا۔

رفتہ رفتہ خانہ جنگی کے باعث سکندر کی عالمگیر سلطنت چار حصوں میں بٹ گئی۔ مقدونیہ اور ایشیائے کوچک، اینٹی گونس نے سنبھال لیے۔ مصر میں بطلیموس قابض ہو گیا۔ شام سے ہندوکش تک کا علاقہ سلیوکس کے قبضے میں آ گیا۔ سرحدی علاقوں کے متعلق یہ آپس میں لڑتے رہے، آرمینیا نے آزادی حاصل کر لی۔ یہودیوں نے فلسطین میں ایک آزاد حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ ان سب کے درمیان صرف ایک رشتہ ثقافت کا تھا۔

☆☆☆

سکندر کے بعد ہندوستان میں ایک متحدہ سلطنت ظہور پذیر ہوئی۔ پورس کے حریف چندر گپت نے مقدونیوں کی واپسی کے بعد افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شمالی ہند کے باشندوں کو پہلی مرتبہ متحد کر دیا۔ اس طرح بعد میں آنے والے ''اشوک'' کی حکمرانی کا راستہ صاف ہو گیا۔ یہ عجیب سلطنت تھی جس پر بدھ مت کا پیرو اشوک فوجی قوت کے بل پر نہیں بلکہ انسانیت دوست تدابیر سے حکمرانی کرتا رہا۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جن کروڑوں انسانوں کے دل میں سکندر کی یاد تازہ تھی، وہ اس کے لیے کوئی واضح لقب تجویز نہ کر سکے۔ اس کی موت کے بعد ایک صدی کے قریب زمانہ گزر گیا تو اسے سکندر اعظم کہا جانے لگا۔

☆☆☆

ہر بڑی شخصیت کی سوانح افسانوی داستانوں کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی زندگی محیرالعقول واقعات سے بھر دی جاتی ہے۔ اس میں زیادہ تر ہاتھ اس شخصیت کے عقیدت مندوں کا ہوتا ہے۔ سکندر بھی دیوتا کی شکل اختیار کر گیا تھا لہٰذا اس کی زندگی داستانوں کی نذر کر دی گئی۔ صدیاں گزر جانے کے بعد اس کی زندگی میں انوکھے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

واقعات شامل کردیے گئے اور ان پر یقین بھی کیا جانے لگا حتیٰ کہ اس کی پیدائش اور وطن کے بارے میں بھی داستانیں گھڑلی گئیں۔ مصریوں نے سکندر پر اپنا حق جتانے کے لیے یہ داستان گھڑلی کہ وہ مصر کے آخری فرعون نکطائی بوس کی ناجائز اولاد تھا۔

مصریوں کے مطابق آخری فرعونِ مصر نکطائی بوس حکمران ہونے کے علاوہ اونچے درجے کا ساحر بھی تھا۔ وہ ستارہ شناس کے بھیس میں سکندر کی والدہ اولمپیاس کے پاس پہنچا اور اسے اس بات پر رضامند کرلیا کہ خود زیوس دیوتا ایک اژدہے کی شکل اختیار کرکے اس سے تمتع حاصل کرے گا۔ اولمپیاس کی رضامندی کے بعد نکطائی بوس نے دوسرا بھیس بدلا اور اژدہا بن گیا۔ اس طرح سکندر پیدا ہوا۔ اگرچہ اس کا قد چھوٹا تھا اور کسی حد تک لنگڑاتا بھی تھا لیکن اس کی شجاعت و مردانگی اور فہم و ذکاوت کی حد نہیں تھی۔

ایرانیوں نے بھی ایک افسانہ تیار کرلیا اور اسے ایرانی ظاہر کیا۔ اس افسانے کا خلاصہ یہ ہے کہ سکندر کورش کے شاہی خاندان کے آخری فرد ہخامنشی کا جائز بیٹا تھا نہ کہ فیلقوس کا جو اس کے باپ کے طور پر مشہور ہوگیا۔ اس نے ایرانیوں کی بہت سی کتابیں چرالیں اور ان کے ترجمے کیے لیکن موبدوں کی شہادت یہ تھی کہ شاہی عظمت اسی کے لیے مخصوص ہوئی۔ اس کہانی میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہا گیا کہ سکندر نے معجزے دکھائے۔ ایرانیوں نے اس افسانے کا نام سکندر نامہ رکھا اور اسے وقت آنے پر فردوسی کے شاہ نامے میں بھی جگہ مل گئی۔

عربوں نے اسے سکندر ذوالقرنین قرار دیا یعنی دو سینگوں والا سکندر۔ اس نے کافر قوموں کے عجیب و غریب اور مخالف دیوتاؤں کی مورتیاں توڑیں۔

صلیبی جنگجوؤں نے ان افسانوں کو یہ شکل دی کہ سکندر ایک بہادر مسیحی سردار تھا جو صلیبیوں سے پیشتر ابتدائی دور میں مشرق پہنچا اور بہت دور آگے بڑھ گیا تھا جہاں تک صلیبی نہ پہنچ سکے۔ اس نے زمین بند سمندر کو عبور کرنے کے لیے جہاز بنائے اور یاجوج ماجوج کا داخلہ بند کرنے کے لیے پیتل یا لوہے کا دروازہ بنوایا تاکہ یہ وحشی قبیلے مشرقی سمت ہی میں بند رہیں۔ اسے آبِ حیات بھی مل گیا تھا۔ بہت سے سیاح جنھوں نے یہ کہانی سن رکھی تھی اپنے ساتھ نمک لگا کر خشک کی ہوئی مچھلی لے جاتے اور اسے راستے میں ندیوں اور چشموں کے پانی میں دھوتے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو پانی اس مچھلی کو زندہ کردے گا..... وہی آبِ حیات ہوگا۔

جب ان افسانوں پر مبنی کتابیں چھپیں تو سکندر کا رومان تمام قوموں میں سب سے زیادہ فروخت ہوا۔

غرض رفتہ رفتہ سکندر کی یہ شکل بن گئی کہ اس کا کوئی وطن نہ تھا۔ اس نے زبردست سفر کیے اور ان خطرات کا مقابلہ کیا جن کا عام طور پر کسی کو علم نہ تھا۔ اس نے مشرق کے آخری راز معلوم کرلیے۔

یہ افسانے اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام انسانوں کی طرح ایک عام انسان تھا۔ اس کا باپ فیلقوس یونان کی ایک چھوٹی سی ریاست ''پیلا'' کا حکمراں تھا۔ سکندر کی تعلیم و تربیت بھی شہزادوں کی طرح ہوئی۔ مختلف اتالیق مقرر تھے جو اسے یونانی زبان اور خطابت و منطق کی مشق کراتے تھے۔ ان اتالیقوں نے دن بھر کے اوقات باہم تقسیم کر رکھے تھے۔ صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے اسے اٹھا دیا جاتا۔ پہلے ایک غلام کے ساتھ دوڑنا پڑتا پھر ناشتا نصیب ہوتا۔ یہ دوڑ ایک ہزار قدم کی ہوتی تھی جو قبرستان پہنچ کر ختم ہوتی۔ دوڑ بھی ایک خاص قسم کی تھی جس میں گھٹنے جھکے رہتے۔ دوڑ کیا تھی چھلانگیں مارتے ہوئے چلنا پڑتا تھا۔ قبرستان کے سامنے سنگِ مرمر کی تختی پر جلی حروف میں یہ الفاظ کندہ نظر آتے۔

''میں اب لافانی دیوتا بن چکا ہوں۔ اب میرے لیے فنا نہیں۔''

یہ الفاظ کہیں اسے یہ ذہن نشین کرانے کے لیے تو نہیں تھے کہ اسے بھی ایک دن دیوتاؤں جیسا بننا ہے۔

دوڑ کے بعد جب وہ محل میں پہنچتا تو سیدھا قربان گاہ کی آگ کے پاس چلا جاتا اور دھوئیں سے اپنے ہاتھ پاک کرتا۔ سورج مشرق میں ان بلندیوں پر اڑا چلا جاتا تھا جہاں دیوتا رہتے تھے۔ کم از کم اسے یہی بتایا گیا تھا۔ وہ آگ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے سامنے کھڑے ہوکر یہ الفاظ کہتا۔

''مقدس باپ کی تقدیس ہو۔ اس کے بیٹے کی تقدیس ہو جو سینگوں والے سانپ سے پیدا ہوا۔ دعا ہے وہ ہمارے نگراں رہیں اور ہماری حفاظت کریں۔''

لوبان اور خوشبوئیں عربستان سے آتی تھیں جو بہت دور تھا۔ ان خوشبوؤں کے حوالے سے وہ عربستان کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔

اسے ایک دن تخت پر بیٹھنا تھا اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ سخت کوش بنایا جارہا تھا لیکن وہ خود کتابوں میں غرق رہتا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ایک دن اس کے نگراں نے یونانی اتالیق سے کہا۔ ''سکندر کتاب کا کیڑا ہے۔ وہ قربان گاہ میں خدمت گزاری کا خواہاں معلوم ہوتا ہے اور حقائق سے دور بھاگتا ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنے باپ کی طرح مردِ میدان نہیں بن سکتا۔''

اسے اس کے بڑے اپنی دانست میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ہتھیار چلانے کی مشق بھی کرایا کرتے تھے۔ اسے رفتہ رفتہ اتنی مشق ہوگئی کہ اس کا اتالیق یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

''اس میں غیر معمولی تیزی ہے اور وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے۔'' اسے پانی سے ڈر لگتا تھا۔ محل کے نوکر چاکر کہا کرتے تھے کہ پانی سکندر کے لیے ہمیشہ خطرناک رہے گا۔ غالباً اسی خوف کو دور کرنے کے لیے اس نے اپنی آدھی زندگی سمندر میں گزاری۔

اسے اپنے باپ کے شہر ''پیلا'' سے نہ جانے کیوں نفرت تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کا باپ اسے وہاں سے باہر نہیں جانے دیتا تھا۔ اسے یہ شہر قید خانہ معلوم ہونے لگا تھا۔ شاید اسی لیے جب وہ یہاں سے نکلا تو کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔

وہ ایک روز پیلا کی شاہراہِ اعظم پر کھڑا تھا کہ مشرق کے آدمیوں کا جلوس وہاں سے گزرا۔ ان کے چمکیلے ارغوانی چغے دھول مٹی کے باوجود دمک رہے تھے۔ سکندر نے شان و شکوہ کا ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''یہ لوگ ایشیا سے آئے ہیں۔'' اس کے دوست نے کہا۔

''کیوں آئے ہیں؟''

''تمہارے باپ سے ملنے۔ تحفے بھی خوب لائے ہوں گے۔''

''میرا باپ تو ''پیلا'' میں ہے ہی نہیں۔ پھر یہ ملیں گے کس سے؟''

''تمہاری ماں سے مل لیں گے۔ وہ بھی تو ملکہ ہے۔''

اس کا دوست اسے معلومات فراہم کررہا تھا اور اس کی نظریں گھوڑوں پر جمی ہوئی تھیں۔ بعض گھوڑے قد و قامت میں اتنے بلند تھے کہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بعض بڑے سبک رفتار تھے اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت سر مسلسل اوپر اٹھے رہتے تھے۔

اسے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ یہ اجنبی شہنشاہ ایشیا کے سفیر ہیں۔ یونان کے لوگ ایشیائیوں کو ایرانی کہتے تھے۔

وہ اس قافلے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا محل تک آگیا اور محل کے اندر جانے والی سیڑھیوں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نظر اب بھی گھوڑوں پر جمی ہوئی تھی۔ اتنی دیر میں ایک کنیز دوڑتی ہوئی آئی اور سکندر سے مخاطب ہوئی۔

''آپ کی والدہ ماجدہ فرما رہی ہیں کہ آپ ان سفیروں کا استقبال کریں اور ان کے قیام کا بندوبست کریں۔'' یہ حکم سنتے ہی وہ ان سفیروں کے پاس پہنچ گیا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ استقبال کے لیے کون سے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ وہ صرف اتنا کرسکا کہ ان کے لیے شراب منگوادی لیکن ان لوگوں نے شراب پینے سے انکار کردیا اور کہا، ہمیں سادہ پانی پلوادیجیے۔ دراصل وہ اس وقت اتنے معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھا کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ''پیلا'' کے حکمران فیلقوس کا بیٹا ہوگا۔ سکندر کی نظریں اب بھی ایک ایرانی گھوڑے پر جمی ہوئی تھیں جس کا قد سب سے اونچا تھا۔ پھر وہ سب کی نظریں بچا کر گھوڑے کے پیچھے چلا گیا۔ کچھ دیر اسے چمکارتا رہا اور پھر رکاب میں پاؤں رکھ دیا اور گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ سفیروں کا ایک ملازم فوراً دوڑتا ہوا آیا اور اسے گھوڑے سے اتارنے کے لیے آگے بڑھا۔ فیلقوس کے ترجمانوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مہمانوں کو اس کی اصلیت بتائی۔

''یہ شاہ مقدونیہ کا اکلوتا فرزند ہے۔''

مہمانوں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اسے بھی اب ہمت ہوئی تھی کہ مہمانوں سے سوالات کرسکے۔ سوال کیا وہ تو گھوڑوں سے متعلق تحقیق کررہا تھا۔

''آپ لوگ کتنا فاصلہ طے کرکے آئے ہیں۔ سمندر کیسے پار کیا؟ کون کون سے ملک ہیں جن کا آپ کا بادشاہ فرماں روا ہے؟'' وہ ان سوالوں کے درمیان یہ بھی بھول گیا تھا کہ انہیں قیام گاہ تک بھی پہنچانا ہے۔ مہمان بھی مجبوراً ان سیڑھیوں پر جم کر بیٹھ گئے تھے۔

''تمہیں گھوڑوں سے بہت عشق ہے؟'' مہمانوں میں سے کسی نے پوچھا۔

''بہت زیادہ۔''

''گھوڑے پر سوار کیوں نہیں ہوتے؟''

''میرا باپ مجھے پیلا سے باہر نہیں نکلنے دیتا لیکن ایک دن میں آپ کے بادشاہ سے ملنے ضرور آؤں گا۔''

''شاباش جوان۔''

ممکن ہے مہمان ابھی کچھ کہتے کہ سکندر کی ماں اولمپیاس محل کے برآمدے میں نمودار ہوئی۔ سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ سکندر بھی خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ وہ غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ ایک دن وہ ایران جائے گا اور ان گھوڑوں کو اپنے قبضے میں لائے گا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ان افسانوں کے برعکس جو اس کے بارے میں بعد میں بیان ہوئے، اس کا مشرق کی طرف جانا اس کے بچپن کی دبی ہوئی خواہشات تھیں جو وہ پوری کر رہا تھا نہ کہ وہ کوئی دیوتا یا جادوگر تھا۔

☆☆☆

سکندر کی توجہ گھڑدوڑ کے میدان کی طرف تھی اور ان گھوڑوں کو دیکھ رہا تھا جو تھسلی سے آئے تھے اور فیلقوس کے چابک سوار انہیں قدم قدم چلا کر دیکھ رہے تھے تاکہ بہترین گھوڑا چن سکیں۔ ان میں سے ایک گھوڑا بہت شوخی دکھا رہا تھا اور اس طرح اچھل کود رہا تھا گویا باگیں چھڑا کر بھاگنے کو بے تاب ہو اور کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ دولتیاں جھاڑنے لگا۔ ایک آدمی اچک کر اس پر سوار ہوا تو گھوڑا مشتعل ہو گیا اور سوار کو زمین پر گرا دیا۔ تمام لوگ اس گھوڑے کی برائی کر رہے تھے لیکن سکندر کو یہی گھوڑا پسند آیا۔ اس کے خیال میں یہی سب سے بہتر تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ چابک سواروں نے اس گھوڑے کو مسترد کر دیا تو وہ اپنے باپ کے پاس پہنچا۔

''ایسے اچھے گھوڑے کو کھو دینا باعثِ شرم ہے۔ یہ بہترین گھوڑا ہے لیکن افسوس آپ کے آدمی کو اس سے کام لینے کا شعور نہیں۔''

''تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ میرے آدمی ناکارہ ہیں..... گھوڑے کو قابو نہیں کر سکتے؟''

''جی ہاں، میں یہی کہہ رہا ہوں۔ میں اس گھوڑے کو قابو کر سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر تم نے اسے قابو کر لیا تو میں یہ گھوڑا تمہیں دے دوں گا۔'' فیلقوس نے اسے پیشکش کی۔ سکندر یہ سنتے ہی گھوڑے کی طرف دوڑا۔ باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ لوگوں سے کہا پیچھے ہٹ جائیں۔ اس نے گھوڑے کو تھپکانا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ اس کا منہ سورج کی طرف پھیر دیا اور بدستور گھوڑے کو تھپکاتا رہا اور پھر گھوڑے کو کوئی اشارہ دیے بغیر اس پر سوار ہو گیا لیکن باگیں ڈھیلی چھوڑے رکھیں۔ نہ چابک استعمال کی نہ ایڑ لگائی۔ جب وہ دوڑتا ہوا میدان میں پہنچا تو سکندر نے باگ کھینچ کر اسے دوڑ کے مقام پر پہنچا دیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ تنا رہا اور پھر باگ کے اشارے پر چلنے لگا۔ جب سکندر نے باگیں کھینچیں تو وہ قدم بہ قدم چلنے لگا۔ باپ نے خوش ہو کر وہ گھوڑا اسے انعام میں دے دیا۔

''میں چاہتا تھا کہ اسے دو ہزار گز کی دوڑ میں دوڑاؤں لیکن اب وہ تمہارا ہے۔''

☆☆☆

''یہ بہت خطرناک بچہ ہے۔ اس کے اتالیق اس کی ذہانت کے سامنے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اسے میں اس درس گاہ میں بھیجوں گا جو پیلا سے دور ایک اجڑے مندر میں قائم ہے اور اس کا نیا استاد ارسطو ہو گا جہاں اسے طب کی تعلیم ملے گی۔'' فیلقوس نے اس کی ماں سے کہا۔

''وہ اتنی دور جائے گا کیسے؟''

''اسے وہ تیز رفتار گھوڑا مل گیا ہے جس پر سوار ہو کر وہ جا سکتا ہے۔''

اس کی ماں مطمئن تو ہو گئی تھی لیکن نہیں چاہتی تھی کہ سکندر طب کی تعلیم حاصل کرے۔ اس نے اپنے جاسوسوں کو اس درسگاہ میں بھیجا اور معلومات حاصل کر لیں اور پھر سکندر کو اعتماد میں لیا۔

''اب تم اتنی عمر کو پہنچ چکے ہو جس میں انسان کے اندر نیک و بد کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔ طب کی تعلیم میں اپنا وقت ضائع نہ کرنا۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ فلسفی سیاست کے راز تم پر آشکار کر سکتا ہے۔ حکمرانی کے گر سکھا سکتا ہے۔ تم اس سے اختیار و اقتدار کے طریقے سیکھنا تاکہ اپنے باپ کی نیابت کر سکو۔''

وہ نیابت کی باتیں اس لیے کر رہی تھی کہ سکندر کے اختیارات میں اضافہ خود ملکہ کے اقتدار میں اضافہ تھا۔ پھر وہ خود بھی اس مندر میں گئی اور مشاہدہ کیا۔ کچھ دیر اکیلے میں ارسطو سے باتیں بھی کرتی رہی اور باہر آئی تو لوگوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ سکندر کے مستقبل کو ارسطو کے ہاتھوں میں محفوظ سمجھتی ہے۔

ارسطو کے پاس رہتے ہوئے اس نے ہیرو ڈوٹس کی تاریخ اور ہومر کی داستان ٹرائے پر طویل بحثیں کیں۔ سکندر نے ٹھان لیا تھا کہ پرانی مذہبی رسوم کی حقیقت معلوم کیے بغیر دم نہ لے گا جن کا وہ معتقد تھا لیکن ارسطو ان کے بارے میں کوئی لفظ زبان پر لانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نہ حق میں نہ خلاف۔ سکندر خود ہی ان حقیقتوں کی تلاش میں دن رات کام کر رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے اس جذبۂ شوق کی مدح سرا تھی اور طرح طرح سے اس کے جذبۂ شوق پر تازیانے لگا رہی تھی۔ ایک روز ڈلفی کے مندر سے لوٹی تو بہت خوش تھی۔

''لوگ کہہ رہے ہیں اہلِ مقدونیہ کتنے خوش نصیب ہیں۔ انہیں فیلقوس جیسا سپہ سالار اور سکندر جیسا بادشاہ مل گیا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ میرے بیٹے کو بادشاہ سمجھتے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہیں۔ اب تمہیں اس کا ثبوت بھی دینا ہوگا۔"

سکندر ہمیشہ ماں کی باتوں کو نظر انداز کرتا۔ اسے تو تحصیلِ علم کی دھن سوار تھی۔ اسے اب سیاسیات اور نقشۂ عالم پر پورا عبور حاصل ہوگیا تھا۔ وہ ہاتھ سے کتاب صرف اس وقت رکھتا جب مذہبی رسوم ادا کرتا یا رات کے وقت جب پہاڑیوں میں گھومنے پھرنے کے لیے نکل جاتا۔ اسے ارسطو کے طریقۂ تعلیم سے اختلاف رہنے لگا تھا۔ وہ اپنے طور پر دریافت وانکشاف کی راہ پر لگ چکا تھا۔

سکندر بھی اب تک دوسروں کی طرح یہی سمجھتا رہا تھا کہ مشرق صرف طلوعِ آفتاب کا مقام ہے لیکن اب وہ سمجھنے لگا تھا کہ اغلب ہے کہ زمین کے اس حصے میں ایسی سرزمینیں ہوں جہاں اب تک کوئی نہیں جاسکا اور پھر ان زمینوں کے بعد سمندر ہو۔

ارسطو کا حال یہ تھا کہ ارضی تصورات پر وقت ضائع کرنا بے سود سمجھتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہتا تھا کہ زمین خود ایک کرہ ہے جو کائنات کے وسط میں معلق ہے۔ اس کرّے پر ہزاروں سال میں زمین کی نمو شروع ہوئی اور زمین اب تک پھیلتی جارہی ہے۔ کرۂ ارض کا شمالی حصہ بہت سرد ہے۔ وہاں ہر وقت برف جمی رہتی ہے۔ سکندر کی توجہ قابلِ آبادی حصۂ ارض کی مشرقی سرحد پر جمی ہوئی تھی۔ مغربی حد میں جہاں سورج غروب ہوتا تھا اس کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ اس معاملے میں وہ اور ارسطو ہم مزاج تھے۔ ارسطو کو بھی مغربی سمت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

رات کے وقت ارسطو تجربات میں مشغول ہوجاتا تو سکندر مشرقی سمندر کے ملاحوں کی کہانیاں پڑھتا رہتا۔

ہیرو ڈوٹس نے مشرق میں جس شہر کو زیادہ سے زیادہ دور افتادہ قرار دیا تھا، وہ بابل تھا۔ اس نے مختلف تجربات سے یہ اطمینان کرلیا کہ بابل کے پاس بھی دو دریا بہتے ہیں، دجلہ اور فرات۔ جاننا چاہیے کہ ان کے سرچشمے کہاں ہیں۔ وہ نکلے کہاں سے ہیں؟

اس نے اتنی کتابیں پڑھ لی تھیں کہ کسی فلسفی کے دلائل اسے مطمئن نہیں کرسکتے تھے۔ وہ تو اس دھن میں تھا کہ خود مشرق کی سمت میں جائے اور اس سرزمین کے اسرار دریافت کرے۔

فیلقوس اس کی ان سرگرمیوں سے خائف تھا۔ اس نے اسے اس راہ سے ہٹانے کے لیے ایک ترکیب سوچی۔ وہ اپنی کتابوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ بادشاہ کے مصاحبوں کی طرف سے ایک سوار اس کے پاس پہنچا۔

"آپ کو فوراً فوج میں پہنچ جانا چاہیے جو سمندر کے کنارے کوچ کرتی ہوئی جارہی ہے۔"

"میں اس مہینے کے اواخر میں جانے کے لیے تیار ہوسکتا ہوں۔"

"آپ کو ابھی چلنا چاہیے، یہ شاہی فرمان ہے۔"

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔
ثمر عباس 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

یہ سنتے ہی سکندر پریشان ہوگیا۔ اس نے کتابیں ایک طرف رکھیں، شب خوابی کا چوغہ اٹھایا، اپنا خنجر ساتھ لیا اور یہ کہتا ہوا چل دیا۔ ''اگر فرمان ہے تو میں ابھی تیار ہوتا ہوں۔''

اس کے بعد وہ کبھی طالبِ علم کی حیثیت سے واپس نہیں آیا۔

فوج منزل بہ منزل چلتی رہی۔ کبھی شاہراہ سے گزرتی کبھی پہاڑوں پر بنی پگڈنڈیوں سے گزرتی۔ مقدونوی فوج کی کوئی خاص منزل نہیں تھی اور نہ یہ پتا چلتا تھا کہ منزل مقصود کیا ہے۔ رات کے وقت کسی شہر میں داخل ہوجاتے صبح ہوتی تو اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے۔ عام خیال یہ تھا کہ فیلقوس مقدونیہ کے لیے بندرگاہیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی اثنا میں فیلقوس ایک حادثے کا شکار ہوگیا جس میں اس کا کولہا اتر گیا۔ وہ بے بس ہوکر ایک ڈولی میں پڑا ہوا تھا۔ سکندر اس کے قریب پہنچا تو اس نے کمزور آواز میں سکندر سے کہا۔

''میں بلا تاخیر واپس جانا چاہتا تھا لیکن اس حادثے نے مزید تاخیر کی صورت پیدا کردی ہے۔ اب ہم برف باری سے پیشتر پیلا نہ جاسکیں گے۔ میں اس حالت میں وہاں جانا پسند نہیں کروں گا۔ میری جگہ تجھے جانا ہوگا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اب طبابت کا قصہ چھوڑ۔ واپس جا اور میرے نام پر وہاں نیابت کے فرائض انجام دے۔''

فیلقوس نے اپنے جرنیلوں کو بھی بتا دیا کہ میں نے سکندر کو نائب السلطنت بنا دیا ہے۔ میری غیر حاضری میں شہر کا انتظام وہ کرے گا۔ اس نے شاہی مہر سکندر کے حوالے کی اور انتظامِ سلطنت کے بارے میں بہت سی نصیحتیں کیں۔

سکندر نے شاہی مہر اپنے کمربند میں محفوظ کی۔ اس کے دل میں اب بھی یہ وسوسہ باقی تھا کہ شاید سپہ گری کے معیار پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے اسے واپس بھیجا جارہا ہے لیکن اسے یہ بھی یقین نہیں تھا پیلا پہنچ کر معاملات کے انتظامات سے عہدہ برآ ہوسکے گا۔

پیلا پہنچ کر انیٹی پیٹر نے مقدونیہ کے انتظامات کا ذمہ سنبھالا، سکندر کی ماں محل کی مختارِ کل بن گئی۔ سکندر کو علمی مسائل کی چھان بین کا موقع مل گیا۔ ارسطو نے جو راز اب تک سکندر سے چھپا رکھے تھے انہیں آہستہ آہستہ ظاہر کرنے لگا۔ عین اس موقع پر اسے ایک مہم پر جانے کا حکم آگیا۔ اولمپیاس (سکندر کی ماں) یہ تجویز لے کر آگئی کہ سرحد پار جو قبیلے ہیں وہ میدانی فوج کی غیر حاضری کے باعث فتنہ و فساد پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ ان کے خلاف مہم جانی چاہیے اور سکندر کو اس کی قیادت کرنی چاہیے۔

''قوم کو آرزو ہے کہ تم فوج کی کمان سنبھال کر میدان میں نکلو۔ وہ تمہیں کتابوں کے مطالعے میں سرگرم نہیں دیکھنا چاہتی۔''

سکندر اس مہم کے لیے تیار نہیں تھا لیکن اسے نکلنا پڑا۔ یہ اس کی پہلی مہم تھی۔

اس مہم سے وہ واپس آیا ہی تھا کہ اسے یہ پیغام ملا۔

''مقدونیہ کے بادشاہ اور سپہ سالار فیلقوس نے اولمپیاس سے رشتہ توڑ لیا ہے اور اٹالوس کی بھتیجی قلوپطرہ سے شادی کرلی ہے۔''

اولمپیاس کو جب یہ اطلاع ملی کہ وہ ملکہ نہیں رہی تو وہ اپنے ذاتی نوکروں کو ساتھ لے کر ایک الگ مکان میں چلی گئی۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے تمام ریشمی لباس اتار دیے اور سیاہ لباس پہن لیا۔ ہر وقت اون کاتتی رہتی اور گھنٹوں چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ باہر نکلتی تو پردہ دار میانے میں نکلتی تاکہ پیلا کے بازاروں میں کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ سکندر کے سوا اسے کسی کی فکر نہ تھی۔ اسے خوف تھا تو یہ کہ فیلقوس شراب پی کر جو سختیاں کیا کرتا ہے، ان سے سکندر کو محفوظ رکھنے کے لیے کچھ نہ کرسکتی تھی۔

نئی ملکہ قلوپطرہ کے رشتے داروں کا طرزِ عمل بہت گستاخانہ ہوگیا تھا۔ وہ بار بار سکندر کو سمجھاتی کہ ان لوگوں سے بچے رہنا۔

قلوپطرہ کے رشتے دار پھر بھی باز نہ آئے اور سکندر کو طرح طرح سے ستانا شروع کردیا۔ اب وہ سوتیلے رشتے داروں کے ظلم سہہ رہا تھا جو اسے ہر صورت میں فیلقوس کا جانشین بننے سے روکنے کے درپے تھے۔

وہ اتنا تنگ ہوگیا کہ اس نے ایک خادمہ کو ساتھ لیا۔ ماں کو گاڑی میں سوار کیا اور خود گھوڑے پر سوار ہوکر اس کے ساتھ چلا۔ ماں کو پرانے خاندانی مکان میں ٹھہرا کر خود شمالی سمت کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ وہ ابھی آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پیلا سے دو قاصد پہنچ گئے جو اس کے باپ کا خط اس کے نام لے کر آئے تھے۔

''یونانی مشیر مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ جب تم اپنے گھر کے لوگوں کو اکٹھا نہیں رکھ سکتے تو جمعیت متحدہ یونان کے فرائض سے کیونکر عہدہ برآ ہوسکو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا واپس آجائے اور فوج میں اپنا عہدہ سنبھال لے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سکندر نے اپنی ماں سے مشورہ کیا تو حیرت انگیز طور پر اس نے اجازت دے دی۔

"مجھے یقین ہے کہ آسمانی طاقتیں تمہاری محافظ ہیں۔"

وہ پہلا پہنچا تو فیلقوس بظاہر سرد مہری سے پیش آیا۔ یہ پوچھا تک نہیں کہ وہ کیوں چلا گیا تھا اور بیٹھتے ہی فوجی مہموں کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔

"منجنیقوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے گاڑیاں تیار کراؤ کیونکہ تم ہی کو ان کے ساتھ جانا ہوگا۔"

سکندر کو یہ احساس ہوا جیسے وہ اسے یونان سے باہر بھیج کر خود سے الگ کرنا چاہتا ہے۔ اس خیال کے باوجود وہ گاڑیوں کے کام کی نگرانی کرنے لگا۔

☆☆☆

سکندر کی بہن کی شادی تھی۔ شاہی خاندان کے افراد اور بڑے بڑے امرا شاہی محل میں جمع تھے۔ ان کے محافظ دستے باہر کھڑے تھے۔ شہنائیاں بج رہی تھیں۔ یکایک باجوں کی آواز آئی۔ یہ اس امر کا اعلان تھا کہ فیلقوس آ رہا ہے۔ لوگوں نے فیلقوس کے لیے راستہ بنانا شروع کر دیا۔ فیلقوس برآمد ہوا مگر چلتے چلتے گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ ایک برہنہ سر آدمی نے چیختے ہوئے اس کی پشت میں خنجر گھونپ دیا۔ قتل کا ذمے دار پاسنیاس نام کا ایک نوجوان تھا۔ اسے بھی تماشائیوں نے اسی وقت قتل کر دیا۔

عام احساس یہ تھا کہ اولمپیاس (سکندر کی ماں) نے پاسنیاس کو برانگیختہ کر کے فیلقوس پر حملہ کرایا لیکن اس کے خلاف کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ قبائلی ضابطوں کے مطابق یہ امر طے شدہ تھا کہ اگر شاہی خاندان کا کوئی فرد دوسرے فرد پر حملہ کرے تو اس کا فیصلہ شاہی خاندان کے افراد یا جرنیل نہیں کر سکتے تھے اور نہ بدلہ دلا سکتے تھے۔

اب نئے حکمران کی نامزدگی کا معاملہ سامنے آیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ کسی ایسے شخص کو حکمران بنایا جاتا جس کی رگوں میں فیلقوس کا خون دوڑ رہا ہو۔ یہ سکندر ہی ہو سکتا تھا لیکن اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ مطالعے میں غرق رہتا ہے اور عام لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا نیز فوجوں کی کمانداری میں ناتجربہ کار ہے۔ فیلقوس کے قتل کے بعد خونی انتقام کا دروازہ کھل گیا تھا۔ سکندر کی ناتجربہ کاری خونریزی کا دروازہ کھول سکتی تھی۔

پرانے سپہ سالاروں کا اصرار تھا کہ فیصلہ فوراً کیا جائے اور سب اس کے پابند ہوں۔ غرض تمام تر اعتراضات کے باوجود فیصلہ سکندر کے حق میں ہو گیا۔

اس کے حکمران بنتے ہی خطرات سامنے آ گئے۔ اس چھوٹی سی سلطنت کے تینوں جانب جو پہاڑی قبیلے رہتے تھے، وہ فی الفور علیحدگی کر کے سابقہ آزادی کے مالک بن گئے۔ بالکل یہی حالت خانہ بدوش تھیسی قبائل کی تھی۔ یونان کی شہری ریاست نے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ ایتھنز میں فیلقوس کی موت پر جشن منایا گیا۔ اندرونی صورت حال یہ تھی کہ خزانے میں دو مہینے کے مصارف بھی پورے کرنے کے لیے رقم نہیں تھی۔

اس نازک صورت حال میں ارسطو نے بھی مشورہ دیا کہ پہلا کام سرکش قبائل کو مطیع کرنے کا ہے چنانچہ سکندر اس مقصد کو سامنے رکھ کر فوج کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

اس نے کتابیں ایک طرف رکھیں اور بیس سال کی عمر میں اپنی زندگی کا حقیقی سفر شروع کیا اور ایک سال کے اندر اندر اس کی کایا پلٹ گئی۔ وہ ابتدا میں بہت شرمیلا تھا لیکن اب صاحبِ عزم بن گیا۔ خطرات کے ہجوم میں بے تکلف گھس جاتا اور پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ اپنے وطن سے باہر نکل کر فوجوں کی قیادت کرتا ہوا ایشیا پہنچے گا۔ اس کا ارادہ وہ کارنامے انجام دینے کے لیے پختہ ہو چکا تھا جو اس سے پہلے کسی نے انجام نہیں دیے تھے۔

پہاڑ کی چوٹیوں سے گزرتی ہوئی مقدونوی فوج ان میں سے تیزی کے ساتھ گزرتی ہوئی بربری قبائل کے پاس پہنچ گئی جو گھات میں بیٹھے ہوئے غنیم کی فوج کا اندازہ کر رہے تھے کہ تعداد میں کتنی ہے۔

سکندر کو اپنی فوج کے ساتھ ایسے گھنے جنگلوں سے گزرنا پڑا جہاں کوئی بھی چھپ کر انہیں تیروں کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ قدم قدم پر ایسی سخت مشکلات پیش آئیں جیسے بھیڑیوں کے غول نے ہلا بول دیا ہو۔ ان مشکلات نے اسے اچانک مضبوط بنا دیا۔ اب وہ کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اس نے اپنی فوج کو بھی خطرات کا عادی بنا دیا تھا لہٰذا اس کی فوج نہایت استقلال کے ساتھ آگے بڑھی۔ راتوں کو اندھیرے میں حملے کرتے، دریاؤں کو عبور کرتے، چھاپے مارتے مسلسل دو دن تک کوچ کرتے رہتے اور اچانک کسی شہر کے سامنے پہنچ جاتے۔ پھر ایک دریا سامنے آ گیا جہاں صرف بازنطینی جہاز نظر آئے۔ رات کی تاریکی میں فوج کو ان پر سوار کیا اور دریا عبور کر لیا۔ ستاروں کی روشنی میں راستہ ڈھونڈا۔ شہری سو کر اٹھے تو یہ دیکھ کر حیران رہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گئے کہ ان کے گرد مسلح سپاہی کھڑے ہیں۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ ایک ایسی وادی میں پہنچ گئے جو صندوق کی طرح ہر طرف سے بند تھی۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بربری جتھے جمے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سکندری فوج کے لیے بچ نکلنے کا راستہ کاٹ ڈالا۔ دوسرے قبیلے بھی ان بربریوں کی کمک کے لیے پہنچ گئے۔ سکندر کا سپہ سالار زبردست یورش کر کے فوج کو اس وادی سے باہر لے آیا اور ایک دریا پر لے آیا۔

سکندر کو ہر وقت یہ فکر لگی رہتی تھی کہ اس کی کوئی کمزوری فوج پر ظاہر نہ ہو۔ اس کی فوج سمجھتی تھی کہ سکندر پر دیوتاؤں کی نگاہِ لطف ہے۔ وہ اس تاثر کو قائم رکھنا چاہتا تھا لہٰذا عزم کی تصویر بنا آگے بڑھتا رہا۔

جنوب کی طرف سے خبر آئی کہ ایتھنز کے گرد و پیش نئی جمعیتِ دفاع تیار ہو رہی ہے۔ خطیبوں نے تھیبیز کو اپنا مرکز دفاع بنالیا ہے۔ یہ خبر بھی پھیل گئی کہ سکندر جنگلوں میں مارا گیا۔ یہ افواہ سنتے ہی مقدونیہ کی ایک فوج تھیبیز کے قلعے پہنچی اور دو مقدونوی افسروں کو قتل کر ڈالا۔ جمعیت متحدہ یونان بھی مقدونیوں کے خلاف حرکت میں آرہی تھی۔ پیلا کے مشیروں کی رائے تھی کہ یونان کی شہری ریاستوں سے صلح کر لینی چاہیے۔

سکندر پر جونہی یہ حالات ظاہر ہوئے وہ نہایت تیزی سے تھیبیز کی طرف روانہ ہوا۔

سکندر نے تھیبیز پہنچتے ہی ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ اس نے شہر کے اردگرد چکر لگایا تو معلوم ہوا لکڑی کی دیواریں ہر طرف کھڑی ہیں اور محاصرے کے سوا تسخیر کی کوئی صورت نہیں۔ بہرحال دیوار توڑی گئی اور ایک سخت مقابلے کے بعد تھیبیز کو آگ لگا دی گئی۔

ایک ریاست یوں تباہ ہوگئی اور وہ بھی اس طرح کہ مقدونوی فوج کے وہاں پہنچنے کا کسی کو علم تک نہ ہوا۔ اہلِ ایتھنز دم بخود رہ گئے۔ بغاوت کے شعلے سرد ہو گئے۔ اہلِ ایتھنز نے اپنے قاصد سکندر کے پاس بھیجے اور پیغام دیا۔

”اس نازک وقت میں یونانی شہروں کی قیادت اس کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ متحدہ یونان کی انتظامی کونسل فیلقوس کی طرح اس کے لیے بھی سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت میں اس کا استقبال کرے گی۔“ وہ ایتھنز پہنچا تو کچھ لوگوں نے صلح کی مذمت کی لیکن اکثریت نے پرشکوہ استقبال کیا اور یقین دلایا کہ ایشیا پر حملہ کرنے والی متحدہ یونانی فوج کی قیادت کا اہل اس کے سوا کوئی نہیں۔ اس سے اصرار کیا جارہا تھا کہ وہ سمندر کو عبور کر کے ”ٹرائے“ پہنچے اور اس مشعل کو اٹھائے جو فیلقوس کے ہاتھ سے گری تھی اور یونان کا محافظ و حامی کار بن جائے۔

اس کے فوجی جرنیلوں نے بتایا کہ فیلقوس اس حملے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ فوج کی تربیت اور نقل و حرکت کا پورا نقشہ تیار ہے۔ ہم درۂ دانیال عبور کر کے ایشیا میں داخل ہوں گے۔ ہماری فوج ہر اس قوت کو شکست دے دی گی جو اس کے مقابلے پر لائی جائے گی۔ بے شک تھوڑا سا خطرہ موجود ہے لیکن اسے قبول کر لینے کے نتائج بے حد فائدہ مند ہوں گے۔ اس طرح ہم ایک ہی ضرب میں اس زرخیز اور دولت مند ساحلی علاقے پر قابض ہو جائیں گے جو یونان کے بالمقابل واقع ہے۔

ایشیا سے دولت کا سیل بہتا ہوا آرہا تھا لیکن مقدونیہ کے پہاڑی علاقے میں کوئی تجارتی شاہراہ نہ آتی تھی اور وہاں کے خزانے میں سونے چاندی کے ذخیرے بھی بہت کم تھے۔ فیلقوس کے پاس تھوڑا سا ساحلی علاقہ تھا جس میں بندرگاہیں موجود تھیں لیکن اس کے پاس نہ تو بیڑا تھا اور نہ وہ اپنے کاشت کاروں کو تجارت کی طرف مائل کر سکا۔ مقدونیہ تک خوش حالی کی لہر تک نہ پہنچی تھی۔ ان حالات میں اہلِ مقدونیہ کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ ایشیائی ساحل کی دولت پر قبضہ جمانے کے لیے قدم آگے بڑھائیں۔

سکندر اسی دولت کو مٹھی میں بند کرنا چاہتا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اہلِ مقدونیہ کی اقتصادی بدحالی کو ختم کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ اسے اگر خطرہ تھا تو اپنے آپ سے۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد نہیں تھا۔ بالآخر اس نے اپنی اس کمزوری پر قابو پالیا اور ارسطو کی مخالفت کے باوجود اس نے ایشیا کی طرف قدم بڑھا دیا۔

دارا کو شکست دیتا ہوا وہ ہندوستان تک پہنچ گیا لیکن اس سے آگے سمندر کے اسرار جاننے کے لیے اس کی فوج تیار نہیں ہوئی اور اسے واپس آنا پڑا لیکن واپسی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ بابل میں اس کی موت واقع ہو گئی اور وہ بھی صرف 32 سال کی عمر میں۔

ماخذات:

سکندرِ اعظم۔ ہیرالڈلیم۔ مہاراجا پورس۔ بدھا پرکاش۔ الیگزینڈر دی گریٹ، جیکب ایبٹ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

شرط

تنویر ریاض

رقابت اور طاقت اگر ساتھ مل جائیں تو یہ احساس عام انسان کو بھی فرعون بنا دیتا ہے۔ وہ بھی خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھتا تھا مگر تدبیر اور تقدیر نے مل کر اسے ایسی مات دے ڈالی جس کا وہ کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا... جس زعم میں اس نے کھیل ہی کھیل میں شرط رکھی وہی گھمنڈ اسے پستی میں لے گیا۔

زیست کی بساط پر جان کی بازی لگانے والے ایک کھلاڑی کی روداد

تین مرتبہ کوشش کرنے کے بعد میں اس کچی سڑک کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو میسا چیوسٹس قصبے کے مضافات میں واقع تھی اور جہاں میں پلا بڑھا تھا۔ یہ سڑک ایک موڑ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ پہلے وہاں ایک پگڈنڈی ہوا کرتی تھی لیکن اب ایک زنجیر کی باڑ کے ذریعے آگے جانے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا اور تھوڑے، تھوڑے سے فاصلے پر داخلہ منع ہے...... کے بورڈ لگے ہوئے تھے اور اس عبارت کے نیچے لکھا ہوا تھا...... غیر قانونی طور پر گھس آنے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

والے کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

میں نے کرائے کی کار کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور باڑ کی طرف چل دیا۔ وہاں ایک گیٹ لگا ہوا تھا۔ میں چند گز پیچھے ہٹا، دوڑتے ہوئے چھلانگ لگائی اور باڑ کے دوسری طرف جا گرا۔ وہ پگڈنڈی پہلے کے مقابلے میں پھیل گئی تھی اور عمودی ڈھلان کی شکل میں اوپر جا رہی تھی۔ آگے جا کر یہ ایک ہموار سطح پر ختم ہو گئی۔ میں نے ایک درخت سے ٹیک لگائی اور وہاں کا نظارہ کرنے لگا۔ میرے سامنے ایک دلدل تھی جو تقریباً سو گز تک چلی گئی تھی۔ داہنے ہاتھ پر ایک عمودی اور تنگ اونچائی تھی۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میری یادداشت سے دلدل نکل گئی اور اس کی جگہ ایک بہت چوڑی اور گہری متروکہ پتھر کی کان نے لے لی۔ کسی زمانے میں اس کان سے نکالے ہوئے پتھر بنیادوں، پلوں اور عمارتوں کی تعمیر میں استعمال ہوتے تھے۔ جب پتھر نکالنے کا کام رک گیا تو سیلاب اور بارش کے پانی نے اس گڑھے نما کان کو بھر دیا اور یہ ایک مستطیل جھیل کی شکل اختیار کر گئی۔ اس طرح یہ جگہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے باعث کشش بن گئی جو یہاں تیرتے اور غوطے لگاتے تھے۔

وہاں چھلانگ لگانے کے لیے تین مقامات تھے۔ سب سے نیچے والا چھجا پانی کی سطح سے دس فٹ اوپر تھا اور روک، کہلاتا تھا۔ اس سے اوپر والا بشپ تیس فٹ اونچا اور تیسرا کنگ، تقریباً ستر فٹ کی بلندی پر تھا۔ کوئی بہادروں کا بہادر ہی وہاں سے چھلانگ لگانے کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب وہاں دلدل، درختوں، پتھروں اور یادوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ایک پولیس آفیسر میری طرف آ رہا تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس یا انتیس سال ہوگی۔ اس کی پیٹی میں ریوالور جھول رہا تھا اور اس کے سینے پر نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی جس پر سائمن لکھا ہوا تھا۔

''تم نے پارکنگ لاٹ کے ساتھ لگا ہوا بورڈ نہیں دیکھا جس پر لکھا ہوا ہے، داخلہ منع ہے۔ ایسا ہی ایک بورڈ باڑ کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔''

''نہیں، میں نے ان پر غور نہیں کیا۔''

وہ کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ ''واقعی ...... ویسے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں یہاں پلا بڑھا ہوں۔'' میں نے دلدل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بچپن میں یہاں آیا کرتا تھا۔ پہلے یہاں ایک جھیل تھی، جس میں ہم سب تیرتے اور غوطے لگاتے تھے۔''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ غیر قانونی شراب نوشی، لڑائیاں اور دوسری غیر اخلاقی حرکتیں بھی ہوا کرتی تھیں...... اور تو کوئی کشش نظر نہیں آتی۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دو باتیں کشش کا باعث تھیں۔ پہلی تو یہ کہ بہت زیادہ گرم موسم میں تیراکی کے لیے یہ قریب ترین جگہ تھی ورنہ بس یا کسی سواری میں بیٹھ کر کاؤنٹی پول جانا پڑتا جو یہاں سے آدھ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔''

''اور دوسری دلچسپی؟''

''یہ ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور آج تم یہاں وہی دیکھنے آئے ہو۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں صرف یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ بھرائی کے بعد یہ جگہ کیسی لگ رہی ہے۔''

سائمن نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا۔ ''تم اس وقت یہیں تھے جب اس کی بھرائی ہو رہی تھی؟''

''نہیں، میں ریاست سے باہر تھا اور تم؟''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ یہاں کوئی بہت برا واقعہ پیش آیا تھا اور اس کے بعد ڈمپر ٹرکوں نے اسے بھرنا شروع کر دیا۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں، یہاں ایک بہت ہی برا واقعہ ہوا تھا۔''

''لگتا ہے کہ یہ کوئی دردناک کہانی ہے، کیا تم کچھ بتانا پسند کرو گے؟''

''ضرور...... اگر تمہارے پاس وقت ہے۔''

اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''اس قصبے میں جرائم برائے نام ہیں، اس لیے ہمارے پاس وقت ہی وقت ہے۔''

''میرا نام ہینک کیلر ہے۔ اس وقت میں سترہ سال اور میری بہن کارا پندرہ سال کی تھی۔ تبھی ایک روز یہ انکشاف ہوا کہ وہ کسی لڑکے سے راہ و رسم بڑھا رہی ہے۔ رات کے کھانے پر ماں نے اس سے پوچھا کہ وہ ڈیوی کوکن سے کیوں ملتی ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ وہ کتنا برا لڑکا ہے۔ اس نے ہماری پلیٹوں میں آلو کے چپس اور ہمبرگ اسٹیک ڈالتے ہوئے کہا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"وہ...... اس کا باپ پیٹرک اور چچا بلیکی سب بدمعاش ہیں، تمہیں اس سے دور رہنا چاہیے۔"

کارا نے میری طرف دیکھا لیکن میں نے اپنی نظریں پلیٹ پر جمادیں۔ میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ کارا بولی۔ "رہنے دو مما، وہ اتنا برا بھی نہیں ہے بلکہ میرا تو بہت خیال رکھتا ہے۔"

ماں دن بھر کی تھکی ہوئی تھی۔ اس لیے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈیڈی کی کرسی گزشتہ آٹھ برس سے خالی تھی۔ اس نے اپنی رانوں پر نیپکن رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔ اگر وہ تمہارا خیال رکھ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ تم سے کچھ چاہتا ہے۔"

کارا نے معصومیت سے پوچھا۔ "اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

ماں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ ان دنوں تم جس طرح کا لباس پہن رہی ہو، اگر تمہارا باپ زندہ ہوتا......"

ایک وقت تھا کہ یہ الفاظ سن کر میں اور کارا خاموش ہوجاتے بلکہ کارا کی تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے لیکن اب بہت کچھ بدل گیا تھا۔ وہ بڑی ہوگئی تھی اور اس نے.... بےہودہ لباس پہننا شروع کردیا تھا بلکہ وہ ماں سے بھی زبان چلانے لگی تھی۔ اسی لیے میں اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا گو کہ میں اس کا بڑا بھائی تھا لیکن وہ مجھے بھی نظرانداز کرنے لگی تھی۔

کھانا ختم ہونے کے بعد میں پلیٹیں اٹھانے میں ماں کی مدد کرنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر کارا سے کہا۔ "تم اس لڑکے سے دور رہو، سمجھ گئیں؟"

کارا بناوٹی انداز میں مسکرائی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماں اور میں برتن دھونے لگے۔ جب میں انہیں خشک کررہا تھا تو گھر کے باہر کار کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ کارا کمرے سے نکلی اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "بائے مام! میں دیر سے آؤں گی۔"

"یہ لڑکی......" ماں اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہارا باپ زندہ ہوتا تو اس کی مجال نہ تھی کہ اس طرح گھر سے باہر جاتی...... یہ لڑکا تمہارے اسکول میں ہے۔ کیا تم کچھ نہیں کرسکتے؟"

میں خاموشی سے پلیٹ صاف کرتا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ کاش اس وقت میں اپنے بیڈروم میں کوئی کتاب پڑھتا یا ریڈیو سن رہا ہوتا۔

"ہینک؟" ماں میرے جواب کی منتظر تھی۔

"مام......وہ اسکول کے دوسرے حصے میں ہے، شاید مکینیکل آرٹس یا اسی طرح کا کوئی مضمون ہے۔ میں اسے زیادہ نہیں جانتا۔"

"تمہیں کچھ کرنا چاہیے۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ "تم اس کے بڑے بھائی ہو۔ تمہیں اپنی چھوٹی بہن کی نگرانی کرنی چاہیے۔"

اس رات میں نے اپنے کمرے میں کتاب سے دل بہلانے کی کوشش کی پھر ریڈیو لگایا لیکن دونوں میں سے کوئی بھی چیز میری توجہ حاصل نہ کرسکی۔ میری نظریں کتابوں کے شوکیس پر رکھی ایک تصویر پر تھیں۔ یہ میرے ڈیڈی کی تصویر تھی جو 1973ء میں لی گئی تھی وہ فوج میں سارجنٹ تھے اور ان کی تعیناتی سائیگاون میں تھی۔ اس تصویر کے لیے جانے کے چند ہفتوں بعد وہ اپنے دوست کے ساتھ گشت پر گئے کہ ان کا پاؤں ایک بارودی سرنگ پر پڑا۔ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔

میرے ذہن میں ان کی کچھ یادیں تھیں۔ جب میں شب بخیر کہنے کے لیے ان کے گالوں کا بوسہ لیتا تو ان کی ڈاڑھی کے بال مجھے چبھنے لگتے۔ ان کے پائپ کے تمباکو کی خوشبو مجھے اچھی لگتی تھی۔ جاتے وقت انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر کہا تھا۔

"ہینک! اب تم بڑے ہوگئے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اپنی ماں اور بہن کی مدد کروگے۔ کیا میں تم پر بھروسا کرسکتا ہوں؟"

مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا جواب دیا تھا لیکن اب ان کی تصویر دیکھتے ہوئے بےساختہ میری زبان سے نکلا۔

"ڈیڈ! تم مجھ پر بھروسا کرسکتے ہو۔"

میں اس وقت جاگ رہا تھا جب میں نے اپنی بہن کے قدموں کی آواز سنی۔ ماں کا بیڈروم پہلی اور ہمارا دوسری منزل پر تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور بولا۔ "کیا مام کو معلوم ہے کہ تم کتنی دیر سے آئی ہو؟"

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "تم مجھ پر شک کررہے ہو؟" اس کے سنہری بال بےترتیب ہورہے تھے اور اس کی پتلون پر مٹی لگی ہوئی تھی۔

"نہیں۔ میں تم پر شک نہیں کررہا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مام ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ تمہیں ڈیوی سے دور رہنا چاہیے۔"

کارا اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ "خدا کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دو ہینک۔" یہ کہہ کر اس نے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

زور سے دروازہ بند کر دیا۔

اگلے دن میں اپنی سائیکل پر پتھروں کی کان کی طرف گیا جو اب ایک جھیل میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے نہانے کا لباس اور سیاہ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور ایک تولیا میرے کندھے پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنی سائیکل ایک درخت کے ساتھ لگائی اور پگڈنڈی پر چلتا ہوا پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔

وہاں تقریباً بیس کے قریب لڑکے لڑکیاں موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کو میں جانتا تھا۔ وہ میرے محلے یا اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ دولڑکے چیختے چلّاتے بشپ تک گئے اور انہوں نے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ یہ دیکھ کر میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ مجھے تو روک سے چھلانگ لگانا بھی مشکل لگتا تھا۔ میں نے کبھی بشپ سے چھلانگ لگانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا جبکہ کنگ جس کی اونچائی ستر فٹ تھی، مجھے ماؤنٹ ایورسٹ کے مانند لگتی تھی۔

میں جھیل کے آخری سرے پر چلا گیا۔ وہاں بچوں نے جھولا جھولنے کے لیے ایک درخت میں رسی لٹکا رکھی تھی۔ میں نے ایک ٹیلے پر اپنا تولیا رکھا۔ جوتے اتارے اور پانی میں اتر گیا۔ میں ایک اچھا تیراک ضرور تھا لیکن اونچائی سے غوطہ لگانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ چند مرتبہ میں نے روک سے چھلانگ لگانے کے بارے میں سوچا جس کی اونچائی صرف دس فٹ تھی لیکن میری ٹانگیں کپکپانے لگیں اور مجھے چھلانگ لگانے کے لیے کافی قوت لگانی پڑی لیکن جھیل کے پانی کی ہموار سطح پر تیرتے ہوئے مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔

میں نے دو چکر لگانے کے بعد وقفہ لیا۔ اسی وقت میرے کانوں میں ہوٹنگ اور شور مچانے کی آوازیں آئیں۔ میں نے جھیل کے کنارے پر دیکھا۔ ڈیوی کولن اس طرح چلتا ہوا آ رہا تھا جیسے وہ اس جگہ کا مالک ہو۔ اس نے نیلے رنگ کی جینز اور جوتے پہن رکھے تھے جبکہ اس نے قمیص اتاری ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بازوؤں پر ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ تین لڑکے اور بھی تھے۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا اور اس کا ایک بازو میری بہن کے کندھے پر تھا۔

اس نے اسے اپنے قریب کر لیا جیسے وہ اس کی ملکیت ہو۔ اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور کارا کے منہ پر دھواں چھوڑ دیا۔ پھر اس نے جھک کر کارا کا بوسہ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی تو ڈیوی نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ گو کہ وہ فاصلے پر تھا اس کے باوجود اس کی شرمناک حرکت دیکھ کر میرا گلا خشک ہو گیا۔

میں تیرتا ہوا واپس اس جگہ گیا جہاں میں نے اپنا تولیا رکھا تھا۔ جسم کو خشک کرنے کے بعد میں نے قمیص اور جوتے پہنے۔ میں نے محسوس کیا کہ فضا کچھ بدلی ہوئی ہے۔ زیادہ تر لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ شاید وہ ڈیوی اور اس کے ساتھیوں سے دور رہنا چاہ رہے تھے۔ البتہ دولڑکے اس کے ساتھ شامل ہونے کے لیے اس کے قریب گئے لیکن اس نے انہیں منہ نہیں لگایا۔

جب میں اس کے قریب پہنچا تو کارا نے مجھے دیکھ کر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا جیسے مجھے واپس بھیجنا چاہ رہی ہو۔

''ہینک ......'' اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ڈیوی نے مجھے پلٹ کر دیکھا۔

''ہائے۔'' اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''بڑا بھائی بھی تماشا دیکھنے کے لیے رک گیا ہے۔ تم سپر مارکیٹ پر کام کرتے ہو نا۔ ایک چھکڑے پر میرا سامان بھی پہنچا دو۔''

میں نے اپنا منہ بند رکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں ہوں۔ ڈیوی نے مجھے چھیڑنے کے لیے کہا۔ ''اور کیا ہو رہا ہے بڑے بھائی؟''

میرا سینہ سخت ہو گیا۔ میں ڈیوی کو اسکول سے جانتا تھا لیکن ہماری کلاسیں الگ الگ تھیں اور ہم کسی جگہ بھی ساتھ نہیں رہے۔ وہ میرے حلقے میں نہیں تھا اور میری کسی سرگرمی میں شریک نہیں ہوتا تھا اور میں بھی اس سے دور رہ کر خوش تھا۔

''ڈیوی......'' میں نے کہا۔

''ہائے۔ بڑا بھائی میرا نام بھی جانتا ہے۔ مبارک ہو۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، جانتا ہوں۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔''

اس کے دونوں ساتھی بدتمیزی سے ہنسنے لگے۔ ڈیوی نے بھی ان کا ساتھ دیا اور اس کی گرفت میری بہن کے گرد سخت ہو گئی۔ کارا نظریں جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمہاری بہن کو چھوڑ دوں...... کیوں؟ اچھا اسی سے پوچھ لیتے ہیں کہ یہ کیا چاہتی ہے۔''

اس نے کارا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں؟''

''نہیں ڈیوی۔'' کارا نے آہستہ سے کہا۔

''دیکھ لیا؟'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''ہمیں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

آپس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سوائے تمہاری موجودگی کے۔ اس لیے یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے سختی سے کہا۔ "نہیں۔"

ڈیوی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "واقعی۔ تم میرا کیا بگاڑ لوگے؟"

اس کے دونوں ساتھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ڈیوی! میں چاہتا ہوں کہ تم......"

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا۔ "میں نے کہا نا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔"

میرا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ شاید اس نے بھی یہ بات نوٹ کی ہوگی۔ تبھی ایک چھوٹا پتھر اٹھا کر میری طرف پھینک دیا جو میری چھاتی پر آ کر لگا۔

میں خاموش کھڑا رہا۔ کارا نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا۔

ڈیوی نے ایک اور پتھر مارا۔ "میں کہتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں واقعی زخمی کردوں۔"

چنانچہ میں وہاں سے چلا آیا۔ رات گئے کارا میرے کمرے میں آئی اور کم از کم پانچ منٹ تک مجھ سے لڑتی رہی۔ اس نے میرے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے کہ اگر ماں سن لیتی تو اس کا گھر سے نکلنا بند ہوجاتا۔ جب وہ سانس لینے کے لیے رکی تو میں نے پوچھا۔

"تمہاری آنکھ کو کیا ہوا؟"

اس نے اپنی آنکھ پر انگلی پھیری اور بولی۔ "کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہوا ہے۔ جبھی یہ آنکھ سوجی ہوئی ہے۔"

"اگر کچھ ہوا ہے تو اس کی وجہ تم ہو۔ تمہیں ایسے معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے جس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا مجھے اور ڈیوی کو تنہا چھوڑ دو۔"

"کارا......" میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ میری بات سنے بغیر کمرے سے باہر چلی گئی۔

اگلے روز اس نے ناشتے کی میز پر ایک خط چھوڑا جس میں اس نے لکھا کہ اسے امتحان کی تیاری میں اپنی دوست میلانی کی مدد کرنے کے لیے جلدی اسکول جانا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ماں کو اپنی سوجی ہوئی آنکھ نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ایک اچھا بھائی ہونے کے ناتے مجھے ماں کو سب کچھ بتا دینا چاہیے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور جلدی جلدی ناشتا کرکے اسکول کے لیے روانہ ہوگیا۔ میں نے اپنی سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی جہاں مجھ جیسے دوسرے غریب لڑکوں کی سائیکلیں کھڑی ہوتی تھیں۔

مجھے ایک خالی پیریڈ ملا تو میں اپنے گائیڈنس کونسلر وڈ فاؤلر کے پاس چلا گیا۔ وہ درمیانی عمر کا فیشن ایبل شخص تھا اور اس کے دروازے طالب علموں کے لیے ہر وقت کھلے ہوئے تھے۔

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کیا سیمسٹر ختم ہونے سے تمہارا تیراکی ٹیم میں شامل ہونے کا کوئی امکان ہے؟"

"شاید نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اسکول کے بعد سپر مارکیٹ میں کام کرتا ہوں۔ میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔"

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بہت بری بات ہے۔ تم جیسے تیراک کو تو ٹیم میں شامل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خیر بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

میں نے اسے پورا قصہ سنا دیا کہ کس طرح میری بہن نے ایک بڑی عمر کے لڑکے سے ڈیٹنگ شروع کی اور اب اس نے اسے مارنا شروع کردیا ہے۔ میری بہن اور میں دونوں اس سے خوفزدہ ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔

مسٹر فاؤلر ایک کاغذ پر سب باتیں نوٹ کرتے رہے اور جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولے۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم میرے پاس آئے۔ یہ سب ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ تمہاری بہن کو تنگ کرے۔ کیا وہ یہاں پڑھتا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولے۔ "اس کا مطلب ہے کہ ہم پولیس کی مدد لے سکتے ہیں اور اسکول انتظامیہ سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس لڑکے کے ساتھ اتنی سختی کرے کہ وہ خوفزدہ ہوکر تمہاری بہن کا پیچھا چھوڑ دے۔"

یہ سن کر میں پُرسکون ہوگیا۔ اب سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا اور کارا بھی اس کے چنگل سے آزاد ہوجائے گی اور میرے ڈیڈی کی روح کو بھی سکون مل جائے گا۔

اس نے مزید کچھ نوٹ لینے کا ارادہ کیا اور بولا۔

"تمہاری بہن کا نام کیا ہے؟"

"کارا این کیلر۔"

"غالباً وہ دوسرے سال میں ہے؟"

"ہاں۔"

"اس کے بوائے فرینڈ کا نام کیا ہے جو اسے مارتا ہے؟"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"ڈیوی کولن۔"

اس کا قلم چلتے چلتے رک گیا۔ "ڈیوی کولن؟"

"ہاں۔"

"اس کے باپ کا نام پیٹرک کولن ہے؟"

"ہاں۔یہی اس کے باپ کا نام ہے۔"

فاؤلر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور قلم میز پر رکھ دیا پھر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"معاف کرنا ہینک ...... میں نہیں سمجھتا کہ اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں گا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "ابھی تم نے کہا تھا کہ پولیس بلاسکتے ہو اور انتظامیہ سے کہہ کر اس پر دباؤ ڈال سکتے ہو کہ وہ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دے۔"

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بولا۔ "اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔"

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔تم ناجائز کررہے ہو۔"

مسٹر فاؤلر نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ اس کا باپ کیسا آدمی ہے اور وہ کیا کرسکتا ہے؟"

مجھے فاؤلر پر غصہ آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ "میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔تم ہی بتادو کہ وہ کیسا آدمی ہے؟"

اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "وہ کولن لیکوئر کا مالک ہے۔بظاہر یہ شراب کا کاروبار ہے لیکن اس کی آڑ میں وہ دوسرے غیر قانونی کام بھی کررہا ہے جن میں منشیات کی سپلائی اور سود کا کاروبار بھی شامل ہے۔اس نے اپنی ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کررکھی ہے۔اسے تم مافیا بھی کہہ سکتے ہو۔کیا تم نے کبھی اس کے بارے میں اخبار میں نہیں پڑھا؟"

میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ "میں محض ایک طالب علم ہوں اور اپنی بہن کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔میرے پاس اخبار پڑھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔"

"پھر تم اس کام کے لیے وقت نکالو اور ڈیوی کا کوئی بندوبست کرو۔تم پولیس کے پاس بھی جاسکتے ہو لیکن اگر وہ کچھ نہ کریں تو حیران مت ہونا۔اس کے باپ کا اس قصبے میں بہت اثر رسوخ ہے۔"

جب میں اٹھنے لگا تو وہ بولا۔ "اگر تم پولیس کے پاس جاؤ تو میرا نام مت لینا۔"

میں دروازہ بند کیے بغیر اس کے کمرے سے باہر آگیا۔ جب اسکول کی چھٹی ہوئی تو میں وقت گزاری کے لیے اسکول کی عمارت میں ٹہلنے لگا کیونکہ سپر مارکیٹ جانے میں کچھ دیر تھی۔ میں گھومتا پھرتا آٹو شاپ کی طرف چلا گیا۔ وہاں ڈیوی اور اس کے ساتھی پہلے سے موجود تھے۔ساؤنڈ سسٹم پر میوزک چل رہا تھا اور ڈیوی نو اسموکنگ کے بورڈ کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے بولا۔ "یہ میری محبوبہ کا بڑا بھائی ہے۔تمہارا جھگڑا کہاں ہے بڑے بھائی؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "کارا کا پیچھا چھوڑ دو۔"

اس نے ایک اور کش لیا اور میرے منہ پر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ "کیوں چھوڑ دوں؟ وہ بہت خوب صورت ہے اور......"

میں اس کے اور قریب ہوگیا۔شاید اس نے میرے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت دیکھ لی تھی یا پھر اس کا ردعمل بے ساختہ تھا۔اس نے سگریٹ پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے مجھے دھکا دیا۔ میں پیچھے کی طرف گرا لیکن فوراً ہی پلٹ کر اس پر جھپٹا۔میرا بازو فضا میں بلند ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے میرا وار روکا اور مجھے زمین پر پٹخ دیا۔میری ناک اور رخسار کی ہڈی پر چوٹ آئی اور سر کے پچھلے حصے میں دھماکے ہونے لگے۔ڈیوی نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"میں نے کہا تھا کہ تمہاری بہن بہت خوب صورت ہے اور وہ میری ہے، جب تک میں کسی اور کے بارے میں نہ سوچوں۔اب تم یہاں سے دفع ہوجاؤ۔اس سے پہلے کہ میں واقعی پاگل ہوجاؤں۔"

میں زخمی حالت میں وہاں تک پہنچا جہاں سائیکل کھڑی کرکے گیا تھا۔سائیکل اپنی جگہ موجود تھی لیکن اس کے دونوں ٹائر کٹ چکے تھے۔رم مڑ گیا تھا اور بقیہ حصوں کو بھی ہتھوڑے مار کر ناکارہ بنادیا گیا تھا۔

اس روز مارکیٹ میں زیادہ رش نہیں تھا۔جب منیجر نے میرا چہرہ دیکھا تو اس نے فوراً ہی مجھے اسپتال بھیج دیا جو سڑک پار کرکے سپر مارکیٹ کے سامنے ایک آبادی میں تھا۔ وہاں سے بچے اور عورتیں ہماری سپر مارکیٹ میں خریداری کے لیے آتے اور ٹرالی میں سامان رکھ کر لے جاتے پھر ہم میں سے کوئی ایک سڑک پار کرکے جاتا اور خالی ٹرالیاں واپس لے آتا۔

اس روز بھی میں نے چھ ٹرالیاں اکٹھی کیں اور انہیں واپس لے جانے لگا۔میری ناک اور رخسار کی ہڈی میں ابھی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تک درد ہو رہا تھا اور مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں جس جگہ کھڑا ہوا تھا، وہ ایک کھیل کا میدان تھا۔ اس کے دوسری طرف ایک پگڈنڈی تھی جو جھیل کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ہمت پکڑی اور ٹرالیوں کو شاپنگ پلازا کی جانب دھکیلنا شروع کر دیا۔ سڑک پر سے ٹریفک گزر رہا تھا اس لیے مجھے رکنا پڑ گیا تبھی میری نظر سڑک کے آخر میں لگے ہوئے ایک نیون سائن پر گئی۔ اس پر لکھا ہوا تھا..... ''کولن لیکوئرز۔''

جب میری شفٹ ختم ہوئی تو میں پیدل چلتا ہوا اس نیون سائن تک پہنچا۔ میں نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی تو ایک مترنم آواز سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔ اندر دیواروں پر لگے شیلف میں شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں اور ایک لڑکا کاؤنٹر پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ قانوناً نابالغوں کو شراب بیچنا جرم ہے۔''

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''مجھے مسٹر کولن سے ملنا ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم اسکول کے اخبار یا ائر بک کے لیے اشتہار لینے آئے ہو تو تمہیں ناکامی ہوگی اور اگر مسٹر کولن نے اشتہار دے بھی دیا تو تمہارا پرنسپل اسے لگانے کی اجازت نہیں دے گا۔''

''نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں اس سے اس کے بیٹے ڈیوی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ بولا۔ ''میں مسٹر کولن کے لیے کام کرتا ہوں۔ تم وہ بات مجھ سے بھی کر سکتے ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ مجھے مسٹر کولن سے ہی ملنا ہے۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے لڑکے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم کیا کر رہے ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔''

وہ مجھے لے کر سیاہ پردے کے پیچھے اسٹور میں لے گیا جہاں شراب کے باکس اوپر تلے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے بائیں جانب بنے ہوئے لکڑی کے دروازے پر تین بار دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں لیکن میرے ساتھ یہ لڑکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ تم سے ڈیوی کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔''

کمرے میں ایک آواز سنائی دی اور وہ شخص میرا بازو پکڑ کر ایک چھوٹے سے دفتر میں لے گیا۔ دیوار میں نصب کتابوں کی الماری میں تاریخ کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی جس سے پارکنگ لاٹ نظر آ رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی لکڑی کی میز رکھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ دو کرسیاں تھیں۔ ایک پر نوجوان لڑکی اور دوسری پر پیٹرک کولن بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''تم کون ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا نام ہینک کیلر ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے؟ کیا ڈیوی تمہارے پیسے چرا رہا ہے یا تمہارے لاکر کی تلاشی لے رہا ہے؟ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ اس نے تمہاری پٹائی بھی کی ہے اور تم اس کی شکایت لے کر آئے ہو۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا لڑکا میری بہن کارا سے ملتا ہے۔ میں اسے روکنا چاہتا ہوں۔ وہ اسے مارتا بھی ہے۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ میرا بیٹا لڑکیوں کو مارتا ہے۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ''تمہارا باپ

تحفہ

ایک احمق شخص گوتم بدھ کے پاس پہنچا اور انہیں برا بھلا کہنے لگا۔ گوتم بدھ نے بڑی خاموشی اور تحمل کے ساتھ اس کی گالیاں سننے کے بعد کہا۔ ''میرے بیٹے! مجھے ایک بات تو بتاؤ کہ اگر تم کسی شخص کی خدمت میں تحفہ لے کر پہنچو اور وہ تمہارے اصرار کے باوجود اسے قبول نہ کرے تو اس تحفے کا مالک کون ہوگا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''اس کا مالک تحفہ لانے والا ہی ہوگا۔''

گوتم بدھ نے جواب دیا۔ ''بیٹا! میں تمہاری گالیوں کی سوغات قبول نہیں کر سکتا تم اسے اپنے پاس ہی رکھو۔''

مرسلہ: بشیر علی، لاہور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ویت نام میں مارا گیا تھا۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''
''ہاں۔''
''اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ وہاں نہ جاتا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''ظاہر ہے کہ تمہارا دماغ بھی اس جیسا ہی ہوگا۔''
''دیکھو۔ میری بات سنو۔''
اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے ہاتھ سے دراز کھولی۔ اس میں سے ایک ٹیپ کا رول، ایک پلاس اور ایک چاقو نکالا۔
''میں تمہیں یہ چیزیں اس لیے دکھا رہا ہوں کہ تم پولیس کے پاس میری شکایت لے کر نہ جاؤ کہ میں نے تمہیں دھمکایا ہے۔'' اس نے ان تینوں چیزوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے کاروبار کے اوزار ہیں۔ اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہے تو سمجھ جاؤ گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ آئندہ اگر تم یہاں آئے یا میرے بیٹے کو پریشان کیا یا اس کے بارے میں باتیں پھیلائیں کہ وہ تمہاری بہن کو ہراساں کررہا ہے تو میرا بھائی بلیکی کسی روز رات میں پکڑ کر تمہیں یہاں لے آئے گا۔ پھر ہم تمہیں اپنے تہ خانے میں بند کردیں گے جہاں سے تم کبھی نہیں نکل سکو گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''
میں مزید کچھ نہ کہہ سکا، بس گردن ہلا دی۔
''شاباش۔ اب یہاں سے دفع ہوجاؤ۔''
اگلے روز صبح جب میں اپنے کمرے سے باہر آیا تو ماں نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ ''تمہیں کیا ہوا؟''
''دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔''
اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے میری ناک اور گال کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''اوہ، ہینک! تمہیں تو بہت زیادہ چوٹ آئی ہے۔ تم کچھ چھپا رہے ہو؟''
میں نے اسے ٹالنا چاہا لیکن وہ سمجھ چکی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں کیا کروں۔ کل جب میں نے کارا کا چہرہ دیکھا تو میں پولیس اسٹیشن گئی تھی لیکن انہوں نے کہا کہ جب تک کارا شکایت درج نہ کروائے، وہ کچھ نہیں کرسکتے اور تم جانتے ہو کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی۔''
میں نے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''مام! میں آئندہ احتیاط کروں گا۔''
''مجھ سے وہ وعدہ مت کرو جو تم پورا نہیں کرسکتے۔''
یہ کہہ کر وہ نیچے چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔
دو دن بعد میرا چہرہ کچھ بہتر ہوگیا۔ اس دوران میں نے بہت کچھ سنا۔ لوگ سرگوشیوں اور اشاروں میں ڈیوی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں باتیں کررہے تھے کہ انہوں نے کس طرح میری پٹائی کی۔ ایک رات میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ یوں لگا جیسے میں نے کچھ سنا ہے۔ میں بستر سے باہر نکل کر راہداری میں آیا۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی۔ ''کارا......''
''چلے جاؤ۔''
اس کی سسکیوں کی آواز اور تیز ہوگئی۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''کارا! دروازہ کھولو ورنہ میں خود آجاؤں گا۔ میں دس تک گنتی گن رہا ہوں۔''
''تمہاری اتنی ہمت نہیں ہوسکتی۔''
''ایک دو تین......''
دس کہہ کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ کارا باتھ ٹب میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے جسم کے گرد ایک بڑا سا تولیا لپیٹ رکھا تھا۔ میں اس کے قریب گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔
''کوئی نئی بات؟'' میں نے پوچھا۔
وہ ناک سڑکتے ہوئے بولی۔ ''اوہ ہینک! میں اس کے چنگل سے نہیں نکل سکتی۔ میں اس سے الگ ہونا چاہتی ہوں لیکن وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کہا کہ وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔''
آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے اور اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ ''میں کیا کروں ہینک...... میں کیا کروں؟ وہ مجھے تکلیف پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔''
میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ کرتا ہوں۔''
وہ اپنی ناک اور آنکھیں صاف کرتے بولی۔ ''اوہ ہینک! تم کیا کرو گے؟ تم کیا کرسکتے ہو؟''
میں نے ٹب میں پڑے ہوئے پانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ سوچتا ہوں۔ مجھ پر بھروسا کرو۔''
اگلے دن میں نے موسم کا حال معلوم کیا۔ پیش گوئی کے مطابق اتوار کو موسم گرم اور حبس کی توقع تھی۔ ایک رات پہلے میں سپر مارکیٹ میں دیر تک رکا رہا اور جب گھر آیا تو تھکن کی وجہ سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔
اتوار کی صبح میں نے نہانے کا لباس پہنا۔ کندھے پر

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تولیا ڈالا اور کارا کی سائیکل پر سوار ہو کر جھیل کی طرف چل دیا۔ صبح سویرے بھی وہاں اچھی خاصی رونق تھی۔ میوزک بج رہا تھا اور کچھ لڑکے بیئر سے دل بہلا رہے تھے جو وہ کاغذ کے تھیلوں میں چھپا کر لائے تھے۔ میں ایک ٹیلے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ کچھ لڑکے اور لڑکیوں نے روک سے جھیل میں چھلانگ لگائی۔ دو لڑکے زیادہ بہادر تھے۔ انہوں نے غوطہ لگانے کے لیے بشپ کا انتخاب کیا۔ البتہ ان میں سے کوئی اتنا بہادر نہیں تھا جو کنگ پر سے چھلانگ لگانے کی ہمت کرتا۔

کچھ دیر بعد ڈیوی میری بہن کا ہاتھ پکڑے نمودار ہوا۔ کارا کو دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی گھسیٹا جا رہا ہے۔ ڈیوی کے ساتھ تین لڑکے اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک نے بڑا سا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ چند منٹوں میں وہاں ایک کمبل بچھا دیا گیا۔ وہ اپنے ساتھ ڈیک بھی لائے تھے۔ چند لمحوں میں فضا تیز موسیقی کی آواز سے گونجنے لگی۔ کارا نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے بے بسی اور لاچارگی نظر آئی۔ میرا سینہ جلنے لگا اور ذہن میں ڈیڈی کے الفاظ گونجنے لگے جو انہوں نے محاذ پر جاتے وقت کہے تھے۔

''میرے بعد تم اس گھر کے سربراہ ہو۔''

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور ڈیوی کی جانب چل دیا۔ وہ کارا سے کچھ کہہ رہا تھا کہ میں نے جھک کر ڈیک بند کر دیا۔ ڈیوی سمیت وہاں موجود سب لوگ مجھے دیکھنے لگے۔ وہ کچھ کہنے والا تھا کہ اس سے پہلے میں بول پڑا۔

''تم بہت طاقتور ہو۔ اس دن تمہاری پھرتی دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تمہیں اس کا اندازہ ہو گیا...... ریڑھی چلانے والے۔''

''لہٰذا میرے بار بار کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ تم ایک بار پھر مار پیٹ کر مجھے خاموش کر دو گے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' اس نے کہا۔

''لیکن اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ تم میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔''

''لگتا ہے کہ تم نے اسے اپنے لیے ایک مسئلہ بنا لیا ہے؟''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ہاتھا پائی کرنا وحشی پن ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم واقعی بہادر ہو۔''

اس کی مسکراہٹ رخصت ہو گئی اور وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''ہمت۔'' میں نے کہا۔ ''میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کتنے بہادر ہو؟''

''تم نے مجھ سے زیادہ بہادر نہیں دیکھا ہوگا۔'' وہ اکڑتے ہوئے بولا۔

''ثابت کرو۔''

اس وقت تک اسکول کے لڑکے اور لڑکیاں ہمارے گرد دائرے کی شکل میں جمع ہو گئے تھے۔ ڈیوی غصے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔''

میرا حلق خشک ہو رہا تھا پھر بھی میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''تم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ بہت بہادر ہو۔ لہٰذا اسے ثابت کرو۔''

وہ میرے قریب آ کر بولا۔ ''تمہارے دماغ میں کیا ہے...... میں کس طرح ثابت کروں؟''

میں نے تین چٹانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں کے درمیان چھلانگ لگانے کا مقابلہ ہوگا۔ ہم روک سے شروع کریں گے۔ اس کے بعد بشپ پر جائیں گے اور آخری چھلانگ کنگ سے لگائی جائے گی۔ پہلے میں جاؤں گا اور تم میرے پیچھے آؤ گے۔ اگر میں تینوں جگہ سے چھلانگ نہ لگا سکا تو پھر تمہارے اور اپنی بہن کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا لیکن اگر میں نے تینوں چھلانگیں لگا لیں اور تم ناکام رہے تو ہمیشہ کے لیے میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو گے...... بولو منظور ہے؟''

اس نے پیچھے ہٹ کر دائیں ہاتھ کا مکا میرے پیٹ پر مارا۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے اور میں کمر کے بل زمین پر گر پڑا۔ ڈیوی میرے قریب آ کر بولا۔ ''یہ ڈیل کیسی ہے؟''

''مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کرو گے۔'' میں نے کھانستے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں مایوسی نہیں ہوئی ہوگی؟''

میں نے اپنے ہاتھوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

''طاقت کا استعمال کوئی بہادری نہیں ہے۔''

ڈیوی کی مٹھیاں ایک بار پھر بھنچ گئیں۔ اسی وقت مجھے سے ایک آواز آئی۔ ''آگے بڑھو ڈیوی۔ بتا دو کہ تم کتنے بہادر ہو۔''

وہاں موجود سب لوگوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ ایک لڑکی بولی۔ ''تم ہمیشہ اپنی بہادری کے دعوے کرتے ہو۔ آج ہمیں بھی دکھا دو۔''

کچھ لوگوں نے اس کی ہمت بڑھانے کے لیے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تالیاں بجانا شروع کردیں۔ ڈیوی الجھن میں پڑ گیا۔ میں نے اپنا تولیا اٹھایا اور کہا۔ ''میں روک، پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں وہاں سے چل دیا۔ مجھے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ روک پر پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ ڈیوی میرے تعاقب میں آرہا تھا۔ اس کے پیچھے لڑکے اور لڑکیاں ایک قطار میں چل رہے تھے۔ کارا ان سب سے پیچھے تھی۔

ڈیوی میرے برابر میں آکر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''پہلے تم جاؤ۔''

میں نے قدم آگے بڑھایا اور چھلانگ لگا دی۔ اس جگہ پانی کی گہرائی کم تھی پھر بھی میری ناک میں پانی چلا گیا اور میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں چند سیکنڈ میں ہی پانی پر چلتا ہوا اوپر آگیا۔

ڈیوی نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ چھلانگ نہیں تھی۔ تم نے صرف غوطہ لگایا تھا۔''

میں پانی پر چلتا ہوا خشکی پر آگیا جبکہ ڈیوی نے دوڑتے ہوئے مکمل چھلانگ لگائی۔ وہاں کھڑے ہوئے لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔ میں روک سے گزرتا ہوا بشپ کی طرف چل دیا۔ وہ جگہ پانی کی سطح سے تیس فٹ اونچی تھی۔ میں وہاں سے چھلانگ لگانے کا تصور کر کے ہی کانپ گیا۔

میں نے دعائیہ انداز میں چہرے پر ہاتھ پھیرا اور بڑی احتیاط سے چھجے کے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا پورا جسم بری طرح کپکپا رہا تھا۔ میرے سر کی پشت پر کسی نے گیلا ہاتھ مارا۔ ڈیوی میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔

''اوہ میرے خدا! بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ کیا تم یہاں سے چھلانگ لگا سکو گے؟ بہتر ہے کہ تم اپنا ارادہ ترک کر دو، حالانکہ ابھی میرا دل تمہاری بہن سے نہیں بھرا۔''

چند سیکنڈ پہلے میں بہت زیادہ خوف اور ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا اور مجھے یقین نہیں تھا کہ اتنی اونچائی سے چھلانگ لگا سکوں گا لیکن ڈیوی کی بات سنتے ہی میں کود پڑا۔ میں نے غلط چھلانگ لگائی تھی۔ اتنی اونچائی سے چھلانگ لگاتے ہوئے دونوں ٹانگیں سیدھی اور آپس میں ملی ہوئی ہونی چاہئیں لیکن میں نے اس طرح چھلانگ نہیں لگائی تھی۔

میں پانی کی سطح سے بہت بری طرح ٹکرایا اور میری چیخ نکل گئی۔ میرے منہ میں پانی چلا گیا اور میں جھیل کی تہ میں اترنے لگا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے تیرنے کی کوشش کی اور بڑی مشکل سے کنارے تک پہنچا۔ لڑکیاں اور لڑکے کنارے پر کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ بلندی پر کھڑے ہوئے ڈیوی نے دونوں بازو اوپر اٹھائے اور مذاق اڑانے کے انداز میں مجھے داد دی۔ میرے پورے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ میں بہت تھک چکا تھا۔ بمشکل تمام گرتا پڑتا خشکی تک پہنچا۔ مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور بری طرح کھانس رہا تھا۔ ڈیوی نے جوش اور مسرت کے عالم میں بشپ سے چھلانگ لگائی اور بغیر کسی دشواری کے پانی پر تیرنے لگا۔

میں بمشکل تمام کھڑا ہوا اور دوبارہ اوپر کی جانب جانے لگا لیکن کارا اور ماں نے میرا راستہ روک لیا۔ ماں نے میرا بازو پکڑا اور بولی۔ ''تم اسے یہیں روک دو۔ وہ جگہ بہت اونچائی پر ہے۔''

میں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا ماں۔ میں شرط لگا چکا ہوں۔''

''ہم اس کے علاوہ بھی کچھ کر سکتے ہیں۔''

''کیا؟'' میں نے کہا۔ ''ہم ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ چکے ہیں۔''

''لیکن تم زخمی ہو۔''

میری ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور بازوؤں پر خراشیں آگئی تھیں۔ ڈیوی اور اس کے دوست میرے پیچھے آرہے تھے۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''ماں! چلی جاؤ...... فوراً چلی جاؤ۔''

وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن میں لنگڑاتا ہوا کنگ کی جانب چل دیا مگر کارا وہیں کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اونچائی پر پہنچ کر میری ٹانگیں بری طرح لڑکھڑا رہی تھیں اور مجھ سے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میں صرف ایک مرتبہ یہاں آیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کتنی اونچائی پر ہے۔ میں نے کنارے پر کھڑے ہو کر نیچے جھانکا۔ پہلے مجھے بشپ بہت اونچی لگ رہی تھی لیکن اب کنگ کے مقابلے میں وہ مٹی کا ڈھیر لگ رہا تھا۔

ڈیوی میرے برابر آکر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم یہاں سے چھلانگ لگا سکتے ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''تو پھر لگاؤ...... دیر کیوں کر رہے ہو؟''

میں نے قدم آگے بڑھایا۔ میری کپکپاہٹ بڑھ گئی۔ میرے گھٹنے جڑ گئے تھے۔ میں کنارے کے بالکل قریب تھا۔

''جلدی کرو بڑے بھائی!'' ڈیوی نے کہا۔ ''آج میرا تمہاری بہن کے ساتھ لمبا چوڑا پروگرام ہے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں نے اگلا قدم بڑھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ میں چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا۔ میں پیچھے ہٹا۔ ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔

ڈیوی نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم یہ نہیں کرسکو گے۔ اب میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ مجھے اور بھی کام کرنے ہیں۔''

مجمعے سے ایک آواز آئی۔ ''ڈیوی! مت بھولو کہ تم نے شرط لگائی ہے۔''

ایک بچہ آگے بڑھا اور بولا۔ ''ہم سب نے دیکھا کہ تم نے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔ شرط یہ تھی کہ تم بھی کنگ سے چھلانگ لگاؤ گے۔''

ڈیوی رک گیا۔ چند اور آوازیں آئیں۔ ''ہاں، یہی شرط لگی تھی۔''

''تمہیں چھلانگ لگانی تھی۔''

عقب سے ایک آواز آئی۔ ''تم بزدل نہیں ہو، کیا یہ چاہتے ہو کہ تمہارے ڈیڈی تمہیں بزدل سمجھیں۔''

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے ایک گندی گالی دی اور چھلانگ لگانے کے ارادے سے کنارے کی طرف بڑھ گیا۔ جس جگہ میں لیٹا ہوا تھا، وہاں سے اسے چھلانگ لگاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا لیکن بعد میں مجھے بتایا گیا کہ اس نے بہترین انداز میں چھلانگ لگائی تھی۔

میں زمین سے اٹھا۔ اپنے ہاتھ پیروں سے مٹی اور کنکر صاف کیے اور لنگڑاتا ہوا نیچے کی جانب چل دیا۔ کسی نے میری جانب توجہ نہیں دی۔ ہر کوئی نیچے جھیل کے پانی میں دیکھ رہا تھا۔

کارا اور ماں نے مجھے پکڑا اور مجھے گھر تک لے جانے میں مدد کی۔ میں نے رونا شروع کردیا اور کچھ ایسے الفاظ ادا کیے جو مجھے نہیں کہنے چاہیے تھے۔ ماں نے پوچھا کہ میں کیا کہہ رہا تھا لیکن میں خاموش رہا پھر اسی وقت ہم نے سائرن کی آواز سنی۔

☆☆☆

''یہ تھی وہ کہانی۔'' میں نے پولیس آفیسر سائمن سے کہا۔ ''ڈیوی کی لاش چند گھنٹوں بعد مل گئی اور دو مہینے کے اندر اس جھیل کو مٹی اور پتھروں سے بھر دیا گیا۔''

سائمن نے کہا۔ ''بہت ہی دردناک کہانی ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے۔''

''یقیناً!'' وہ بولا۔ ''اب کہاں جاؤ گے؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ائرپورٹ جانے سے پہلے ماں اور کارا سے ملنا چاہتا ہوں۔ کارا کے بچے مجھ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔''

''اگر تم برا نہ مناؤ تو ایک سوال پوچھوں؟''

''ضرور......''

''وہ آخری غوطہ لگانے کے بعد تم کیا کرتے رہے؟''

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اس موسم گرما میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ میری ماں کو بینک میں بہتر ملازمت مل گئی اور کارا نے لڑکوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ چند برس بعد اس کی شادی ہوگئی اور پیٹرک کولن بیٹے کی موت کے کچھ عرصے بعد ہی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی بنا پر پکڑا گیا۔''

''اور تم؟''

''میں نے فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔''

''وہاں تم کیا کرتے ہو؟''

''تم شاید یقین نہ کرو۔ میں چھاتہ بردار دستے میں ہوں۔''

''اچھا۔'' وہ حیرت سے بولا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں بلندی سے ڈر لگتا ہے۔''

''میں نے کہا نا کہ اس موسم گرما میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔''

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ لڑکا ڈیوی جھیل میں غوطہ لگاتے ہی مرگیا۔''

''ہاں، اس کا سر کسی دھاتی شے سے ٹکرایا اور وہ شدید زخمی ہوگیا۔ پولیس کی تحقیقات کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ مقامی آبادی کے کچھ لڑکے جھیل میں ناکارہ سامان پھینک رہے تھے۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کیا سامان تھا؟''

''مجھے یاد نہیں۔''

چند قدم چلنے کے بعد اس نے کہا۔ ''تم نے بتایا کہ گھر جاتے وقت تم کچھ بڑبڑا رہے تھے اور تمہاری ماں نے پوچھا بھی تھا لیکن تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے کیا کہا تھا؟''

''نہیں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

میں نے دل میں سوچا کہ ہاں مجھے یاد ہے، میں نے کیا کہا تھا۔ ''بالآخر تمہیں شاپنگ ٹرالی مل ہی گئی ڈیوی اور وہ بھی بے شمار۔'' یہ اعتراف کرنے کی ضرورت نہیں کہ ایک رات پہلے وہ میں نے ہی جھیل میں پھینکی تھیں۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

چھٹا حصہ

رنگ آسماں

اے۔آر۔راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شراہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدانِ جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلّی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔کوہِ شالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں کی دلکش وادیوں میں ایک مختصر قافلہ محوِ سفر ہے۔اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔اس قافلے میں اس کی نیلی آنکھوں والی جوان اور حسین بیٹی ریٹا بھی شامل ہے۔اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔پروفیسر ہنری کا ایک اوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن کارشیا بھی ساتھ ہیں۔ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک بانکا سجیلا کڑیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔یہ جنرل مائیکل شا کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔شوکت عرف شوکی، ریٹا کو دل بیٹھا ہے مگر ہزاجا گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔کوہِ شالیہ کی تین خودمختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔اس گروپ میں علی ریحان بھی تھا جو فوجِ آزادی کے سپہ سالار جنرل قمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا تھا۔اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔اور یہ گروہ "کاروانِ مجاہد" کہلاتا ہے۔باقی دو ساتھی شرجیل اور قیصر شاہ تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی... سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔غاصب فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کوہِ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کر سکیں۔یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا "مسلسلۂ تسلط" کوہِ شالیہ کی ان تینوں قابلِ ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔لہٰذا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بہ ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں تر پال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جاسکے۔تر پال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔مہارانی نجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔مہارانی نجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سوجتا بھی ہے۔مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے۔جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔مہارانی نجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔پرتاب کمار دودھ پی لیتا ہے اور راج محل میں ایک کہرام بپا ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مہاراجا چندر گپتا کا انتقال ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے ان کی پتنی مہارانی نجو بائی نے چیخم دھاڑ مچائی تھی اور اس میں کوئی رنگ آمیزی یا ڈراما نہیں تھا۔وہ واقعی سینہ کوبی کر رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے بہنے والا پانی، حقیقت میں آنسو ہی تھے۔ایک عورت کے لیے بیوگی کا جو کرب اور سہاگ کے اجڑنے کا جو ملال ہوتا ہے، وہ اس کے غم زدہ چہرے سے صاف عیاں ہوتا تھا۔غم کی یلغار سے پہلے پہل تو نجو بائی پر اپنے شوہر کا مرا ہوا چہرہ دیکھ کر ایک عجیب سی دہشت سی طاری ہو گئی تھی۔

یہ اس کی دوسری چال تھی جو نا کام ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس بار خود اس کے گلے کا ہار بھی بن گئی تھی۔وہ کسی معمولی شخص کی پتنی نہیں تھی، ایک مہاراجا کی بیوی تھی، جو ریاست کا ان داتا تھا، ایک بادشاہ تھا اور اسی کی نسبت سے نجو بائی بھی مہارانی تھی۔اس حوالے سے اس کا بھی طنطنہ تھا۔شوہر کا اگر ریاست میں دبدبہ تھا تو مہارانی نجو بائی کا راج محل میں...... بیوی کا دم خم شوہر سے ہوتا ہے، اولاد سے نہیں۔وہ چاہے کتنے ہی گبرو بیٹوں کی ماں ہو، اگرچہ ایک گبرو بیٹے کی وہ بھی ماں تھی۔مہارانی نجو بائی اب "مہارانی" نہیں رہی تھی، فقط کہلائی جانے والی مہارانی رہ گئی تھی لیکن یہاں تو مسئلہ اور تھا...... اس کا دوسرا بیٹا جس نے اس کی کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا، وہ ولی عہد تھا۔راج کے سنگھاسن پر اب وہی گدی نشین ہونے والا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

عجیب بات تھی جسے اس کے حق سے دور کرنے کی سازشیں کی جارہی تھیں، اب تقدیر نے جیسے وہ حق اسے پلیٹ میں سجا کر پیش کر دیا تھا۔ موت کا گڑھا اس کے لیے کھودا گیا تھا مگر اس میں گر کوئی اور گیا تھا اور ایسا گرا تھا کہ اپنے ساتھ کسی اور کو بھی لے کر گرا تھا۔

نجو بائی کو تو اس سانحے پر یقین کرنے میں بھی کئی لمحوں کا تامل کرنا پڑا تھا۔

”یہ کیسے ہو گیا؟ مرنا کسی کو تھا اور مر کوئی اور گیا......؟ آہ...... بدری ناتھ! یہ کیسا انیائے کر دیا تو نے مجھ پر مورکھ! یہ کیسا زہر دے دیا تو نے......“

وہ زخمی دل اور جھیر جھیر کلیجے کے ساتھ کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کو بددعائیں دینے لگی، مگر پھر دہشت زدہ ہو کر چپ ہو گئی۔ ایک دم خوف زدہ ہو کے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ بھگتی تھی کہ اپنے ”رازداں“ کا نام بھولے سے بھی لینے پر اس کی رہی سہی مکتی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔

وہ سینہ کوبی اور ماتم کرتی رہی۔ بیٹی سوجنا اور خادمائیں اسے سنبھالنے کے جتن کیے جارہی تھیں۔ خود سوجنا کی حالت باپ کے اچانک مرنے پر غیر سی ہو رہی تھی۔ بڑا بیٹا پرتاب تو جیسے سکتے میں آ گیا تھا۔ ابھی تو اسے اصل حقیقت کا علم ہی نہ تھا کہ پردے کے ”در پردہ“ ہو کیا گیا تھا؟

اس نے دوہتڑ بچھورام کے سینے پر بھی رسید کر کے پوچھا تھا۔

”بدبخت مورکھ! یہ کیا کر دیا تو نے......؟ کس کے دودھ میں کس کے لیے زہر ملا دیا تو نے؟“

بچھورام کی خود اپنی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ بولا۔

”مم...... مہارانی صاحبہ! میں نے ولی عہد کے ہی مخروطی اور کھلے پیندے والے گلاس میں زہر ملایا تھا۔ پتا نہیں گلاس کیسے بدل گیا؟ دودھ پہنچانے کی ذمے داری بھی نرملا کی تھی، پر تو لگتا ہے دودھ کا گلاس ہی نہیں بدلا...... دودھ کا گلاس پہنچانے والا بھی بدقسمتی سے بدل گیا تھا۔“

”تو نے میرا ستیاناس کر دیا بچھورام......! بلکہ سارے منصوبے کا ستیاناس کر دیا۔“

مہارانی... کو فرط غم و اندوہ سے صحیح معنوں میں غش تو تب ہی آیا تھا جب اس نے ولی عہد پرتاب کو بالکل بھلا چنگا اپنے سامنے دیکھا تھا۔ اس کے دل خرابہ کے کہیں کونے میں یہ امید جگنو بن کر چمکی ضرور تھی کہ شاید...... شاید دودھ ملا گلاس ایک کے بجائے غلطی سے دو میں ملا دیا گیا ہو، غلطی سے مہاراجا کا اور ”منصوبہ بندی“ سے ولی عہد پرتاب کا بھی گلاس زہر ملا دودھ کا ہو۔ چاہے پھر راج محل سے دو لاشیں اٹھ جاتیں، نجو بائی کو اس کا ملال کم ہی ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

پرتاب اس کے سامنے چاق و چوبند کھڑا تھا اور وہیں نجو بائی نے غش کھایا تھا۔ غم سے بھی اور اس ناکامی سے بھی کہ تقدیر کی طرفہ کاری نے دو ہاتھ سے تالی بجا کر اس کے دونوں گال پیٹ ڈالے تھے......

☆☆☆

وہ اس قدر بھیانک چہرہ تھا کہ علی ریحان جیسا مضبوط دل گردے کا جری شخص بھی ایک لمحے کو دہشت زدہ ہو کے چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس میں شاید کچھ اثر ماحول کا بھی تھا۔ برستی طوفانی رات، پہاڑی جنگل اور مسافروں سے عاری مال گاڑی کی یہ آخری مختصر بوگی کی محدود گھٹی گھٹی فضا......

علی دوسری دیوار کے زنگ آلودہ بنک بیڈ سے جا لگا تھا۔ اس طرح کہ جھٹکا کھا کے اس پر بیٹھنے کے انداز میں گر سا گیا تھا۔ ایسے میں علی کی پھیلی ہوئی نظریں اپنے سامنے کے بوسیدہ بنک بیڈ پر دھرے اس بھیانک چہرے والے وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ کمبل اس کے چہرے سے ہٹا ہوا تھا۔ اب ادھ رخی چہرہ اور بھی ڈراؤنا ہو گیا جو چھت کو گھورتا محسوس ہوتا تھا۔

وہ بے ماس کا استخوانی چہرہ ایسا تھا کہ اس کا ایک گال پھٹا ہوا تھا، وہاں سے جبڑے کے دانتوں کی جھلکتی نصف قطار بھیانک دکھائی دیتی تھی۔ ناک غائب تھی اور اس کی جگہ جلا ہوا گوشت کا لوتھڑا نظر آتا تھا جس میں دو سوراخ تھے۔ دوسرے گال کی کھال اتری ہوئی اور وہاں سرخ بوٹی جیسا گوشت بھی کہیں کہیں سے سیاہ پڑا ہوا نظر آتا تھا۔ آنکھیں دونوں ہی کھلی ہوئی تھیں مگر اس طرح کہ ایک آنکھ کا ڈھیلا پھٹا ہوا باہر کو ابلا پڑا ہوا تھا۔ کھوپڑی اس کی گنجی تھی مگر اس طرح کہ جیسے اس کے سر کے بال بری طرح نوچ نوچ کر اتارے گئے ہوں۔ جس کے باعث اکثر جگہوں سے کھال بھی اتری اور پھٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ جہاں خون بھی کہیں کہیں سے سرخ اور کہیں سے جم کر سیاہ لکیریں ڈال چکا تھا۔

بوسیدہ سا کمبل چہرے سے سرک کر سینے تک اور پھر گاڑی کے تسلسل جھٹکوں کی وجہ سے وہاں سے بھی سرک کر نیچے گرنے کو تھا کہ اسی وقت اس نیم جاں خستہ حال وجود میں جنبش پیدا ہوئی اور اس کا ایک ہاتھ جس کا گوشت بھی زخم خوردہ ہی نظر آتا تھا اور ہڈیاں سی نظر آ رہی تھیں، اوپر کو اٹھا، جیسے دیوار کا سہارا لینا چاہ رہا ہوا اٹھنے کے لیے...... یوں اس پر پڑا باقی ماندہ کمبل بھی سرک کر نیچے گر پڑا اور علی کی پھیلی ہوئی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

آنکھوں نے ایک مُردہ نما سے انسان کو جس کے لاغرو استخوانی سے نظر آتے زخم آلودہ وجود پر لباس بھی لیروں کی شکل میں جھول رہا تھا، اٹھ بیٹھا۔

دونوں آمنے سامنے بنک بیڈ پر بیٹھے ایک دوسرے کو تکے جارہے تھے۔

مال گاڑی ٹھکا...... ٹھک...... ٹھکا...... ٹھک...... کی آواز سے دوڑی جارہی تھی۔ وسط میں رکھی کوئلوں والی انگیٹھی کی گرمائش اور اس کے سلگتے دہانے سے پھوٹتی تیز جہنمی سرخی سے گارڈ بوگی کا محدود ماحول عجیب منظر پیش کررہا تھا۔ ایسے میں یہ بھیانک وجود اس کے سامنے تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کی ہڈیوں میں کوئی دم ہی نہ رہا تھا۔ اس سے تو شاید بیٹھا بھی نہیں جارہا تھا، وہ پشت کے بل دوبارہ اسی طرح لیٹ گیا۔

تب علی نے حوصلہ پکڑا...... وہ سمجھ گیا کہ اس میں ایسی کوئی خوفناک یا دہشت ناک بات نہیں البتہ اسراریت ضرور ہے۔ بھوت پریت پر تو وہ ویسے ہی یقین نہیں رکھتا تھا، تاہم اس کے پسِ پردہ کیا اسرار تھا؟ وہ یہ جاننے کے لیے اب پورے حوصلے اور ہمت کے ساتھ کمربستہ ہوگیا۔ اب اسے کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ اس کے سامنے کوئی ماورائی مخلوق نہیں ہے بلکہ یہ خود زخم خوردہ ہے اور شاید مدد و دستگیری سے بھی کوسوں دور جاچکا ہے تو کیوں نہ اس سے حال معلوم کیا جائے۔

''کک...... کون ہو تم......؟'' علی ریحان نے دل ہی دل میں آیت کریمہ کا ورد کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوکر کہا۔ ابھی تک علی ریحان یہ تخصیص نہیں کرپایا تھا کہ یہ کوئی مرد تھا یا عورت......؟ اس بدنصیب انسان کا جسم اس قدر سوکھا سڑا اور زخم خوردہ تھا کہ صاف لگتا تھا کہ اس پر یا تو انسانیت سوز تشدد کیا گیا ہے یا پھر یہ کسی کوڑھ جیسی خطرناک بیماری میں مبتلا رہا ہے۔

وہ کوئی بھی تھا اس نے بولنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا ساتھ نہ زبان دے رہی تھی نہ ہی کٹا پھٹا منہ...... تب ہی اس نے اپنے ایک مدقوق سے کپکپاتے ہاتھ کا اشارہ اپنی ٹانگوں کی طرف کیا۔

علی ریحان اب بہ غور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اس کی حالتِ زار کو دیکھ کر سمجھ تو چکا تھا کہ یہ جاں بہ لب شخص بولنے سے قاصر ہے۔ اسی لیے اشاروں سے مقدور بھر کام لینے کی کوشش میں ہے۔

لہٰذا اس نے بھی اشارے کی سمت دیکھا، مگر کچھ نہ سمجھ پایا۔ تب اسے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہونا پڑا کہ شاید اس کی ٹانگوں کی طرف کچھ پڑا نظر آجائے، مگر ندارد۔ اسے کوئی بھی ایسی شے نظر نہ آئی۔

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو......؟'' علی نے ذرا اس کے قریب آتے ہوئے اور اس پر تھوڑا جھک کر کہا۔ اس آدمی کے اندر دوبارہ اپنا استخوانی اور جلا کٹا ہاتھ اٹھانے کی شاید مزید سکت باقی نہیں رہی تھی۔ بلکہ اس سے تو سانس بھی نہیں لیا جارہا تھا۔ وہ بھی اٹک اٹک کر چل رہی تھی۔ لیکن علی نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ کچھ بولنے کی کوشش کررہا تھا مگر ناکام رہا اور اس کے بعد اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ وہ شاید آخری سانسوں پر تھا، اب وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔

علی ریحان مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ چند ثانیے اسی طرح پُرسوچ انداز میں کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ خود اس وقت مخدوش صورتِ حال کا شکار تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پلٹا اور دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

مال گاڑی اپنی مناسب رفتار سے دوڑی جارہی تھی۔

باہر طوفان بادوباراں کا شور بھی اب ذرا تھمنے لگا تھا۔

علی ریحان نے دماغ پر زور دیا۔ اس کا مال گاڑی میں سوار ہونا، اس بدنصیب شخص کی آخری سانسوں کا اس کی موجودگی میں ختم ہونا یہ سب خالی از علت نہ تھا۔ وہ منطقی انداز میں یہ سب سوچتا جارہا تھا۔

''کیا یہ مشیتِ ایزدی تھی؟ کیا اس میں اللہ کے کسی حکم کا دخل تھا؟ کیا قدرت کی مصلحت اس سے اور بھی کوئی کام لینا چاہتی تھی؟ ورنہ اس بدنصیب آدمی کی جیسی حالت تھی وہ اس کی آمد سے پہلے بھی تو مر سکتا تھا؟ تب ہی اس کے سوچتے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

اس آدمی نے اپنے پیروں کی طرف اشارہ کیا تھا جو وہ نہیں سمجھ پایا تھا۔ اس نے بولنے یا شاید کچھ بتانے کی بھی کوشش کی تھی، مگر اس کی ہیت کذائی ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ بولنے سے تو کیا حرکت کرنے سے بھی قاصر رہا تھا۔

تب ہی علی ایک بار پھر کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھا۔ وہ اس کی لاش کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد اس کی نظر اس کے نچلے وجود پر پڑی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اسے اس کا چیتھڑوں میں لباس بھی پورا نہیں نظر آرہا تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر لالٹین اٹھالی اور اس کی لو تھوڑی اونچی کرنا چاہی تو بھی روشنی میں کوئی فرق نہ پڑا۔

وہ اسی طرح مدھم اور پیلی یرقان زدہ سی رہی۔ اس کی بتی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے لالٹین اٹھا کر لاش کے نچلے دھڑ کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

قریب کی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ، پشت اور ٹانگوں کو چھونے کی کوشش کرتا رہا اور تب ہی اچانک اس کا ہاتھ لاش کی ٹانگوں سے نیچے پنڈلیوں پر بندھے کسی ابھار پر پڑا۔

شلوار تھوڑی اونچی کی تو وہاں اسے کوئی شے بندھی ہوئی نظر آ گئی۔ علی نے فوراً اس کی ڈوری کھینچی تو وہ شے نیچے گر پڑی۔ وہ چونکا مگر ٹھہرا نہیں۔ اس نے وہ شے فوراً ہی جھک کر اٹھالی۔ دیکھا تو وہ رول کیا ہوا ایک کھال سا کپڑا تھا۔ کھولنے کے بعد اس پر بوسیدہ سا کاغذ کا ٹکڑا چپکا ہوا تھا اور اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔

یہ ہندی اور اردو میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے حروف سے ایسا نظر آتا تھا جیسے...... یہ سب کچھ جلدی جلدی لکھا گیا ہو اور روشنائی بھی پھیکی پھیکی سی تھی۔ یہی نہیں لکیروں کی مدد سے کوئی خاکہ بھی کھینچا گیا تھا جیسے کسی لکیر کے اختتام میں گول دائرہ تھا تو کوئی لکیر دائیں جانب مڑ کر ختم ہوتی تھی اور اس کے آخر میں چوکور نشان، ایک جگہ بہتے آنسو جیسا چھوٹا خاکہ کھینچا گیا تھا۔ کہیں ہلالی چاند کی تصویر بنائی گئی تھی، غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اسے کشتی ظاہر کیا گیا ہے، کیونکہ اس کے نیچے باریک سی لہراتی لکیریں کھینچ کر پانی دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

علی کو ملی جلی ہندی اردو کی شد بد تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ ایک تو الفاظ بکھرے اور ٹوٹے پھوٹے سے تھے، دوسرے روشنی بہت مدھم تھی۔ جو تھی علی کو وہ بھی جاتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، ہاں البتہ سردست اسے ایک نام ہی پڑھا گیا تھا وہ بھی خاصی مشکل سے اور وہ اس نام کو پڑھ کر چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

☆☆☆

خیمے لگانے میں سب نے ملازمین کے ساتھ ہاتھ بٹایا تھا تاکہ کام جلدی نمٹ جائے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ خیمے لگا دیے گئے تھے اور ہر کوئی اپنا اپنا سامان وہاں رکھنے لگا۔

شوکی بھی ڈرائیور امجد خان اور نندو بابا کے ساتھ مصروف تھا۔ خیموں کی تعداد تین رکھی گئی تھی۔ ایک خیمہ رابرٹ اور گارشیا نے اپنے لیے الگ بنایا تھا۔ دوسرا خیمہ رینا کا تھا جہاں اس نے دونوں بوڑھے ملازم میاں بیوی نندو بابا اور شانتا کو رہنے کی اجازت دی تھی۔ تیسرے خیمے میں شوکی اور امجد خان تھے۔ یہ سارا کام خاموشی سے نمٹایا گیا تھا اور جانے کیا بات تھی کہ یہاں کے ماحول میں بھی کچھ ایسا تھا جس نے انہیں ایک چپ سی لگا رکھی تھی۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے راکاشی کی یہ وادی ناگرہ ریاست کی آخری حدود میں واقع تھی، جس کے ایک جانب دو طرفہ رخ میں جنگلاتی ڈھلوانوں والی پہاڑیاں اور دوسری سمت میں جنگل تھا۔ اگرچہ اس کے پار بھی پہاڑی چوٹیاں نظر آتی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے پار بھی پہاڑیوں کا عظیم سلسلہ تھا۔ یہ وادی ناگرہ آبادی سے تقریباً پندرہ بیس کوس کے فاصلے پر تھی۔

موسم کے تیور بدلنا شروع ہو گئے تھے اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف کے تاج سجنے لگے تھے۔ فضا میں ایک خوشگوار سی ٹھنڈک کا احساس موجود تھا۔

تینوں خیمے مثلث کے زاویوں کی صورت میں نصب کیے گئے تھے کہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہیں۔ جبکہ درمیان میں الاؤ روشن کرنے کی صورت میں تینوں خیموں تک آگ کی حدت پہنچتی رہے۔

وسط میں الاؤ بھڑکا دیا گیا تھا اور اب وہاں نندو بابا اور اس کی بیوی کافی تیار کرنے میں مصروف تھے۔ شوکت حسین اور امجد خان نے الاؤ کے گرد تین کرسیاں لگا دی تھیں۔ وہ اب چھوٹا موٹا کام نمٹانے اور آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ایسے میں رینا اپنے خیمے سے برآمد ہوئی اور ایک نگاہ شوکی پر ڈالنے کے بعد وہ الاؤ کے گرد دھری کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہو گئی۔

قریب کام کرتے ہوئے شوکی نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ رینا کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ اسے کچھ پریشان بھی لگ رہی تھی اور الجھی ہوئی بھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے قریب جا کے اس کی دل جوئی کی کوشش کرے، ابھی وہ اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسی وقت گارشیا اور رابرٹ بھی اپنے خیمے سے برآمد ہوئے اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اس کے قریب کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ شوکی نے ان کی طرف ....سے اپنا منہ پھیر لیا۔

''ہے...... شیفس!'' رابرٹ نے الاؤ کے پاس موجود نندو بابا اور اس کی بیوی کی طرف دیکھ کر ہانک لگائی۔ ''کافی تیار ہے تو لے آؤ۔''

''ابھی لائے صاحب!'' نندو بابا نے جواب دیا۔

''اس بدبخت گورے لومڑ نے پھر حکم چلانا شروع کر دیا۔'' امجد خان نے برا سا منہ بناتے ہوئے شوکی سے سرگوشی کی مگر شوکی نے کوئی جواب نہ دیا، محض اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''اے...... موٹے ڈمپ! ادھر آؤ۔'' دفعتاً ہی جیسے امجد خان کی شامت آ گئی۔ رابرٹ نے اسے آواز دی تھی جس پر امجد سمیت شوکی بھی اس طرف دیکھنے لگے۔

''اور ...... تم بھی......'' شوکی کو دیکھتا پا کر رابرٹ نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اس سے بھی کہا۔ ''تم بھی آؤ ادھر......؟''

شوکی اور امجد خاموشی سے چلتے ہوئے اس کی کرسی کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔

''تم دونوں ہمارے خیمے میں جاؤ۔ وہاں دو بندوقیں رکھی ہیں۔ انہیں لے کر پہرے پر کھڑے ہو جاؤ۔'' وہ ان سے تحکمانہ بولا۔ ''آج سے تم دونوں کا یہی کام ہوگا۔ جب تک ہم یہاں مقیم ہیں تم نے کڑا پہرا دینا ہوگا۔''

رابرٹ کا لہجہ تحکمانہ مگر کسی بھی قسم کی درشتی یا سختی سے پاک تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ رابرٹ نے شوکی سے مخاطب ہو کر کسی قسم کی رعونت یا اہانت آمیز رویے سے کام نہیں لیا تھا۔ گارشیا نے ترچھی نگاہوں سے بس، ایک لمحے کے لیے شوکی کی طرف دیکھا تھا اور شوکی نے رینا کی طرف...... جو ہنوز کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ اس کے بعد وہ دونوں خاموشی سے خیمے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے بندوقیں اٹھائیں، لیکن اس سے پہلے شوکی نے غور سے ان کے کارتوسوں ...کا جائزہ لیا تھا۔

یہ پھر تو بندوقیں تھیں، جن کے کارتوس عموماً گائے یا خنزیر کی چربی سے بنے ہوتے تھے، یہ فرنگیوں کی چال ہوتی تھی، تاکہ اسلحہ چھن جانے کی وجہ سے اسے ہندو یا مسلم باغی استعمال نہ کر سکیں۔ مگر شوکی نے جائزہ لے لیا تھا کہ ان بندوقوں کے کارتوس خنزیر کی چربی کے نہیں تھے۔

وہ کارتوسوں کی چرمی پیٹی اور بندوقیں سنبھالے خیمے سے باہر آ گئے۔

''سنو......'' رابرٹ نے انہیں پکارا...... اور ایک بار پھر ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ان سے کہا۔

''تم امجد کھان! اس طرف جاؤ گے اور تم شوکی...... اس طرف...... لیکن وقفے وقفے سے اپنی جگہیں بدلتے رہنا، زیادہ دیر ایک ہی جگہ بیٹھے مت رہنا۔ اوکے؟ جاؤ۔''

آگے بڑھتے ہوئے امجد خان اور شوکی دو الگ سمتوں میں بٹ کر خیموں سے ذرا دور پڑاؤ کی دو مخالف سمتوں میں جا کھڑے ہوئے۔

شوکی کو اب رابرٹ کا حکم چلانا برا لگتا تھا۔ اس بات سے رینا بھی خوب اچھی طرح واقف تھی۔ شوکی کو کچھ حیرت سی ہوئی تھی کہ رینا نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔

نندو بابا اور شانتا نے ایک ایک گرما گرم کافی کا مگ امجد خان اور شوکی کو بھی دیا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ شوکی کا دل رینا کی طرف سے کچھ عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے الاؤ کے قریب ان کی جانب بھی دیکھ لیتا تھا۔

ادھر یہ تینوں خاموشی سے کافی پی رہے تھے۔ گارشیا اور رابرٹ کی نظریں مگ کے افق سے رینا کے کھوئے کھوئے چہرے کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر کافی کے ایک دو سپ لینے کے بعد دونوں بہن بھائیوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو ان میں معنی خیزیت کا ہلکا سا شائبہ ابھرا۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں نے پہلے ہی سے کچھ نئی قسم کی ''ٹھان'' رکھی تھی۔ کیونکہ خیمہ زنی کے دوران رابرٹ اور گارشیا تھوڑی دیر تک اپنے خیمے میں موجود اور آپس میں کچھ خاص قسم کی گفتگو میں مصروف رہے تھے۔

تب ہی جیسے گارشیا نے رابرٹ کو خفیف سا اشارہ کیا اور رابرٹ ہولے سے کھنکھار کر رینا کو مخاطب کر کے بولا۔

''رینا ڈیئر! کیا بات ہے تم کچھ پریشان سی نظر آ رہی ہو؟'' رابرٹ کے لہجے میں ملائمت آمیزی اور اپنائیت تھی۔

''آں...... ہاں! نن...... نہیں تو ایسی تو کوئی خاص بات نہیں......'' رینا جیسے خیالات کے بھنور سے اچانک ابھر کر بولی۔

''چلو...... خاص نہیں تو عام ہی وجہ بتا دو......؟'' رابرٹ نے مسکرا کر کہا۔ رینا کو پہلی بار آج رابرٹ کا لہجہ مہذب اور خلیق سا محسوس ہوا تھا، جسے محسوس کر کے وہ بھی بے اختیار ہولے سے مسکرا دی تھی۔ تب ہی گارشیا نے تھوڑا آگے سرک کر رینا کے کندھے پر اپنا ایک ہاتھ رکھ دیا اور نرمی سے بولی۔

''رینا! تم کسی بات کی فکر مت کرو۔ میں اور رابرٹ تمہارا پورا پورا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس لیے تم خود کو بالکل اکیلا مت سمجھو۔ پہلے میرا اور رابرٹ کا یہی فیصلہ تھا کہ ہم واپس چلے جائیں لیکن ہمیں تمہارا خیال آ گیا۔ انکل ہنری آخر کو ہمارے بھی کچھ لگتے تھے۔ سچی بات ہے کہ ہمیں بھی ان کی موت کا بے حد دکھ ہے۔ ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ان کے قاتلوں کو سزا ملے۔'' ایک لمحہ توقف کے بعد گارشیا نے رابرٹ کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پھر رینا سے دوبارہ مخاطب ہو کے بولی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"برادر رابرٹ کو بھی اس بات کا دکھ ہے کہ اس نے جھوٹی گواہی دے کر جیتے ہوئے مقدمے کا پانسا پلٹ دیا لیکن اس کے در پردہ اصل بات کچھ اور ہی تھی۔" پھر وہ اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم خود ہی رینا سسٹر کو بتا دونا برادر!" یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔ رابرٹ نے رینا سے کہا۔

"ہاں رینا! مجھے بھی ان ساری باتوں کا اچھی طرح احساس ہوگیا ہے لیکن مجھ سے غلطی نہیں شاید ایک بے وقوفی ہوگئی ہے۔ جس کا مجھے اب سخت پچھتاوا ہوتا ہے۔" وہ اتنا کہہ کر رکا۔ رینا کی نگاہیں اب رابرٹ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان دونوں بہن بھائیوں کی باتوں سے رینا کے اندر رقت سی اترنے لگی تھی جو اب اس کی دلکش اور نیلی آنکھوں سے ہلکی نمی کی صورت میں بھی جھلکنے لگی تھی، نیز چہرہ بھی اسی طرح کے اندرونی جذبات سے مرتعش ہو رہا تھا۔

"رینا! بات اصل میں یہ تھی کہ...... میں لوگوں سے خوف زدہ ہوگیا تھا۔ کیونکہ مجھے سوبجنا نے اشاروں کنایوں میں یہی بتایا تھا کہ کالی کے مندر کے پجاریوں کے خلاف گواہی میرے لیے مہنگی پڑ سکتی ہے۔" رابرٹ آگے بتانے لگا۔

"کالی کے مندر کا مہا پجاری بدری ناتھ ایک خطرناک ساحر ہے۔ وہ زہریلے سانپوں کا راجا ہے۔ کیا خبر وہ خود بھی سانپ ہو اور سو سال گزرنے کے بعد انسان کی جون اختیار کرنے کی پراسرار طاقت حاصل کرچکا ہو۔ انکل ہنری کی طرح وہ مجھے بھی مروا سکتا ہے لہٰذا ان سے دشمنی ہمیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔ بس! یہی وہ وجہ تھی کہ جس سے میں خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اب دیکھو نا رینا ڈیئر! زندگی کسے نہیں پیاری ہوتی، مجھے تو سانپ کے نام سے ہی ڈر لگنے لگتا ہے۔"

رابرٹ نے کچھ اس طریقے سے رینا سے لبھانے والے انداز میں بات کی تھی کہ اس کی کچھ ڈھارس بندھی وہ بولی۔

"تمہاری جھوٹی گواہی سے ہی سارا معاملہ خراب ہوا تھا رابرٹ!" اس کے لہجے میں خفیف سا شکوہ تھا۔ "ورنہ پاپا کے قاتلوں کو تو یہاں کے ولی عہد پرتاب نے بھی کیفر کردار تک پہنچانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ ہر طرح سے میرا ساتھ دینے کو تیار تھے اور اب بھی ہیں۔"

اس کی بات پر گارشیا نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے رابرٹ کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ "میں نا کہتی تھی برو! کہ دال میں کچھ کالا ہے اور اب ہمارا مشترکہ مفاد اسی چال سے وابستہ ہوچکا ہے۔" اور حقیقت بھی یہی تھی کہ راج محل سے ہمیشہ کے لیے رخصت باالفاظِ دیگر بے دخلی کے وقت میں ولی عہد پرتاب کا مہمان گاہ میں آکر نہایت نرم مخصوص لہجے میں رینا سے مخاطب ہونا اور اس کی بعد میں بھی ہر ممکن مدد اور ساتھ دینے کا پورے خلوص اور محبت سے اظہار کرنے کے انداز نے سب سے پہلے گارشیا کو ہی اندر سے کھٹکا دیا تھا اور گارشیا جیسی عورتوں کی نگاہ ہی نہیں ایسے "معاملے" میں ساری حسیات بھی بڑی زود فہم ہوجاتی ہیں اور گارشیا کی نگاہِ کھوج نے ولی عہد کے دل کا "چور" پکڑ لیا تھا۔

تب ہی اس کے شیطانی دماغ نے ایک نئی چال سوچی تھی۔ اس نے رینا کا شوکی سے راہِ الفت والا راستہ کھوٹا کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھا تھا کہ راج کمار پرتاب کے ساتھ اس کا "معاملہ" استوار رکھا جائے۔ کیونکہ اس سے پہلے گارشیا نے شوکی کے حصول کے لیے شوکی کا دل رینا سے یہ چال چل کر خراب کرنے کی کوشش کی تھی کہ رینا اس کے بھائی رابرٹ میں "انوالو" ہے مگر اس کی یہ چال کامیاب نہ ہوسکی۔

اب جو اس نے ولی عہد پرتاب کو رینا کی جانب راغب ہوتے محسوس کیا تو اس نے اسی راہ کو "ہوا" دینے کا سوچا تھا اور رابرٹ کو بھی سمجھایا تھا، جب وہ یہاں آکر اپنے خیموں کی تیاریوں میں جتے ہوئے تھے، تو اس نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ اب رینا اور شوکی کے معاملے میں خود کو ذرا "خفیف" سا رکھے، اور چونکہ رابرٹ کا اس میں مفاد تھا کہ رینا کے حوالے سے اگر ولی عہد پرتاب کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے تو اس میں ان کی راہ بھی سہل ہونے لگے گی، سو رابرٹ نے بھی اپنی بہن کے سمجھانے بجھانے پر بہن کو اس کا ساتھ دینے کا "گرین سگنل" دے دیا۔ یوں اب وہ دونوں ہی رینا کی "خیرخواہی" کا فرض ادا کرنے اور اس کے ساتھ ہمدردیاں جتانے میں لگے ہوئے تھے۔

سوبجنا والی دھمکی کی بات رابرٹ نے رینا سے جھوٹ بولی تھی۔

"ہاں رینا! اسی بات کا تو مجھے ہی نہیں بلکہ برادر رابرٹ کو بھی دکھ ہوا ہے مگر افسوس کہ برادر رابرٹ سوبجنا کی دھمکی میں آکر خوف زدہ ہوگیا۔" رابرٹ کے بجائے گارشیا نے رینا سے کہا اور فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولی۔

"لیکن...... رینا! اب وقت اور حالات کا تقاضا یہی ہے کہ ہمیں پچھلی باتوں کو بھلا دینا چاہیے اور آپس کی ناچاقیوں کو بھی۔ میں اور برادر رابرٹ بھی تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں، صدقِ نیت کے ساتھ......"

"اور رینا......! ہمیں یہ دیکھ کر حوصلہ بھی ہوا کہ راج محل سے تعلق رکھنے والی ایک اہم شخصیت، جس کی ہمیں بھرپور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

حمایت حاصل ہے، یعنی مستقبل کے راجا ولی عہد پرتاب کمار..... وہ ہم سے بہت مخلص ہیں۔"

"ہم سے تو ہیں ہی، بلکہ خوش قسمتی سے وہ رینا کو بھی اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی بڑی عزت اور احترام کرتے ہیں۔ اکثر وہ رینا سے مخاطب ہونے کے لیے خود بہ نفسِ نفیس مہمان گاہ چلے آتے تھے۔" گارشیا نے رینا کے سامنے پرتاب کے حسنِ اخلاق کی تعریف کی۔ جس پر ان دونوں بہن بھائیوں نے دیکھا تھا کہ رینا کے معصوم سے لبوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

یہ سب کہتے ہوئے گارشیا نے رابرٹ کو پھر مخصوص اشارہ کیا تو وہ رینا سے مخاطب ہو کے بولا۔

"یقیناً رینا! یہ ہماری ہی نہیں تمہاری بھی خوش قسمتی ہے اور ہو بھی کیوں نا تمہاری دل فریب شخصیت اور مرتبہ بھی تو راج کمار سے کم نہیں ہے۔ یاد نہیں تمہیں کہ لندن کے ایک کالج میں پپی کرسمس کی تقریب میں جب تم خوب سج سنور کر آئی تھیں تو سب نے تمہارے حسن اور دل فریب شخصیت کو دیکھ کر تمہیں "لیڈی آف ایوننگ" کا خطاب دیا تھا۔" رابرٹ کی بات پر رینا اس بار ذرا کھل کر مسکرائی تھی۔

"دیکھو رینا!" گارشیا نے فوراً متانت بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہارے مشن میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ ہماری تم سے محبت ہی تو ہے کہ ہم نے تمہیں ابھی تک اکیلا نہیں چھوڑا، میرا مطلب یہ تھا کہ راج کمار پرتاب مستقبل کا والیِ ریاست بھی ہے۔ ہمارا مشورہ یہی ہے کہ تم اس سے اپنے روابط برقرار رکھو...... بلکہ اس سے گھلنے ملنے کی بھی کوشش کرتی رہو۔ میرا خیال ہے وہ تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور وہی تمہاری زیادہ اچھے طریقے سے اور ہر معاملے میں مدد کر سکتے ہیں۔" اس کی بات پر رینا کے حسین و معصوم چہرے پر شرم کی ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی۔

لوہا گرم دیکھ کر دونوں مکار بہن بھائیوں نے فتح مندی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ادھر ادھر کی باتوں میں وقت گزرتا رہا۔ ادھر شوکی بری طرح بوریت محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ یہ دونوں شاطر بہن بھائی وہاں سے اٹھ کر اپنے خیمے میں جائیں تو وہ...... رینا کے پاس جا کر دو گھڑیاں سکھ چین کی گزارے۔

کافی دیر بعد اسے یہ موقع ملا تھا جب اس نے دیکھا کہ رابرٹ اور گارشیا، رینا کے پاس سے اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

یہ دیکھ کر شوکی پہلے تو ذرا دیر تک منتظر رہا کہ رینا ہی اسے آواز دے کر بلا لے گی، یہی امید اسے کب سے باندھے تھی، مگر اس وقت گارشیا اور رابرٹ اس کے پاس آن بیٹھے تھے اور اب وہ ان کے اٹھ کر جانے کا بے چینی سے منتظر تھا، لہٰذا اب وہ تھوڑی دیر تک تو انتظار کرتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ رینا تو کسی اور ہی سوچوں میں کھوئی ہے' لہٰذا شوکی نے سوچا کہ خود ہی رینا کے قریب چلا جائے۔

اگرچہ وہ ان دونوں بہن بھائیوں کی موجودگی میں رینا سے زیادہ گھلنے ملنے سے احتیاط ہی کرتا تھا۔ بہرکیف...... وہ پہلے تو رینا کے بلانے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب ایسا نہ ہوا تو وہ خود ہی اٹھ کھڑا ہوا، لیکن ابھی اس نے الاؤ کے قریب بیٹھی رینا کی طرف ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ اسے اپنے قدم روکنا پڑے۔ کیونکہ اسی وقت رینا اپنی کرسی سے اٹھی اور اپنے خیمے کی طرف چل دی۔ شوکی اپنی ہی جگہ رکا سوچتا کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

لیفٹیننٹ بروجر کو بے وقوف بنانے اور اس کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لیے اریبہ اور شاہ زمان نے جو ڈراما رچایا تھا اس کا پہلا مرحلہ بہ خیر و خوبی طے ہوتا نظر آ رہا تھا، کیونکہ اریبہ اور شاہ زمان کی مصنوعی نوک جھوک اور لڑائی کو حقیقت سمجھتے ہوئے لیف بروجر نے فوراً ہی اپنے ایک سپاہی کو ان کے پاس بھیج دیا تھا جس نے دونوں کے بجائے صرف اریبہ کو ساتھ چلنے کا کہا تھا کہ اسے لیف بروجر نے بلایا ہے اور یوں اریبہ آخر میں بھی شاہ زمان کو کھری کھری سناتی ہوئی اور بروجر سے شکایت کرنے کی دھمکی دیتی ہوئی اس فرنگی سپاہی کے ساتھ چل نکلی تھی۔

اریبہ اس کے ساتھ چلی تو آئی تھی مگر اندر سے ڈری ہوئی بھی تھی، اس لیے نہیں کہ اس کا "ڈراما" کامیاب یا ناکام ہوا ہے، کیونکہ اپنے ڈرامے کی کامیابی کے آثار تو اسے صاف نظر آ ہی رہے تھے، لیکن...... اصل مسئلہ جس سے وہ کچھ خوف زدہ سی تھی وہ فرنگی افسر تھا جس کے ساتھ وہ تریا چلتر کھیلے ہوئے تھی۔ تاہم اس نے خدا سے دل ہی دل میں اپنی عزت و جاں کی دعا کی اور سپاہی کے ساتھ فرنگی آفیسر لیف بروجر کے کمرے میں داخل ہوئی۔

لیف بروجر اس وقت ایک بڑی سی کرسی پر اپنی پشت ٹکائے بڑے ٹھسے سے براجمان تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی طرف ایک نرم گرم مسہری بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ریشم و کمخواب کا صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا اور ایک سرخ رنگ کا مخمل کا گاؤ تکیہ بھی مسہری کے سرہانے دھرا پڑا تھا۔ بروجر کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بائیں ہاتھ پر لکھنے والی میز اور اس پر کچھ لکھنے پڑھنے کا سامان نظر آرہا تھا۔ ایک خوبصورت سی قندیل بھی چھت کے وسط میں جھول رہی تھی۔ کمرے میں شمعیں روشن تھیں۔

بروجر کے سامنے گول لکڑی کی میز رکھی تھی اور اس پر ایک ہاتھ دھونے کا برتن، شراب کی بوتل اور تانبے کا گلاس تھا۔

بروجر نے اریبہ کی طرف ایک گہری نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر اس کے ساتھ کھڑے سپاہی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ سپاہی اپنے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ لیے مگر احترام سے سر جھکائے پلٹ گیا۔

کمرے کی دھڑکتی ہوئی فضا میں اریبہ کو سانسوں کی بازگشت سی صاف گونجتی سنائی دے رہی تھی جس میں ایک ڈرا سہما سا اضطراب بھی نمایاں ہوتا تھا۔

سپاہی نے جاتے ہوئے کمرے سے نکلنے کے بعد اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا تھا۔ کمرے میں پل کے پل ایک بھیدوں بھری سی خاموشی طاری ہوگئی تھی اور اریبہ کو یوں لگتا تھا جیسے کمرے کی دم بہ خود کھڑی دیواریں بدروحوں کی طرح چلّا چلّا کر اسے یہاں سے بھاگ جانے کو کہہ رہی ہوں۔

بروجر نیم بازسی نظروں سے اپنے سامنے کھڑی اریبہ کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی کے ڈورے صاف پتا دیتے تھے کہ وہ تھوڑی دیر پہلے سے نوشی میں مصروف رہا تھا۔

"دیکھو نا... سرکار! آج بھوپت نے پھر مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ یہ...... یہ میرا بھیا ہے نا سوشیل، جو ادھر پال پور گیا ہے، گنیش دیوتا کے میلے میں شریک ہونے کے لیے......"

اریبہ کو اس ماحول سے گھبراہٹ ہونے لگی تو اس نے فوراً مخصوص لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے بے تکان کہنا شروع کردیا۔ "آج بھوپت کے منہ سے نکل ہی گیا کہ اس نے اس ڈومن شاردا کو بھی بلوایا ہے تاکہ وہ بھی یہاں راج محل آکر اپنی آواز کا جادو جگائے۔ پرنتو، میں خوب جانتی ہوں اس بیچ اصل معاملہ کیا ہے۔"

"اچھا! کیا معاملہ ہے؟" لیف روجر نے اس کی طرف اسی طرح گرسنہ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کی ہوسناک نظریں اریبہ کے خوب کسے ہوئے بدن پر بندھی سوتی ساڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں سے اریبہ کے شباب کی کچھ جھلکیاں کسی سنسنی خیز داستان یا فلم کی اشتہاری سرخیوں کی طرح چلّا چلّا کر اعلان کرتی محسوس ہوتی تھیں۔

"صاحب سرکار! وہ شاردا کو یہاں کیوں لانا چاہتا ہے، یہ میں خوب جانتی ہوں۔ پہلے تو مجھے شک تھا پرنتو اب تو مجھے پورا یقین ہوگیا ہے۔ آپ سمجھ جائیں نا سرکار! کیا معاملہ ہوسکتا ہے۔" اریبہ نے آخر میں اپنا لہجہ روہانسا بنالیا۔

"ہوں......" بروجر نے ہنکاری بھری۔ بولا۔ "پر یہ تو بتا کہ تُو نے اپنے پتی کے منہ سے یہ اگلوایا کس طرح......؟" وہ بھی اس کی باتوں میں دانستہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

"مجھ سے کہتا رہتا تھا بھوپت کہ مہاراجا کب تک تیرا راگ سنے گا۔ ایک وقت آئے گا وہ تجھ سے بیزار ہوجائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ شاردا کو بھی بلوالیا جائے۔ میرے بھیا تو سیدھے سادے ہیں سدا کے...... وہ بھوپت کی چالاکی نہ سمجھیں گے، پر میں تو سمجھتی ہوں۔"

"ہوں...... بات تو واقعی تشویش کی ہے۔" بروجر نے بھویں اچکا کر کہا۔ "خیر...... تو بیٹھ تو سہی......" بروجر نے اسے اشارہ کیا اور پھر بوتل اور گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جام انڈیلا اور اس کی جانب بڑھایا۔

"لو یہ...... اپنا غم غلط کرو...... اور اب تھوڑی دیر کے لیے اپنے پتی بھوپت کو بھول جاؤ۔ مجھے کوئی اچھا سا گیت سناؤ۔ پیار و محبت بھرا۔ ایسا کہ بس دل پیار و محبت کے لیے تڑپ اٹھے۔"

لیف بروجر بھی ترنگ میں آیا ہوا تھا۔ اس نے اریبہ کو قریب ایک کرسی پر بیٹھنے کا بھی کہہ ڈالا۔ اریبہ نے چالاکی سے غم گسار لہجے میں کہا۔

"صاحب سرکار! آج میرا من بہت دکھی ہورہا ہے لیکن پھر بھی کوشش کرتی ہوں، میں گٹار لے آؤں؟"

"نہیں، بغیر گٹار کے ہی سنادو۔" بروجر بولا۔ "میں صرف تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں اور تمہیں خوب جی بھر کے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اریبہ دل میں خوش تھی کہ اس کا اور شاہ زمان کا ڈراما خوب کامیاب رہا تھا۔ اب بس اس شیطان.... گورے سے جان چھڑانا باقی تھا۔ اس نے یونہی اس کا دل بہلانے کے لیے ایک گانا گا دیا مگر اس کی نگاہوں نے تاڑ لیا کہ گورے کو شاعری یا گیت سے کوئی لگاؤ نہ تھا وہ بس اس کے سراپا کو گرسنہ نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

اریبہ نے گانا بند کردیا پھر جانے کی اجازت چاہی تو لیف بروجر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور قریب تپائی پر رکھے جام کا گلاس اٹھا کر اس کی جانب بڑھا۔ اپنا ایک ہاتھ اریبہ کے نیم برہنہ گداز شانے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے جام اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"لو......چند گھونٹ بھر لو......"

"س......سرکار! میں نہیں پیتی۔" اریبہ نے گھبرا کے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بروجر کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی، مگر کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہونے پر اس کا ہاتھ خود ہی ہٹ گیا تھا۔ وہ اپنی ساڑی کا پلو بھی درست کرنے لگی۔

"پی لو......میں کہہ رہا ہوں نا لڑکی......!" بروجر نے زور دے کر کہا۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ اس نے دوبارہ ہاتھ اریبہ کے شانے پر رکھ دیا۔ اریبہ کو سخت کوفت محسوس ہونے لگی۔ وہ اندر سے ڈری ہوئی بھی تھی مگر اس نے حوصلہ اور حواس بحال رکھے تھے۔ لجلجا کر بولی۔

"مم......مجھے مجبور مت کریں سرکار! میں واقعی نہیں پی سکتی یہ......مم......میرا پتی بھوپت پیتا ہے یہ......"

"اپنے پتی کو گولی مارو......" بروجر جھلا کے بولا۔ اریبہ نے گورے پر دل میں لعنت بھیجی مگر اوپری دل سے بولی۔

"وہ مجھے بھی زبردستی پلانے کی کوشش کرتا ہے، ایک دن اس نے ایسا ہی کیا تو ایک دو گھونٹ بھرتے ہی مجھ پر جنون طاری ہو گیا اور میں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ یہی نہیں اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اس کا منہ بھی چھیل کر رکھ دیا تھا۔" چالاکی سے یہ کہتے ہوئے وہ تھوڑا پیچھے کو سرک گئی۔ مقصد گورے کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹانا تھا۔

لیف بروجر اس کی بات پر تھوڑا سا خفیف ہوا مگر ڈھیٹ بھی ثابت ہوا۔ اس نے خود ہی دو گھونٹ بھرے، گلاس تپائی پر رکھا اور پھر اریبہ کی طرف بڑھا۔ وہ اس کی طرف دہشت زدہ سی نگاہوں سے تکتی ہوئی، ایک بار پھر پیچھے کو سرکنے لگی، مگر لیف بروجر نے کسی شکرے کی طرح اریبہ کو اپنے ہاتھوں کے پنجوں میں دبوچ لیا اور اپنے ساتھ لگانے کی کوشش کی اریبہ نے غچا دیا اور اس کی گرفت سے نکل گئی۔

گرفت زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ لیف بروجر اسے گرم حلوا سمجھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اریبہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی گود میں آن گری ہے مگر یہ اس کی بھول تھی۔

"س......سرکار! ی ی......یہ آپ کیا کر رہے ہو؟ مم......میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔" اریبہ نے خوف زدہ سی نگاہوں سے اس گورے شیطان کی طرف دیکھ کر کہا تو بروجر ہانپتی ہوئی سی آواز میں بولا۔

"میں نے کب کہا تم ایسی ویسی لڑکی ہو؟ تم تو بہت اچھی ہو، حسین اور خوبصورت، پُرشباب بھی......میرے ساتھ وقت گزارو، تمہیں بہت سکون اور راحت ملے گی۔ آؤ......یہاں میری اجازت کے بغیر کوئی نہیں آئے گا۔" کہتے ہوئے وہ پھر اس کی طرف لپکا تو اریبہ نے دانستہ ایک زوردار چیخ ماری اور پرے ہٹتی ہوئی دروازے سے جا لگی۔ بروجر اس کی چیخ سے گھبرا سا گیا اور وہیں رک گیا۔ اب اس کے غلیظ چہرے پر طیش بھرے آثار نمودار ہو چلے تھے اور پھر وہ اسی لہجے میں اسے دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

"دیکھو لڑکی! اپنی اوقات مت بھولو......تم نہیں جانتی کہ میں یہاں راج محل میں کس عہدے پر ہوں۔ میں اگر چاہوں تو تمہیں اور تمہارے شوہر بھوپت کے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی کر سکتا ہوں۔ مجھ سے دوستی کر لو، تمہارے فائدے میں ہوگی یہ۔ تمہارا شوہر بھی تو دوسری لڑکی کے چکروں میں پڑا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے تمہاری آج اس سے لڑائی ہوئی ہے۔"

"س......سرکار! ابھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے۔" اریبہ نے چالاکی سے اس گورے کو رام کرنے کی غرض سے کہا۔ وہ اسے ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ "میں پھر سوچ کر آپ کو جواب دیتی ہوں۔"

"سوچنا کیسا؟" بروجر نے اس انداز میں اسے بات کرتے دیکھا تو پھر اس کی جانب جارحانہ انداز میں بڑھا۔ اریبہ خوف زدہ سے انداز میں دیوار سے لگی ہوئی تھی مگر اب دھیرے دھیرے دروازے کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔

"آ جاؤ میرے پاس......میں تمہیں بہت قیمتی تحفے دوں گا۔ تم یہاں عیش سے جتنے دن چاہے رہو......ورنہ یاد رکھو، اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں راج محل میں تمہارا رہنا اجیرن کر دوں گا۔" کہتے ہوئے وہ پھر اس کی جانب جھپٹا، مگر اریبہ کھسکتی ہوئی دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگی، مگر دروازہ نہ کھلا۔ وہ باہر سے بند تھا اور یہ "فریضہ" شاید اسی فرنگی سپاہی نے ہی انجام دیا تھا جو اریبہ کو یہاں لے کر آیا تھا۔

اسی وقت پیچھے سے اریبہ کو لیف بروجر نے دبوچ لیا۔ اریبہ نے پورے جی جان سے چیخنے کی کوشش بھی کی مگر بروجر پر شیطان حاوی ہو چکا تھا اس نے اریبہ کو اس بار چیخنے کا موقع بھی نہ دیا کیونکہ وہ اپنے سپاہیوں کی مدد سے اپنے شیطانی اور ہوس ناک کھیل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ اس نے اریبہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اریبہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ایک شیطان کے جال میں پھنس گئی ہے، بلکہ بے بس بھی ہو چکی ہے۔

☆☆☆

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

آج پورن ماشی کی رات تھی۔اس کالی گھپ رات کے سیاہ پردے میں وہ شیطانی اور خونی کھیل کھیلا جارہا تھا جو کالی کے مندر میں حسب سابق کھیلا جاتا رہا تھا۔یہ بہت خفیہ اور پراسرار کھیل تھا۔اس کھیل کے درپردہ جو عوامل کارفرما تھے ان سے صرف کالی کے مندر کا مہاپجاری بدری ناتھ ہی آگاہ تھا یا پھر اس کے چیلے۔

جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان کالی کے اس پوشیدہ سے مندر کی دیواروں اور چھتوں پر نیا رنگ و روغن نظر آتا تھا۔ چھت پر لٹکی ہوئی مدھم قندیلیں روشن تھیں۔کالی دیوی کے خوفناک نظر آنے والے بت کے گرد بنی ہوئی منڈیروں کے درمیان جلتے ہوئے انگاروں سے لوبان کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔تلک کے لیے گھسے جانے والے صندل کی خوشبو چہار سو مہک رہی تھی۔

اس وقت بھی کالی کے بت کے سامنے کنواریوں کا رقص جاری تھا۔ہر طرف بکھرے ہوئے لہو کی بو،لوبان اور ہرمل کے جھاڑ کے دھوئیں میں رچ کر پھیلی ہوئی تھی۔

کنواری پجارنیں مندر میں ہی رہتی تھیں۔ان میں کچھ تو وہ تھیں جنہیں کالی دیوی کے سحر میں جکڑ دیا گیا تھا اور وہ خوش تھیں لیکن کچھ ایسی بھی ناریاں تھیں جو اس بھیانک رات کی آمد سے خوف زدہ رہتی تھیں۔وہ دعائیں مانگتی تھیں کہ یہ کالی رات نہ آئے تاکہ ان کی مکتی بنی رہے مگر اس رات کو تو آنا ہی تھا۔وہ بھاگ جانا چاہتی تھیں،ان کی حیثیت قیدیوں کی سی تھی مگر انہیں مہاپجاری بدری ناتھ اور اس کے حواریوں نے زبردستی یہاں ٹکے رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔انہیں دیسی تاڑی میں ایک خاص قسم کے سانپ کے زہر کی ہلکی مقدار شامل کر کے پلا دیا گیا تھا۔بدری ناتھ خود کو سانپوں کا راجا کہتا تھا۔ وہ صرف ان کی قسموں سے ہی واقف نہ تھا بلکہ ان کے زہر کے نقصانات اور افادیت سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتا تھا۔ کس سانپ کا کون سا زہر ایک جیتے جاگتے انسان کو پل کے پل موت کی نیند سلا دیتا ہے اور کون سا زہر نشہ پیدا کر کے انسان کے اندر خرمستی اور جنون پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ نیز کس زہر کی کتنی مقدار کیا گل کھلاتی ہے،اسے سب معلوم تھا۔

یہ کنواری لڑکیاں کالی دیوی کے نام پر وقف کر دی گئی تھیں۔یوں ان کا ہیجان انگیز رقص بھی پوجا کا ایک اہم حصہ تھا۔جو فدائی تھیں وہ بھنگ اور شراب کے نشے میں دھت تھیں اور جو ڈری ہوئی تھیں ان کو زہریلی تاڑی نے مست اور بے خبر کر رکھا تھا۔

یہ سب کنواریاں نرم و گداز جسم اور حسن و جمال میں یکتا تھیں۔کیونکہ ان کے "انتخاب" کی یہی شرط تھی۔یہ سب کی سب تقریباً نیم برہنہ تھیں۔مجھے پر بے خودی اور بے اختیاری کی کیفیات طاری تھیں۔

یوں ننگ دھڑنگ سیاہ رو پجاریوں کی قطار بھی بت کے گرد جمع تھی،وہ بھی سب بھنگ اور شراب کے نشے سے چُور تھے۔پوجا اس وقت آخری مراحل میں تھی۔

کالی کے بت پر ان گنت زہریلے سانپ بھی لپٹے ہوئے رینگتے نظر آتے تھے۔ان کی خوفناک پھنکاروں سے مندر کی مکدر فضا میں بھیانک گونج سی پیدا ہوتی تھی۔وہ قریب ہی رقص کرتی کنواریوں کی طرف اپنا خوفناک پھن کاڑھے انہیں ڈسنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔یوں بھی ہوتا تھا کہ کوئی سانپ اچھل کر کسی کنواری کے سر پر آن گرتا اور اس کے دراز گیسوؤں میں الجھ کر برہنہ شانوں پر آجاتا۔تب ہی وہ اپنا مہیب منہ کھول کر اپنے خطرناک زہر میں بجھے ہوئے دانت کنواری کے گداز شانے میں گاڑ دیتا۔مگر حیرت انگیز طور پر سانپ کے ڈستے ہی وہ ناری اپنے حلق سے ایک زوردار وحشیانہ چیخ مار کر مزید مستی میں آجاتی اور اس کے رقص میں بھی تیزی آجاتی،مگر اس کے بعد وہ کالی دیوی کے چرنوں میں جا گرتی۔

یوں ابھی تک ایسا صرف دو ناریوں کے ساتھ ہی ہوا تھا اور دونوں کی لاشیں وہیں فرش پر بت کے پاس ہی گری پڑی تھیں۔ان کی خوبصورت کشادہ آنکھیں بڑے ڈراؤنے انداز میں کھلی ہوئی تھیں اور دہانے کے دل آویز ہونٹ ادھ کھلے رہ گئے تھے،جہاں سے سرخ سرخ لہو کی لکیر بہتی نظر آتی تھی۔

پھر......یہی وہ وقت تھا جب اس ہال کمرے کا عقبی دروازہ کھلا اور مہاپجاری بدری ناتھ اپنے گھٹے ہوئے سر کی چوٹی کو لہراتا سر دھنتا نمودار ہوا۔اس نے نیچے گیروے رنگ کی دھوتی باندھ رکھی تھی اور اوپری بدن برہنہ تھا۔سیاہ رنگت کے گینڈے...... جیسے گھٹے ہوئے بدن پر اس نے کوئی تیل مل رکھا تھا جو شمعوں اور مشعلوں کی روشنی میں خوب چمک رہا تھا۔اس کی چال میں عجیب سی مستی تھی۔شراب کا نشہ اس کے اعصاب پر طاری تھا۔

مہاپجاری کو دیکھتے ہی مجمع کھڑا ہو گیا۔

"مہاپجاری بدری ناتھ کی جے......!اور کالی کی جے......!" کے نعروں سے ہال گونج اٹھا۔یوں پجارنوں کے جسم کا انگ انگ بدمستی کے عالم میں تھرکنے لگا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مہا پجاری بدری ناتھ نے پہلے کالی کے قدموں میں ڈنڈوت دی اور پھر پوجا کے اشلوک پڑھنے کے لیے گھٹنوں کے بل بت کے سامنے بیٹھ گیا۔ آخری اشلوک کا وقت آیا تو اس نے ایک اشارہ کیا۔

بت کا عقبی دروازہ کھلا اور... دو پروہت ایک حسین و جمیل اور سنہرے بالوں والی لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے قربان گاہ کی طرف لے آئے۔ لڑکی کی وضع قطع ظاہر کرتی تھی کہ وہ ایک فرنگن تھی۔ اس وقت اس کی خوبصورت آنکھیں مارے دہشت کے پھٹی ہوئی تھیں۔ پھر کالی کے خوفناک بت پر اس کی دہشت زدہ نگاہیں پڑتے ہی اس نے خوف سے فلک شگاف چیخ بلند کی اور پھر وہ مسلسل چیخنے چلانے لگی لیکن کسی نے توجہ نہیں دی۔

کالی کے بت کے سامنے لا کر دونوں پروہتوں نے اس کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ فرنگن دوشیزہ کا گلا مسلسل چیخنے سے بیٹھ چکا تھا۔ خوف سے وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

مہا پجاری بدری ناتھ کے قریبی چیلے جو اس کا نائب اور کالی کے مندر کا بڑا پروہت کہلاتا تھا یعنی پرس رام...... اس کے اشارے پر ایک پجاری چمکتا ہوا خنجر لے کر آگے بڑھا۔ فرنگن دوشیزہ کے حلق سے ایک خوف زدہ چیخ بلند ہوئی۔ خنجر کے ایک ہی اشارے پر فرنگن کا باریک لباس اس کے مہین و نازک جسم سے الگ ہو کر فرش پر گر پڑا۔

مہا پجاری بدری ناتھ کے لبوں سے ایک گہری سانس، سانپ کی پھنکار سے مشابہ برآمد ہوئی۔ فرنگن لڑکی کا دمکتا شباب گلاب کے پھول کی طرح تروتازہ تھا۔

پروہتوں نے تڑپتی ہوئی فرنگن کو قربانی کے چبوترے پر لٹا دیا۔ انہوں نے اسے بالکل بے بس کر دیا تھا۔ مہا پجاری بدری ناتھ کے لبوں پر ایک ابلیسی مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔ اس نے جھک کر کالی دیوی کو ڈنڈوت دی اور پھر بڑے ہولناک انداز میں آگے بڑھا۔

طبلے کی تھاپ جھانجھر اور بانسری کی آواز اور رقص کا ہیجان اچانک شدت اختیار کر گیا۔ مہا پجاری نے کالی کے بت کے سامنے جھک کر نعرہ بلند کیا۔ ”جے کالی کی......“ تمام مجمعے نے بہ یک آواز نعرے کو دہرایا۔

اسی وقت بڑا پروہت پرس رام آگے بڑھا اور اس کا چمکدار خنجر فضا میں بلند ہوا۔ تب ہی اس فرنگن دوشیزہ کی آخری چیخ بلند ہوئی اور پھر اس کا سرخ سرخ تازہ خون بھل بھل قربان گاہ پر بہنے لگا۔

اسی وقت مہا پجاری بدری ناتھ نے مجمعے سے خطاب کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔

”آج میتھونا کی اس عظیم قربانی کے بعد میں نے امر کی راہ میں پناہ لینے کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا ہے اور تم سب کے لیے میں ایک امرتی کی چھایا بن گیا ہوں۔ سو سال پورے ہونے میں ابھی کچھ سال باقی ہیں، اس کے بعد میں جون بدلنے کی شکتی حاصل کر لوں گا۔ دیوتا بن جاؤں گا۔ پچھلے جنم میں مجھ سے ایک ساحر نے یہ شکتی چھین لی تھی اور اس جنم میں، میں نے اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

”شیش ناگ کا روپ دان کرتے ہی میں لازوال شکتیاں حاصل کر لوں گا۔ زمین کے خزانوں میں دفن خزانوں کا مالک بن جاؤں گا۔ ناقابلِ شکست ہو جاؤں گا اور جنہوں نے میرا اور کالی کا ساتھ دیا ہے وہ سب میرے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی بتائیں گے۔ جے مہا شکتی کالی کی......“ اس نے آخر میں ایک نعرہ بلند کیا اور مجمعے نے بھی حسبِ سابق اس کا ساتھ دیا تھا۔

”اب بس میتھونا کی ایک آخری بھینٹ درکار ہو گی۔ اس کے بعد میری تپسیا کا لازوال سفر شروع ہو جائے گا۔ ایک ایسی ہی گوری چمڑی والی کنیا جو ودیشی بھی ہو، کی اگلی پورن ماشی کی قربانی ہو گی۔ کیونکہ میتھونا کی قربانی ایسی ہی کنیاؤں پر زیادہ اثر دکھاتی ہے۔“

آخر میں یہ سب کہتے ہوئے پجاری بدری ناتھ کی سانپ جیسی چندی چندی آنکھوں میں نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی رینا کا چہرہ گردش کرنے لگا تھا اور اسی سبب جیسا کہ مذکور ہو چکا...... بدری ناتھ نے پروفیسر ہنری برنارڈ کا قتل نادانستہ نہیں بلکہ سوچی سمجھی سازش کے تحت ہی کیا تھا۔ کیونکہ بدری ناتھ جانتا تھا کہ ہنری کی موجودگی میں یہ کام مشکل ہو سکتا تھا یوں...... جو ہتھیار اس نے مہارانی مجو بائی کے ایما پر ولی عہد پرتاب کے لیے تیار کر رکھا تھا، وہ اسے اپنے ذاتی مقصد کے لیے آزما چکا تھا۔ یوں ایک طرح سے اس نے مجو بائی کو بھی بے وقوف بنایا تھا۔

☆☆☆

وہ نام ترپال کے نواب شہباز خان کا تھا۔ ظاہر ہے علی کے لیے یہ نام غیر آشنا نہ تھا۔ وہ اپنی جان خطرات میں ڈالے انہی سے تو ملنے جا رہا تھا۔

اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔ اس نے تیزی سے سوچا تھا یہ کوئی انتہائی اور اہم خفیہ نوعیت کا پیغام ہے جو نواب صاحب کے لیے ہی اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے اور نیز یہ کہ وہی اسے اچھی طرح پڑھ اور سمجھ سکتے تھے۔ اس نے وہ پیغام سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ایک نظر اس نے لاش پر ڈالی اس کے بعد کھڑکی کا کتا ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی اور اس کے محتاط اندازے کے مطابق وہ ریاست ناگرہ کی حدود سے تو کب کا نکل آیا تھا اور اب ترپال پہنچ چکا تھا۔

وہ اب مال گاڑی کے رکنے کا انتظار کرنے لگا مگر تھوڑی دیر مزید انتظار کرنے کے بعد گاڑی چلتی رہی تو اس نے چھلانگ لگا کر اترنے کا ارادہ کیا اور دروازہ کھول کر اس مختصر کیبن سے باہر آ گیا۔

گرم کیبن سے باہر آتے ہی سرد ہواؤں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ ٹھٹھر کر رہ گیا۔ ہر سو گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں گھنا جنگل تھا اور ان کے پار سر بفلک پہاڑیوں کے اندھیاروں میں ڈوبے ہوئے اسرار بھرے ہیولے...... جن کی چوٹیوں پر چاند کی سنہری گیند لڑھک کر پیچھے سرک چکی تھی۔ آسمان البتہ صاف تھا اور تارے ٹمٹما رہے تھے۔

علی نے مال گاڑی کی رفتار کا اندازہ کیا۔ رفتار تیز تو نہ تھی مگر کم بھی نہ تھی، اترنے کی کوشش میں چوٹ لگنے کا اندیشہ تھا۔ وہ اندر آ گیا۔ کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ علی کو مال گاڑی کی رفتار آہستہ ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے کھڑکی کھول کر گردن باہر نکالی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ چونکہ یہ مال گاڑی تھی۔ اسی لیے پلیٹ فارم والے ٹریک پر مڑنے کے بجائے یہ دوسری سمت کو مڑ رہی تھی، جہاں لوکوشیڈ کی ٹمیالی اور دھوئیں سے سیاہ پڑی مخروطی بوسیدہ سی عمارت نظر آ رہی تھی۔

یہاں شاید اس کے انجن کی ضروری چیکنگ اور فیول وغیرہ ڈالا جانے والا تھا۔

بہرطور...... گاڑی کے آہستہ ہوتے ہی علی اتر گیا۔ گزشتہ شب شاید بارش ہوئی تھی اسی سبب ٹریکس پر جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ وہ سنبھل کر پاؤں رکھتا ہوا اسٹیشن کی عمارت کی طرف چل دیا، جہاں سناٹے کا راج تھا یا پھر عملے کے چند شبینہ افراد ہاتھوں میں لالٹین ٹارچیں اور ہتھوڑی پکڑے نظر آئے۔

علی اسٹیشن کا نام پڑھنا چاہتا تھا۔ تب ہی ایک آدمی سے اس نے پوچھ لیا۔

”بھائی جی! یہ کون سا اسٹیشن ہے؟“

”سید پور......“ اس نے تھکن سے بیزار آواز میں بتایا اور آگے چل دیا۔

علی کو ترپال کی ساری معلومات تھی۔ سید پور کے اسٹیشن کا نام سن کر اس نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اب اسے صرف...... نواب صاحب کی حویلی تک پہنچنا تھا۔ وہ مطمئن تو تھا کہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا اور قدرے محفوظ بھی...... لیکن ایک تربیت یافتہ گوریلے کی حیثیت سے اس نے یہاں بھی احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور چاروں طرف سے چوکنا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ انگریزوں کے جاسوس یہاں بھی چھپے ہو سکتے تھے۔

اگرچہ یہ ایک مسلم ریاست تھی، مگر جاسوسوں کا خطرہ یہاں بھی تھا۔ یہی نہیں وہ انگریز چھاپا مار کمپنی ”گائیڈز“ کے کرتوتوں سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ”گائیڈز“ برٹش آرمی کی ایک خطرناک اور گوریلا رجمنٹ تھی۔ جو بیک وقت جاسوس اور چھاپا مار تھی۔ دشمن کو دیکھتے ہی جیا ن سے مار ڈالنا ان کا اہم مشن ہوتا تھا۔ وہ بھی یہاں مختلف بہروپ میں عام انسانوں کے درمیان گھوم پھر رہے ہوتے تھے۔

بہرطور...... علی ریحان ان سارے عوامل پر نگاہ رکھے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ علی کی معلومات محدود تھیں۔ اسے حویلی کا پتا تو معلوم نہ تھا لیکن اسے تلاشنا کوئی مشکل بھی نہ تھا، بھلا نواب شہباز سے کون واقف نہ ہوگا۔ یہ مسلم ریاست ناگرہ اور پالن پور کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی۔ علی جاسوسوں اور گائیڈز کے گوریلوں کے ڈر سے کسی سے پوچھنے میں بھی محتاط تھا۔

مشرق کی سمت سے پو پھٹنے لگی تھی اور سفیدی کی لکیر سی نمودار ہونے لگی تھی۔ وہ ابھی اسٹیشن کی پرانی سی ٹمیالے رنگ والی عمارت کے اندر ہی تھا۔ پلیٹ فارم خالی تھا کوئی ریل کار نہیں کھڑی تھی۔ یہاں صرف دو ہی ٹریک بچھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ آنے جانے کے لیے ایک ہی ٹریک استعمال ہوتا تھا۔ دوسرا شارٹ ٹریک تھا، جو لوکوشیڈ کی طرف جاتا تھا یا پھر اسے فاضل گاڑی کھڑی کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

علی ویران پلیٹ فارم پر چلتا ہوا پھاٹک تک پہنچا۔ وہاں ایک وردی پوش عملے کا آدمی کھڑا نظر آیا۔ علی سمجھ گیا کہ وہ اسے روک کر سوالات کرے گا جس کا جواب بھی اس نے سوچ رکھا تھا، مگر اس نے اس کی طرف ایک ہی نظر دیکھا تھا اور اس کے بعد چائے کے ایک کھوکھے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ علی باہر آ گیا۔

کوئی تانگا وغیرہ نظر نہیں آیا۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک ناپختہ سی سڑک دائیں سے بائیں جا رہی تھی۔ وہ اس کے کنارے پر ہی سوچتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ فضا میں سردی کی کاٹ شامل تھی۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اندھیرے کے سنگم میں سحر کی سپیدی گھلی ہوئی عجیب سا منظر پیش کرتی تھی۔ ایک فرحت بخش سی خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ دو تین مریل

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے کتے ادھر ادھر بھاگتے نظر آئے۔
علی نے آگے بڑھنے کا ارادہ سرِدست ملتوی کر دیا اور کچھ سوچ کر دوبارہ پھاٹک کی طرف بڑھا اور وہاں سے اندر پلیٹ فارم میں آ گیا۔ اب اس کا رخ چائے کے کھوکھے کی طرف تھا جہاں ایک کمزور سا عمر رسیدہ آدمی چائے کے برتن ترتیب سے لگا رہا تھا۔ عملے کا وہ آدمی جس کے بارے میں علی کا خیال تھا کہ وہ ٹکٹ چیکر ہے، وہیں کھڑا چائے پی رہا تھا۔ اس نے سفید رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ علی بھی اس سے ذرا فاصلے پر ایک باہر کو نکلے ہوئے چوبی تختے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

''چاچا! ایک کپ چائے مل جائے گی؟'' اس نے عمر رسیدہ آدمی سے کہا۔

''ضرور بھائی جی! کیوں نہیں ...... ابھی لو۔'' یہ کہتے ہوئے اس آدمی نے فوراً ہی مٹی کے چولہے پر دھری ایک بڑی سی سلور کی چینک سے کپ میں گرما گرم دھواں اڑاتی چائے انڈیل کر اس کی طرف بڑھا دی۔

علی چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ وہ ٹکٹ چیکر کے جانے کا منتظر تھا تاکہ وہ عمر رسیدہ آدمی سے کچھ کام کی باتیں پوچھ سکے۔ تب ہی اس نے دیکھا کہ ٹکٹ چیکر اسے چائے پینے کے دوران گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ علی نے کوئی توجہ نہ دی اور چائے پیتا رہا۔

لکڑی کی ایک بینچ بھی پڑی تھی، مگر وہ کھڑے ہو کر ہی چائے پی رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ چولہا قریب تھا اور سردی میں وہ اسے نعمت محسوس ہو رہا تھا۔ ٹکٹ چیکر بھی اس کے ذرا قریب ہی کھڑا چائے پینے میں مصروف تھا۔

''میرے حساب میں لکھ لینا......'' اچانک ٹکٹ چیکر نے خالی کپ کاؤنٹر نما چوبی تختے پر رکھتے ہوئے عمر رسیدہ آدمی سے کہا تو وہ بولا۔

''ٹھیک ہے بابو جی! اپنا حساب تو چلتا رہتا ہے......''

ٹکٹ چیکر اپنے آفس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ علی ریحان نے اطمینان کی سانس لی، مگر دوسرے ہی لمحے وہ یوں رکا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ پلٹا اور علی کی طرف عجیب سی نظروں کے ساتھ دیکھنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف آنے لگا۔ علی گھبرا سا گیا مگر اس نے خود پر قابو پائے رکھا۔ چائے کا کپ اس کا بھی نصف ہو چکا تھا۔

''تم کوئی مسافر ہو......؟''

علی کو ہی نہیں بلکہ شاید چائے والے آدمی کو بھی ٹکٹ چیکر کا اس سے یوں مخاطب ہونا عجیب سا ہی لگا تھا۔ اسی سبب وہ بھی قدرے چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''جی بابو جی......'' علی نے عام سے لب و لہجے میں جواب دیا۔

''مگر ابھی تو کوئی ریل کار نہیں آئی......؟ تم کیسے یہاں تک پہنچے ہو؟'' ٹکٹ چیکر نے کچھ اشتباہ انگیز سے لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ جی میں تو کافی دیر کا آیا ہوا تھا۔ وہاں ایک بینچ پر سو گیا تھا۔ سوچا صبح ہو جائے تو شہر کا رخ کروں۔''

''ٹکٹ کہاں ہے تمہارا......؟'' بالآخر اس نے وہی سوال کر ڈالا تھا جس کا علی کو ڈر تھا۔

''وہ جی...... ٹکٹ تو تھا میرے پاس...... پر شاید ادھر ادھر ہو گیا ہے۔'' علی نے کھسیانا سا ہو کے جواب دیا۔

''ہوں...... لگتا ہے تم اس مال گاڑی میں ابھی پہنچے ہو یہاں اور مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔'' ٹکٹ چیکر بھی کوئی تجربہ کار ریلوے ملازم تھا۔ یہ کہتے ہوئے وہ سامنے لوکوشیڈ والے ٹریک پر کھڑی مال گاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ اشارہ بھی اس نے اسی طرف کیا تھا۔

علی کے ایک لمحے کو اوسان خطا ہو گئے۔ اس طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا کہ ٹکٹ چیکر کو اس کا شبہ ہو سکتا تھا جبکہ اسی مال گاڑی کی سب سے آخر والی گارڈ بوگی میں ایک لاش بھی تھی۔ اس پر اس کے قتل کا الزام بھی لگ سکتا تھا۔ علی کو دو باتوں پر سخت پچھتاوا ہونے لگا۔

پہلا تو اس بات پر کہ اسے کم از کم اس لاش کو اندھیرے ویران جنگل میں لڑھکا دینا چاہیے تھا۔ یا پھر وہ ادھر کا رخ نہ کرتا۔ حالانکہ وہ اسٹیشن کی عمارت سے باہر جا چکا تھا اور بلاوجہ ہی پلٹا تھا۔ علی جیسے آدمی سے بھی ایک فاش غلطی ہو گئی تھی۔ جلدی سے بولا۔

''نہیں بابو جی! بالکل نہیں میں بھلا اس مال گاڑی میں کیسے سوار ہو سکتا ہوں۔'' اسی وقت دفتر کے کمرے سے عملے کا ہی ایک آدمی بوکھلایا ہوا باہر نکلا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نظر کھوکھے کے پاس کھڑے ٹکٹ چیکر پر پڑی اور وہ سیدھا ادھر ہی دوڑتا ہوا آ گیا اور ٹکٹ چیکر سے بولا۔

''ریاض صاحب! لوکوشیڈ سے فون آیا ہے۔ میں اسٹیشن ماسٹر صاحب کو بلانے جا رہا ہوں۔''

''ہوا کیا ہے آخر جاوید؟'' ٹکٹ چیکر نے پوچھا۔

''ریاض صاحب! ابھی جو مال گاڑی پہنچی ہے...... اس کی گارڈ بوگی کے اندر ایک لاش پڑی ملی ہے۔''

جاوید نامی اس آدمی نے جیسے دھماکا کر دیا۔ علی ریحان کے پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے سان گمان

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں بھی نہ تھا کہ جس علاقے کی زمین کو وہ اپنے لیے محفوظ سمجھے ہوئے تھا، وہاں اس طرح اچانک ایک بڑی مصیبت کا شکار ہو جائے گا......

اس نے راہِ فرار اختیار کرنے کے بارے میں سوچا، لیکن پھر فوراً ہی اپنا ارادہ بدل دیا۔ جبکہ ٹکٹ چیکر ریاض، جاوید کی بات سن کر بری طرح چونک اٹھا تھا اور علی کی جانب گھورنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شکوک کی پرچھائیاں اور گہری ہو گئی تھیں۔

ادھر جاوید جانے لگا تو ریاض نے اسے روک دیا۔
''ٹھہر جاؤ جاوید!'' وہ رک گیا اور الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ریاض نے علی سے تحکمانہ درشتی سے کہا۔
''تم ذرا میرے ساتھ چلو...... خبردار! بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ سارے علاقے کی پولیس تمہارے پیچھے لگا دوں گا۔'' اس کی بات پر نہ صرف جاوید بلکہ چائے کے کھوکھے والا بھی حیران پریشان سی نظروں سے ٹکٹ چیکر ریاض کو تکنے لگے۔
''میں نے کوئی جرم کیا ہے جو بھاگ جاؤں گا بابو جی؟ چلو، میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' علی نے بہ ظاہر سینہ تان کر کہا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

تاہم اندر سے اس کا دل اس اچانک مخدوش صورتِ حال پر تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ یہ سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ کہاں تو وہ خود کو یہاں ہر طرح سے محفوظ و مامون سمجھے ہوئے تھا۔ اس لیے کہ یہ ایک آزاد مسلم ریاست تھی۔ یہاں اسے کوئی خطرہ نہ تھا اور اب اچانک یہ مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے مال گاڑی سے اترنے کے بعد اسٹیشن کا رخ ہی کیوں کیا تھا؟ وہ اسٹیشن کی ٹوٹی پھوٹی باؤنڈری وال سے بھی تو باہر نکل سکتا تھا، کسی کی نظروں میں آئے بغیر...... ایسا نہ کیا تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ علی کو ابھی تک حیرت ہو رہی تھی اپنی اس فاش غلطی پر، مگر اب تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔

یوں علی نے بھاگنے کا بھی سوچا تھا مگر اس طرح مزید صورتِ حال گڑبڑ ہو جاتی۔ اسے کچھ تسلی تھی کہ اس بھیانک چہرے والی لاش نے اسے اگر پھنسوا دیا ہے تو اسی نے اس کے ہاتھ میں ترپ کا ایک پتا بھی اس رقعے کی صورت میں تھما دیا ہے جو نہ صرف اس کی بے گناہی کی گواہی دے سکتا ہے بلکہ نواب شہباز خان کی نظروں میں اس کی عزت و تکریم کا سبب بھی بن سکتا تھا۔

وہ ترپ کا پتا اس کی جیب میں تھا۔ یہ سوچ کر علی کو کچھ سکون محسوس ہوا اور خدا کا شکر بجا لایا کہ اس سے ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہیں ہوئی۔ یعنی اس نے فرار کا راستہ اختیار نہیں کیا اور خود کو پیش کر دیا۔

ٹکٹ چیکر نے فوراً جاوید کو بھیج کر ریلوے پولیس کو بلوا لیا۔ علی کو تھانے لے جایا گیا جو اسٹیشن کی عمارت سے متصل ہی تھا۔ وہاں ایک چھریری قامت کا پولیس انسپکٹر منظور شاہ موجود تھا۔ اس کا چہرہ بھی اس کے جسم کی طرح پتلا اور لمبوترا تھا۔ اس کی آنکھوں سے درشتی اور چہرے سے کرختگی نمایاں تھی۔ وہ ایک سخت گیر پولیس آفیسر نظر آتا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اس نے اپنے دبلے پتلے شریر پر لفافہ قسم کی پتلون اور شرٹ چڑھا رکھی تھی۔
وہ علی کو بہ غور گھورتے ہوئے مستفسر ہوا۔
''کیا نام ہے تمہارا؟''
''علی ریحان۔'' علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا نام بتایا۔
''کیا تم اسی مال گاڑی پر سوار تھے جس کی گارڈ بوگی سے ایک لاش برآمد ہوئی ہے؟''
''ہاں!'' علی نے سچ بولا۔
''اس شخص کو تم نے ہلاک کیا تھا؟''
''ہرگز نہیں...... یہ وہاں پہلے سے ہی ادھ موا پڑا تھا لیکن اس نے مجھے ایک پیغام دیا تھا جو میں نے یہاں کسی کو پہنچانا تھا۔''
''پیغام......؟ کیسا پیغام؟'' انسپکٹر منظور شاہ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
''ہاں! اور وہ پیغام نواب شہباز خان کے لیے تھا۔'' علی نے بتایا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ معاملہ حساس ہو گیا تھا اور پولیس اس میں شامل ہو چکی تھی۔

ادھر نواب شہباز کے نام پر علی کی بھانپتی نظروں نے دیکھا کہ انسپکٹر منظور شاہ کے چہرے پر ایکا ایکی کرختگی کی جگہ ایک عجیب قسم کے چونکنے پن نے لے لی تھی۔ وہ اسی لہجے میں مستفسر ہوا۔
''وہ پیغام کیا ہے؟''
''یہ بہت اہم پیغام ہے جو میں صرف نواب صاحب کو دوں گا۔'' علی نے مسکت جواب دے ڈالا، اس پر انسپکٹر ذرا نرم پڑتا محسوس ہوا۔
''بیٹھو......'' اس کا رویہ ایک دم تبدیل ہوتا دیکھ کر علی ریحان کو مطلق حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نے نام ہی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ایسی شخصیت کا لیا تھا کہ انسپکٹر منظور تو کیا اچھے اچھوں کا رویہ بھی بدل جانا معمول کی بات ہوتی۔

علی جسے پہلے مجرموں کی طرح ہتھکڑیاں لگا کر کھڑا کر رکھا گیا تھا اور دو سپاہی بھی تنے ہوئے وہاں کھڑے تھے۔ انسپکٹر کے اشارے پر علی کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بھی کھول دی گئی تھیں۔

اس کے بعد انسپکٹر منظور نے دونوں سپاہیوں کو باہر جانے کا بھی اشارہ کر دیا۔

اب صرف اس چھوٹے سے کمرے میں علی اور انسپکٹر منظور رہ گئے تھے۔

"تم کوئی جاسوس ہو؟ میرا مطلب ہے باغی گروپ کے جاسوس؟" انسپکٹر نے اس بار نیچی آواز میں اس سے پوچھا۔ علی محتاط مزاج تھا لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ سچ بولے بنا گلوخلاصی ممکن نہ تھی اور ایک طرح کی مجبوری بھی تھی۔ تاہم پھر بھی محتاط انداز میں بولا۔

"انسپکٹر صاحب! مجھے اس بات کی پوری تسلی ہے کہ میں ایک آزاد مسلم ریاست میں موجود ہوں اور میری یہ طمانیت ہی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں جبکہ حقیقت بھی یہی ہے کہ میں نواب صاحب کے پاس ایک اہم خبر لے کر بہت پہلے سے ہی ان سے ملنا چاہتا تھا، ریل کار مجھ سے چھوٹ گئی تھی اور پہنچنا بھی جلدی تھا مجھے...... لہٰذا اس مال گاڑی میں ہی سوار ہونا پڑا۔ چنانچہ میں اب آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ کی تفتیش کی صورت میں کوئی تاخیر ہوگئی تو میرا خیال ہے نواب صاحب اس کا بہت برا منائیں گے۔"

علی نے بات ختم کرنے کی غرض سے سب کہہ ڈالا تو انسپکٹر منظور بولا۔

"تمہیں پتا ہے کہ وہ لاش کس کی تھی؟"

"نہیں۔" علی نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

"وہ نواب صاحب کے ہی ایک آدمی خاور حیات کی تھی۔"

"اوہ......!" علی کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

"پھر تو آپ کو مجھے فی الفور نواب صاحب کی حویلی پہنچا دینا چاہیے۔"

"ہوں...... کچھ ضروری اور ضابطے کی کارروائی سے متعلق قانونی ضرورتیں پوری ہو جائیں، جس میں چند ہی منٹ لگیں گے اس کے بعد میں خود آپ کو سراج خان صاحب کے پاس لیے چلتا ہوں......"

"سراج خان......؟" علی کے منہ سے الجھن آمیز انداز...... میں سوال برآمد ہوا تھا۔

☆☆☆

گارشیا اور رابرٹ کے اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف جانے کے بعد رینا بھی تھوڑی ہی دیر میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس بات سے بےخبر کہ کچھ دور کھڑا شوکی اس کا بےچینی سے منتظر تھا کہ وہ کب اسے اپنے پاس بلاتی ہے۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں خیمے کی طرف بڑھی اور اندر داخل ہو کر اس نے پردہ برابر کر کے ڈوری لپیٹ دی۔

اندر ایک آئل لیمپ روشن تھا۔ اس نے ایک شمع دان بھی روشن کر لی تھی۔ ایک کونے میں نندو بابا اور شانتا گہری نیند سوئے پڑے تھے۔

وہ اپنے باپ کے صندوقچے میں دھری پڑی کتابیں اور نوٹ بکس دیکھنے لگی، تب ہی ایک ڈائری اس کے ہاتھ لگی۔

اگرچہ باپ کے مرنے کے بعد رینا نے پروفیسر ہنری کے صندوقچے اور ان میں رکھی مختلف النوع موضوعات کی کتابوں کی جھاڑ پھونک کی تھی تاہم وہ خود بھی انہیں پڑھتی اور ان سے استفادہ حاصل کرتی رہتی تھی۔ لہٰذا ڈائری کو بھی پہلے تو یونہی سرسری انداز میں پڑھتی اور دیکھتی چلی گئی لیکن اچانک ایک مضمون پر اس کی نگاہ اٹک کر رہ گئی۔

ڈائری میں مندرج سارے مضامین بقلم خود ہاتھ سے لکھے گئے تھے۔ جن میں انگریزی اور زیادہ تر اردو ہندی میں لکھے گئے تھے، رینا کو بھی چونکہ اردو ہندی آتی تھی، جیسا کہ مذکور ہوا، رینا اپنے باپ کے بہت قریب رہی تھی اور اس کے تحقیقی کاموں میں ہاتھ بھی بٹانے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ بھی مہم جوئی اور تحقیقی کاموں میں پوری دلچسپی لیتی تھی۔ اپنے باپ پروفیسر ہنری برنارڈ کی طرح اسے بھی کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

جس مضمون پر اس کی نگاہیں اٹک کر رہ گئی تھیں وہ ایک ہندوستانی ریسرچر، پروفیسر دنکر سہنا جسے انگریز سرکار کی طرف سے "سر" کا خطاب بھی مل چکا تھا کا لکھا ہوا تھا، پروفیسر دنکر سہنا کا اصل شعبہ اسراریات تھا۔ اسی مناسبت سے اس نے ناگرہ کی ایک وادی راکاشی کا ذکر کیا تھا جس کے دور و نزدیک کہیں کالی کا پرانا مندر تھا جو عرصہ دراز سے غیر آباد تھا۔ یہ مندر اگرچہ راکاشی وادی سے تھوڑا ہی دور اور ناگرہ ریاست کی جنوب مشرقی حدود میں واقع تھا، اس کے متعلق لکھا تھا۔

رینا اس ڈائری کو اٹھا کر روشنی کے قریب کیے ایک موٹے گرم گدیلے پر پڑھنے بیٹھ گئی۔

فاضل پروفیسر دنکر سہنا نے اپنے اس اہم مضمون میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جو ایک طرح سے اس کی یادداشتوں کا حصہ بھی تھا، پہلے اس کی اسراریات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا۔

"صدیوں سے شیطان اس دھرتی پر مختلف روپ لے کر پیدا ہوئے ہیں...... جسے ہم وناش کہتے ہیں۔ اس مندر کو راکاشی کے لوگوں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک منصوبہ بندی کے تحت بنایا تھا۔ جس میں ایک خفیہ تہ خانہ رکھا گیا تھا۔ چار پروہتوں کا ایک گروپ جو شیطانی عمل کے پریوگ میں مصروف رہتا تھا اور سانپوں کے راجا ناگ راج کو پوجتا تھا۔ وہاں انہوں نے سانپ پالنا شروع کر دیے اور کسی بڑے ناگ کا بت بنا کر دن رات اس کی پوجا کرتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان چاروں شیطان پجاریوں کو شیش ناگ کے منکے کی تلاش تھی۔ اس میں ایک پجاری بھیمن داس کو سانپوں کے زہر کی بڑی معلومات تھی۔ یہاں تک کہ وہ سانپوں اور بچھوؤں کے زہر میں نہ صرف موت تلاشتا تھا بلکہ اسی میں سے تریاق بھی نکالتا تھا۔ پجاریوں کے اس شیطانی گروپ میں بھیمن داس کو "مہا پجاری" کی حیثیت حاصل تھی۔ منکا تو وہ حاصل نہ کر پائے البتہ ایک خاص قسم کا زہر مہا پجاری بھیمن داس کے ہاتھ ضرور لگ گیا، جس کے کھانے سے موت تو واقع نہیں ہوتی ہے لیکن اس سے ہڈیوں کا ایک عجیب وغریب...... مرض پیدا ہو جاتا ہے، جو جسم میں وٹامن ڈی کی شدید کمی کا سبب بنتا تھا، اس کے کھانے کے نتیجے میں ہڈیاں مڑ جایا کرتی ہیں، جسے انگریزی اور میڈیکل سائنس میں اوسٹوملیشیا اور ریکٹس کہا جاتا ہے۔ یہ نوجوانوں اور بچوں میں تیزی سے پروان چڑھتا ہے اور اس میں وہ منرلز اور وٹامن (ڈی) کی کمی پیدا ہو جاتی ہے جو ہڈیوں کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

"یہ شیطانی گروہ سانپ پالنے لگے اور ان کی پوجا کرتے، ان کا زہر نکال کر محفوظ کرتے جس کی بنا پر کئی بے گناہ معصوم لوگوں کی موت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ کالی کے مندر کے مہا پجاری بھیمن داس کا اصل مقصد امر شکتی اور پراسرار شیطانی قوتوں کا حصول تھا۔ جس کے لیے وہ معصوم بچوں سے لے کر کنواری دوشیزاؤں کو کالی کا بلیدان دے کر جاپ الاپ کیا کرتا تھا۔

"ساتھ ہی مہا پجاری بھیمن داس نے اس زہر کو جب عام لوگوں میں آزمانا شروع کیا جو ان کی شیطانی حرکتوں کے خلاف ہوتے تھے تو انہیں ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی سب سے زیادہ مخالفت راکاشی قبیلے کے لوگوں نے ہی کی تھی اور انہوں نے ہی ان کے شیطانی کھیل کو بے نقاب کیا تھا اور بھیمن داس نے بیٹے کو مرتے وقت نصیحت کی تھی کہ وہ راکاشی والوں سے اس کا انتقام ضرور لے گا۔

"کہا جاتا ہے مرنے سے پہلے مہا پجاری بھیمن داس نے اپنا یہ علم اپنے بیٹے بدری ناتھ کو منتقل کر دیا تھا۔ ہندو مت کی کتاب "بھورش شیوانی" میں لکھا ہے کہ یہ شیطانی گروہ بیمار ہیں اور اسی بیماری نے انہیں جہاں بدن کی کمزوری دی وہیں بعض شیطانی قوتیں بھی ملیں، یہ شیطانوں کا گروہ ہے ان سب کو ختم کر دینا چاہیے......"

ڈائری کے مندرجات پڑھتے پڑھتے رینا کا دماغ شل ہونے لگا تھا کیونکہ کالی کے مندر اور مہا پجاری بدری ناتھ سمیت اس کے چیلے چانٹوں کا کچا چٹھا اس ڈائری نے کھول کر رکھ دیا تھا جو لوگوں کے سامنے بہ ظاہر دھارمک بنے ہوئے تھے مگر حقیقت ان کی اندر سے ایک شیطانی گروہ کی سی تھی۔

رینا کا اب اس بات پر پختہ یقین ہونے لگا تھا کہ اس کے باپ پروفیسر ہنری برنارڈ کا قاتل بدری ناتھ اور اس کے شیطانی حواری تھے۔ رینا نے ان سے اور بالخصوص بدری ناتھ سے انتقام لینے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس ڈائری میں ہندوستانی پروفیسر دنکر سہنا کے یہ الفاظ ثبوت تھے کہ ماضی کے مہا پجاری بھیمن داس اور اس کے شیطانی حواریوں کا بھید کھلتے ہی لوگوں نے مندر میں بلا بول کر انہیں مار ڈالا تھا اور مزید یہ کہ پجاری بدری ناتھ اسی کا بیٹا تھا۔ اب وہ اپنے باپ کے اس شیطانی عمل کو پورا کرنے کی جستجو میں تھا۔

تب ہی رینا کے سامنے یہ پراسرار عقدہ بھی کھلا کہ جب پہلی بار وہ اپنے آنجہانی باپ ہنری کے ساتھ یہاں فروکش ہوئے تھے تو انہوں نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا تھا جو چوپایوں کی طرح چلنے پھرنے پر مجبور تھے۔ وہ رات کی تاریکی میں کہیں نکل جاتے اور رات کے آخری پہر یا صبح منہ اندھیرے لوٹ آتے تھے۔

یہی نہیں رینا کو اس وادی نما بستی راکاشی، جہاں وہ اب اپنے ساتھیوں کے ساتھ فروکش تھی، کا یہ پراسرار راز بھی آشکار ہونے لگا کہ...... وہ ضرور مہا پجاری بھیمن داس کے موروثی انتقام کا نشانہ بنائے گئے ہیں، اور یہ فریضہ اس کے بیٹے بدری ناتھ کے سوا بھلا اور کون انجام دے سکتا تھا۔

اس ڈائری کے مطالعے کے بعد رینا پر اب کالی کے مندر کے اسرار اور اس کے مہا پجاری بدری ناتھ کے کالے کرتوت منکشف ہونے لگے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب اس کے ہاتھ اس خبیث اور شیطان پجاری کی تباہی کا سامان لگ چکا ہے، رینا کے شکست خوردہ وجود کے اندر ہمت و حوصلے کی ایک نئی طاقت ابھرنے لگی تھی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اپنے باپ کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کی اسے ایک نئی راہ ملی تھی۔ وہ اب اس موقعے کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس بار اس نے بہت سوچ سمجھ کر بدری ناتھ کے خلاف قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ ترپ کا یہ پتا ضائع نہ چلا جائے۔

وہ ڈائری بند کر کے اب اس بات پر گہری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگی تو اسے ادراک ہونے لگا کہ بدری ناتھ کی کھٹیا کھڑی کرنے کے لیے صرف وہ یا اس کے ساتھی کافی نہیں ہوں گے۔ کوئی ایسا آدمی ہونا چاہیے جو مضبوط ہو اور بااثر بھی...... جو صدقِ نیت اور اس سے زیادہ خفیہ طور پر اس کی مدد کر سکے۔

اس بارے میں پہلا خیال اس کا شوکی کی طرف گیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا یہ خیال مسترد کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ شوکی پر اسے اعتماد نہیں تھا یا اس سے مدد کی کوئی امید نہ تھی، وہ تو اس کے لیے جان دینے کو بھی ہر دم تیار رہتا تھا لیکن رینا کے نزدیک شوکی اس معاملے میں ایک حد تک ہی مدد کر سکتا تھا اس سے زیادہ نہیں، باقی رہے گارشیا اور رابرٹ تو ان کے بارے میں مدد کا سوچنا ہی عبث تھا۔

''ولی عہد پرتاب کمار......''

یہی ایک نام اس کے خیال انگیز دماغ میں ابھرا تھا۔

''ہاں! پرتاب کمار ہی وہ واحد شخص ہے جو میری بھرپور اور ہر طرح سے مدد کر سکتا ہے۔'' اس کا نام ذہن میں آتے ہی رینا جوش و جذبے تلے بے اختیار خود کلامیہ بڑبڑانے پر مجبور ہو گئی۔ اس کی نظرِ انتخاب ولی عہد پرتاب کمار پر ایسے ہی نہیں پڑی تھی، اس میں خود پرتاب کے اس کے ساتھ ''رویے'' کا بھی دخل تھا۔

یہی وہ واحد شخص تھا جس نے کسی سیاسی مصلحت اور لوگوں کی پروا کیے بغیر انصاف کرتے ہوئے سب سے پہلے کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ جیسے بااثر آدمی کے خلاف کھلا مقدمہ چلایا تھا، لیکن بعد میں رابرٹ کی جھوٹی گواہی نے نہ صرف سارا کھیل بگاڑ دیا بلکہ جیتا ہوا مقدمہ بھی وہ ہار گئے، نیز ولی عہد کو بھی شکست خوردگی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر باوجود اس کے وہ اس سے خفا نہیں ہوا تھا بلکہ راج محل سے رینا کی بے دخلی کے وقت اس نے خود آ کر معذرت کے ساتھ آئندہ بھی مدد کا اظہار کیا تھا۔ اگرچہ ان کی راج محل سے بے دخلی کا اسے بھی بے حد دکھ ہوا تھا۔

لہٰذا رینا کو پرتاب کمار کا وعدہ یاد تھا۔

اسی وقت وہ چونکی، اس کے خیمے کے باہر کسی کی آہٹ ابھری تھی۔ اس نے سر اٹھا کر پردے کی طرف دیکھا۔ رات

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اپریل 2018ء
کی جھلکیاں

بجیا
ڈاکٹر ساجد امجد کے کلکِ قلم
کا شہکار، فاطمہ ثریا بجیا کی داستانِ حیات

اماوس کا مسافر
زویا اعجاز کی شرربار تحریر، دسیب
کے ایک بڑے شاعر کی دکھ بھری کتھا

نمک لاہوری
شکیل صدیقی کا تحفہ، اردو
کے ایک بڑے قلم کار کا ذکرِ خاص

اننناس کے پھول
محمد ظفر حسین کے قلم سے
ایک دکھ بھری سچ بیانی، رلا دینے والی تحریر

شمشال سے ٹورنٹو
ندیم اقبال کا دلچسپ سفرنامہ
جواب ایک دلچسپ مراحل میں ہے

اس کے علاوہ

لہورنگ طویل کہانی ''ناسور'' کراچی کے بھولے بسرے محلوں کی داستان ''یاد ماضی''...... اور بھی بہت سی سچ بیانیاں سچے قصے دلچسپ حقائق۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اتر آئی تھی اور سحر انگیزی چاندنی چہار سو نچھاور ہونے لگی تھی۔ اسی کی روشنی میں اسے خیمے کے پردے پر ایک انسانی سایہ لہراتا دکھائی دیا۔

''کون......؟'' اس نے فوراً قدرے بلند آواز سے پوچھا۔

''میں ہوں...... شوکی......'' باہر سے شناسا آواز سنائی دی تو رینا نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں......؟'' اس نے باہر سے پوچھا۔

رینا اس وقت ایک اہم ترین منصوبے پر غور کر رہی تھی اور اس نے ڈائری ملنے کے بعد اپنے باپ کے صندوقچے کو مزید کھنگالنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ جبکہ شوکی سے اس سلسلے میں اس نے پھر بھی بات کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت پوری یکسوئی کے ساتھ...... اپنے آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے خیمے سے باہر آنے کی زحمت گوارا کیے بغیر ہی شوکی سے جواب میں کہہ ڈالا۔

''شوکی ڈیئر! میں اس وقت ایک اہم کام میں مصروف ہوں۔ میری یکسوئی متاثر ہوگی، ہم کل بات کریں گے۔ ابھی تم بھی تھکے ہوئے ہوگے، جاکر اپنے خیمے میں آرام کرو۔''

باہر کھڑے شوکی کو رینا کی بات پر کرب آمیز سی حیرت محسوس ہوئی۔ پہلے تو اسے رینا کے ان الفاظ پر یقین ہی نہ آیا، مگر وہ اس کے...... لہجے اور واضح الفاظ کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

رینا کے جواب پر اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ چند ثانیے اسی طرح سوچتا سا کھڑا رہا اس کے بعد واپس اپنے خیمے کی طرف پلٹ گیا۔ وہ اندر سے بری طرح الجھ سا گیا تھا، آخر کیا بات تھی؟ رینا کا رویہ کیوں بدل رہا تھا؟ یا پھر یہ میرا وہم تھا، وہ پریشان بھی تو تھی۔

انہی سوچوں میں غلطاں وہ اپنے خیمے میں آیا تو امجد خان جاگ رہا تھا۔ وہ اب تک اس کا ٹھیک ٹھاک رازداں بن چکا تھا اور خاصا بے تکلف بھی ہوگیا تھا۔ خیمے لگانے کے دوران وہ پہلے سے ہی اس کے چہرے کے تاثرات سے بے کلی کو محسوس کیے ہوئے تھا۔ اب جو اسے یوں واپس منہ لٹکائے اندر آتے دیکھا تو بولا۔

''کیا بات ہے شوکی؟ یہ تیرا چہرہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں یار...... بس، ایسے ہی......'' شوکی نے ٹالنا چاہا اور ایک طرف کونے میں...... بیٹھ گیا۔ امجد غور سے اس کا چہرہ تکتا ہوا اس کے پاس ہی دری بچھی زمین پر بیٹھ گیا اور اپنے کاندھے کا ہلکا ٹھوکا مار کے بولا۔

''ایسے ہی نہیں ہے، میرے یار! معاملہ کچھ گڑ بڑ لگتا ہے۔ کیا اس فرنگن نے دل توڑ دیا ہے تیرا؟''

''نہیں یار! ایسی بات تو نہیں ہے۔'' شوکی گومگو سے لہجے میں بولا۔

''اچھا!'' امجد نے ہلکا سا دوستانہ طنز کیا۔ ''جتنا عرصہ بھی تیرے قریب رہا ہوں میں سب جان گیا ہوں اور جو نہیں جانتا تھا وہ تو مجھے ایک اچھا دوست سمجھ کر بتا چکا ہے۔'' اس کی بات پر شوکی نے بے تاثر مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھٹک کر رہ گیا۔ امجد خان جو کافی حد تک شوکی کی بے چینی اور قنوطیت آمیز اداسی کو سمجھ چکا تھا۔ صاف گوئی سے بولا۔

''میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ فرنگن کسی کی نہیں ہوتی ہیں۔ بے وفائی ان کے خمیر میں بسی ہوتی ہے۔ پر تو بھی بھولا ہی رہا۔'' اس کی بات پر شوکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ امجد کی بات اسے بری تو نہیں البتہ تلخ ضرور لگی تھی۔ اسے یوں دیکھتا پا کر امجد تھوڑا خفیف سا ہوا اور اسی لہجے میں بولا۔

''میرا مقصد تیرا دل برا کرنا نہیں تھا میرے یار! بلکہ حقیقت بتانا تھا۔ ان فرنگنوں کے خیالات ایک سے کبھی نہیں رہتے۔ جہاں شہد ٹپکا وہیں چپک گئیں...... پہلے وہ اس بدمعاش گورے رابرٹ کے ساتھ نتھی رہی، پھر تمہیں دیکھا تو تمہارے ساتھ پینگیں بڑھا لیں اور اب...... چل چھوڑ...... ویسے ولی عہد پرتاب کے رویے کو تو تم نے بھی محسوس کیا ہی ہوگا۔'' بات کرتے کرتے امجد اصل ماجرا بھی بیان کر ہی گیا تھا۔

''مگر رینا ایسی نہیں ہے امجد!'' بالآخر شوکی کو کہنا پڑا۔ تاہم اسے محسوس ہوا تھا کہ رینا کی حمایت میں کہے گئے اس کے الفاظ مقابلتاً، امجد کے کہے گئے جملوں سے کمزور تھے۔ یوں اس کے لہجے کی کمزوری اس کے لفظوں سے میل نہیں کھاتی تھی۔ وہ آگے بولا۔ ''وہ موجودہ حالات کی وجہ سے فکرمند ہے اور پھر راج محل کی بے دخلی سے تو ہم سب بھی تو کم پریشان نہیں ہیں۔''

امجد اس کی بات پر ایک ٹھوکا مار کے ہنسا مگر پھر سنجیدہ ہو کے بولا۔ ''یہ جواز اپنی جگہ، مگر رینا کے اور اس کے دل کے قریب ترین ساتھی تم ہی ہو اس وقت...... اور یہی وہ ایسا وقت ہوتا ہے جب ایک پریشان انسان کو کسی اپنے کے ساتھ کی اس کی دل جمعی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ تم رینا کی ہر مد میں شاملِ حال رہے ہو، پھر اس کی تم سے دوری کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟''

امجد خان کی دلیل مضبوط تھی جسے شوکی کا دماغ تو مان رہا تھا مگر دل نہیں۔ بولا۔ ''یہ سب آج ہی تو ہوا ہے یار! اتنی جلدی رینا کے بارے میں تیرا یوں اندازہ قائم کرنا غلط بھی ہوسکتا ہے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''اللہ کرے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔'' وہ پورے دوستانہ خلوص سے بولا ...... ''لیکن میرے یار! انسان اگر تصویر کے دوسرے رخ پر بھی نظر رکھے رہے تو پھر بعض تلخ حقیقتوں کے اچانک آشکار ہونے کا دکھ کم ہوتا ہے، ورنہ تو آدمی ادھ موا ہو جاتا ہے اور میں تجھے غم زدہ نہیں دیکھنا چاہتا میرے دوست!''

شوکی ایک لمحے تو حیرت سے امجد خان کا منہ تکتا رہ گیا۔ کیا تھا وہ؟ اس کی طرح ایک معمولی سوجھ بوجھ کا ملازم فرنگیوں کا نمک خوار، زیادہ پڑھا لکھا بھی نہ تھا، لیکن کیا انسان کے اپنی زندگی کے ذاتی تجربات بھلا کتابوں میں ملتے ہیں؟ امجد خان کا بھی تجربہ تو کسی جامعہ کے تدریسی نصاب سے کیا کم تھا۔

شوکی سے پھر کچھ نہیں بولا گیا۔ وہ محض ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ امجد خان نے اس کے مضطرب الحال چہرے سے اس کی دلی کیفیت تاڑ لی اور ماحول کا تکدر دور کرنے کی غرض سے بولا۔

''میرے یار! تو ایک سیدھا اور سچا آدمی ہے اور ایسے انسان کی محبت میں بڑا زور ہوتا ہے۔ وہ اپنی محبت کے پیچھے سب کچھ وار دیتے ہیں، جان تک دے دیتے ہیں۔ اور تو نے رینا کے ساتھ ایسا ہی کیا ہے۔ چل چھوڑ۔ آرام کر لے، ہو سکتا ہے میں ہی غلط ہوں۔ تیری بات بھی تو صحیح ہے کہ اتنے کم عرصے میں ہم کسی کے بدلنے کا بھلا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔''

شوکی کو یوں لگا جیسے امجد نے اس کا دل رکھنے کے لیے یہ بات کہی ہو۔

شوکی اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔ البتہ امجد کے خراٹوں سے خیمہ گونجنے لگا تھا۔

راکاشی وادی کی یہ رات یوں بھی بڑی اسرار بھری محسوس ہو رہی تھی۔ چاروں طرف سے جنگلاتی پہاڑیوں میں گھری ہوئی پیالہ نما وادی کے آسمان پر ٹنگے طباق چاند کی روشنی میں سرد ہوائیں آسیبی سرگوشیاں کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ مثلث کے زاویے سے بنے تین خیموں کے درمیان الاؤ مدھم پڑنے لگا تھا۔ ایک سحر انگیز سی ملگجی چاندنی تاریکی کے بطن سے پھوٹتی عجیب سا طلسماتی اثر طاری کیے ہوئے تھی۔ ایسے میں کہیں قریب ہی کوئی کسی گیدڑ کے رونے کی منحوس آسیبی آواز ابھری تھی۔

رات کے آخری پہر جا کر کہیں شوکی کی آنکھ لگی ......

ادھر اپنے خیمے میں رینا بھی کم و بیش ایسے ہی وقت میں سوئی تھی۔

اچانک خیموں کے اطراف میں پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں ہلکی سرسراہٹ ہوئی۔ پھر دو آنکھیں چمکیں، اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے دو سے چار اور چار سے آٹھ ہوتی چلی گئیں۔ ان میں محویت تھی اور مجوبیت بھی۔ غصہ بھی تھا اور ایک طرح کا دبا دبا خوف بھی۔ یہ آنکھیں اب تین اطراف سے جھاڑیوں میں دبکی ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔ پھر ان کے درمیان کچھ کھسر پھسر ہوئی، اس کے بعد شاید آپس کی سرگوشیوں میں صلح مشورہ کیا گیا اور تینوں جانب کی جھاڑیوں کی سرسراہٹ میں کچھ اضافہ ہو گیا۔

وہ چھ کی تعداد میں عجیب الخلقت افراد تھے جو کسی چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے اندھیرے سے برآمد ہوئے۔ ان کے جثے اب حلیوں سمیت واضح ہو چکے تھے۔ جسموں پر انسانوں ہی کی طرح کے ڈھیلے ڈھالے لباس نظر آتے تھے۔

اب ان کے انداز میں محتاط پن تھا۔ اب خیموں کے وسط میں مدھم مدھم سے دہکتے ہوئے الاؤ کی روشنی میں یہ انسان نما حیوان سے نظر آنے والی مخلوق تین حصوں میں بٹ کر خیموں کے قریب جا پہنچی۔ ان کے عقب میں ان کے باقی دبکے ہوئے ساتھیوں کی آنکھیں ہنوز چمک رہی تھیں۔ ان میں مرد عورتیں اور چھوٹے بڑے سب ہی موجود تھے۔

آخر اللہ کر...... چھ چوپائے نما انسان، اسی طرح چلتے ہوئے خیموں کے دروازے کے پاس رک گئے تھے۔ پھر انہوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو پیغام رسانی کی اور پھر ان کے مڑے تڑے سے ہاتھ ان کے...... شلوکے دار لباس کے اندر رینگ گئے اور جب برآمد ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں چقماق پتھر اور سوکھی جھاڑیوں کے تنکوں کا گچھا تھما نظر آ رہا تھا۔ وہ انہیں جلانے لگے، جلد ہی ان میں شعلے بھڑکنے لگے، وہ انہوں نے خیموں کے پردوں اور چادروں کو دکھا دیے اور نہایت پھرتی کے ساتھ واپس پلٹ گئے۔

تینوں خیموں میں دیکھتے ہی دیکھتے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ جھاڑیوں میں دبکے ہوئے یہ عجیب الخلقت لوگ لپکتے شعلوں کو گھورنے لگے۔

☆☆☆

ولی عہد پرتاب کے لیے اپنے باپ کی موت اچانک اور ناقابلِ یقین تھی۔ اگرچہ اس نے ماں کا پیار بھی دیکھا تھا جب وہ پندرہ سولہ سال کا تھا۔ اسے اپنی ماں کی شبیہ بھی یاد تھی اور اس کی محبت بھی دیکھی تھی۔ وہ اچانک تو نہیں مری تھی البتہ بیماری میں کچھ دنوں بعد انتقال کر گئی تھی۔ پرتاب کو بھی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تک یاد تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ کس قدر رویا تھا۔ باپ سے بھی اسے محبت ملی تھی مگر کم...... لیکن ماں کے مرنے کے بعد کئی ہفتوں تک وہ اداس اور غمگین رہا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے ایسے زخم بھی بھر دیتا ہے۔ بیٹے کو اس طرح غمناکی کی حالت و کیفیات میں دیکھ کر ہی مہاراجا چندر گپتا ریاستی امور و سیاست سے اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہوا تھا کہ یہی اب ولی عہد بھی تھا۔

یوں مہاراجا چندر گپتا نے، پرتاب کو باپ کی بھی پوری پوری محبت اور شفقت دینا شروع کی تو پرتاب کے غم کا بوجھ ہلکا ہوا اور دونوں باپ بیٹے کے درمیان گویا نئے سرے سے محبت اور شفقت پروان چڑھنے لگی۔ یہاں تک چندر گپتا کی خصوصی توجہ سے پرتاب ریاستی امور اور دیگر علوم میں طاق و مشاق ہونے لگا۔ یوں اس کا دل بھی بہلتا رہا۔

لیکن...... اب جیسے وہی پرانا زخم پھر سے ہرا ہو گیا تھا۔ باپ کی اس اچانک موت کے بعد پرتاب کے پرانے زخموں کا اندمال دوبارہ چھل گیا تھا۔ باپ کا غم تو تازہ تھا مگر اب اسے ماں بھی یاد آنے لگی۔ وہ اب یتیم و یسیر ہو گیا تھا۔ خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا تھا لیکن اب بات بچپنے کے دکھ والی بھی نہیں تھی۔ پہلے تو باپ نے آگے بڑھ کر اسے اور اس کے دکھ کو سنبھال لیا تھا، مگر اب کون تھا؟ ایسے میں جبکہ وہ والیِ ریاست بھی تھا۔ سوا سے خود کو ہی سنبھالنا پڑا۔

جانتا تھا کہ وہ اس طرح غم سے نڈھال رہا تو ریاست کو کون سنبھالے گا جس رموز کو سکھانے کے لیے اس کے باپ نے دن رات ایک کیے تھے اس کی خاطر......

یہی وجہ تھی کہ پرتاب نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ باپ کی چتا کو آگ دکھا دی تھی۔ اس کی راکھ کو بھی۔.. بہا دیا تھا۔

پوری ریاست میں سات دنوں کے سوگ کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ مہارانی نجو بائی جواب ودھوا (بیوہ) ہو چکی تھی، نے اپنی مانگ کا سیندور مٹا کر اور چوڑیاں توڑ کر سفید سوتی لباس پہن لیا تھا۔ اس کی حالت بھی اب کافی سنبھل گئی تھی۔ تاہم اب اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی، غم اپنی جگہ مگر اس غم میں وہ نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس غم میں جاہ طلبی کی طمع دیرینہ بھی شامل تھی، شقاوت قلبی اور سازشوں کی آگ بھی بھڑکی ہوئی تھی۔ اس کے لیے شوہر کی موت بے وقت تھی۔ ابھی تو اس نے راج محل میں اپنی ذات کو اپنے بیٹے ایش کمار کی صورت میں مستحکم و مضبوط کرنے کے لیے سازشوں کے تار ہلانے ہی شروع کیے تھے کہ تقدیر نے بازی ہی پلٹ دی تھی۔

"مہارانی جی! خود کو فوراً سے بھی پیشتر سنبھال لیجیے...... غم بعد میں کرتی رہیے گا پرنتو، آگے کی سوچیے......"

ایسے میں بچھورام نے نجو بائی کے کان میں سرگوشی کر کے گویا اسے جگایا تھا۔

بچھورام پہنچی ہوئی چیز تھا، اس کے دماغ نے ہی نہیں بلکہ دوربین...... نظروں نے بھی بھانپ لیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا تھا۔ مہارانی کا دماغ تو باگِ عنان تک ہی محدود رہتا تھا مگر بچھورام ان کے درپردہ عوامل پر بھی بڑی نظر رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مہارانی اس کی بات کی نزاکت اور حساسیت کا مطلب جانے بغیر شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

"بچھورام! اب رہ ہی کیا گیا ہے سنبھلنے کو...... میں جسے راجا کی گدی نشینی پر دیکھنا چاہتی تھی وہ سپنا تو میرا چور چور ہو گیا ہے۔"

"سپنے دپنے چھوڑیے مہارانی جی! اور گدی نشینی کا بھی رنج من سے نکال دیں اب......" بچھورام نے اسرار بھرے لہجے میں کہا تو مہارانی نجو بائی کو چونک کر اس کی بات کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ سمجھ رہی تھی کہ اس کا پرانا نمک خوار کوئی دور کی کوڑی بجھا رہا ہے۔ وہ قدرے جھلا کر بولی۔

"تیرا مطلب کیا ہے آخر......؟ کھل کر کیوں نہیں بول دیتا......"

بچھورام نے اپنے منہ سے یوں سانس خارج کی جیسے...... نجو بائی کی عقل پر کفِ افسوس مل رہا ہو۔ بولا۔

"جو بات میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں وہ آپ کو غور سے سننا ہو گی اور اس کا تدارک بھی...... آپ ہی کو سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔ میں نے راج کمار ولی عہد پرتاب کی آنکھوں میں غم کی چھایا کو اتنی جلدی مٹتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔"

"تو پھر......؟" نجو بائی ہنوز بچھورام کی بات سمجھنے سے قاصر ہی رہی۔

"تو پھر یہ مہارانی صاحبہ کہ پرتاب کو مہاراجا کی موت پر کسی شبے کی بھنک پڑنے لگی ہے۔ وہ راج محل کے خادموں اور خادماؤں کی قطار لگا رہے ہیں۔ ان سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ مہاراجا کے کمرے کو بھی مقفل کر رکھا ہے اور کمرے کی جو شے جہاں ہے اسے وہیں رہنے کا حکم صادر کرتے ہوئے اس بات کی بھی سختی سے تاکید کر دی ہے کہ کوئی بھی مہاراجا کے کمرے میں داخل نہ ہونے پائے اور نہ ہی وہاں سے کوئی ذرہ برابر شے بھی نکال پائے۔"

بچھورام کی اس بات کی گہرائی اور گیرائی کی ایک ذرا سی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بُو بات ہی پل کے پل مہارانی نجو بائی کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ وہ اب دہشت اور جانے انجانے خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ بچھورام کا چہرہ تکنے لگی۔

''ہاں، مہارانی صاحبہ!'' بچھورام نے پھر اسی انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بھاری لہجے میں کہا۔ ''اب آپ سمجھ رہی ہیں، میری بات......'' بچھورام کی نظریں مہارانی کے ڈرے سہمے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ آگے بولا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں سوچ رکھیں اگر سوال جواب اور پوچھ گچھ کی کیفیات سے آپ کو بھی گزرنا پڑا، جس کا مجھے پورے سولہ آنے وشواس بھی ہے تو آپ کیا جواب دیں گی؟''

''مجھے......!'' مہارانی نجوبائی کا ایک دم روایتی طیش جاگ اٹھا، غصے سے اس کا چہرہ لال بھبوکا نظر آنے لگا، جوش غیظ تلے وہ کانپنے لگی۔ تھوڑی دیر پہلے کا اس پر طاری جانا انجانا خوف عنقا پذیر ہونے لگا۔ ''وہ......وہ، اکیلا، یتیم لاوارث بچے۔ کٹہرے میں کھڑا کرے گا، مہارانی نجوبائی کو...... چندر گپتا کی پتنی کو......'' پھر وہ اسی طرح غضب ناک آنکھوں سے بچھورام کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھ سے یہ بات کہنے کی، بچھورام!''

مگر بچھورام بھی موقع کھائے ہوئے تھا۔ وہ پہلے ہی ادراک کر چکا تھا کہ اب ان تلوں میں تیل نہیں رہا، بغیر کسی خوف کے تیزی سے دوبارہ اسی لہجے میں بولا۔

''نہ نہ......مہارانی صاحبہ! وہ اکیلا نہیں رہا اب...... ایک اور ایک گیارہ بن چکا ہے۔ آپ کا غصہ سر آنکھوں پر، مگر مہارانی صاحبہ! میں آپ کو جو حقیقت بتا رہا ہوں اسے تسلیم کرنے میں آپ کا فائدہ ہی ہے۔ عمل کرو آپ کی مرضی۔ لو، میں اپنا منہ اب بند کیے دیتا ہوں۔'' بچھورام نے یہ کہتے ہوئے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

مہارانی نجوبائی کی آنکھیں کھلیں۔ بچھورام اس کا آزمایا ہوا مہرہ تھا۔ اس نے آج تک دھوکا نہیں دیا تھا اور نہ ہی اس کے مشورے یا باتیں غلط ثابت ہوئی تھیں۔ یوں اسے بھی اندازہ ہوا کہ اب وہ پہلے جیسی دم خم والی بات نہیں رہی ہے۔ موجودہ حالات کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھے کھڑے بچھورام کی طرف بے بسی سے دیکھا اور قدرے جھلا کر بولی۔

''یہ تم کیا باؤلوں کی طرح منہ پر ہاتھ رکھے کھڑے ہو۔ بتاؤ مجھے کہ کیا کرنا چاہیے؟ یہ موا پرتاب تو تخت نشین ہو چلا۔''

بچھورام نے منہ سے ہاتھ ہٹایا اور بولا۔ ''کہہ

دھن

غیر ممالک میں زبان کا بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ فرانس میں ایک صاحب ایک ریسٹورنٹ میں گئے تو کافی دیر تک مینیو سامنے رکھے بیٹھے رہے اور اسے پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر انہوں نے ایک جگہ انگلی رکھی اور ویٹر کو بلا کر انگریزی میں کہا۔

''یہ لے آؤ......''

ویٹر جو انگریزی سمجھتا تھا، نرمی سے بولا۔

''سر......ہمارے میوزک بنانے والے اس وقت یہی دھن بجا رہے ہیں۔''

تین سو میل

سمندری مخلوق پر ریسرچ کرنے والے ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا۔ ''وہیل مچھلی تین سو میل دور سے بھی سمندر میں دوسری وہیل مچھلی سے رابطہ کر لیتی ہے۔''

دوست نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''بھلا تین سو میل دور سے وہ دوسری وہیل مچھلی سے کیا کہتی ہوگی؟''

وہ صاحب سوچ کر بولے۔ ''میں یقین سے تو نہیں بتا سکتا لیکن میرا خیال ہے، وہ یہی کہتی ہوگی تمہیں میری آواز سنائی دے رہی ہے نا۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

حکایت حکیم لقمان

سورج اور ہوا آپس میں مقابلہ کر رہے تھے کہ دیکھیں بکری چرانے والے لڑکے کا چوغا کون اڑاتا ہے۔ ہوا چلتی ہے تو لڑکا چوغے کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے لیکن جب سورج چمکتا ہے تو وہ خود ہی چوغا اتار دیتا ہے۔

اس حکایت سے یہ سبق ملتا ہے کہ ریاستیں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ اس وقت کرتی ہیں جب وہ قوت و تحکم استعمال کرنے کے بجائے لوگوں کے نجی مفاد کی مطابقت میں کام کرتی ہیں۔

مرسلہ: راحیلہ شفیق، سندھی ہوٹل، نیو کراچی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

رہا ہوں تا مہارانی صاحبہ! ابھی فی الحال تخت نشینی کی بات کو رہنے دیں اور خود کو بچانے کی فکر کریں۔ پرتاب بڑی چوٹ کھائے ہوئے ہے، سمجھتا سب ہے، مگر مہاراجا کی وجہ سے خاموش تھا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سب سے گن گن کے بدلے لے...... اس کے لیے ہمیں بڑی مکاری اور کافی حد تک اور نچلے بیٹھ کر چالیں کھیلنا پڑیں گی اب...... مگر بعد میں ابھی اپنی فکر کرنا ہوگی۔"

بچھورام اتنا کہہ کر رکا تو مہارانی اس کی بات کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ وہ اپنے سر کو ہولے ہولے اثباتی جنبش دینے لگی۔

"مہارانی صاحبہ!" بچھورام نے جب دیکھا کہ مہارانی نجو بائی بالکل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی ہے اور اب وہ ایک بار پھر اس پر منحصر ہے تو اس نے بڑی مکارانہ اور معنی خیز انداز میں اسے پکارا۔

نجو بائی نے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ میرے ہوتے ہوئے کیوں فکر کر رہی ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں آپ کا پرانا نمک خوار ہوں اور رہوں گا۔ کیا آپ کو مجھ پر وشواس نہیں......"

مہارانی کو پہلی بار بچھورام کے لہجے میں جانے کیوں ایک عجیب سی بات محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس کا غلام، اس کا رازداں تھا۔ غلام جب آقا کا رازداں بن جائے تو سماجی لحاظ سے نہ سہی، رازداں کی نسبت سے...... ہم مرتبت تو بن ہی جاتا ہے۔ نجو بائی کو بھی کچھ ایسا ہی بچھورام کے لہجے سے محسوس ہوا تھا تاہم وہ زیادہ غور نہ کر سکی اور بولی۔

"مجھے تم پر پورا وشواس ہے بچھورام! کیا کہنا چاہتے ہو، بولو؟"

"بولوں گا...... ضرور بولوں گا مہارانی صاحبہ! بس آپ حقیقت کو سمجھ کر چلیے۔ دو بار کی ناکامی کے بعد تیسری بار کامیابی آپ کے نصیب میں دیکھ رہا ہوں، لیکن پہلے مقدمے سے جان چھڑا لیجیے۔" بچھورام نے اپنی چندی چندی آنکھوں کو مہارانی کی نگاہوں کے سامنے گردش دیتے ہوئے کہا۔

اس کے شاطر دماغ میں ایک نئی کھچڑی پکنے لگی تھی۔ اس بات پر نجو بائی کا دل بھی دھڑکنے لگا تھا۔ جاہ طلبی کی ہوس اور بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

راج محل میں سب نے دیکھا کہ خاموش طبع پرتاب کمار ایک دم جیسے پھٹ پڑا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ایک شاندار مگر رسمی کارروائی میں گدی نشینی اختیار کی اور مسند پر براجمان ہوتے ہی اس نے ریاستی امور کے جملہ کام نمٹائے، پرجا کے ایک بڑے مجمعے سے خطاب کر کے انہیں تسلیاں دیں۔ مشیروں، مصاحب داروں اور سرداروں، بہی خواہوں اور ریاست کے چند معتبرین کے ساتھ نیک تمناؤں کا اظہار اور صلح و مشورے کیے۔

یہ سارا کچھ ترنت نمٹانے کے بعد اس نے چند زیرک دماغ آدمیوں کی جماعت کو مقرر کیا اور بالآخر راج محل میں ایک دن سب کو ایک بڑے ہال میں اکٹھا ہونے کا حکم صادر کر دیا۔

ان "سب" میں سبھی کو شامل ہونے کی بڑی سختی سے تاکید کی گئی تھی۔ لہٰذا جب راج محل کے بلند چھت والے ایک ہال کمرے میں دو قطاریں لگا دی گئیں تو راجا پرتاب کمار...... چار زیرک دماغ جماعت کے ساتھ بڑی شاہانہ کروفر اور دبدبے کے ساتھ وہاں پہنچا۔

اس کے بعد ایک اور ٹولہ بھی ایک دوسرے دروازے سے برآمد ہوا تھا۔ ان میں پرجا کے پانچ معتبرین شامل تھے جو راجا پرتاب کا انصاف دیکھنے اور حقیقت جاننے کے لیے لائے گئے تھے۔ کیونکہ آنجہانی مہاراجا چندر گپتا سے ریاست کے لوگ بہت خوش اور مطمئن تھے، انہیں ان سے عقیدت کی حد تک محبت تھی۔ پرجا دیکھنا چاہتی تھی کہ مہاراجا کے یوں اچانک مرنے کے بعد راج محل میں کیا ردعمل دیکھنے میں آتا ہے؟ اب وہ بھی دیکھ رہے تھے۔

بیٹھنے کے لیے کسی نشست کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ ماسوائے اپنے لیے اور ایک مزید نشست کے...... جو مہارانی نجو بائی کے لیے رکھی گئی تھی۔

قطاریں دو تھیں۔ ایک قطار میں خاندان کے افراد اور دوسری قطار میں وہ چیدہ چیدہ خدام اور نوکر تھے جنہیں راجا پرتاب نے موجود رہنے کا حکم دے رکھا تھا۔

راج محل میں، مہاراجا چندر گپتا کے دیہانت ہونے کے بعد سے ہی یہ افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ ولی عہد پرتاب نے اپنے چار زیرک دماغوں کی جماعت کے ساتھ۔ از خود ہی اپنے باپ کی اس اچانک موت سے متعلق تحقیق کر کے بہت سی ایسی باتوں کا پتا چلا لیا ہے جس کے حقائق بڑے سنسنی خیز ہوں گے۔ بچھورام نے اسی سے متعلق ہی مہارانی کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی اور ایسا اس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔

راجا پرتاب اپنے شاہانہ لباس میں اونچی پشت گاہ والی کرسی پر براجمان تھا اور بڑے غور سے دونوں قطار میں شامل کھڑے افراد کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے بلائے ہوئے سبھی لوگ اس میں شامل تھے یا...... کوئی کم تھا۔ خداموں وغیرہ کی قطار میں تو سب ہی پورے تھے مگر خاندان والوں میں سے ایک کم

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا جس کے احترام کا پاس رکھتے ہوئے راجا پرتاب کے حکم سے صرف اسی کے لیے ہی کرسی کا بندوبست کیا گیا تھا اور وہ تھی مہارانی نجو بائی۔ وہ کرسی خالی تھی، جس کا مطلب تھا کہ نجو بائی ان میں شامل نہیں تھی۔

''ماتا جی کہاں ہیں؟''

دفعتاً راجا پرتاب نے بہ آوازِ بلند پوچھا۔ اس کے لہجے میں بردباری اور احترام تھا۔

کسی نے بتایا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو راجا پرتاب نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''حیرت ہے کہ...... ایک ایسی ودھوا...... جس کے پتی کا دیہانت ایسے حالات میں ہوا جسے شبہے کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور اس کارن یہ نشست لگائی گئی ہے۔ ایسی عورت کو تو شمشان سے بھی اٹھ کر ادھر چلے آنا چاہیے تھا۔ لہٰذا مہارانی صاحبہ کو فوراً یہاں پیش کیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضوں کو بہ احسن و خوبی پورا کیا جاسکے۔''

مہارانی کو فوراً پیش کر دیا گیا۔ وہ دو خادماؤں کے سہارے چل کر آئی تھی۔ چہرہ غم کی تصویر بنا ہوا تھا، بڑی بڑی آنکھوں میں جھلملاتی نمنا کی میں سوگ کا جیسے گنگا جل امڈنے کو تھا لیکن اس کی تہ میں دبی ہوئی خفیف سی غیظ و غضب کی پرطیش چنگاری کو بھی محسوس کیا جاسکتا تھا۔ خادماؤں نے انہیں سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔

بچھورام کی باتیں اور ہدایتیں مہارانی نجو بائی کے کانوں میں ہی نہیں دماغ میں بھی گردش کر رہی تھیں۔ اس نے ایک اور امید اسے دلائی تھی اور وہ اپنے اس غلام نما رازداں پر پورا بھروسا کرتی تھی۔

جب ایک مصاحب دار نے بڑے ادب سے نجو بائی کو اس نشست کے بارے میں بتایا تو وہ ایک دم بڑے طنطنے سے بولی۔

''انصاف یہ نہیں ہوتا کہ راج محل کے مکینوں کو بھی مجرموں کی قطار میں کھڑا کر دیا جائے، اگر ایسا کیا جائے تو پھر ہمارے ساتھ...... ولی عہد پرتاب کو بھی اسی قطار میں لگنا چاہیے۔ مہاراجا کی موت سے انہیں کیوں الگ سمجھا جا رہا ہے؟ کیا یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ جلد سے جلد راجا کی مسند پر براجمان ہوں؟''

بچھورام کے بتائے ہوئے ان الفاظ کو مہارانی نے بڑے دبنگ لہجے میں اور بغیر کسی خوف کے دہرا دیا۔ تو راجا پرتاب پوری بردباری اور اعتماد سے مسکرایا اور پھر اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔

''ہم انصاف کے تقاضے کے طور پر ماتا جی کے اس اعتراض کا احترام کرتے ہیں اور مصاحب جماعت سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں بھی قطار میں لگا یا جائے۔''

یہ کہتے ہوئے راجا پرتاب بھی خاندان کی قطار میں جا کھڑا ہوا۔

پرجا کے نمائندوں کی حیثیت سے آنے والے معتبرین راجا پرتاب کی اس انصاف پسندی، بردباری پر اش اش کر اٹھے تھے۔

تب ہی مصاحب اور زیرک دماغ جماعت کے ایک ایک فرد نے باری باری مقدمہ سناتے ہوئے بالآخر یہ انکشاف کر ڈالا کہ آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کو دودھ میں زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ولی عہد پرتاب کے ہی ایما پر ایک غیر جماعت تحقیق کاروں نے اس عقدے کا پتا لگایا تھا کیونکہ مہاراجا کی لاش کا جائزہ لیا گیا تو ان کی باچھوں سے سرخ خون کی لکیر بہہ رہی تھی۔ نیز راج محل کے حکیموں اور ویدوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے، وغیرہ۔

ملازمہ نرملا اپنی قطار میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی، کیونکہ اسی کے ذمے دودھ کے گلاس پہنچانا ہوتے تھے، اور اس کے ساتھ کھڑی ایک اور ملازمہ، اس کی تو حالت ہی غیر ہو رہی تھی۔

غرضیکہ یہ کارروائی ترنت نمٹائی گئی۔ نرملا نے بتایا کہ اس روز اس کی طبیعت خراب تھی اور اس کی جگہ اوشا نامی ملازمہ نے یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ اس لیے اسے کچھ نہیں پتا تھا۔

خادمہ نرملا کے اس انکشاف پر مہارانی نجو بائی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی نرملا کا منہ نوچ لے۔

''اس حرام زادی کی طبیعت بھی اسی دن خراب ہونا تھی۔'' اس نے دل میں اسے کوسا۔ یوں نوکروں کی قطار میں بچھورام بھی موجود تھا۔ اس نے بھی نرملا کا بیان سن لیا تھا اور اس کی سمجھ بوجھ کے مطابق کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا ورنہ تو اس نے اپنا ''کام'' بڑی ہوشیاری سے نمٹایا تھا۔ تقدیر کو الٹی چال چلنا تھی اب اسے کوسنے کا کیا فائدہ تھا، لہٰذا اس کی نظر آئندہ کے حالات پر تھی۔ اسے تسلی تھی کہ کوئی بھی اس پر شک نہیں کر سکتا تھا کہ اسی نے مہارانی نجو بائی کے ایما پر درحقیقت ولی عہد کے دودھ والے گلاس میں زہر ملایا تھا جو خادمہ کی تبدیلی کے باعث بدلا جا چکا تھا۔

اوشا کو سامنے لایا گیا تو اس نے بھی یہی کہا کہ اس نے دودھ کے بھرے ہوئے گلاس باپ بیٹوں کو پہنچا دیے تھے۔ اسے کچھ علم نہیں۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"کیا دودھ کے گلاس پہلے سے بھرے ہوئے تھے جب تم نے وہ پہنچائے تھے، یا پھر اپنے سامنے پتیلے سے دودھ ڈالا تھا؟" مہاراجا پرتاب کمار کے تیار کیے گئے سوالات میں سے اگلا سوال معتبرین اور زیرک دماغ جماعت نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے دودھ گلاسوں میں انڈیلا تھا۔" اوشا نے جواب دیا۔

راجا پرتاب بڑے غور سے یہ جوابات سن رہا تھا۔ وہ معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا کہ اسے ہی مروانے کی سازش کی گئی تھی مگر ملازمہ کی تبدیلی کے سبب گلاس بدل گئے تھے۔ کیونکہ اس نے اپنی چار رکنی زیرک دماغ جماعت کے ساتھ تحقیق کے دوران یہ دیکھا تھا کہ اس کے دودھ کا گلاس وہ نہیں تھا جو اسے دیا جاتا تھا۔ مگر کسی سبب دونوں باپ بیٹے اس بات پر توجہ ہی نہ دے سکے تھے۔ عقدہ تو صبح کھلا تھا...... کہ اس کے در پردہ قصہ قضا کیا گیا تھا۔

زہر پتیلے میں ملانے کے بجائے گلاس میں ملایا گیا تھا اور اس مہارت سے ملایا گیا تھا کہ پتا نہ چل سکا تھا یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی۔ یوں سازش کا پتا تو چلا کہ یہ سراسر ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت ولی عہد پرتاب (موجودہ راجا) کو قتل کرنے کی سازش تھی۔

یہ بات علی الاعلان کردی گئی تھی مگر قاتل نہ پکڑا جا سکا تھا پر مہاراجا پرتاب کا "مقصد" پورا ہو چکا تھا۔ وہ سب کو یہ باور کرا دینا چاہتا تھا کہ اس کی موت کی سازش ہی تیار کی گئی تھی اور کون کر سکتا تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس نے فیصلہ اوروں پر چھوڑ دیا تھا۔ یوں سمجھنے والے سمجھ گئے تھے کہ یہ حرکت کون کر سکتا ہے۔

مہارانی نجوبائی بچ تو گئی تھی مگر انتہائی مشکوک نظروں میں آچکی تھی اور یوں اس کی رہی سہی شان و شوکت بھی دم توڑنے لگی۔ اس سے "مہارانی" کا لقب بھی چھین لیا گیا۔ اب وہ صرف نجوبائی تھی۔ اس سے مہاراجا چندر گپتا کی ودھوا (بیوہ) کی حیثیت بھی چھین لی گئی تھی اور اس کی جگہ غیر اعلانیہ قاتلہ کا لقب قرار ٹھہرا دیا گیا تھا۔

مہاراجا پرتاب کی یہ چال تو اسے بعد میں سمجھ آئی جب ریاست کی پرجا اور ریت نے اسے وہ عزت و تکریم دینا ہی چھوڑ دی۔ وہ سرعام مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم گردان لی گئی تھی اور یہی مہاراجا پرتاب کا مقصد بھی تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوئی قرار واقعی سزا ملنے سے زیادہ بڑی سزا مہارانی کے لیے یہی تھی کہ وہ...... جیتے جی لوگوں کی نظروں سے گر جائے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے کچھ اپنے راج محل کی عزت و تکریم کا بھی پاس تھا۔ وہ دو بچوں کی ماں بھی تھی۔ مہاراجا پرتاب نے اس کے ساتھ ایک طرح کی رحم دلی بھی دکھائی تھی، کیونکہ جیسے ہی زہر والی بات طشت از بام ہوئی تھی سونجنا نے پرتاب کی طرف بڑی رحم طلب اور روہانسی نگاہوں اور چہرے سے دیکھا تھا۔ سونجنا ہی اس کی واحد بہن تھی جس نے سوتیلا ہونے کے باوجود اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا تھا سونجنا ہی راج محل میں پرتاب کے لیے وہ واحد ہستی تھی جو اپنی ماں نجوبائی اور بھائی انیش کمار کے مزاج و سلوک کے برخلاف پرتاب سے سگی بہنوں جیسا ہی پیار کرتی تھی۔ ایک طرح سے نجوبائی کو بچانے میں سونجنا کے آنسوؤں بھرے رحم طلب معصوم چہرے کا بھی دخل تھا۔

یوں بات بہ ظاہر آئی گئی بھی ہو گئی تھی اور مجرم بھی نظروں کے سامنے لایا جا چکا تھا۔

لیکن اب مہارانی نجوبائی کو محدود کر دیا گیا تھا۔ وہ راج محل اور ریاستی امور میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اب مہاراجا پرتاب کمار کے ہر حکم پر سر جھکانا تھا۔ غرضیکہ وہ راج محل کی ایک ایسی "شے" بنا دی گئی تھی جو بیکار جانی جا چکی تھی، جسے عضو معطل کی طرح ایک کونے میں پھینک دیا گیا تھا۔

مہارانی نجوبائی کو تو گزرتے وقت کے ساتھ ہی ان تلخ حقیقتوں کا پتا چل سکا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا گیا تھا۔ واویلا وہ نہیں کر سکتی تھی، شور مچانے کا کوئی جواز پرتاب نے اس کے لیے چھوڑا ہی نہ تھا۔ ایسا کرتی تو اسے جواب دہ ہونا پڑتا۔ کیونکہ انگلیاں اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کون نہیں جانتا تھا یہ حقیقت کہ ایک عورت اپنے سگے بیٹے کو راج کے سنگھاسن پر براجمان دیکھنا چاہے گی یا اپنے سوتیلے بیٹے کو......؟

بچھورام جس خطرے کی طرف اشارہ کیے ہوئے تھا وہی ہوا تھا۔ وہ دوراندیش تھا، نجوبائی اب جا کر اس کی باتوں کا مطلب سمجھی تھی کہ وہ اس سے کہنا کیا چاہتا تھا۔

☆☆☆

ایک رات میں جب دونوں ملکہ و غلام یکجا ہوئے تو......

مہارانی نجوبائی اپنے غلام کے آگے بے بسی کے عالم میں رو پڑی۔

"یہ کیا ہو گیا بچھورام! ہم مہارانی سے صرف نجوبائی بن کر رہ گئے۔ بلکہ...... اب تو عام انسان کی حیثیت سے بھی جاتے نظر آ رہے ہیں۔ ہم تو کہیں کے نہیں رہے بچھورام...... ہماری شان ہماری شوکت اور ہمارا دبدبہ تو نوکروں پر بھی نہیں رہا۔ ہم تو کہیں کے نہ رہے۔ ہم سے یہ سب چھین لیا گیا ہے اور تم...... جسے ہمارا پرانا وفادار اور نمک خوار ہونے پر فخر ہوتا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا، کیا میں یہ کہوں کہ یہ سب تمہارے غلط مشوروں کے طفیل ہوا؟"

اس وقت رات گہری ہو چلی تھی۔ راج محل کا ہر فرد محوِ خواب تھا۔ قلعہ نما عمارت کے اوپر ٹکا چاند راج محل کے اس خفیہ گوشے میں پروان چڑھنے والی ایک نئی اور گھناؤنی سازش کو اپنی طلسماتی آنکھ سے دیکھتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی روشن چمکتی آنکھ نے نہ جانے کتنے ادوار دیکھے ہوں گے، کتنی ہی محلاتی سازشوں کو پروان چڑھتے اور بے گناہوں کے خون کی ہولی کو کھیلتے دیکھا ہوگا۔ آج پھر ایک نئی داستان رقم ہونے والی تھی۔

ملکہ اور غلام کے درمیان آج کچھ اور ہی نیا پکنے والا تھا۔ راج محل کا اصل چور اور سازشی دماغ بچھورام ہی تھا۔ اس کا ڈنک مارتا نہیں، تڑپاتا تھا۔ اس نے ایک اور ڈنک تیار کیا تھا مگر یہ ڈنک کسی اور کو مارنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے آپ کو مارنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ کیونکہ پاگل دیوانہ بچھو بھی کبھی خود کو بھی ڈنک مارتا ہے، شاید کچھ ایسا ہی ہونے والا تھا۔

بچھورام...... آج نجوبائی کے اداس سراپا کو بڑے غور اور خاص نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دراز قد، بھرے بھرے خدوخال، شراب کی تلچھٹ دیتا رنگ جو جسم کی گدازیت میں گھل کر ایک عجیب سا نشہ طاری کیے دیتا تھا۔

نجوبائی دو جوان بچوں کی ماں کے باوصف ابھی جوان تھی۔ اس کے جسم کی بناوٹ ایسی کیوں نہ ہوتی۔ وہ بنیادی طور پر رقاصہ ہی تو تھی۔ سوتی سفید رنگ کی ساڑی میں اس کا بھرا بھرا ایک ایک انگ مجسم رقص ہی دکھتا تھا۔ لیکن بچھورام کو صرف اسی سے غرض نہ تھی وہ تو اس سے آگے کی بھی سوچے ہوئے تھا، وہ ایک پاگل بچھو بن گیا تھا۔ آج وہ خود کو ڈنک مارنے چلا تھا۔ جب غلام آقا کے "رازداں" بنتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آقا کی کمزوریاں ان کے ہاتھ ہوتی ہیں۔ وہ بڑبولے اور منہ چڑھے ہونے لگتے ہیں۔ بچھورام بھی آج کچھ ایسا ہی بڑبولا ہونے والا تھا۔

نجوبائی اس کے سامنے والی ایک کرسی پر اداس اور بکھری بکھری سی بیٹھی تھی۔ اس کے دراز سیاہ گیسو سفید ساڑی کے ادھ کھلے برہنہ شانوں پر ناگنوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی اور اس ہلکی روشنی کا اپنا ایک سحر طاری تھا۔

بچھورام...... اس کے سامنے محض دو یا تین قدموں کے فاصلے پر موجود تھا۔ آج وہ کھڑا نہیں تھا، ایک کرسی پر اپنے نحیف

حقیقی ساتھی

اے انسان! زمانے میں تیرے تین ساتھی ہیں۔ ایک وفادار ہے۔ دوسرے دو تجھے چھوڑ جانے والے ہیں اور اس چھوڑنے میں وہ مجبور ہیں۔ ایک ساتھی تیرا دوست، دوسرا ساتھی تیرا مال واسباب اور تیسرا ساتھی تیرے اعمال۔ جب تیری موت کا وقت آئے گا، دوست زبانِ حال سے کہے گا۔ میں تیری گور تک جاؤں گا۔ تیری قبر پر تھوڑے عرصے تک ٹھہروں گا۔ اس سے زیادہ تیری میری رفاقت اور نہیں ہو سکتی۔ تیرا دوسرا ساتھی، تیرے مال واسباب اب تیرا ساتھی نہیں رہے گا۔ وہ تیرے وارثوں کا ساتھی ہو گیا ہے۔ اگر تیرا ساتھی ہوتا تو تیرے ساتھ قبر میں جاتا۔ البتہ تیسرا ساتھی، تیرا اخلص اور حقیقی ساتھی ہے۔ جو قبر میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ البتہ تیرے ساتھ ہی اندر جائے گا۔ یہ ساتھی تجھے قبر کے اندر اچھا یا برا ٹھکانا دے گا۔ اس لیے اے انسان...... اپنے اعمال کی فکر کر۔ کیونکہ اس سے بہتر اور وفادار ساتھی کوئی نہیں۔

محمد حیات خان نیازی کی مرتب کردہ کتاب "سنہرے اقوال" سے انتخاب (مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال)

سے وجود کو لیے بیٹھا ہوا تھا۔ جھکی جھکی سی کمر، لمبوترا چہرہ، بہت کم بالوں سے جھانکتی گنجی اور تنگ پیشانی سے نیچے گول گول چھوٹی آنکھوں سے وہ کوئی گرسنہ بوڑھا گدھ ہی نظر آتا تھا۔

اس نے نجوبائی کی بات سنی اور چہرے پر خبیثانہ مسکراہٹ ابھری۔ بہت ہولے سے مہارانی کو پکارا۔

"نجوبائی......!"

جیسے بجلی کڑکی ہو...... جیسے کسی نے دو دھاری خنجر گھونپ دیا ہو، کچھ ایسا ہی مہارانی نجوبائی نے آج اپنے غلام...... بچھورام کے منہ سے یہ لفظ "نجوبائی" سن کر محسوس کیا تھا۔ اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ...... کہ...... ایک حقیر غلام، اس کے پیروں میں ہر سے لوٹنے والا بچھورام...... وہ بھی...... اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ کچھ نہ کر سکی۔ تاہم ایک نیم مردہ سی آواز میں ایک ہلکا سا احتجاجی لفظ، فقط یہ اس کے ہونٹوں سے ضرور ابھرا تھا۔

"بب...... بچھورام...... تت...... کیا تم بھی......؟"

"ہاں...... نجوبائی...... میں بھی۔" بچھورام اسی لہجے میں بولا۔ وہ اب کرسی سمیت مہارانی نجوبائی کے تھوڑا اور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

قریب سرک آیا تھا۔ اس نے مہارانی نجو بائی کا نرم گرم ہاتھ اپنے کھردرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مہارانی نجو بائی کے چہرے اور آنکھوں سے عجیب طرح کا خوف مترشح ہونے لگا تھا۔ وہ جو ایک دبنگ عورت کہلاتی تھی۔ کوئی اس سے آنکھ اٹھا کر بات کرنا تو کجا دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا اور اس سے مخاطب ہونے سے پہلے اس کی اجازت کا محتاج ہوتا تھا مگر آج......

آج...... اس کی ہک دک سی نگاہیں سامنے اور قریب...... بہت قریب...... بیٹھے بچھورام پر جمی رہ گئی تھیں، وہ آج اسے ایک راکشس کے روپ میں نظر آ رہا تھا تب ہی اچانک جیسے بچھورام کا چہرہ بدل گیا اور اس کی جگہ مہاراجا چندر گپتا نے لے لی۔ وہ گمبھیر آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔

”دیکھ لیا مہارانی صاحبہ! اپنے کالے کرتوتوں کا انجام...... آج راج محل کا ایک ادنیٰ خادم جو نوکر سے بھی کم تر ایک غلام ہے، کس طرح تیرے منہ چڑھ گیا؟ کیا حیثیت رہ گئی تیری۔“

”نن...... نہیں......“ مہارانی نجو بائی کے حلق سے خوف زدہ سی سسکی برآمد ہوئی اور اس نے یک دم ہاتھ کھینچ لیا۔

ادھر بچھورام کی چندی چندی آنکھوں میں مستی اور مکاری ہویدا تھی۔ پتلے پتلے بدہیت ہونٹوں پر خبیثانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ وہ بہت دھیرے سے بولا۔

”تمہیں یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی نجو بائی! اس کے سوا تم نہ ہمت پکڑو گی نہ ہی حوصلہ...... تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تمہیں دوبارہ مہارانی بنانا چاہتا ہوں، اس راج محل کی ہی نہیں بلکہ ریاست ناگرہ کی بھی اور...... پورے کوہ شالیہ میں تمہارے نام کا دبدبہ اور ڈنکا بجوانا چاہتا ہوں تمہاری یہ غلط فہمی ہے کہ میری چالیں الٹی ہو گئی ہیں، پرنتو یہ تو تقدیر کا کھیل تھا، ورنہ تم بھی جانتی ہو کہ میری کوئی چال ناکام نہیں تھی اور یہ بھی سن لو...... کہ تقدیر بار بار ہمارے ساتھ یہ کھلواڑ نہیں کر سکتی۔ میری بات کو پورے دھیان سے سنو......“

قریب بیٹھا بچھورام بڑے سنجیدہ لہجے اور آواز میں مہارانی نجو بائی سے کچھ کہنے لگا اور کہتا رہا...... بغیر کسی وقفے کے...... مہارانی نجو بائی جیسے بت بنی یہ سب سنتی چلی جارہی تھی۔

سب سے آخر میں بچھورام نے اپنی کرسی کو تھوڑا پیچھے کھسکا کر مہارانی نجو بائی سے کہا۔

”میں کل ہی راج پور نکل جاؤں گا۔ وہاں کے دیوان صاحب شیورائے بھولکر سے ملاقات کرتا ہوں۔ وہ فرنگیوں کا وفادار ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے افسروں تک اس کی رسائی ہے۔ میری باتیں سن کر ہوسکتا ہے وہ میری ملاقات گورنر ڈنی کاسٹوفر اور جنرل مائیکل شا سے بھی کروا دے۔ پھر دیکھنا کیسے ہوتا ہے دھرتی تختہ اپنے نئے راجا پرتاب کمار جی کا......“

پھر آخر میں وہ مہارانی نجو بائی کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

”بس...... نجو بائی! صرف تمہاری ایک ہاں...... درکار ہے، کیا کہا میں نے......؟“

مہارانی نجو بائی کا چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے شکست خوردگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ بچھورام کی باتیں سن کر یک دم گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا اور وہ بے اختیار اپنی کرسی سے اٹھ کر بچھورام کی طرف بڑھی تھی اور اس کے قریب پہنچ کر اس پر جھک گئی۔

بچھورام کی چندی چندی آنکھیں پھیل کر عجیب مکروہ منظر پیش کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

”لیکن...... انسپکٹر صاحب! میں تو کسی سراج صاحب کو نہیں جانتا۔“ علی ریحان نے الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے انسپکٹر منظور کی طرف دیکھا تھا۔

”مجھے معلوم ہے تم انہیں نہیں جانتے مگر یہاں سب انہیں جانتے ہیں بہت اچھی طرح سے...... وہ نواب شہباز خان کے چھوٹے بھائی ہیں۔“

”میں صرف نواب شہباز صاحب سے ہی ملنا چاہتا ہوں۔ یہ پیغام انہی کے لیے ہی ہوسکتا ہے۔“ علی نے بالآخر مسکت جواب دے ڈالا تو انسپکٹر منظور کچھ سوچتا بن گیا، پھر ہولے سے کھنکھارا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ علی اپنی گردن گھما کر اسے جاتا دیکھنے لگا انسپکٹر کی چال میں چوروں کا سا انداز محسوس کر کے علی کو حیرت ہوئی تھی۔

اس نے دیکھا، انسپکٹر منظور نے دروازہ کھول کر تھوڑا باہر جھانکا پھر اس کی طرف آیا اور نہایت رازدارانہ لہجے میں اس سے بولا۔

”تم یہاں تریپال پور میں شاید نئے آئے ہو اسی لیے تمہیں یہاں کی اندرونی صورتِ حال کا علم نہیں ہے۔“

علی اس کی بات پر چونکا تھا۔ وہ سوالیہ لہجے میں بولا۔ ”کیا مطلب؟ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا انسپکٹر صاحب؟“

”نواب صاحب بہ ظاہر تو باغی گروہوں کے حامی اور مددگار بنتے ہیں، مگر درونِ خانہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں۔“ انسپکٹر منظور نے جیسے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ علی ریحان کو اس کی بات پر ایک جھٹکا لگا۔

”کک...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ کو نواب صاحب کے بارے میں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، وہ انگریزوں کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

وفادار کبھی نہیں ہو سکتے۔"

"یہ میں نہیں کہتا، بلکہ ترپال پور کے وہ سب لوگ کہتے ہیں، جنہوں نے نواب صاحب کی بیٹھکوں میں بڑے بڑے انگریز افسروں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ بلکہ لوگوں کو بھی چھوڑو، ان کے اپنے چھوٹے بھائی سراج خان تو اپنے بڑے بھائی نواب شہباز خان کو اچھی طرح جانتے ہیں، وہ خود بھی یہی کہتے ہیں۔ وہ تو پہلے انہی کی قلعہ نما حویلی میں رہتے تھے، دونوں بھائیوں میں بڑی محبت تھی۔ سراج خان محبِ وطن تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ...... ان کے بڑے بھائی نواب شہباز در پردہ انگریزوں کے حامی ہیں اور انہی کی حمایت میں انہیں بڑی بڑی جاگیریں عنایت کی گئی ہیں تو چھوٹے بھائی سراج خان کو اپنے بھائی سے ہی نفرت ہوگئی اور پھر وہ ...... ان سے الگ ہو گئے۔" انسپکٹر منظور بتا رہا تھا مگر علی ریحان کو اس کی باتوں پر یقین کرنے میں تامل ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق نواب شہباز خان کی ہی ریاست جونا گڑھ اور پالن پور سے بہت چھوٹی تھی، نہ صرف ایک مسلم ریاست ہے بلکہ وہ کٹر مسلم، محبِ وطن اور مسلم باغیوں کے زبردست دستِ راست اور حامی ہیں۔

"معاف کیجیے گا انسپکٹر صاحب! میں آپ کی اس بات کا یقین نہیں کر سکتا۔" اس نے کہا۔ "آپ برائے مہربانی میری نواب صاحب سے ملاقات کا بندوبست کر دیں۔ ان تک وہ پیغام پہنچانا بے حد ضروری ہے۔"

اس کی بات پر انسپکٹر منظور نے ایک گہری ہنکاری بھری، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت ضبط سے کام لینے پر مجبور ہو۔ ورنہ ایسا اس کا مزاج نظر نہیں آتا تھا۔ بولا۔

"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی، لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ جو اہم پیغام تم یہ سمجھ کر نواب صاحب کو دینا چاہتے ہو، وہ درحقیقت انگریزوں کے فائدے میں ہوگا اس سے مسلم باغی گروہوں کو نہ صرف نا قابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے بلکہ تمہاری بھی ساری محنت پر پانی پھر سکتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر دھری بیل پر ہاتھ مارا۔ وہی دونوں سپاہی اندر آ گئے اور اسے سیلیوٹ جھاڑا۔

"گاڑی کا بندوبست کرو...... ہمیں اسی وقت لال حویلی جانا ہے۔" انسپکٹر منظور نے تحکمانہ کہا۔

"ٹھیک ہے جناب!" دونوں میں سے ایک سپاہی نے فدویانہ لہجے میں کہا اور پھر دونوں پلٹ گئے۔

"چلو پھر تمہاری ضد پوری کیے دیتے ہیں۔"

دونوں سپاہیوں کے جاتے ہی انسپکٹر منظور نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

علی الجھ سا گیا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں ہو گیا۔ اس وقت اسے اپنے ساتھیوں شاہ زمان اور رابیہ کی شدید کمی محسوس ہونے لگی۔ وہ ہوتے تو ان سے صلح مشورہ کر کے اس گمبھیر صورتِ حال سے نمٹنے کی کوشش کرتا۔

"ویسے وہ پیغام جو تم نواب صاحب تک پہنچانا چاہتے ہو، کیا زبانی کلامی ہے یا تحریری ہے؟" انسپکٹر منظور نے اچانک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو علی ریحان اندر سے چونکا۔ اس کی چھٹی حس کسی گڑبڑ کی طرف اشارہ کرتی محسوس ہوئی۔ تاہم اس نے مصلحتاً ذرا دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

"تحریری پیغام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آؤ......" انسپکٹر منظور نے کہا اور اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

اسی وقت ایک سپاہی نے اندر آ کر اطلاع دی کہ گاڑی تیار ہے۔

علی الجھا الجھا سا انسپکٹر منظور کے ساتھ چل پڑا اور کمرے ...... سے باہر آ گیا۔ برآمدے میں ہی کھڑے ہوئے اسے وہ جیپ نظر آ گئی جو تھانے کے مختصر احاطے میں ہی کھڑی تھی۔ وہ انسپکٹر منظور کے ساتھ چلتا ہوا جیپ کے قریب آ گیا۔ جیپ اسٹارٹ تھی اور اس میں ایک ڈرائیور موجود تھا۔ انسپکٹر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ دو سپاہیوں کو مخصوص اشارہ کر دیا۔ انہوں نے علی ریحان کو جیپ میں سوار کرایا اور خود اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اگلے ہی لمحے جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی اور احاطے کے پھاٹک سے گزرتی ہوئی پختہ سڑک پر آ کر دائیں جانب کو مڑ گئی۔

تھانہ آبادی کے جنوب مشرق میں تھا۔ اس طرف آبادی کم تھی۔ کچے پکے گھر نظر آتے تھے اور آگے ایک چھوٹی سی مسجد بھی دکھائی دی تھی مگر جیپ آبادی سے ہٹ کر دوسری سڑک پر آ گئی، اس کی رفتار ہلکی ہی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک مصروف مارکیٹ سے گزرنے لگی۔ لوگ پولیس کی گاڑی کو دیکھ کر ادھر ادھر ہو کر راستہ دینے لگے۔

ڈرائیور جیپ گھماتا ہوا مارکیٹ کراس کر گیا اور پھر ایک قدرے چوڑی سڑک پر آ کر اس نے جیپ کی رفتار بھی کچھ بڑھا لی۔

علی غور سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ترپال اسے خاصا گنجان آباد لگا تھا۔ یہاں اس نے ایک دریا بھی بہتا دیکھا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا اور قدرتی جھیلیں بھی۔ آبادی کے وسط سے گزرتے وقت اس کی نظر ایک جامع مسجد پر پڑی۔ مندر اور گردوارے بھی تھے، مگر بہت کم۔ جیسا کہ مذکور ہوا ترپال ایک آزاد مسلم ریاست تھی۔ تاہم ہندو اور سکھ بھی یہاں رہتے تھے، چند عیسائیوں کے بھی گھربار تھے۔

ایک نالے کی پلیا سے جیپ دوسری جانب اتری تو نیم پختہ سڑک شروع ہوگئی۔ آبادی سے ان کا راستہ بالکل کٹ گیا تھا۔ آبادی پیچھے رہ گئی تھی۔ تھوڑا اور آگے کا سفر شروع ہوا تو آبادی کا جیسے نام و نشان ہی ختم ہونے لگا۔ اب نیم جنگلاتی اور مٹیالے رنگ کا میدان شروع ہوگیا تھا جہاں کہیں کہیں ٹیلے بے پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ دور اطراف میں پہاڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ایک جگہ جنگل گھنا ہو چلا تھا۔ سڑک کچی ہوگئی تھی۔ جیپ کی رفتار نسبتاً تیز کردی گئی تھی۔ وہ نیم ہچکولوں کی زد میں تھی۔

علی کو آس پاس کا علاقہ کچھ زیادہ ہی ویران محسوس ہوا۔ اسے حیرت تھی کہ نواب شہباز خان کی حویلی آبادی سے اس قدر دور کیوں تھی؟ یہ بات اس کے دل کو نہیں لگی تو وہ بے چین سا ہوگیا اور اس نے بالآخر اگلی سیٹ پر بیٹھے انسپکٹر منظور سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا نواب شہباز صاحب کی حویلی آبادی سے اتنی دور ہے۔ کیوں؟''

''ہاں! وہ آبادی کے ہنگاموں سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔'' انسپکٹر شہباز نے مبہم سا جواب دیا۔

علی کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ ایکا ایکی اس کے اندر کا گوریلا جاگ پڑا۔ اس کی چھٹی حس ایک بار پھر خطرے کا الارم بجانے لگی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ ڈرائیور نے جیپ کی رفتار اب پہلے سے بڑھالی تھی۔ حالانکہ جیپ کو خاصے ہچکولے بھی آرہے تھے مگر وہ شاید ایسے راستوں پر جیپ چلانے کا تجربہ رکھتا تھا۔

''انسپکٹر! تم مجھے کہاں لے جارہے ہو......؟''

معاً ہی علی نے قدرے بلند آواز میں انسپکٹر منظور سے پوچھ ہی لیا۔

''سراج خان کے پاس......'' انسپکٹر منظور نے بغیر گردن کو پیچھے موڑے جواب دیا اور علی کے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ اسے انسپکٹر کی ہٹ دھرمی پر غصہ آگیا، چیخ کر بولا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ میرے ساتھ یہ زبردستی نہیں کر سکتے۔ روکیے جیپ، میں سراج خان سے نہیں ملنا چاہتا۔''

''ضد مت کرو اور نہ ہی مجھے کسی سختی پر مجبور کرو۔ تمہیں میری بات کا کیوں نہیں یقین آتا۔ ایک بار سراج صاحب سے مل تو لو، پھر تمہارا دل اجازت دے تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہیں وہاں سے نواب صاحب کی حویلی لے جاؤں گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

علی کو شبہ ہو چکا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ نہیں ہے جو اسے بتایا جارہا ہے۔ وہ چاہتا تو ان کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ وہ چلتی جیپ سے اتر کر بھاگ بھی سکتا تھا۔ لیکن اس کے دل میں خیال سا ابھرا کہ اگر انسپکٹر منظور اسے سراج خان کے پاس لے جانے پر مصر ہی تھا تو جا کر اس سے مل لینے میں کوئی حرج نہ تھا لیکن وہ اسے کوئی پیغام نہیں سنائے گا اور اپنی ضد پر قائم رہے گا۔ سراج خان نواب شہباز خان کا ہی بھائی تھا تو کیا خبر وہ بھی اس کی ضد کے آگے مجبور ہوجاتا لیکن اگر سراج خان سے ملنے کے بعد اس کی تسلی ہوگئی کہ انسپکٹر کی بات غلط نہ تھی تو وہ کچھ اور سوچ سکتا تھا۔ یوں بھی یہ پولیس کا معاملہ تھا۔ جبکہ اسے پولیس ایک قتل کے الزام میں پہلے ہی گرفتار کرچکی تھی۔ یہی نہیں منظور اس لاش کو بھی پہچان چکا تھا کہ وہ ...... نواب صاحب کے ہی ایک آدمی خاور حیات کی لاش تھی۔

معاملہ اسے اپنی سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر نظر آرہا تھا۔

بہرطور وہ چپ کیے بیٹھا رہا۔ جیپ کا سفر مزید تھوڑی دیر جاری رہا تو......اس کی رفتار بتدریج گھٹنے لگی۔

اب فضا میں اسے مرطوب سی ہواؤں کا احساس ہونے لگا اور جنگل بھی قدرے گھنا ہونے لگا تھا۔ زمین بھی چٹیل نہ رہی تھی اس کی جگہ کہیں قدآدم تو کہیں چھوٹے چھوٹے جھنڈ کی صورت میں جھاڑیوں کی بہتات بھی ہونے لگی تھی۔

تب ہی ایک قدرے بلند پہاڑی کی ڈھلان پر اسے درختوں کے درمیان ایک مٹیالے رنگ کا مکان نظر آیا۔ وہ خاصا بڑا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے سامنے وسیع احاطہ تھا اور وہاں اس نے اسلحہ بدست پہرے داروں کو بھی دیکھا، جن کے قریب دو قدآور اور خوفناک جبڑوں والے کتے بھی مٹرگشت کررہے تھے۔

جیپ اسی احاطے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی تو دونوں اسلحہ پوش پہرے دار ایک دم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

جیپ رکتے ہی وہ اس کی طرف لپکے تھے۔ علی سنبھل کر بیٹھ رہا۔ اس کی نظریں اطراف کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے دل کو ایک بار پھر نامعلوم سی بے چینی محسوس ہوئی، یوں جیسے وہ کسی جال میں پھنسایا جانے والا تھا......

(جاری ہے)

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

رقیب

منظر امام

انسان کو شاید اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کا مجموعہ بنایا ہے۔ جس طرح انسان سمندر کی طرح گہرا، پربت سے اونچا بلند کردار اعلیٰ ظرف ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی طرح پیاز کے مانند پرت در پرت اس کی شخصیت کے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں... جیسے کہ یہاں وہ مالک مکان جس طرح بے پروا، لاابالی پن کا مظاہرہ کرتا رہا مگر درحقیقت اس کی نظر نے ہر پہلو کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا اور بالآخر وہ فیصلہ کرلیا جو کسی کو حیران، تو کسی کو پریشان کرگیا۔

رقابت اور چاہتوں کے بیچ دوست اور رقیب کی رسا کشی

مشتاق صاحب ایک بہت بڑے گھر میں رہا کرتے تھے۔ اگرچہ پینتالیس اور پچاس کے درمیان کے ہوچکے تھے لیکن ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ شادی کے سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ انسان شادی کرے تو ایسی عورت سے جس کی مثالیں داستان بن جائیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ عام سی عورت کے ساتھ شادی کرکے عام سی زندگی گزار کر مرگئے۔

مشتاق صاحب کو دو ہی شوق تھے۔ ایک بے تکے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

لطیفے سنانے اور دوسرا بے تکے مقدمے کرنے کا۔ ان کی آمدنی کا ذریعہ ان کی کئی عدد کانیں تھیں جو کرائے پر چلا کرتیں اور جس سے مشتاق صاحب بہت آرام سے اپنی زندگی گزار رہے تھے۔

مقدمے بازی کے شوق کے لیے انہوں نے اپنے مکان میں ایک وکیل کمال کو کرائے دار رکھ لیا تھا اور کرائے کے عوض بے چارے کمال کو ان کے الٹے سیدھے مقدمات نمٹانے ہوتے تھے۔

وہ بے چارہ کئی بار بھاگنے کی کوشش کر چکا تھا لیکن مشتاق صاحب نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے کسی کلائنٹ سے فیس کے معاملات طے کر رہا تھا کہ مشتاق صاحب اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

"کمال! فافٹ نئے مقدمے کی تیاری کرو۔" مشتاق نے کہا۔

"کس کے خلاف؟"

"وہ سامنے والے مکان میں جو بندہ رہتا ہے۔ کیا نام ہے اس کا، افتخار...... اس کے خلاف۔ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا بلا مقصد۔"

"مسکرانا تو صدقہ جاریہ ہے مشتاق صاحب۔" کمال نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایں...... اس قسم کے صدقے کے لیے کیا میں ہی رہ گیا ہوں۔ کسی عورت نے ایسا صدقہ کیوں نہیں کیا آج تک۔ کیس فائل کرو اس کے خلاف۔"

"اب مجھے اس گھر میں رہنا ہی نہیں ہے۔ یہاں رہ کر آپ کے فری کیسز لڑ لڑ کر میرا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے۔ میں چلا جاؤں گا یہاں سے۔"

"ایسا مت کرنا کمال۔" مشتاق نے پریشان ہو کر کہا۔ "تم نہیں جانتے، مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔"

"اچھا اچھا چلیں۔ میں نہیں جا رہا۔" کمال نے کہا۔ "بس آپ کی محبت روک لیتی ہے۔"

"بس تمہاری یہی سعادت مندی مجھے اچھی لگتی ہے۔ ورنہ اب تک تم پر بھی کیس کر چکا ہوتا۔"

☆☆☆

پرویز کو وہ لڑکی ایک پارک کے گیٹ پر مل گئی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ میں دبی ہوئی نوٹ بک زمین پر گر پڑی۔ پرویز نے جلدی سے وہ نوٹ بک اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔ "یہ لو۔"

"شکریہ۔" لڑکی نے نوٹ بک لیتے ہوئے کہا۔ "اب شاید تم اس چکر میں ہو گے کہ میں دوبارہ مسکرا کر تمہارا شکریہ ادا کروں اور تم محبت بھرا کوئی گانا سنانے لگو۔"

"نہیں محترمہ! میری ایسی کوئی پلاننگ نہیں ہے۔"

"تو پھر تم مجھ سے ٹکرائے کیوں تھے؟"

"اگر میں یہ کہوں کہ خود تم نے یہ ڈائری جان بوجھ کر گرائی تھی تو پھر......؟"

"ذہین معلوم ہوتے ہو۔ خیر مجھے اس سے کیا۔ میں تو جا رہی ہوں۔"

پرویز سوچتا رہ گیا۔ وہ لڑکی پارک کے گیٹ سے اندر چلی گئی۔ پرویز کو بھی اسی پارک میں جانا تھا۔ لڑکی ایک بینچ پر اکیلی بیٹھی تھی۔ پرویز غیر ارادی طور پر اس کی طرف بڑھ گیا۔ "ہیلو۔"

"اوہ...... تم یہاں بھی آ گئے۔" لڑکی نے غصے سے کہا۔

"ناراض کیوں ہو رہی ہو۔ میں پبلک پارک میں آیا ہوں۔ تمہارے گھر نہیں آیا۔"

"کاش۔ میرا بھی کوئی گھر ہوتا۔" لڑکی نے ایک گہری سانس لی۔

"انٹرسٹنگ...... یہی حال میرا بھی ہے۔ کیا میں تمہارے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟" پرویز نے پوچھا۔

"وہ کس خوشی میں؟"

"ہم دونوں کے درمیان گھر نہ ہونے کا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ ایک بے گھر ہی دوسرے بے گھر کا دکھ سمجھ سکتا ہے۔"

"باتیں تو اچھی کر لیتے ہو۔ چلو بیٹھ جاؤ۔"

پرویز اس کے برابر بیٹھ گیا۔ لڑکی تیکھے مزاج کی لیکن خوب صورت تھی۔ اس کی گفتگو کا انداز یہ بتا رہا تھا کہ تعلیم یافتہ بھی ہو گی۔

"اب سوچ کیا رہے ہو، کوئی بہانہ بنا کر باتیں شروع کرو۔" لڑکی نے تیزی سے کہا۔

"چلو، یہی بتا دو کہ جب گھر نہیں ہے تو پھر تم کہاں رہتی ہو؟" پرویز نے پوچھا۔

"اپنی ایک پھوپی کے پاس جو خود بھی اپنی ایک پھوپی کے ساتھ رہتی ہیں۔ اس طرح میں دو پھوپیوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گئی ہوں۔"

"یہ داستان سنانے کے بعد چندہ تو نہیں مانگو گی۔"

"ہاں! ایک این جی او سے تعلق ہے میرا۔ انجمن بہبود سگاں نام ہے اس کا۔ ہم کتوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔"

"کتوں کی دیکھ بھال؟"

"ہاں بھئی۔ بے چارے مظلوم کتے۔ محلے کے ایک

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کتے کا گردہ بدلوانا ہے۔ اس کے لیے پیسے اکٹھے کررہی ہوں۔اب بتاؤ کتنے کی رسید کاٹوں؟"

"مجھ سے کوئی آج تک اپنا ادھار واپس نہیں لے سکا۔تم چندے کی بات کررہی ہو۔ویسے تمہاری اطلاع کے لیے ایک بات بتادوں۔"

"ضرور بتاؤ۔"

پرویز نے اپنی جیب سے ایک بک نکالی۔" یہ دیکھو۔ یہ بھی چندے کی رسید ہے۔ میں بھی تمہاری طرح ایک این جی او کے لیے چندے جمع کرتا ہوں۔ اب بتاؤ، کتنے کی رسید کاٹوں؟"

لڑکی ہنس پڑی۔"میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو معاف کردیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

☆☆☆

کمال قلم کاغذ لیے بیٹھا تھا۔ مشتاق اس سے کچھ لکھوارہا تھا۔

اسی وقت دروازے پر بجنے والی گھنٹی نے مشتاق صاحب کو چونکا دیا۔" دیکھنا تو کون آیا ہے۔ اگر کوئی چندہ وغیرہ مانگنے کے لیے آیا ہے تو اس پر مقدمہ کردینا۔"

کمال برا سا منہ بناتے ہوئے باہر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ایک نوجوان کے ساتھ ہوئی تھی۔"مشتاق صاحب! یہ آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔"

"تم نے اطمینان کرلیا ہے نا۔ یہ پیسے مانگنے تو نہیں آئے ہیں۔"

"نہیں، میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" کمال نے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں اس سے نمٹتا ہوں۔"

کمال جان بچنے پر شکر ادا کرتا ہوا اندر چلا گیا......

جبکہ وہ نوجوان اتنی دیر میں سامنے والے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔"یہ تم میرے سامنے صوفے پر کیوں بیٹھ گئے؟"

"تو پھر کہاں بیٹھوں، جناب!"

"یہ قالین کس لیے بچھایا گیا ہے، قالین پر بیٹھو۔"

"میں امجد علی کا بیٹا ہوں، جو رشتے میں آپ کے بھائی ہوتے تھے۔ سلیم نام ہے میرا۔ ابو مجھے پیار سے شنو کہتے تھے۔" نوجوان نے بتایا۔

"میرے پاس کیوں آئے ہو۔"

"انکل! اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ نہ کوئی گھر نہ ماں نہ باپ۔"

"برخوردار! صرف ان باتوں کی بنیاد پر میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔"

"انکل! میں تو بہت امیدیں لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔" شنو نے کہا۔

"اچھا چلو تم یہاں رہ سکتے ہو لیکن شرط یہ ہے کہ تمہیں میرے لطیفے سننے ہوں گے۔" مشتاق صاحب نے کہا۔

☆☆☆

پرویز اس لڑکی کو اپنے ساتھ ایک عام سے ہوٹل میں لے آیا تھا۔ دونوں میں اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی۔ کہکشاں پُرمزاح لڑکی تھی۔ بے پروا قسم کی۔ اس نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتادیا تھا۔

والدین کی موت کے بعد وہ اپنی ایک پھوپی کے یہاں رہا کرتی تھی۔ اس نے کئی جگہ ملازمت بھی کی تھی لیکن اپنی لاابالی طبیعت کی وجہ سے کسی بھی جگہ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکی تھی۔ پرویز کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ دونوں ایک عام سے ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ کہکشاں نے پرویز کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔" میں دوپہر کے کھانے میں عام طور پر بریانی کھایا کرتی ہوں۔"

"اور میں عام طور پر ہوا کھاتا ہوں۔" پرویز نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بالکل ہی مفلس ہو۔"

"بے روزگار بندہ مفلس ہی ہوتا ہے۔"

"کب سے بے روزگار ہو؟" کہکشاں نے پوچھا۔

"سترہ تاریخ کو میری بے روزگاری کو آٹھ ماہ ہوجائیں گے۔" پرویز نے بتایا۔

اس دوران میں ہوٹل کا ویٹر میز کے پاس آکر کھڑا ہوگیا تھا۔"اب تو آرڈر دے دیں صاحب۔ اس وقت سے آپ دونوں صرف پانی پیے جارہے ہیں۔ مجھے بھی تو اپنی نوکری کرنی ہوتی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ جاؤ دو چائے لے کر آجاؤ۔"

"صرف چائے؟"

"ہاں صرف چائے۔ ہم کھانا کھا چکے ہیں۔" ویٹر چلا گیا۔

"پرویز! ایک بات کہوں۔ جس طرح نپولین نے قلوپطرہ کا دل توڑا تھا، اس طرح تم نے بھی توڑ دیا ہے۔"

"جب ہسٹری نہ معلوم ہو تو حوالے مت دیا کرو۔" پرویز نے کہا۔"نپولین کے زمانے میں قلوپطرہ نہیں تھی اور قلوپطرہ کے زمانے میں نپولین نہیں تھا۔ کس طرح توڑ دیا؟"

"میں نے یہ سوچا تھا کہ تم مل گئے ہو۔ تم سے دوستی ہوگی۔ دکھ سکھ بانٹ لیں گے لیکن تمہاری مفلسی دیکھ کر ہوش ٹھکانے آگئے ہیں۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''کہکشاں! دوستی کے جذبے کو کھانے کے جذبے سے الگ رکھو۔ ان دونوں کو مکس اپ مت کرو۔ ورنہ میں مایوس ہوکر کسی اور کی طرف چلا جاؤں گا۔ کسی اور کو اپنا دوست سمجھنے لگوں گا۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ تمہاری مفلسی تمہارے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔'' کہکشاں مسکرا کر بولی۔ ''کم از کم اس شہر کی کوئی لڑکی تمہیں لفٹ نہیں دے گی۔ خود سوچو، کون اس کا ساتھ دے گا جو ایک وقت کی بریانی بھی نہ کھلا سکے۔''

''نادان لڑکی ...... بریانی کی کیا حقیقت ہے۔ تم دو منٹ یہیں بیٹھو۔ میں ابھی تمہارے لیے اسپیشل بریانی لے کر آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، لے آؤ لیکن چائے کے پیسے دیتے جانا۔''

پرویز نے چائے کے پیسے دیے اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ اس کی جیب میں اس وقت صرف چائے کے ہی پیسے تھے اور اس لڑکی کو بریانی کھلانا بھی ضروری تھا۔

پرویز کو ایک بابا کے مزار کا خیال آ گیا۔ اس وقت وہاں لنگر بھر بریانی ہی ملا کرتی تھی۔ ذرا سی دیر کے لیے لائن لگانی پڑتی تھی اور دل پر جبر کر کے ہاتھ آگے پھیلانا پڑتا تھا۔

پرویز نے جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے پر اس طرح باندھ لیا کہ اس کی صورت واضح نہ ہوسکے۔ کچھ دیر بعد وہ دو شاپرز میں بریانی لیے ہوٹل میں واپس آ گیا تھا۔

''یہ لو، تمہارے لیے خاص طور پر مسالے دار بنوا کر لایا ہوں۔'' پرویز نے کہا۔

''یہ تو بابا کے لنگر کی معلوم ہوتی ہے۔'' کہکشاں بریانی کا معائنہ کرنے کے بعد بولی۔

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''اس لیے کہ میں خود کئی بار اس لنگر سے بریانی لے چکی ہوں۔'' کہکشاں نے بتایا۔

اس بار پرویز کا قہقہہ بہت جاندار تھا۔

☆☆☆

کھانے کی میز پر وہ تینوں ہی بیٹھے تھے۔ مشتاق، کمال اور شیخو۔

مشتاق نے کمال کی طرف دیکھتے ہوئے ایک کیس کے بارے میں پوچھا۔ ''تم نے مقدمے کے کاغذات تیار کیے؟''

''جناب! اس کیس میں کوئی جان نہیں ہے۔'' کمال نے بے زاری سے بتایا۔

''تو پھر جان پیدا کرو۔'' مشتاق نے شیخو کی طرف دیکھا۔ ''اگر میں تمہارے خلاف کوئی مقدمہ کردوں تو تم برا تو نہیں مانو گے؟''

مشتاق نے گلاس اٹھا کر توڑ دیا۔ ''میں سمجھا نہیں۔ کس قسم کا کیس؟''

''یہی کہ ایک شخص زبردستی میرے مکان میں داخل ہوا اور اس نے توڑ پھوڑ مچادی۔''

''ارے انکل! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' شیخو نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''جی مشتاق صاحب! مجھ مجبور کو تو ہر حال میں آپ ہی کا ساتھ دینا ہے۔''

☆☆☆

کہکشاں کو رخصت کرنے کے بعد پرویز بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا پھر شام ہونے کے بعد اپنے مکان میں واپس آ گیا۔ یہ مکان صرف ایک کمرے، باتھ روم اور باورچی خانے پر مشتمل تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اس کا مالک مغرب کے بعد گھر سے نہیں نکلتا کیونکہ اسے رات کے وقت دکھائی نہیں دیتا تھا۔

پرویز کے پاس جتنے پیسے تھے، اس نے کہکشاں پر خرچ کردیے تھے اس لیے رات کے کھانے میں سوائے پاپے اور چائے کے اور کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

اس شاندار ڈنر کا مزہ اس وقت کرکرا ہوگیا جب اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کا قدیمی دوست شیخو کھڑا تھا۔ ''آؤ بھئی۔'' پرویز نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں ابھی اپنا ڈنر لے رہا تھا...... چائے اور پاپے۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔''

''اتفاق سے میں بھی اسی قسم کا ڈنر کر کے آیا ہوں۔'' شیخو نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت تیرے پاس ایک آفر لے کر آیا ہوں۔''

''جاب کی آفر ہے؟''

''جاب کی نہیں۔ ایک مستقل ٹھکانے کی۔ آخر کب تک کرائے کی اس کوٹھری میں پڑے رہو گے۔''

''تو پھر بتاؤ کیا کروں؟ میں تو خود جان چھڑانا چاہتا ہوں۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میرے رشتے کے ایک انکل ہیں۔ بہت دولت مند۔ بہت بڑا مکان ہے ان کا۔ آج کل میں ان ہی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔''

''کس مزاج کے آدمی ہیں تمہارے انکل؟''

''بہت معصوم، بہت نیک...... صرف لطیفے سناتے ہیں۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''کرایہ تو لیں گے نا؟''
''کوئی کرایہ نہیں۔ تمہیں صرف لطیفے سننے ہیں اور ہنستے رہنا ہے۔''
''اور وہ لطیفے کس قسم کے ہوتے ہیں؟'' پرویز نے پوچھا۔
''بہت ہی بور، رونے کو دل چاہتا ہے۔''
''خیر، تم اس کی پروا مت کرو۔ میں ہنس ہنس کر پاگل کر دوں گا۔''
''تو پھر آ جاؤ میرے پاس۔ میں ایڈریس سمجھا دیتا ہوں۔''

☆☆☆

دوسرے دن پرویز، مشتاق کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ مشتاق اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شنیو، مشتاق کے برابر کھڑا تھا۔ ''انکل! یہ پرویز ہے میرا دوست۔'' شنیو نے بتایا۔
''کیا خوبی ہے اس میں؟''
''پرویز! اب تم اپنی خوبیاں خود ہی بتاؤ، مجھے تو یاد نہیں آ رہیں۔'' شنیو نے کہا۔
پرویز نے کسی چابی بھرے کھلونے کی طرح بولنا شروع کر دیا۔ ''جناب! میں ایک نمبر کا تنہا انسان ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت دکھ برداشت کیے ہیں۔''
''مجبور ہو اسی لیے برداشت کیے جا رہے ہو۔ آگے بتاؤ۔''
''آپ یقین کریں جناب کہ سلیقے سے ہنسے ہوئے بھی پانچ برس ہو چکے ہیں۔'' پرویز نے کہا۔
''تو کیا ضرورت ہے ہنسنے کی۔'' مشتاق غصے سے بولا۔ ''جس ملک کی کوئی کل سیدھی نہ ہو، تم اس ملک میں ہنسنے کی بات کر رہے ہو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟''
''شنیو بتا رہا تھا کہ آپ کو ڈھیروں لطیفے یاد ہیں۔'' پرویز نے کہا۔
''کیا تم لوگوں نے مجھے مسخرہ سمجھ رکھا ہے۔'' مشتاق دہاڑنے لگا تھا۔
''سمجھنے کی کیا بات ہے انکل۔ میں نے تو پورے شہر میں آپ کی یہی تعریف کر رکھی ہے۔'' شنیو جلدی سے بولا۔
''اور اس بہانے پورے شہر کو میرے گھر میں لا کر بسانا چاہتے ہو۔''
''شنیو میرے دوست۔'' پرویز نے شنیو کو مخاطب کیا۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ شاید تقدیر کو یہ منظور ہی نہیں ہے کہ مجھے بھی چین کی نیند آئے۔ میری قسمت میں فٹ پاتھ کی راتیں اور پارک کے دن لکھے ہوئے ہیں۔ مجھے جانے دو میرے دوست۔ خدا حافظ۔''
پرویز نے دو قدم بڑھائے تھے کہ مشتاق نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ''ادھر آؤ، میری بات سنو۔''
''جی انکل۔'' پرویز جلدی سے مشتاق کے پاس پہنچ گیا۔
''دیکھو نوجوان! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ دو کوڑی کے فلمی ڈائیلاگ سنا کر مجھے متاثر کر لو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔''
''ٹھیک ہے انکل تو پھر میں جا رہا ہوں۔'' پرویز نے کہا۔
''نہیں۔ تم اس طرح نہیں جا سکتے۔'' مشتاق مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں پورے پروٹوکول کے ساتھ رخصت کروں گا۔ میری سیکریٹری تمہیں باہر کا راستہ دکھائے گی۔''
''سیکریٹری!'' پرویز اور شنیو نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
''ہاں سیکریٹری۔'' مشتاق نے اندر والے دروازے کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔ ''سیکریٹری! آؤ، باہر آؤ۔'' آواز سن کر کہکشاں باہر نکل آئی۔
''یہ ...... یہ آپ کی سیکریٹری ہے؟'' پرویز نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں۔ سیکریٹری ہے میری۔'' مشتاق نے کہکشاں کی طرف دیکھا۔ ''کہکشاں! چلو شنیو کے اس دوست کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔''
''چلو پرویز! میں تمہیں باہر کا راستہ دکھا دوں۔''
''کیا مطلب؟'' مشتاق چونک گیا۔ ''کیا تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟''
''یس باس! ہماری کل ہی ملاقات ہوئی تھی۔'' کہکشاں نے بتایا۔ ''شاید ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرنے لگے تھے۔''
''میرا خیال ہے کہ اس کو باہر نکالنے کے بعد بھی تمہاری پسند برقرار رہے گی۔''
''یس باس! یہ بات تو ہے۔''

☆☆☆

وکیل کمال نے ایک آدمی گھیر لیا تھا۔ مشتاق نے دھمکی دی تھی کہ اگر کمال نے کسی ایسے آدمی کا بندوبست نہیں کیا جس پر کیس بنایا جا سکے تو اسے گھر سے باہر نکال دیا جائے گا۔
کمال نے اسی لیے اس بندے سے معاملے کی بات کر لی تھی اور وہ معاملہ یہ تھا کہ اس آدمی کے ہاتھوں مشتاق کی ٹھکائی کروا دی جائے۔ اس ٹھکائی کے دو فائدے تھے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پہلا فائدہ تو یہی تھا کہ مشتاق اس آدمی پر کیس بنوا کر اسے بند کروا دیتا اور دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اس طرح مشتاق کی ٹھکائی سے کمال کو بھی دلی سکون مل جاتا۔

وہ آدمی مشتاق ہی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا کمال سے معاملات طے کر رہا تھا۔ ”صاحب! یہ تو بتاؤ مجھے کتنے دنوں تک تھانے میں بند رہنا ہوگا؟“

”صرف چھ دن...... چھ دنوں کے بعد میں تمہاری ضمانت کروا دوں گا۔“

”ان چھ دنوں میں تو میری بہت ٹھکائی ہو چکی ہوگی صاحب۔“ اس آدمی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

”اسی حساب سے پیسے بھی تو ملیں گے تمہیں۔“

”اور الزام کیا لگایا جائے گا؟“

”وہی مار پیٹ کا۔“ کمال نے کہا۔ ”ابھی ایک صاحب اندر سے آئیں گے۔ ان کو دو چار گھونسے مار دینا۔“

”لیکن خوامخواہ کیوں ماروں؟“

”بات یہ ہے بھائی کہ ان صاحب کو مقدمہ کرنے کا شوق ہے۔ وہ تمہیں اندر کروا دیں گے۔ تمہارا کیس میں لڑ کر تمہیں چھڑوا لوں گا۔ بات ختم ہوگئی۔ آیا سمجھ میں؟“

اس دوران مشتاق اندر سے چائے کی پیالی لیے ہوئے برآمد ہوا۔ کمال کے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ ”یہ تم کس کو لے کر آئے ہو؟ اس گھر میں اب کسی کی جگہ نہیں...... سمجھے۔“

”میری بات تو سن لیجیے پہلے...... یہ آدمی آپ کو دو چار گھونسے مارے گا۔ آپ اس کے خلاف فوراً کیس کر دیجیے گا۔“

”ہاں، یہ اچھی ترکیب ہے۔“ مشتاق نے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ ”پیسے کتنے طے ہوئے ہیں؟“

”یہ چھ دنوں کے پندرہ ہزار روپے دے رہے ہیں صاحب جی۔“

”میں تمہیں چھ دنوں کے تیس ہزار دوں گا۔ تم اس وکیل کی ٹھکائی کر دو۔“

”جی۔“ وہ آدمی حیران ہو گیا تھا۔

”جلدی کرو۔ ورنہ آفر واپس لے لوں گا۔“

”پھر تو آپ فکر ہی نہ کریں صاحب۔ میں ایسی ٹھکائی کروں گا کہ یہ بھی کیا یاد کرے گا۔“

کمال چیختا رہ گیا تھا۔ آدمی نے اسے مارنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

کہکشاں اور پرویز اسی ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں پرویز پہلی بار اسے لے کر آیا تھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس شخص کی سیکریٹری کیسے بن گئیں؟“ پرویز نے پوچھا۔

”میں کسی کے حوالے سے اس تک پہنچی تھی۔“

کہکشاں نے بتایا۔ ”وہ بہت دلچسپ آدمی ثابت ہوا۔ ایسے جھکی مزاج آدمی اس شہر میں کم ہی ہوں گے۔“

”بے کار کی باتیں نہ کرو۔ اس گھر میں رہنے کے لیے کوئی راستہ نکالو۔“

”ٹھہرو۔ میں تمہارے دوست سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔ کیا نام ہے اس کا شیخو۔ ویسے تمام تر کوششوں کے باوجود اگر اس گھر میں تمہاری انٹری نہیں ہو سکی اور تم مفلس ہی رہے تو پھر مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔“

”چلو وہ سوچ بھی بتا دو...... پھر کیا سوچو گی؟“

”یہی کہ میں شیخو یا کمال کے لیے ٹرائی کروں۔“

کہکشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خبردار...... جو اس قسم کی کوئی بات کی تو۔ اب یہ بتاؤ کہ اس گھر میں تمہاری ڈیوٹی کیا ہے؟“

”یہی تو سمجھ نہیں آیا۔ کہہ رہے تھے میں لطیفے سنا رہا ہوں، تم ہنسو۔“

”پھر کیا ہوا...... لطیفے سنائے؟“

”ہاں، بہت ہی بور قسم کے تھے لیکن اپنی نوکری بچانے کے لیے زبردستی ہنسنا بھی پڑا۔“

”گڈ آئیڈیا۔ تم ان سے میرے لیے یہ کہہ سکتی ہو کہ میں لطیفوں کو بہت انجوائے کرتا ہوں۔ ایک لطیفہ سن لوں تو پورے ایک ہفتے تک ہنستا رہتا ہوں۔“

”ہاں، یہ طریقہ ہو سکتا ہے۔ میں آج ہی بات کرتی ہوں۔“

☆☆☆

مشتاق نے شیخو کو اپنی امپالا کار دھونے کی ڈیوٹی دے دی تھی۔ پرانے زمانے کی یہ گاڑی اتنی بڑی تھی کہ اس میں سے موجودہ دور کی چار گاڑیاں نکل سکتی تھیں۔ شیخو جس وقت پانی کی بالٹی اٹھائے باہر جانے کے لیے ڈرائنگ روم کی طرف آیا، کمال نے آواز دے کر اسے متوجہ کر لیا۔

کمال کے ایک بازو پر بینڈیج تھی۔ اس آدمی نے تیس ہزار کے لالچ میں اس کی کچھ زیادہ ہی ٹھکائی کر دی تھی۔ وہ اپنا سوٹ کیس سامنے رکھے کراہ رہا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو شیخو بھائی۔“ اس نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"ہاتھی نہلانے۔ میرا مطلب ہے گاڑی دھونے۔" شیخو نے بتایا۔

"پلیز! یہ سوٹ کیس اٹھا کر میرے سر پر رکھ دو۔" کمال نے کہا۔ "میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ بہت مار کھالی میں نے۔"

"کمال بھائی! مجھے بھی اپنا فیوچر کچھ ایسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔ اس سوٹ کیس میں ہے کیا؟"

"اب کیا بتاؤں بھائی۔" کمال نے ایک گہری سانس لی۔ "سوٹ کیس کا سارا سامان مشتاق صاحب نے ضبط کرلیا ہے۔ ایگری منٹ کے مطابق جو بھی اپنی مرضی سے جائے گا، اس کا سامان ضبط کرلیا جائے گا۔"

"کمال! سچ یہ ہے کہ تم سے محبت سی ہوگئی تھی اسی لیے تمہارے جانے کا بہت افسوس ہورہا ہے۔"

"محبت ہے تمہاری۔ چلو، اب یہ سوٹ کیس رکھو۔"

شیخو نے خالی سوٹ کیس کمال کے سر پر رکھ دیا جس کو اس نے ایک ہاتھ سے سنبھال لیا تھا۔ اسی وقت مشتاق اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آگیا۔ مشتاق کو دیکھتے ہی شیخو کمال پر برس پڑا۔ "عجیب آدمی ہو تم۔ جب انکل نے جانے کے لیے کہہ دیا ہے تو جاتے کیوں نہیں ہو۔ خوامخواہ اپنا وقت کیوں ضائع کررہے ہو؟"

"مشتاق صاحب! شیخو نے آپ کو دیکھ کر اپنا بیان بدلا ہے۔ ابھی مجھ سے یہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں آپ سے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دوں۔"

"شیخو! لگتا ہے تم نے ایگری منٹ نہیں پڑھا۔"

"کیوں انکل! اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"ایگری منٹ کے مطابق جو شخص کسی دوسرے کو گھر سے نکالنے کی کوشش کرے، اسے خود نکلنا پڑتا ہے۔"

"جی؟"

"جی ہاں۔ اب تم خود اپنا سوٹ کیس سر پر رکھو اور نکلو یہاں سے۔"

"انکل! یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟"

"کمال! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" مشتاق نے کمال سے کہا۔ "تم سے بعد میں بات کروں گا۔ جب تک میں شیخو سے نمٹتا ہوں۔"

☆☆☆

پرویز اپنی کوٹھری میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کیا زندگی تھی اس کی، بے مقصد، ادھر ادھر لڑھکتی ہوئی۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ یہ مالکِ مکان نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی دستک بہت جارحانہ ہوا کرتی تھی۔ شیخو بھی نہیں ہوسکتا تھا یا شاید وہی ہو۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ کہکشاں کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ "تم ......تم یہاں کیسے آگئیں؟"

"تم ہی نے تو ایڈریس بتایا تھا۔" کہکشاں اندر آتے ہوئے بولی۔

"ارے بابا! ایڈریس تو تکلفاً بتاتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ٹپک ہی پڑو۔" پرویز نے کہا۔

"میں چندہ جمع کرنے کی مہم پر نکلی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ تم بھی اسی محلے میں رہتے ہو۔ کیوں نہ تم کو بھی دیکھ لیا جائے۔"

"کمال کرتی ہو، تم کو سیکریٹری کی جاب مل گئی ہے۔ اس کے باوجود چندے اکٹھے کرتی پھر رہی ہو۔"

"ایسے آدمی کی جاب کا کیا بھروسا...... نہ جانے کس وقت جواب دے دے۔ پھر میں کیا کروں گی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ این جی او والا کام چلتے رہنا چاہیے۔ لاؤ کیا دے رہے ہو؟"

"دیکھو کہکشاں! میں پیسوں کے علاوہ دل، جگر، جان، زندگی، آرزوئیں، حسرتیں، ارمان سب کچھ تمہارے قدموں میں ڈھیر کرسکتا ہوں۔"

"مجھے اپنے قدموں میں اتنا کچرا نہیں چاہیے۔ دو کتوں کی زندگی خطرے میں ہے، ان کا علاج کروانا ہے۔"

"آخر یہ کس قسم کی این جی او ہے جو کتوں کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔"

"ایک بات تو بتاؤ۔ کیا تمہارے پاس فرنیچر ٹائپ کی کوئی چیز نہیں ہے۔" کہکشاں نے پوچھا۔

"مالکِ مکان کے ڈر سے فرنیچر نہیں رکھتا۔ نہ جانے کس وقت بھاگنا پڑ جائے۔ اب فرنیچر لے کر کہاں بھاگوں گا۔ لے دے کے یہ تکیہ ہے میرے پاس۔ اس کو اٹھایا اور چل دیے۔"

"اپنے پاس تو تکیہ بھی نہیں ہے۔ مجھے مشتاق صاحب کے گھر سے بھاگنا پڑا تو کچھ اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"کہکشاں! تم بہت دلچسپ لڑکی ہو۔"

"بس شروع ہوگئیں مردانہ حرکتیں۔ تعریف سے اسٹارٹ لے لیا ہے تم نے۔ ارے بھئی ہم دونوں دوست ہوگئے ہیں۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔" پرویز نے ایک گہری سانس لی۔ "ہم شریف لوگوں کے ساتھ یہی پرابلم ہوتی ہے کہ وہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کچھ زیادہ ہی شریف ہوجاتے ہیں۔"

☆☆☆

کمال اور شینو، مشتاق کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مشتاق نے ان دونوں کو جانے سے روک لیا تھا اور اب گہری نگاہوں سے دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔" اس طرح سر جھکائے کیوں بیٹھے ہو تم دونوں؟" اس نے پوچھا۔

"مشتاق صاحب! جس بندے کے پاس رہنے کا ٹھکانا نہ ہو اور جو فری کے مقدمے لڑتا رہے، اس کا سر جھکا ہی رہتا ہے۔"

شینو نے کہا۔" اس بات پر بھی حیرت ہے کہ آپ نے ہم دونوں کو جانے سے کیوں روک لیا؟"

"اس کے لیے پورے دو سو روپے خرچ ہوئے ہیں میرے۔" مشتاق نے بتاتے ہوئے میز پر رکھی ہوئی ایک موٹی سی کتاب اٹھالی۔" یہ دیکھو، یہ ہے لطیفوں کی نئی کتاب۔ اس کے سارے لطیفے تم دونوں کو سنانے ہیں۔"

"جی؟" دونوں بہ یک وقت بول اٹھے۔

"جی ہاں۔" پھر اچانک کچھ یاد کرکے اس نے شینو کی طرف دیکھا۔"میری گاڑی کا کیا ہوا، تم نے دھوئی کیوں نہیں؟"

"سمجھ گیا انکل۔" شینو بوکھلا گیا۔" آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں گاڑی دھودوں۔"

"ہاں، میری بات کا یہی مقصد تھا۔" مشتاق نے کہا۔" تم گاڑی دھو، میں جب تک اس نام نہاد وکیل کو لطیفے سناتا ہوں۔"

مشتاق صاحب کی گاڑی بہت ہی لمبی چوڑی تھی۔ شینو نے اس گاڑی کو کبھی چلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ شینو نے ایک بار پھر سوال کیا۔" انکل! جب آپ گاڑی استعمال ہی نہیں کرتے تو پھر اس کو رکھنے کا فائدہ کیا ہے؟"

"اچھا سوال ہے اور اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گاڑی رکھنے سے ذرا شان بڑھ جاتی ہے۔"

شینو نے گاڑی کے پاس آکر بالٹی ایک طرف رکھی اور ابھی اپنا کام شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک لڑکی اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ ایک خوب صورت اسمارٹ سی لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر شینو کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی تھی۔

"اے مسٹر! گاڑی دھونے کے کتنے پیسے لیتے ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔

"آپ کی تو میں فری میں دھودوں گا۔"

"مجھے بدتمیزی پسند نہیں ہے۔ خاص طور پر میں گاڑی دھونے والوں کو بھی فری نہیں کرتی۔"

"میڈم! فار یور کائنڈ انفارمیشن...... میں گاڑیاں دھونے والا نہیں ہوں۔ مشتاق صاحب کا پے انگ گیسٹ ہوں۔"

"پے انگ تو کہیں سے نہیں لگتے۔ صرف گیسٹ ہوگے۔ خیر میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ سوری۔"

لڑکی جانے لگی تھی۔ شینو نے آواز دے کر اسے روک لیا۔" دومنٹ، بات تو سنو۔"

"کیا ہے؟"

"تم جیسی لڑکی کی خدمت کرکے مجھے خوشی محسوس ہوگی۔ کہاں ہے تمہاری گاڑی؟"

"اوہ...... تو تم تیار ہو۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔" لڑکی نے کہا۔

وہ لڑکی کے ساتھ چل پڑا۔ اسی گلی کے درمیان ایک چھوٹی گلی تھی۔ بہت مختصر سی اور اسی گلی کے سامنے وہ ٹینکر کھڑا تھا۔" یہ دیکھو، یہ ہے گاڑی۔" لڑکی نے ٹینکر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ گاڑی ہے؟" شینو کو غش آنے لگا تھا۔

"ابا کو ہمیشہ بڑی گاڑیوں کا شوق رہا ہے۔" لڑکی نے کہا۔" دادا نے تو ایک ریل گاڑی رکھی ہوئی تھی۔"

"اچھا ہوا میں تمہارے دادا کے زمانے میں نہیں تھا۔ ورنہ ریل گاڑی دھونی پڑتی۔"

"چلو، اب جلدی سے کام شروع کرو۔" لڑکی نے کہا۔

"کیا پاگل ہوگئی ہو...... اتنے بڑے ٹینکر کو دھونا کوئی آسان سمجھ رکھا ہے کیا؟"

"تو پھر وعدہ کیوں کیا تھا؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ٹینکر کے سامنے لاکر کھڑا کردوگی۔"

"اب میں کیا کروں۔ گاڑی نہیں دھلی تو ابا ناراض ہوجائیں گے۔ وہ غصے والے پہلوان ہیں۔"

"باپ رے۔ تم کسی پہلوان کی اولاد ہو۔" شینو نے دیدے گھمائے۔

"میرے دو بھائی بھی ابا ہی کی طرح پہلوانی کرتے ہیں۔" لڑکی نے کہا۔" چلو کام شروع کرو۔ ورنہ ابا ناراض ہوجائیں گے۔"

☆☆☆

پرویز اور کہکشاں پھر اسی ہوٹل میں بیٹھے ہوئے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھے۔ یہ انتہائی عام سا ہوٹل ان کا پسندیدہ اس لیے بن گیا تھا کہ ایک تو یہاں کھانا بہت سستا ملتا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ ہوٹل والے پہچاننے لگے تھے۔

ان کے آتے ہی ویٹر ان کی میز پر پانی کا گلاس لاکر رکھ دیا کرتا۔ کہکشاں آج پھر پرویز کی کھولی میں پہنچ گئی تھی۔ ''کیا ہوا، نہ تم نے ٹھکانا بدلا اور نہ تمہیں جاب ملی۔''

''وقت آنے دو سب ہوجائے گا۔'' پرویز نے کہا۔

''لیکن تم کیسے نکل آئیں؟''

''عجیب احمقانہ کام سے بھیج دیا تھا بڑے میاں نے۔ کہہ رہے تھے لطیفوں کی ایسی کتاب ڈھونڈ کر لاؤ جس میں لطیفوں کے لطیفے ہوں۔''

''یہ کیا چیز ہوتی ہے......لطیفوں کے لطیفے۔''

''یہ مجھے کیا معلوم۔ میں نے جس سے پوچھا، اس نے مجھے پاگل سمجھا۔ اب چلو، اس ہوٹل سے چل کر بریانی کھاتے ہیں۔'' کہکشاں نے کہا۔ ''اور مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس پیسے نہیں ہوں گے۔ اس لیے دو سو روپے لیتی آئی ہوں۔''

''گڈ! تم بہت سمجھدار لڑکی ہو۔ چلو۔''

ہوٹل میں آنے کے کچھ دیر بعد ہی کہکشاں نے بھن بھنانا شروع کر دیا تھا۔ ''ایک نمبر کے بے حس اور بدمعاش لوگوں کا شہر ہے۔ احساس ہی نہیں ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ کوئی بھلا ایسے بھی لڑکی کو نظر انداز کرتا ہے؟ جیسے وہ مجھے کر رہا ہے' وہ نیلی قمیص والا۔''

''تم لڑکیوں کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ تم ایسا کرو شادی کرلو۔''

''یہ تم نے میرا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا ہے۔ اس لیے بریانی کے بعد چائے بھی پلواؤں گی مگر شادی کے لیے کوئی ڈھنگ کا بندہ تو ملے۔'' کہکشاں نے کہا۔

''میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' پرویز نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

''میں ڈھنگ کے بندے کی بات کر رہی ہوں۔ تم اپنے آپ کو کہاں سے لے آئے۔''

''کیا میں تمہیں ڈھنگ کا دکھائی نہیں دے رہا؟'' پرویز نے کہا۔ ''خیر، یہ بتاؤ تمہارا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟''

کہکشاں نے ایک نظر پیچھے کی طرف دیکھا پھر پرویز سے بولی۔ ''میرے بیک گراؤنڈ میں کچھ الٹے سیدھے لوگ چائے پی رہے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں۔''

''میں تمہاری کرسی کا بیک گراؤنڈ نہیں پوچھ رہا۔ تمہارے خاندان کا بیک گراؤنڈ پوچھ رہا ہوں۔''

''پرویز! میرے ابا ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔ میٹرک کرلیا تھا انہوں نے۔''

''تم میٹرک تک کو پڑھا لکھا کہہ رہی ہو۔''

''تمہیں میرے خاندان کا نہیں معلوم نا اس لیے تم یہ بات کہہ رہے ہو۔ ہماری فیملی میں تعلیم کا کوئی رواج نہیں تھا۔ وہ میرے ابا تھے جنہوں نے میٹرک تک اس لیے تعلیم حاصل کی تھی کہ رشیدہ کو لولیٹر لکھ سکیں۔''

''اور یہ رشیدہ کون تھی؟''

''میرے ابا کی پہلی محبت۔ اس سے پہلے وہ حمیدہ سے محبت کرتے تھے لیکن اس زمانے میں ابا کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے ایک منشی سے حمیدہ کے لیے خط لکھوایا کرتے تھے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ حمیدہ کی شادی اسی منشی سے ہوگئی اور ابا منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر ابا نے رشیدہ سے محبت کرلی اور اس چکر میں میٹرک بھی کرلیا۔''

''پھر تو بہت زبردست بیک گراؤنڈ ہے تمہاری فیملی کا۔''

''اسی لیے تو مجھے فخر ہے۔ خیر، اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''میری کہانی وہی ہے جو عام طور پر مجھ جیسے ناداروں کی ہوا کرتی ہے۔ والدین کی موت کے بعد ایک ماموں نے پرورش کی۔ تعلیم دلوائی اور جب ان کا بھی انتقال ہوگیا تو اس وقت سے اکیلے زندگی گزار رہا ہوں۔ دو چار دوست ہیں، بس۔''

''اور کوئی محبت وغیرہ؟''

''نہیں۔ آج تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ اب تم مل گئی ہو تو شاید کوئی راستہ نکل آئے۔''

''پرویز! دیکھو میں وعدہ تو نہیں کرتی لیکن میری کوشش ہوگی کہ تم سے محبت کرسکوں۔ بس دعا کرتے رہنا۔''

☆☆☆

مشتاق اور کمال دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ کمال کو پھر جھاڑ پڑ رہی تھی۔ ''تم کسی کام کے آدمی نہیں ہو۔ میرا دل بہلانے کے لیے تم نے ابھی تک کچھ نہیں کیا ہے۔''

''آپ کا دل بہلانے کے لیے... آپ کو پرسوں پارک تو لے گیا تھا۔''

''بے وقوف! یہ دل ایسی باتوں سے نہیں بہلتا۔ مجھے کوئی مقدمہ چاہیے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ کمال نے دروازہ کھولا، پہلوان کی لڑکی اپنے ہاتھ میں ایک پیالہ لیے کھڑی تھی۔ "کچھ مانگنے آئی ہو؟" کمال نے پوچھا۔

"نہیں، کچھ دینے آئی ہوں۔"

"تو آؤ اندر آجاؤ۔ باہر کیوں کھڑی ہو۔"

پہلوان کی لڑکی اندر آگئی تھی۔ "میں فرزانہ ہوں۔" اس نے مشتاق کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ "شنو صاحب کے لیے یہ کھیر لے کر آئی ہوں۔"

"کون شنو صاحب! یہاں تو کوئی شنو صاحب نہیں ہوتے۔"

"وہی جو اس مکان میں آپ لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"تو صرف شنو کہونا۔ وہ صاحب کب سے ہو گیا۔"

"جب سے ابا کا ٹینکر دھویا ہے، میں انہیں صاحب کہنے لگی ہوں۔"

"اچھا لاؤ یہ کھیر دے دو۔" کمال نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "مجھے بھی کھیر وغیرہ کھانے کا بہت شوق ہے۔"

"جی نہیں، یہ آپ کے لیے نہیں۔ شنو صاحب کے لیے ہے۔ اس پر ابا نے کچھ پڑھ کے پھونکا ہے۔"

"کیا پھونک دیا ہے اس پر؟" مشتاق نے پوچھا۔

"کھیر کھانے کے بعد شنو صاحب کو مجھ سے محبت ہو جائے گی اور وہ ابا سے میرا رشتہ مانگ لیں گے۔"

"فارغ تو میں بھی بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ کھیر تو میں بھی کھا سکتا ہوں۔" کمال نے کہا۔

"جی نہیں۔ پہلا حق شنو صاحب کا ہے کیونکہ انہوں نے ٹینکر دھویا تھا۔ ہمارا پہلوانی اصول پہلے آؤ پہلے پاؤ والا ہوتا ہے۔"

"اگر کھیر کھانے کے بعد بھی شنو نے رشتہ نہیں بھیجا تو پھر کیا ہوگا؟" مشتاق نے پوچھا۔

"پلیز انکل! ایسا مت کہیں۔ میں کھیر بناتے بناتے تھک چکی ہوں۔ یہ کھیر کا چالیسواں پیالہ ہے جس پر ابا نے کچھ پڑھ کر پھونکا ہے۔"

"کیا تمہارے ابا کوئی پیر۔ فقیر ٹائپ کی چیز ہیں؟" مشتاق نے پوچھا۔

"نہیں انکل! پیری فقیری تو ان کا پارٹ ٹائم شوق ہے۔ ویسے وہ پہلوان ہیں۔"

کمال چونک اٹھا تھا۔ "پہلوان۔"

"ہاں، بہت مشہور پہلوان ہیں میرے ابا۔" فرزانہ نے کہا۔

"پھر تم یہ کھیر شنو ہی کو کھلا دینا۔" کمال نے کہا۔ "میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہ کھیر واپس لے جا رہی ہوں۔" فرزانہ نے کہا۔ "شنو صاحب کو بتا دیجیے گا کہ پہلوان سکندر کی بیٹی فرزانہ کھیر لے کر آئی تھی۔"

فرزانہ کے جانے کے بعد مشتاق نے کمال کی طرف دیکھا۔ "کیوں نہ اس کے پہلوان باپ پر کیس کر دیا جائے۔"

"وہ کیوں مشتاق صاحب! اس نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟"

"پھونک مار مار کر کھیر جیسی چیز کو زہر آلود کر دیا ہے۔ اس سے بڑا جرم اور کیا ہوگا۔"

☆☆☆

رات اچھی خاصی ہو چکی تھی۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے پرویز کو پہلے تو نیند سے جگا دیا پھر اس کے ہوش اڑا دیے۔ اتنی رات گئے اتنے دھڑلے کے ساتھ صرف کمرے کا مالک ہی آسکتا تھا۔

پرویز نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ مالکِ مکان تیزی سے اندر چلا آیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، پرویز نے بولنا شروع کر دیا۔ "اچھا ہوا آپ خود آگئے۔ میں تو کل آپ کو نوٹس دینے والا تھا۔"

"بہت خوب۔" کمرے کا مالک غرایا۔ "تم الٹا مجھے نوٹس دینے والے تھے۔ وہ کس خوشی میں؟"

"میں یہ دو کوڑی کا کمرا خالی کر رہا ہوں۔" پرویز نے کہا۔ "کیا رکھا ہے اس میں، چاچا نے اسّی لاکھ کا اپارٹمنٹ خرید کر دے دیا ہے مجھے۔"

"ایسا کون سا چاچا ہے جو تمہیں اسّی لاکھ کا اپارٹمنٹ خرید کر دے گا۔"

"میں اپنے چاچا کی بات کر رہا ہوں۔ وہ تو ڈھائی کروڑ کا مکان دیکھ کر آئے تھے۔ میں نے ہی فضول خرچی سے منع کر دیا۔ اکیلا آدمی ہوں۔ اتنا بڑا مکان لے کر کیا کرنا ہے۔"

مالکِ کمرا کی آنکھوں میں چمک بھی پیدا ہو گئی اور اس کا لہجہ بھی نرم ہو گیا تھا۔ "بھائی پرویز! میں تو صرف خیریت پوچھنے آ گیا تھا۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے، آپ جب تک جی چاہے رہیں۔"

"ہاں۔ مکان کا قبضہ ملنے تک تو رہنا ہی ہوگا۔"

"شوق سے رہیں اور کرائے وغیرہ کی پروا نہ کریں۔ وہ تو مل ہی جائے گا۔ اب اجازت دیں۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''جاؤ۔ خدا حافظ۔''

☆☆☆

شیخو کو پتا چل گیا تھا کہ وہ لڑکی فرزانہ اس کے لیے کھیر لے کر آ گئی تھی اور اس نے مشتاق اور کمال سے یہ بتایا تھا کہ یہ کھیر رشتے کے لیے ہے۔

شیخو کو بھی وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی اس کے قریب آئی تھی اور وہ بھی اس درجہ کہ دو تین ملاقاتوں میں وہ محبت کا اظہار بھی کر بیٹھی تھی۔

اس وقت بھی وہ اس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ فرزانہ پھر کھیر لیے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ شیخو کو اکیلے دیکھ کر وہ کھل اٹھی تھی۔ ''دیکھو، میں نے اس کھیر میں ابھی تک کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیا ہے۔''

''فرزانہ! مجھے تم خود بھی بہت پسند ہو لیکن یہ جادو ٹونے والی پسندیدگی ٹھیک نہیں ہے۔''

''شیخو! تم سمجھ نہیں رہے۔ یہ جادوٹونے والی پسندیدگی نہیں ہے۔ روحانی پسندیدگی ہے۔ میرے ابا نے کچھ پڑھ کر پھونکا ہے۔''

''دیکھو، جب میں بغیر کھیر کھائے تمہیں پسند کر رہا ہوں تو پھر کھیر کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں نے بالکل یہی بات ابا سے پوچھی تھی۔''

''تو پھر کیا بتایا تمہارے ابا نے؟''

''کہنے لگے...... دیکھو، تم دونوں کے درمیان محبت تو کھیر کے بغیر بھی ہو جائے گی لیکن ان کی روحانیت کا بھی تو کوئی تجربہ ہونا چاہیے۔ اتنی محنت سے تو انہوں نے وظیفہ سیکھا ہے۔''

''تم میری طرف سے اپنے ابا کو جا کر بتا دو کہ میں بغیر وظیفے کے بھی محبت کر سکتا ہوں۔''

''نہیں۔ تم ابا کا دل مت توڑو۔ تم جانتے ہو وہ پہلوان آدمی ہیں۔ اگر انہیں غصہ آ گیا تو پھر کیا ہوگا۔''

''میں تمہارے پہلوان ابا کا غصہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ جاؤ بتا دو ان کو کہ ان کا وظیفہ دو کوڑی کا ہے۔'' شیخو نے جھلا کر کہا۔

''شیخو! یہ تم خود اپنے حق میں برا کر رہے ہو۔ ابا غصے میں ہاتھی سے بھی ٹکرا جاتے ہیں۔''

''مرے ہوئے ہاتھی سے ٹکراتے ہوں گے۔''

''ارے بیٹا، کہاں ہو تم۔ میری ریاضت کا وقت ہو رہا ہے۔''

''یہ لو، ابا خود یہاں تک آ گئے۔ پلیز شیخو! یہ کھیر کھالو۔''

''اب تو ہرگز نہیں کھانی ہے۔ تم بلالو اپنے ابا کو کہ اپنی روحانیت سے مجھے جلا دیں۔''

باہر سے پھر سکندر کی آواز آئی۔ ''فرزانہ! کہاں ہو تم؟''

''آ جاؤ ابا۔ دروازہ کھلا ہوا ہے۔''

سکندر کھانستا ہوا اندر آ گیا۔ ''کیا بات ہے بیٹا! تم یہاں کیوں چپک گئیں؟''

''ابا! یہ شیخو صاحب کھیر نہیں کھا رہے۔ کہہ رہے ہیں کہ یہ روحانی عمل وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

''نوجوان! تمہاری یہ مجال کہ تم میرے وظیفے کا مذاق اڑاؤ۔ تم نے ابھی میری طاقت نہیں دیکھی۔'' سکندر کھانستے ہوئے بولا۔

''طاقت ہی تو دیکھ رہا ہوں۔ کھانس کھانس کر برا حال ہو رہا ہے۔''

''فرزانہ! یہ بے وقوف میری روحانی اور جسمانی دونوں طاقتوں کو للکار رہا ہے۔''

''چھوڑ دیں ابا ان کو۔''

''نہیں بیٹا! تم اب کسی اور کو دیکھو۔ میں اس کا کام تمام کرنے والا ہوں۔''

سکندر نے جوڈو کراٹے والے ایکشن میں دونوں ہاتھ آگے پھیلائے۔ ایک زوردار چیخ ماری اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔ فرزانہ نے اسے جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ ''ابا...... ابا...... ہوش میں آؤ۔ کیا ہوا ہے آپ کو۔ شیخو! ابا تو شاید چل بسے۔''

''ایسے ابا کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔'' شیخو نے کہا۔ ''ٹھہرو، دیکھنے دو مجھے۔'' اس نے قریب جا کر معائنہ کرنے کے بعد بتایا۔ ''پریشان مت ہو، تمہارے ابا صرف.... بےہوش ہوئے ہیں۔ ابھی ہوش میں آ جائیں گے۔''

مشتاق کو یہ ساری کہانی معلوم ہو گئی تھی۔ اس نے اس وقت سے کمال کی جان کھا رکھی تھی کہ اس آدمی پر کیس کر دیا جائے۔

کمال قانون کی کتابیں لے کر بیٹھ گیا تھا۔ ''ہاں بھائی، کیا کیس بنایا ہے اس آدمی پر؟''

''مشتاق صاحب! وہی ڈھونڈ رہا ہوں۔ فی الحال کوئی کیس نہیں بنتا۔''

''کیسے نہیں بنتا۔ ایک آدمی یہاں آ کر بے ہوش ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو کوئی کیس نہیں بنتا۔''

''مشتاق صاحب! آپ ایسا کریں، مجھ پر کوئی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

الزام لگا کر مجھے اندر کروا دیں۔''

''یہ بھی اچھا مشورہ ہے۔غور کیا جا سکتا ہے۔''

☆☆☆

وہ ایک خستہ سی دکان تھا۔ دو تین کرسیاں، ایک ٹوٹی ہوئی میز اور ایک اسٹول کے سوا دکان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ ایک نجومی کی دکان تھی۔ وہ جس کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے پیچھے دیوار پر نجومی بوکا زوافریقا پلٹ لکھا ہوا تھا۔ اس وقت وہ نجومی کہکشاں کا ہاتھ دبائے بیٹھا تھا۔ پرویز، کہکشاں کے برابر والی کرسی پر بیٹھا برا سا منہ بنائے نجومی کو دیکھے جا رہا تھا۔

پھر جب اس سے برداشت نہیں ہوا تو وہ بول ہی پڑا۔ ''نجومی صاحب! یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔''

''کیا اچھی بات نہیں ہے؟''

''آپ نے میرا ہاتھ تو پانچ منٹ میں فارغ کر دیا اور اس لڑکی کا ہاتھ ایک گھنٹے سے دبائے بیٹھے ہیں۔''

''مجھے اس لڑکی کے ستارے عروج پر دکھائی دے رہے ہیں۔'' نجومی نے کہا۔

''تو ستارہ دیکھنے کے لیے آسمان کو دیکھیں۔ آپ تو اس لڑکی کو دیکھے جا رہے ہیں۔'' پرویز نے کہا۔

''پرویز! تم کیوں نجومی صاحب کو ڈسٹرب کر رہے ہو۔ چلیں نجومی صاحب! یہ بتائیں میری شادی کب تک ہوگی؟'' کہکشاں نے پوچھا۔

''بہت جلد۔ زہرہ جب تیسرے خانے میں جائے گا تو شادی ہو جائے گی۔''

''اور وہ کمبخت کب تک جائے گا؟'' پرویز نے پوچھا۔

''بہت جلد۔ بس اس کی اسپیڈ تیز کرنی ہوگی۔'' نجومی نے بتایا۔

''اور اس کی اسپیڈ کیسے تیز ہوگی؟''

''اس کے لیے مجھے کچھ ٹوٹکے کرنے ہوں گے۔'' نجومی نے کہا۔ ''جس کی فیس دو ہزار روپے ہوگی۔''

''کیا وہ ستارہ ریموٹ سے چلتا ہے کہ تم یہاں سے بٹن دبا کر اس کی اسپیڈ تیز کر دو گے؟''

''دیکھو بھائی! یہ روحانی معاملات ہیں۔ جب تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو مت بولو۔'' نجومی برا مان کر بولا۔ ''میں نے نہ جانے کتنے ستاروں کو ادھر سے ادھر کر دیا ہے۔''

''پرویز! مجھے نجومی صاحب سے بات کرنے دو نا۔ تم کہاں شروع ہو گئے۔'' کہکشاں نے نجومی کی طرف دیکھا۔

''چلیں اب یہ بھی بتا دیں کہ جس سے شادی ہوگی، وہ کیسا ہوگا؟''

''بہت خوب صورت۔'' نجومی نے پرویز کو ایک نظر دیکھنے کے بعد کہکشاں سے کہا۔ ''نیلی نیلی آنکھیں، سنہرے بال، خوب صورت جسم، لانبا قد۔''

''سچ نجومی صاحب؟''

''ہاں، میرا علم بھی غلط نہیں ہوتا۔'' نجومی نے کہا۔

''اس وقت تو تمہارا علم زہر اگل رہا ہے۔'' پرویز پھٹ پڑا تھا۔ ''ارے، تم نے جتنی خوبیاں بتائی ہیں، ان میں سے مجھ میں ایک بھی نہیں ہے۔''

''اب میں کیا کر سکتا ہوں، یہ تو ستاروں کا فیصلہ ہے۔''

''آئی ایم سوری پرویز۔ اب مجھے ایسے کسی آدمی کو تلاش کرنا ہوگا۔'' کہکشاں نے کہا۔

''لگا دی نا آگ۔ کباڑا کروا دیا میری محبت کا۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ ستارے بتا رہے ہیں۔''

''تو ستارے میرے ہی دشمن کیوں ہو گئے۔ میں نے کیا بگاڑا تھا ستاروں کا۔'' پھر اس نے کہکشاں کی طرف دیکھا۔ ''کہکشاں! تم میرے ساتھ چل رہی ہو یا نہیں۔''

''تم جاؤ، مجھے تو ابھی نجومی صاحب سے اس بندے کا مکمل ایڈریس بھی معلوم کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تو پھر بیٹھی رہو اس نجومی کے پاس۔'' پرویز جلا کر اس دکان سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

مشتاق جب لاؤنج میں داخل ہوا تو فرزانہ گردن جھکائے اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ مشتاق اس دن بہت بور ہو رہا تھا۔ کئی دنوں سے کوئی نیا لطیفہ اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ سیکریٹری بھی بس یوں ہی ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے یہ سارا کھڑاگ اپنی تنہائیوں کے عذاب کو کم کرنے کے لیے پھیلایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی معاشی پریشانی نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس قسم کی ذہنی تفریح کرتا تھا۔ اس کے پیروں کی آہٹ سن کر فرزانہ جلدی سے کھڑی ہو گئی تھی۔

''بیٹھو، بیٹھ جاؤ۔'' مشتاق اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''کیسے ہیں تمہارے ابا۔''

''وہ پہلوان آدمی ہیں انکل۔ ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بڑا فولادی بدن ہے ان کا۔'' فرزانہ نے کہا۔

''کسی دو نمبر فیکٹری کا فولاد معلوم ہوتا ہے۔'' مشتاق نے کہا۔ ''لوہا ذرا بکھر گیا ہے۔ یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟''

''انکل! آپ شنو صاحب سے میری سفارش کر دیں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نا۔" فرزانہ نے کہا۔
"کس بات کی سفارش!"
"یہی کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگیں۔"
"وہ بے وقوف محبت ہی تو کر رہا ہے۔ اب اور کیا کرے۔"
"انکل! یہ بھی کوئی محبت ہے، مجھے فلمی اسٹائل کی محبت پسند ہے۔ ویسے کل میں نے ٹرائی تو کیا تھا لیکن بات نہیں بنی۔"
"کس چیز کی ٹرائی؟"
"کل شام ہم دونوں پارک میں گئے تھے۔" فرزانہ نے بتایا۔ "میں نے ایک گانے کا ایک بول گایا۔ سوچا تھا سچویشن کے مطابق شیخو دوسرا بول گا کر اس گانے کو آگے بڑھا دیں گے لیکن کہنے لگے مجھے یہ گانا یاد نہیں آ رہا۔"
"تو اس میں کون سی برائی ہو گئی۔"
"میں نے سوچا تھا کہ اگر شیخو نے دوسرا بول گا کر سنا دیا تو اسی وقت ابا سے جا کر رشتے کی بات کرلوں گی۔"
"ویسے وہ گانا کیا تھا؟"
"بہت آسان سا تھا انکل۔ بہت مشہور۔ ٹھہریں میں گا کر سناتی ہوں۔" فرزانہ نے گنگنانا شروع کر دیا۔ "زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں۔"
اسی وقت عقب سے کمال کی آواز سنائی دی۔ "میں تو مر کر بھی میری جان تجھے چاہوں گا۔"
فرزانہ بوکھلا کر بولی۔ "انکل! یہ تو کمال صاحب کی آواز ہے۔"
"ہاں، یہ اسی کی آواز ہے اور اب تمہیں اسی سے اپنے رشتے کی بات کرنی ہوگی۔ بھول جاؤ شیخو کو۔"

☆☆☆

مالک کمرا نے پرویز کی طرف آنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک بار راستے میں ملاقات ہوئی تو پرویز سے زیادہ پرویز کے چاچا کی خیریت دریافت کرتا رہا تھا۔ پرویز اب بھی اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے اس سے نمٹنے کے اور کئی بہانے سوچ لیے تھے۔ اس وقت کی دستک سے اس نے یہی سمجھا کہ شاید کمرے کا مالک پھر آن ٹپکا ہے لیکن آنے والا شیخو تھا۔ پرویز اسے دیکھ کر خوش ہوا تھا۔
"آؤ یار، میں ابھی تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔"
"پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔" شیخو نے کہا۔ "رہنے کا تو ٹھکانا ہو گیا ہے اور کھانے پینے کو بھی مل جاتا ہے لیکن پیسے نہیں ملتے۔"
"ارے بابا! تم سے پیسے کون مانگ رہا ہے جو تم نے تقریر شروع کر دی۔"
"تو پھر کیا بات ہے؟"
"تم اپنے مشتاق انکل سے میری سفارش کر دو۔ انہیں یقین دلا دو کہ میں ان کے لطیفے سنتا رہوں گا۔ چاہے جتنے بھی پرانے ہوں۔"
"تم تو ان کو ناراض کر کے آ گئے تھے۔"
"میں نے کہاں ناراض کیا تھا۔ وہ تو خود انہوں نے میری بے عزتی کر دی تھی۔ بھائی تم ان سے سفارش کر دو گے تو مجھ غریب کو ضرور اپنے پاس رکھ لیں گے۔ اس طرح رہنے کا آسرا بھی مل جائے گا اور محبت بھی مل جائے گی۔"
"کیا مطلب! کیا تم انکل سے محبت کرو گے؟"
"انکل سے نہیں یار، کہکشاں سے۔ تم کو تو معلوم ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔"
"سوچنے دو مجھے۔ تم ایسا کرو، کوئی بہانہ کر کے آ جاؤ۔"

☆☆☆

کمال اور شیخو دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخو کچھ ناراض دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کمال کی طرف سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر رکھا تھا۔ کمال نے کچھ دیر برداشت کرنے کے بعد پوچھا۔ "کیا بات ہے، کیا تم مجھ سے کچھ ناراض ہو؟"
"ہاں ناراض ہوں۔" شیخو نے کہا۔
"وہ کیوں؟"
"یہ تم اپنے ضمیر سے پوچھو۔ میں نے تمہیں دوست سمجھا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم مجھے برباد کرنے کی کوشش کرو گے۔ میری محبت چھیننے کی سازش کرو گے۔ وہ گانا کیوں گایا تھا تم نے؟"
"ارے نہیں شیخو بھائی وہ...... بہت اچھی لڑکی ہے لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بہت خوب صورت بھی ہے لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بہت سیدھی معصوم اور اسمارٹ ہے لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
"اے، دنیا بھر کی دلچسپیاں ظاہر بھی کر دیں اور کہہ رہے ہو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
اسی وقت مشتاق تیزی سے اندر آ گیا۔ "ٹھہرو نوجوانو...... ٹھہرو۔ شاید تم دونوں میں رقابت شروع ہو گئی ہے۔"
"نہیں انکل! ہم تو بس یوں ہی باتیں کر رہے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھے۔" شیخو جلدی سے بولا۔

"ایسا نہیں بھی ہے تو بھی ایسا ہی ہے۔ اگر اس گھر میں رہنا ہے تو رقابت کرنی ہوگی۔ ایک دوسرے کو جان سے مارنے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

"ہمارا دماغ نہیں خراب کہ در و دیوار کے لیے جانیں دے دیں۔" شیخو نے کہا۔

"محبت دماغ کی خرابی کا ہی نام ہے۔" مشتاق نے کہا۔

"یہ آپ نے کیا خطرناک پلاننگ شروع کردی۔ میں فرزانہ سے وِدڈرا ہو رہا ہوں۔"

"اور مجھے تو ویسے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے میں کیوں مارا جاؤں۔" کمال نے کہا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کم بختو! اس معصوم لڑکی کو زندگی میں ایک بار خوشی کا موقع تو دو۔ ورنہ جس ٹائپ کا اس کا باپ ہے، اسے سوائے دکھوں کے اور ملا کیا ہوگا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔ تم دونوں کو ریوالور لے کر لڑنا ہے۔"

"مشتاق صاحب! ریوالور میرے پاس نہیں ہے اس لیے میں نہیں لڑ سکتا۔" کمال جلدی سے بولا۔

"اس کی فکر مت کرو، تم دونوں کو ریوالور میں دوں گا۔ اتنے دنوں کے بعد تو اس گھر میں خوشی کا ایک موقع آرہا ہے۔"

☆☆☆

پرویز نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول رکھا تھا اور دروازے کے ٹھیک سامنے اخبار کو دسترخوان بنا کر کھانا کھا رہا تھا۔ کہکشاں دروازہ کھلا دیکھ کر سیدھی اندر آگئی تھی۔

"خدا کی بندی! تم کیسی سیکریٹری ہو جو ہر وقت باہر ہی رہتی ہو۔"

"ہر وقت نہیں۔ صرف اس وقت جب لطیفوں کی کتاب ڈھونڈنے نکلتی ہوں۔" کہکشاں نے کہا۔ "اور یہ تم دروازہ کھلا رکھ کر کھانا کیوں کھا رہے ہو؟"

"تاکہ آنے جانے والوں کو پتا چل جائے کہ بے چارہ روکھی سوکھی روٹیاں کھائے چلا جا رہا ہے۔"

"شرم نہیں آتی، ایسا کھانا کھاتے ہوئے۔" کہکشاں برا سا منہ بنا کر بولی۔

"تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ تم تو اس نیلی آنکھ والے کو تلاش کرو۔"

"وہی تو بتانے آئی ہوں کہ میرے ساتھ کیا دھوکا ہوا ہے۔" کہکشاں نے کہا۔

"بتاؤ، کیا دھوکا ہوا ہے؟"

"مجھے نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا ایک بندہ مل گیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"بعد میں پتا چلا کہ یہ تو وہی نجومی ہے۔ کم بخت آنکھوں میں لینس لگا کر اور بالوں کو ڈائی کروا کے میرے سامنے آگیا تھا۔"

"چلو، پھر اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

"میں تم سے شرمندہ ہوں پرویز۔ میری وفائیں تمہارے لیے ہیں لیکن یہ مت سمجھ لینا کہ میں اوریجنل بندے کی تلاش ختم کردوں گی۔ نہیں، وہ بھی چلتا رہے گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ جب تمہاری وفائیں میرے لیے ہیں تو پھر کسی اور کو کیوں تلاش کر رہی ہو؟" پرویز نے پوچھا۔

"میں ایک آپشن ہمیشہ کھلا رکھتی ہوں۔ نہ جانے تم کس وقت بے وفائی کر جاؤ۔ اس لیے احتیاط بہت ضروری ہے۔"

☆☆☆

مشتاق کے لاؤنج میں اس وقت ہلچل مچی ہوئی تھی۔ فرزانہ اور مشتاق بھی موجود تھے۔ مشتاق کے ہاتھ میں ایک انچی ٹیپ تھا جس سے وہ فاصلہ ناپ رہا تھا۔

اس نے ٹیپ کا ایک سرا فرزانہ کی طرف بڑھایا۔ "یہ لو ادھر سے ناپنا شروع کردو۔ کم از کم آٹھ گز کا فاصلہ ہونا چاہیے۔"

"شیخو کو کس طرف کھڑا کریں گے انکل؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"اس طرف۔" مشتاق نے ایک جانب اشارہ کردیا۔ "اور کمال اس طرف کھڑا ہوگا۔"

"انکل! ایک بات تو سوچیں۔ یہ فاصلہ تو بہت کم ہے۔ اس طرح دونوں مر جائیں گے۔"

"ہاں، یہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"تو پھر میرا کیا ہوگا۔ میں کس سے محبت کروں گی؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"بے وقوف لڑکی! کیا تم نہیں چاہتیں کہ تاریخ میں تمہارا نام زندہ رہے۔" مشتاق نے کہا۔ "لوگ تمہاری طرف اشارہ کریں کہ دیکھو یہ ہے وہ حسینہ جس کے لیے دو نوجوانوں نے جانیں دے دیں۔ بتاؤ کیا تم یہ نہیں چاہتی ہو؟"

"کیوں نہیں چاہتی ہوں انکل۔ اگر ایسا ہوجائے تو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں خود اپنے ہاتھوں سے دونوں کو گولی ماردوں۔"
"شاباش، اسے کہتے ہیں سچا جذبہ، سچی لگن۔"
اسی وقت شیخو اندر سے برآمد ہوا۔ اس نے مشتاق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" انکل! میں جارہا ہوں یہاں سے۔ مجھے حرام موت نہیں مرنا ہے۔"
"پلیز شیخو! جان دے کر امر ہو جاؤ نا۔" فرزانہ نے کہا۔"کم از کم میرے ابا کی خوشی کے لیے امر جاؤ۔"
"کیا میں پاگل ہوں جو ایسے ابا کے لیے جان دے دوں۔"
"سن لیا انکل آپ نے۔" فرزانہ نے مشتاق کو دیکھا۔"یہ سب دل توڑنے والی بات ہے یا نہیں۔"
"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں شیخو کو سمجھادوں گا۔ یہ بہت سعادت مند ہے۔"

☆☆☆

مالک پھر پرویز کے پاس آدھمکا تھا۔ اس بار پرویز نے بڑی شان کے ساتھ دروازہ کھولا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق کمرے کے مالک نے بہت جھک کر اس سے مصافحہ کیا تھا۔
ایک دن پہلے اس نے پرویز کے پاس آ کر کہا تھا کہ وہ اپنا نیا بزنس شروع کرنا چاہتا ہے جس کے لیے اسے سرمائے کی ضرورت ہے۔ پرویز نے اپنے چاچا کے تعاون کی یقین دہانی کرادی تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے دوران اس نے پوچھا۔" پرویز صاحب! آپ کے چاچا میرے کاروبار میں کتنے پیسے لگا سکتے ہیں؟"
"میں پانچ کروڑ تک کی تو گارنٹی لے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔" پرویز نے بے نیازی سے جواب دیا۔
"ارے صاحب! یہ پانچ کروڑ بہت ہیں، بہت ہیں پانچ کروڑ۔" مالک کمرا خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔"آپ خوش رہیں، ویسے وہ سنگاپور سے تو واپس آچکے ہوں گے۔"
"ہاں لیکن پھر مڈغاسکر چلے گئے۔" پرویز نے بتایا۔
"مڈغاسکر! وہ کیوں؟"
"زلزلے والوں کی دیکھ بھال کرنے۔"
"واہ، کیا بات ہے۔ کیا انسانیت ہے، چاچا ہو تو ایسا ہو۔" مالک کمرا..... خوش ہوا جارہا تھا۔" ایک بات تو بتائیں، کیا آپ کے ایک ہی چاچا ہیں؟"
"جناب! جب ایک ہی سے اتنے دنوں تک کام چل گیا ہے تو پھر دوسرے کی کیا ضرورت ہے۔" پرویز نے کہا۔
"آپ ملوائیں گے نا اپنے چاچا سے۔"
"ملوانا تو بہت چھوٹی سی بات ہے امتیاز صاحب۔ میں تو آپ کو ان کا بزنس پارٹنر بنوانا چاہ رہا ہوں اور آپ صرف ملوانے کی بات کر رہے ہیں۔"
اس کی چکنی چپڑی باتوں سے وہ ذرا چونک گیا اور ہوشیاری سے کہا۔" پرویز صاحب! اب ایک بات آپ بھی سن لیں۔ اگر اس ہفتے تک آپ نے اپنے چاچا سے نہیں ملوایا تو آپ خود کو بے گھر ہی سمجھیں۔"
"جی...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" پرویز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"مجھے جو کہنا تھا وہ میں کہہ چکا ہوں۔" مالک کمرا نے کہا۔"اور اب میں جارہا ہوں۔ خدا حافظ۔"
مالک کمرا کے جانے کے بعد پرویز سوچ میں پڑ گیا۔ اب اس کمرے میں رہنا اس کے لیے ناممکن ہو چلا تھا اور اس کے پاس صرف ایک ہی ٹھکانا تھا۔ شیخو کے انکل کا گھر۔ ایک بار بے عزتی ہو چکی تھی۔ چلو ایک بار اور سہی۔

☆☆☆

مشتاق کے گھر کے لاؤنج میں اس وقت ڈوئل کی تیاری اپنے آخری مرحلے میں تھی۔ مشتاق، شیخو، کمال اور فرزانہ سب اس لاؤنج میں تھے۔ کمال اور شیخو کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔
"فرزانہ۔" شیخو نے فرزانہ کو مخاطب کیا۔"مجھ بے گناہ کی موت کی ساری ذمے داری تمہاری ہوگی۔ تم خوامخواہ مجھے ٹھکانے لگوا رہی ہو۔"
"اور میں تو بس یوں ہی مارا جاؤں گا۔" کمال نے کہا۔"کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے۔"
"شیخو! مجھے تمہارے پیار سے بہت سی امیدیں ہیں، جیسے رانجھا نے جولیٹ کے لیے پہاڑ کھودا تھا۔"
"لڑکی، عاشقوں کو ایک دوسرے سے مکس مت کرو۔" مشتاق دہاڑا۔"رانجھا ہیر کے ساتھ ہوتا تھا۔ جولیٹ کو رومیو نے پھانس رکھا تھا اور پہاڑ کھودنے والا فرہاد تھا۔"
"خیر جو بھی ہو، میں تو یہ چاہتی ہوں کہ شیخو میں ان تینوں کی کوالٹی آجائے۔" فرزانہ نے کہا۔
"مشتاق صاحب! اگر میں مر گیا تو آپ کے مقدمے کون لڑے گا؟" کمال نے آخری حربہ آزمایا۔
"کمال! یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تمہاری موت کے بعد میں مقدمے بازی ختم کردوں گا۔ چھوڑ دوں گا سب کچھ چلو، اب ایک دوسرے کا نشانہ لو اور جیسے ہی میں سیٹی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بجاؤں ایک دوسرے پر فائر کر دینا۔''

''انکل! ایک منٹ، آپ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے؟'' فرزانہ نے کہا۔

''نہیں، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ میرے بچو! اس سے پہلے کہ تم دونوں اپنے آخری سفر پر روانہ ہو، میں تمہیں ایک لطیفہ سنانا چاہتا ہوں۔''

''ارے جہنم میں گیا لطیفہ، جب میں مر ہی رہا ہوں تو پھر لطیفہ کیوں سنوں۔'' کمال نے کہا۔

''شیخو! ذرا اپنا پستول مجھے دینا۔'' مشتاق نے کہا۔

''یہ لیں انکل۔'' شیخو نے جلدی سے پستول مشتاق کے حوالے کر دیا۔

''نالائق۔'' مشتاق نے پستول کا رخ کمال کی طرف کر دیا۔ ''میرے ہی گھر میں رہ کر میرے لطیفوں سے انکار کر رہا ہے۔''

مشتاق کے ہاتھ سے ٹریگر دب گیا۔ کمال کو اپنی جگہ کھڑے دیکھ کر اور باہر سے کسی کی چیخ سن کر سب حیران رہ گئے۔

''انکل! آپ کی گولی تو کھڑکی سے باہر چلی گئی۔'' فرزانہ نے کہا۔

''نہ صرف باہر گئی ہے بلکہ کسی کو ٹھنڈا بھی کر چکی ہے۔'' شیخو نے اضافہ کیا۔

''ارے جاؤ جلدی، دیکھو کس کو لگ گئی۔ میرا تو دل گھبرا رہا ہے، کہیں بے ہوش نہ ہو جاؤں۔''

''میں دیکھتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔'' کمال نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

''لڑکی! کیا ایسے موقع کے لیے تمہارے ابا کے پاس کوئی وظیفہ نہیں ہے؟'' مشتاق نے فرزانہ سے پوچھا۔

''نہیں انکل! اتنی ایمرجنسی کا کوئی وظیفہ نہیں ہوتا۔''

اسی دوران میں کمال دوڑتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ''شیخو! تمہارا وہ دوست ہے نا پرویز۔ انکل کی گولی اس کو لگی ہے، وہ بے چارہ باہر بے ہوش پڑا ہوا ہے۔''

☆☆☆

''میری جان، میرے منے، میرے ہم راز۔'' مشتاق، پرویز کی خوشامد کیے جا رہا تھا جو اس وقت ایک کمرے میں ایک بستر پر بڑی شان کے ساتھ لیٹا ہوا تھا گولی اس کو معمولی سا زخمی کرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ یہ لوگ اسے باہر سے اٹھا کر کمرے میں لے آئے تھے۔ محلے کے ایک ڈاکٹر نے مرہم پٹی بھی کر دی تھی۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔

کمال نے مشتاق سے کہا۔ ''انکل! آپ مجھے روکیں گے تو نہیں نا؟''

''کس بات پر؟''

''میں آپ کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوانے جا رہا ہوں۔'' کمال نے بتایا۔ ''آپ نے ایک ساتھ کئی جرائم کیے ہیں۔ پہلا جرم تو یہ ہے کہ آپ نے دو شریف آدمیوں کو آپس میں لڑوانے کی کوشش کی۔ دوسرا جرم یہ ہے کہ آپ نے دونوں کو ایک ساتھ مارنے کی کوشش کی۔ دونوں کو بھرے ہوئے ریوالور دے دیے تاکہ ایک دوسرے کو مار دیں اور تیسرے کو گولی مار کر زخمی کر دیا۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ پر کتنی دفعات لگ چکی ہیں۔''

''ارے نہیں بیٹا! تم لوگ تو مجھے جان سے زیادہ پیارے ہو۔'' مشتاق نے کہا۔ ''میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

''اگر ہم ایک دوسرے پر گولیاں چلا دیتے تو؟'' شیخو نے بھی آنکھیں دکھائیں۔

''کیسے چلا دیتے، میں کبھی سیٹی ہی نہیں بجاتا۔''

''لیکن آپ نے مجھ پر تو گولی چلا دی تھا نا۔'' کمال نے کہا۔

''نہیں بیٹا! تم پر نہیں چلائی۔ کھڑکی سے باہر کا نشانہ لیا تھا۔ اسی لیے تو بے چارہ پرویز زخمی ہو گیا۔''

''انکل! ہم آپ کو معاف کر سکتے ہیں لیکن صرف ایک شرط ہے۔'' شیخو نے کہا۔

''اب وہ شرط بھی بتا دے بیٹا۔ اس وقت تو میں پھنسا ہوا ہوں۔''

''شرط یہ ہے کہ اب آپ ہمیں لطیفے نہیں سنائیں گے۔'' کمال نے کہا۔

''اور دوسری شرط یہ ہے کہ اب یہ پرویز بھی اسی مکان میں رہے گا۔'' شیخو نے بتایا۔

''لیکن میں معاف نہیں کروں گی۔'' کہکشاں بول پڑی۔ ''کیونکہ آپ نے اس شخص کو گولی ماری ہے جس سے میں نے محبت کا فیصلہ کیا تھا۔ خود سوچیں، اگر آپ کی گولی سے وہ معذور ہو جاتا تو مجھے فیصلہ بدلتے ہوئے کتنی تکلیف ہوتی۔''

''کہکشاں! اپنے پرویز کے لیے انکل کو معاف کر دو۔'' کمال نے کہا۔

اچانک پرویز بھڑک اٹھا۔ ''تم سب کیا پاگل ہو گئے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہو۔ ایک دوسرے سے معافی مانگے جارہے ہو جس کو گولی لگی ہے، اسے کوئی پوچھ ہی نہیں رہا ہے۔"

"میں تو پوچھ رہا ہوں نا بیٹا۔ صبح سے دو گلاس دودھ پلا چکا ہوں۔"

"انکل! آپ کو بہت شوق ہے نا دوسروں پر مقدمہ کرنے کا۔ اب خود آپ پر مقدمہ ہوگا تو کیسا لگے گا؟" کمال نے کہا۔

"میرے وکیل بیٹے۔ میں مقدمے سے نہیں ڈرتا۔ شرط یہ ہے کہ کسی اور پر ہو رہا ہو۔" مشتاق نے کہا۔ "بہرحال اب تم لوگ جلدی سے فیصلہ کرکے بتاؤ کہ مجھے معاف کر رہے ہو یا نہیں۔ ورنہ میں تم سبھی پر مقدمہ کردوں گا۔"

"وہ کیوں۔ آپ کس خوشی میں مقدمہ کریں گے؟" شیخو نے پوچھا۔

"بہت مضبوط کیس بنتا ہے تم لوگوں کے خلاف۔" مشتاق مسکرا کر بولا۔ "میں ایک اکیلا آدمی ہوں، اکیلے مکان میں رہتا ہوں۔ تم لوگوں کو یہ معلوم ہوا اور تم سب کے سب میرے مکان پر قبضہ کرنے چلے آئے۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے گولی چلا دی۔ جس سے تمہارا ایک آدمی بھی زخمی ہوگیا۔ اب بتاؤ۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں انکل۔" کمال نے ایک گہری سانس لی۔ "آپ واقعی جب جی چاہے ہم سب کو اندر کرواسکتے ہیں۔"

"بس تو پھر بھول جاؤ پرانی باتوں کو اور اس زخمی بے وقوف سے بھی کہو کہ خاموش رہے۔ ورنہ ایک گولی اور مار کر الٹا اس کے خلاف کیس بنوا دوں گا۔"

☆☆☆

اب سب اسی مکان میں رہنے لگے تھے۔ فرزانہ، شیخو سے چپک گئی تھی۔ کہکشاں نے پرویز میں اپنا مستقبل تلاش کرنے کی کوشش شروع کردی تھی جبکہ مستقبل نہ تو پرویز کا تھا اور نہ کہکشاں کا۔

مشتاق نے ایک دن کہکشاں سے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ میں ایک خطرناک قسم کے مرض میں مبتلا ہوں۔"

"نہیں، میں یہ تو نہیں جانتی۔" کہکشاں نے بتایا۔

"تو اب جان لو کہ میری صحت جواب دیتی جارہی ہے۔ نہ جانے کس وقت میرے ساتھ کیا ہوجائے۔"

"پلیز، آپ اپنا دھیان رکھیں۔"

"شاید تم کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ میرے پاس کروڑوں روپے ہیں۔" مشتاق نے بتایا۔

"نہیں، مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا۔"

"تو اب جان لو کہ میں کروڑوں کی دولت کا مالک ہوں۔ بہت کچھ ہے میرے پاس۔ اس گھر کے علاوہ آٹھ دکانیں ہیں، جن کا ہزاروں روپے کرایہ آتا ہے۔ ایک پیٹرول پمپ ہے۔"

اسی شام پرویز نے کہکشاں کو ایک خوشخبری سنائی۔

"کہکشاں! مجھے ایک جاب مل گئی ہے؟"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہماری محبت اب کامیاب ہونے والی ہے۔" پرویز نے کہا۔

"چلو یہ بھی بتادو کہ تمہاری سیلری کتنی ہے؟" کہکشاں نے پوچھا۔

"سب ملا کر پندرہ ہزار۔" پرویز نے بتایا۔

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ یہ تم نے کیسی رٹ لگا رکھی ہے، جس کے پاس کوئی آسرا نہ ہو اس کے لیے پندرہ ہزار کم نہیں ہوتے۔"

"چلو مبارک ہو۔" کہکشاں بے دلی سے بولی۔

کہکشاں کے دھیان میں کروڑوں روپے تھے۔ کروڑوں، جن سے بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ جو زندگی کو بدل سکتے ہیں لیکن یہ پیسے کیسے حاصل کیے جاسکتے تھے۔

"دیکھو پرویز! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔" اس نے پرویز سے کہا۔ "لیکن دولت پھر دولت ہوتی ہے۔ میں تمہارے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں لیکن دولت پھر دولت ہوتی ہے۔ میں تمہارے لیے آگ میں بھی کود سکتی ہوں لیکن دولت پھر دولت ہوتی ہے۔ میں تمہارے لیے زہر کھا سکتی ہوں لیکن دولت پھر دولت ہوتی ہے۔"

"چپ کرو۔ یہ تم نے کیا رٹ لگا رکھی ہے۔" پرویز حیرت سے بولا۔ "یہ تم دولت دولت کیا بولے چلی جارہی ہو؟"

"پرویز! میری بات ذرا دھیان سے سنو۔" کہکشاں نے کہا۔ "یہ جو اپنے مشتاق صاحب ہیں نا...... ان کے پاس کروڑوں روپے ہیں۔"

"تو پھر...... ہم کیا کرسکتے ہیں؟" پرویز نے پوچھا۔

"پرویز! ان کروڑوں سے بہت کچھ ہوسکتا ہے۔" کہکشاں نے کہا۔ "کیا ہم کسی طرح حاصل نہیں کرسکتے؟"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"کیا پاگل ہوگئی ہو۔ ان کی دولت ہم کیسے لے سکتے ہیں؟"

"کوئی طریقہ سوچو یار۔ ورنہ ساری زندگی اسی مفلسی میں گزرے گی۔ خودسوچو، پندرہ بیس ہزار میں آج کل ہوتا کیا ہے۔"

"میری سمجھ میں تو کوئی طریقہ نہیں آرہا۔" پرویز بے بسی سے بولا۔

"تو پھر میں ہی سوچ لیتی ہوں۔"

☆☆☆

فرزانہ کے پہلوان باپ نے فرزانہ کی زندگی عذاب کررکھی تھی۔ "ابے تم نے کس کو اپنی شادی کے لیے پسند کرلیا ہے۔ وہ تو میرے ایک ہاتھ کا بھی نہیں ہے۔"

"ابا! تم اسے داماد بناؤ گے یا اس سے کشتی لڑو گے؟" فرزانہ نے جل کر پوچھا۔

"ابے، میرے داماد کو کم از کم مجھ جیسا تو ہونا چاہیے۔" پہلوان نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سینہ پھلانے کی کوشش کی لیکن کھانسی کے جھٹکوں نے بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔

"بیٹا! کیا وہ نوجوان اس وقت میرے پاس آسکتا ہے؟"

"وہ کیوں ابا؟"

"اس سے تمہارے رشتے کی بات کرنی ہے۔" پہلوان مسکرا کر بولا۔ "ذرا پتا تو چلے وہ تیرا بوجھ برداشت کرسکتا ہے یا نہیں۔"

"کرلے گا بوجھ برداشت۔ اس دن میں نے اس کے کندھے پر کھڑے ہو کر پتنگ اتاری تھی۔ وہ بالکل جما ہوا کھڑا رہا تھا۔"

"بے وقوف! میں دوسرے قسم کے بوجھ کی بات کررہا ہوں۔" پہلوان نے کہا۔ "جا جلدی سے گھیر کے لے آ اس کو۔"

"بس ابھی لاتی ہوں۔" فرزانہ باہر چلی گئی۔

دس منٹ کے بعد ہی وہ شیخو کو بلا کر لے آئی جو اس کے سامنے بہت مؤدبانہ انداز میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ "ابا السلام علیکم۔" شیخو نے سلام کیا۔

"تم کو ابھی ابا کہنے کا حق نہیں ملا ہے۔" پہلوان نے کہا۔ "اس لیے زیادہ محبت جتانے کی کوشش نہ کرو۔ بیٹھ جاؤ سامنے۔"

شیخو سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں میاں بتاؤ، کیا کام کرتے ہو...... کیا آمدنی ہے تمہاری؟"

"پہلوان صاحب! ابھی میری آمدنی شروع نہیں ہوئی ہے۔" شیخو نے بتایا۔

"تو کب شروع ہوگی...... مرنے کے بعد۔"

"ارے نہیں، پہلوان صاحب! خدا آپ کو صحت دے۔ آپ ابھی سے کیوں مرنے کی بات کررہے ہیں۔"

"ابے، میں اپنے نہیں تیرے مرنے کی بات کررہا ہوں۔" پہلوان بلبلا گیا تھا۔ "میں پوچھ رہا ہوں کہ کس قسم کی آمدنی شروع ہوگی۔ کیا کوئی بزنس کرنے لگے ہو؟"

"بزنس ہی سمجھ لیں۔" شیخو نے کہا۔ "پندرہ پندرہ سو کے دو پرائز بونڈ خرید کر رکھ لیے ہیں۔ انعام نکلتے ہی بزنس شروع کردوں گا۔"

"اچھا تم یہ بتاؤ۔ شادی کے بعد فرازنہ کو کہاں رکھو گے؟ اب یہ مت کہنا کہ میں اسے اپنے دل میں رکھوں گا۔ اپنی آنکھوں میں رکھوں گا۔ اپنے سر پر رکھوں گا۔ میں اس قسم کی باتیں نہیں سننا چاہتا۔ میں گھر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، کس گھر میں رکھو گے؟"

"پہلوان صاحب! میں کچھ دنوں کے لیے تو فرزانہ کو اپنے چاچا مشتاق صاحب کے یہاں رکھوں گا۔" شیخو نے کہا۔ "کچھ دنوں کے بعد بھی اگر بندوبست نہیں ہوگا تو پھر اور کچھ دنوں کے لیے رکھ لوں گا۔"

"دیکھ لیا ابا! شیخو کتنے عقل مند ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"ابے، یہ عقل مندی نہیں بے غیرتی ہے۔ یہ تجھے ہمیشہ کے لیے اسی گھر میں رکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔"

"نہیں پہلوان صاحب! اب میں ایسا بھی نہیں ہوں۔"

"دیکھو میاں، جب فرزانہ کو تمہارے ساتھ رہ کر بھی مشتاق ہی کے گھر میں رہنا پڑے گا تو پھر یہ ڈائریکٹ مشتاق ہی سے کیوں نہ بات کرلے۔ اب تمہاری کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔" پہلوان نے کہا۔

"دیکھو فرزانہ! تمہارے ابا کیسی باتیں کررہے ہیں۔" شیخو نے شکایت بھری نگاہوں سے فرزانہ کو دیکھا۔

"ابا ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔" فرزانہ مسکرا کر بولی۔ "جب تمہارے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو پھر میں تمہارے آسرے پر کیوں رہوں گی۔"

☆☆☆

مشتاق اور پرویز اس وقت لاؤنج میں بیٹھے تھے جب کہکشاں چائے لے کر آئی۔ اس نے چائے کی پیالی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مشتاق کی طرف بڑھادی۔ "یہ لیں باس۔ میں نے آپ کے لیے ایک خاص فارمولے سے چائے بنائی ہے۔"

"کہکشاں! تم نے یہ فارمولا مجھ پر کیوں نہیں اپلائی کیا؟" پرویز نے کہا۔

"تم پر اپلائی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" کہکشاں منہ بنا کر بولی۔ "میرے لیے باس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔"

مشتاق کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ خوشی سے اس کے دانت باہر جھانکنے لگے تھے۔

"بتائیں سر! کیسی ہے چائے؟" کہکشاں نے ایک خاص ادا سے اٹھلاتے ہوئے پوچھا۔

"بہت زبردست۔" مشتاق نے تعریف کی۔

"سر! آپ سے تعریف سن کر میرا خون بڑھ جاتا ہے۔" کہکشاں نے کہا۔ "اور کل تو اتنا زیادہ بڑھا ہوا تھا، نکسیر پھوٹ نکلی تھی میری۔"

"پرویز۔" مشتاق نے کہکشاں کو نظر انداز کرتے ہوئے پرویز کو دیکھا۔ "تمہیں کہکشاں کی باتیں بری تو نہیں لگ رہیں۔"

"نہیں انکل، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" پرویز جلدی سے بولا۔

"یہ بہت اچھا ہے۔ تو پھر ایسا کیا کرو جب ہم دونوں کے درمیان اس قسم کی باتیں ہونے لگیں تو تم ذرا ادھر ادھر ہوجایا کرو۔"

"او کے۔ میں ادھر ادھر ہو رہا ہوں۔" پرویز جل کر کھڑا ہوگیا۔

اس شام پرویز نے کہکشاں سے بات کی۔ "خدا کی بندی، تم نے یہ مشتاق صاحب کے ساتھ کیا شروع کر دیا ہے؟"

"میں تمہاری لائف بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔" کہکشاں نے کہا۔

"بہت خوب، میرے سینے پر چھریاں چلا چلا کر میری لائف بنا رہی ہو۔" پرویز غصے سے بولا۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو پرویز۔ اگر ہم ایک دم توڑتے ہوئے انسان کو کچھ دیر کی خوشیاں دے سکیں تو اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ یہ تو بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔"

"کون دم توڑتا ہوا انسان؟" پرویز نے پوچھا۔

"میں مشتاق صاحب کی بات کر رہی ہوں۔"

"وہ دم توڑتا ہوا انسان ہے کہ دم نکالتا ہوا انسان ہے۔" پرویز نے کہا۔

"تم نہیں جانتے پرویز۔" کہکشاں نے ایک گہری سانس لی۔ "اس راز میں انہوں نے صرف مجھے شامل کیا ہے۔ میں تمہیں شامل کر رہی ہوں۔ مشتاق صاحب بس کچھ دنوں کے مہمان ہیں۔" کہکشاں نے بتایا۔

"ارے، کیا ہوا ہے ان کو؟"

"کچھ خطرناک قسم کی بیماریاں ہیں۔" کہکشاں نے بتایا۔ "بلکہ یہ کہو کہ بیماریوں کا پورا پیکیج ہے۔ شوگر، بلڈ پریشر، گردوں کی خرابی، پھیپھڑوں میں پانی، آنتوں کا زخم اور نہ جانے کیا کیا۔"

"اوہ مائی گاڈ۔ اتنی بیماریوں کے لحاظ سے تو ان کو کم از کم دس دفعہ مرجانا چاہیے۔"

"مر ہی چکے ہیں۔ چلتی پھرتی لاش ہیں بے چارے۔" کہکشاں نے کہا۔ "یہ جو مقدمے بازی اور لطیفے وغیرہ کا شوق ہے، یہ صرف اپنے آپ کو بہلانے کی ترکیبیں ہیں۔ ورنہ اندر سے کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔"

"تم نے بہت دردناک اسٹوری سنادی۔"

"پھر تنہائی کا بھوت الگ ہے۔" کہکشاں کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ "ان کے دکھوں کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اسی لیے میں ان کا دل بہلانے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتی رہتی ہوں تاکہ زندگی سے بالکل مایوس ہو کر خودکشی نہ کرلیں۔"

"کہکشاں! اب مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں رہی۔ تم بہت نیکی کا کام کر رہی ہو۔" پرویز نے کہا۔ "لیکن تم وہ میرے مستقبل کی کیا بات کر رہی تھیں؟"

"ہاں، میں یہ بتا رہی تھی کہ مشتاق صاحب کے پاس کروڑوں کی دولت ہے اور یہ دولت اسے دے کر جائیں گے جو ان کے دل کو بھائے گا۔ میں اسی لیے ان کی خدمت میں لگی رہتی ہوں کہ دو چار کروڑ مجھے بھی دے جائیں۔ خود سوچو، اگر میرے پاس دولت آگئی تو کیا تم کو نہیں ملے گی؟"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" پرویز نے اپنی گردن ہلائی۔

"بس اب تم دیکھتے جاؤ۔ میں کس طرح ان سے دولت حاصل کرتی ہوں۔"

☆☆☆

مشتاق لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ کمال اس کے سامنے تھا۔ مشتاق، کمال کو اپنا وصیت نامہ لکھوا رہا تھا۔ "لکھو کہ سات کروڑ بیس لاکھ چار سو اسی روپے اس لڑکی کو ملیں گے جو مجھ سے پہلی شادی کرے گی۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"مشتاق صاحب! آپ کیا چھ سات شادیوں کا پروگرام بنا کر بیٹھے ہیں؟"

"دیکھو مسٹر وکیل، میرے پاس پچاس کروڑ ہیں۔" مشتاق نے بتایا۔ "اب سات سات کروڑ کے حساب سے جتنے بھی حصے ہو جائیں۔"

"اس طرح سات شادیاں ہوں گی آپ کی۔" کمال نے کہا۔ "وہ بھی انچاس کروڑ ہوں گے، پھر بھی ایک کروڑ بچ جائے گا۔"

"ایک کروڑ میں اس وکیل کو دے جاؤں گا جو میری یہ شادیاں کروائے گا۔"

"اگر میں کوشش کروں تو......" کمال نے پوچھا۔

"چلو، تم بھی کیا یاد کرو گے؟ یہ چانس میں نے تم کو دیا۔ تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔"

"لیکن مشتاق صاحب! ایک وقت میں آپ سات بیویاں کیسے رکھیں گے؟" کمال نے پوچھا۔

"ایک وقت میں نہیں بے وقوف۔ الگ الگ۔ مثال کے طور پر پہلی شادی کی۔ اگلے مہینے اسے فارغ کر کے سات کروڑ بیس لاکھ چار سو اسی روپے کا چیک اس کے حوالے کر دیا۔"

"صرف ایک مہینے کے بعد ہی؟" کمال نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بھائی۔" مشتاق نے گہری سانس لی۔ "یہ میری بہت پرانی قسم ہے۔ زندگی میں سات لڑکیوں کے والدین نے مجھے رشتہ دینے سے انکار کیا تھا۔ اسی لیے ہر انکار پر ایک شادی کر کے ایک مہینے میں فارغ کر دوں گا۔"

"لیکن صرف ایک مہینے میں کیوں؟"

"اس لیے کہ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ میری زندگی کے دن بہت کم رہ گئے ہیں۔" مشتاق نے بتایا۔ "زیادہ سے زیادہ آٹھ دس مہینے نکال لوں گا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" کمال حیران ہوتا جا رہا تھا۔

"ہاں، میرے وکیل بیٹے۔ میں اپنے اس راز میں صرف تمہیں شامل کر رہا ہوں۔" مشتاق نے کہا۔ "شاید تم کو نہیں معلوم کہ مجھے دنیا بھر کی بیماریاں ہیں، بیماریوں کا پورا پیکیج ہے۔"

"مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں تھا۔" کمال نے کہا۔

"اسی لیے تو جلدی جلدی خوشیاں سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔" مشتاق نے گہری سانس لی۔ "زندگی کے جو دن رہ گئے ہیں اس کو ہنسی خوشی گزار لوں۔ جو کبھی نہیں کر پایا وہ اب کر لوں۔ میرے ڈاکٹر نے اب سے ٹھیک دس مہینے بعد یعنی اٹھارہ نومبر کی تاریخ دے دی ہے۔"

"مشتاق صاحب! اس ڈاکٹر نے اتنی کنفرم ڈیٹ کیسے دے دی؟"

"بیٹا! وہ ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ نجومی بھی ہے۔" مشتاق نے بتایا۔ "دن میں نجومی کی پریکٹس کرتا ہے، شام کو میڈیکل کی۔"

"سمجھ گیا، تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی شادی کا بندوبست کر دوں؟" کمال نے پوچھا۔

"صرف بندوبست ہی نہ کرو بلکہ شادی کروا دو۔" مشتاق نے کہا۔

☆☆☆

پرویز اور کہکشاں ایک بار پھر اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ اس بار پرویز کہکشاں کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "دیکھو کہکشاں! یہ دنیا چار دنوں کی ہے۔ ہم کو ان چار دنوں میں زندگی کو انجوائے کر لینا ہے۔ ورنہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"پرویز! محاورہ اگرچہ غلط استعمال ہوا ہے لیکن تمہاری بات بالکل صحیح ہے۔ ہم نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ صرف سوچتے ہی رہے ہیں۔"

"اور مشتاق صاحب کے پاس کروڑوں روپے ہیں۔" پرویز نے کہا۔ "تم بتاؤ، کیا تمہارے ذہن میں کوئی ترکیب آئی؟"

"نہیں، فی الحال تو صرف ایک ہی ترکیب آرہی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"بینک ڈکیتی۔" کہکشاں نے بتایا۔

"کیا پاگل ہو گئی ہو۔ بینک ڈکیتی سے مشتاق صاحب کی دولت کا کیا تعلق؟ کوئی اور راستہ سوچو۔"

"دیکھو، اب تم ہی کوئی راستہ بتا سکتے ہو تو بتاؤ۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب تو ہے۔ اب پتا نہیں تم تیار ہو گی یا نہیں۔"

"تم بتاؤ تو سہی، ہو سکتا ہے کہ میں بھی وہی سوچ رہی ہوں۔"

"تم نے بتایا تھا نا کہ مشتاق صاحب کچھ دنوں کے مہمان رہ گئے ہیں؟" پرویز نے پوچھا۔

"ہاں، یہ بات تو کنفرم ہے۔"

"تو کیوں نہ تم......اب چھوڑو، رہنے دو۔"

"شرم آنی چاہیے تم کو۔" کہکشاں نے کہا۔ "تم یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہو کہ میں مشتاق صاحب سے شادی کر لوں؟ اگرچہ یہ بات خود میں نے بھی سوچی تھی لیکن تم تو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مرد ہو۔ تم کیوں سوچ رہے ہو؟ تمہارا یہ خیال ہے کہ مشتاق صاحب کچھ دنوں کے بعد انتقال کر جائیں گے اور میں آزاد ہو جاؤں گی۔ تم کو تو ایسا سوچتے ہوئے شرم سے ڈوب مرنا چاہیے، اگرچہ بالکل یہی پلاننگ میری بھی تھی لیکن میری بات اور ہے۔ میں ایک کمزور عورت ہوں، جو بھی چاہے سوچ سکتی ہوں لیکن تم کیوں سوچ رہے ہو؟''

''بے وقوف! میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔'' پرویز جھلا کر بولا۔ ''میرے ذہن میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا لیکن جب تم نے کہا ہے تو پھر میں بھی مجبوراً یہی سوچ رہا ہوں۔''

☆☆☆

''شیخو! میں ہانگ کانگ میں مکان لینا چاہتی ہوں۔'' فرزانہ نے کہا۔

''تم کو معلوم بھی ہے ہانگ کانگ کہاں ہے؟''

''معلوم تو نہیں ہے لیکن جب مکان لے لوں گی تو محلے والے خود ہی بتا دیں گے کہ اس شہر کا نام ہانگ کانگ ہے۔''

''بے وقوف! یہ ہانگ کانگ کا خیال کہاں سے آیا ہے تمہارے دل میں؟'' شیخو نے پوچھا۔

''ابا بتا رہے تھے کہ پہلوانوں کو ہانگ کانگ بہت راس آتا ہے۔'' فرزانہ نے کہا۔ ''وہ وہاں جا کر جوڈو کراٹے سیکھنا چاہتے ہیں۔''

''ابا سے کہو کہ اس عمر میں اب وہ موت کے فرشتوں سے نمٹنے کا طریقہ سیکھیں۔'' شیخو جل کر بولا۔ ''نہ جانے کچھ باپ اتنے اوندھے دماغ کے کیوں ہوتے ہیں اور اپنے ابا سے معلوم تو کرو کہ ہانگ کانگ میں مکان خریدنے کے پیسے کہاں سے لائیں گے۔''

''کہہ رہے تھے کہ مشتاق صاحب کی دولت کس کام آئے گی۔''

''واہ، کیا کہنے ہیں۔ مشتاق صاحب نے ساری دولت تمہارے ابا کے لیے اکٹھی کی ہے نا۔''

''ابا کہہ رہے تھے کہ مشتاق صاحب بیمار آدمی ہیں۔ میں ثواب کے لیے ان سے شادی کرلوں۔''

''کیا......؟ تمہارے ابا کہہ رہے تھے کہ تم مشتاق صاحب سے شادی کرلو؟ آخر کس مزاج کے ہیں تمہارے ابا؟''

''بہت ہی ہمدرد مزاج کے ہیں۔ وہ کسی کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتے۔'' فرزانہ نے بتایا۔ ''کہہ رہے تھے کہ مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش پوری ہو جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔''

''فرزانہ! تم ایک بے وقوف لڑکی ہو۔ تمہارا وہ نام نہاد پہلوان باپ مشتاق صاحب سے تمہاری شادی کرا کے ساری دولت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا ہے۔'' شیخو نے کہا۔ ''تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو۔ کیا دولت ملنے کے بعد تم مجھے چھوڑ دو گی؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' فرزانہ نے کہا۔ ''تم میری پہلی آخری اور درمیانی محبت ہو لیکن دوسری طرف آٹھ دس کروڑ روپے بھی تو ہیں۔''

''اس کے لیے صرف ایک ہی ترکیب ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم مشتاق صاحب سے شادی کرلو۔''

''یہ لو، تم تو یہی بات کررہے ہو۔''

''میں کچھ اور بھی تو کہہ رہا ہوں۔ تم شادی کرلو۔ مشتاق صاحب کچھ دنوں کے مہمان ہیں۔ اس کے بعد تم اگر مجھ سے محبت کرتی ہو تو اپنی دولت لے کر میرے پاس آ جانا۔ ورنہ رہنے دینا۔''

''ایسا مت کہو، میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتی۔ تم میرے خوابوں میں بھی آنے لگے ہو۔ حالانکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں نہ جانے کتنے لڑکوں کو خوابوں میں آنے سے منع کر چکی ہوں۔ وہ بے چارے دوبارہ نہیں آئے لیکن تمہاری بات اور ہے۔ تمہیں میں نہیں روک سکتی۔''

''ٹھیک ہے، تو پھر ان خوابوں ہی کی قسم، تم وہی کرو جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔''

☆☆☆

مشتاق کے لیے پرویز اور شیخو دونوں نے قربانیاں دی تھیں۔ پرویز نے کہکشاں کے رشتے کی بات کی تھی اور شیخو نے فرزانہ کے رشتے کی اور مشتاق نے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے دونوں کی بات مان لی تھی۔

اب مشتاق کی دو بیویاں ہیں۔ کہکشاں اور فرزانہ۔ شادی کو دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کی صحت دن بدن بہتر ہوتی جارہی ہے۔ دور دور تک اس کی موت کے آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ان تینوں کو اپنے گھر سے باہر نکال دیا ہے۔

اور اب شہر کے پھٹیچر سے ہوٹل میں بیٹھ کر کمال، پرویز اور شیخو مشتاق کے خلاف کوئی کیس بنانے کی سوچتے رہتے ہیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مقدمہ کیا جائے تو اس کی نوعیت کیا ہو......؟ کیونکہ کہکشاں اور فرزانہ دونوں ہی اس کے ساتھ خوش بلکہ بہت خوش ہیں۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اجنبی محسن

ملک صفدر حیات

اکثر خیال آتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ دلوں میں پسندیدگی کا جذبہ نہ ڈالتا تو شاید کسی کی زندگی میں کبھی اچانک انقلاب نہ آتا... مرتے ہوئے لوگ اچانک جی نہ اٹھتے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی لمحے کی گھٹن میں مبتلا تھی کہ کسی کی ایک نظر نے کمال کردیا... برسوں کی اجنبیت پل کے پل میں جب چاہت میں ڈھلی تو محبوب کی رفاقت کے حصول کے لیے اس اجنبی محسن نے سر دھڑ کی بازی لگادی... یہ اور بات کہ اس بازی میں اس نے کیا کھویا اور کیا پایا لیکن ایک نظر کی محبت پر اس نے اپنے نام کی مہر ثبت کردی... گائوں کے عیاش وڈیروں کے نرغے میں پھنسی ایک معصوم فطرت دوشیزہ کی بے بسی نے جب اثر دکھایا تو نہ چاہنے کے باوجود اس دلدل سے نکلنے کے لیے ان بے گناہوں سے وہ جرم سرزد ہوگیا جو وہ کرنا نہیں چاہتے تھے مگر اس کے سوا رستہ بھی تو کوئی نہ تھا۔

ملک صاحب کی ڈائری سے ظلم وستم اور عدل وانصاف پر مشتمل

ایک اور داستان

وہ موسم سرما کی ایک ٹھنڈی ٹھار رات تھی۔ پورا چاند آب وتاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا اور بادلوں کے ساتھ اس کی آنکھ مچولی بھی جاری تھی۔ جب بادل کا کوئی ٹکڑا چاند کے مکھڑے کو ڈھانپ لیتا تو فضا اس کی روشنی سے محروم ہوجاتی لیکن جلد ہی وہ پہلے سے بھی زیادہ شان وشوکت کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوکر ماحول میں اجالا بھر دیتا اور قرب وجوار کی ہر شے کو منور کردیتا۔ ایسی رگوں میں لہو کو منجمد کردینے والی یخ بستہ رات میں، میں حوالدار نبی بخش کے ساتھ نہر اَپر چناب کے کنارے پر موجود تھا۔

ان دنوں میں ضلع گوجرانوالہ کے تھانہ صدر میں تعینات تھا۔ میرا تھانہ جی ٹی روڈ پر شیخوپورہ موڑ کے نزدیک واقع تھا۔ مجھے میرے مخبر نے اطلاع دی تھی کہ آج نصف شب شوکا ڈنگر چور مویشیوں کی کثیر تعداد کے ساتھ میرے علاقے میں داخل ہونے والا ہے۔ میں نے مویشی چور شوکت عرف شوکا کا نام سن رکھا تھا تاہم ابھی تک میرا اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ آج کی رات مجھے شوکا سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملنے والا ہے۔ ان دنوں ضلع گوجرانوالہ میں مویشیوں کی منڈی لگی ہوئی تھی اور شوکا چوری کے جانوروں کو رات کی تاریکی میں مذکورہ منڈی تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی کوشش کو ناکام بنانا تھا۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر میں اور حوالدار نبی بخش وجود کو اکڑا دینے والی سردی کو برداشت کررہے تھے۔

نہر اَپر چناب، دریائے چناب سے نکلنے والی ایک بڑی نہر ہے اور یہ گوجرانوالہ کے مضافات میں زرعی اراضی کے اندر سے گزرتی ہے۔ نہر مذکور میں پانی کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی سمت ہے۔ ہم نے اسی نہر کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ میں پناہ لے رکھی تھی اور ہماری نظریں نہر کے اس حصے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے شوکا نے چوری کے جانوروں کو نہر پار کرانا تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا، ان دنوں موسم سرما جوبن پر تھا۔ دسمبر کا مہینا اپنا نصف سفر طے کرچکا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

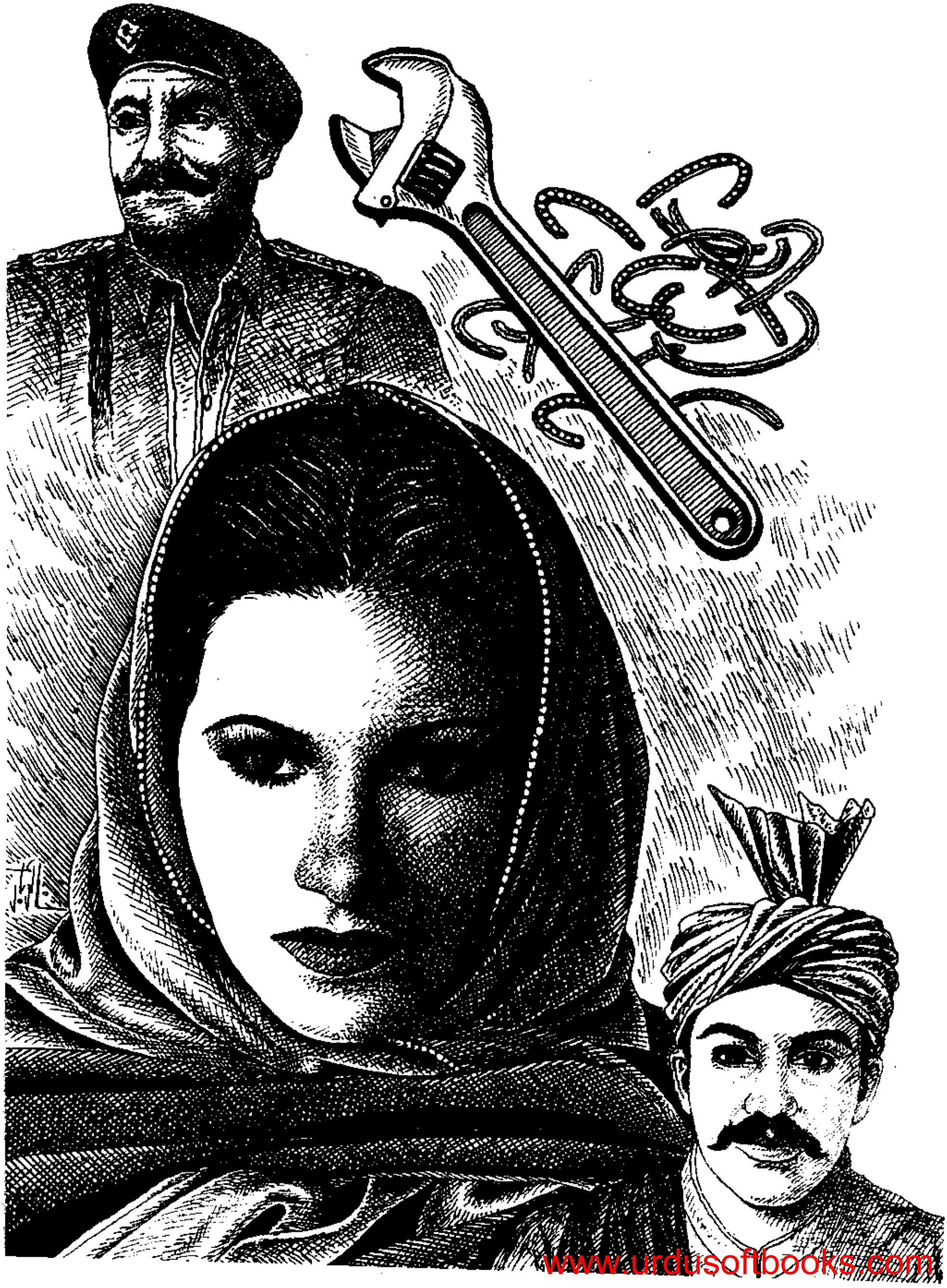

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا۔ نہر کے اندر پانی کی مقدار بہت کم تھی۔ مئی سے اگست تک اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ یہ نہر لبالب بھر کر چلتی دکھائی دیتی ہے اور پانی کی رفتار بھی آٹھ سے دس میل فی گھنٹا ہوتی ہے تاہم اس وقت نہر کے وسط میں پانی کا ایک چھوٹا سا نالا سست روی سے رواں دواں تھا۔ یہی سبب تھا کہ شوتکا نے یہاں سے نہر عبور کرنے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ بھری پری نہر میں ایسا سوچنا بھی حماقت ہوتی۔

''ملک صاحب! مجھے تو لگتا ہے، ریاست کی اطلاع درست نہیں۔'' حوالدار نبی بخش نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ایک دوسرے کے اوپر رگڑتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔

ریاست علی اس مخبر کا نام تھا جس نے مجھے شوتکا کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اپنی نگاہ کو نہر پر جمائے رکھا اور حوالدار سے پوچھا۔ ''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟''

''جناب! آدھی سے زیادہ رات گزر چکی۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''کیا ہم صبح تک اس منحوس شوتکا کے انتظار میں ادھر ہی بیٹھے سردی میں ٹھٹھرتے رہیں گے؟''

''آدھی رات کا گزر جانا یا شوتکا کا منحوس ہونا یا ہمارا سردی میں ٹھٹھرنا......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ریاست علی کی اطلاع درست نہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میرے خیال میں اب تک اسے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔'' میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''رات واقعی آدھی سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے ہیں اور آج کل تو سورج بھی لگ بھگ پانچ بجے غروب ہو جاتا ہے۔ اس حساب سے تو رات ہوئے سات گھنٹے گزر چکے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ شوتکا نے ہمارے نہیں، اپنے پروگرام کے مطابق آنا ہے لہٰذا ہمارے بیٹھے کا تقاضا تو یہی ہے کہ کم از کم اذانِ فجر تک شوتکا کی راہ دیکھی جائے......'' لحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آج تک ریاست نے مجھے کبھی غلط اطلاع نہیں دی۔ وہ میرے بھروسے کا بندہ ہے۔''

''میں ریاست کی قابلیت پر شک نہیں کر رہا ملک صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے، شوتکا نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا ہو......''

''ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

نبی بخش نے واضح طور پر اپنا بیان بدلا تھا۔ پہلے اس نے بڑے مضبوط انداز میں کہا تھا کہ ریاست کی اطلاع درست نہیں لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں ریاست پر اپنے اعتماد کا اظہار کر رہا ہوں تو اس نے بھی اپنے خیال کی پٹڑی بدل لی تھی۔ ہم اس وقت کھیتوں کے بیچ کھلے ماحول میں، جھاڑیوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے تھے اور موسم کی یخ بستگی نے حوالدار کی مت ماردی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ سردی کا تو کام ہی لگنا ہے۔ یہ سب کو لگتی ہے۔ بس، اپنی اپنی برداشت کی بات ہے۔

''وہ کیا ہے......؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''کہاں...... کدھر...... کیا......؟'' نبی بخش الرٹ لہجے میں بولا۔

میں نے نہر کی مشرقی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو۔ نہر کے اندر...... کچھ تیرتا ہوا ہماری طرف آرہا ہے۔''

چاندنی رات کی وجہ سے کافی دور تک دیکھنا آسان ہو گیا تھا۔ نہر کے پانی کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی سمت تھا اور وہ ''چیز'' ادھر مشرق کی جانب سے بہتی ہوئی ہماری طرف آرہی تھی۔

''مجھے تو یہ کپڑوں کی کوئی گٹھڑی لگ رہی ہے۔'' نبی بخش نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اگر یہ کپڑوں کی گٹھڑی نہیں تو پھر کوئی انسان ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لباس سمیت......''

''مگر آدھی رات کو کون تیراکی کرے گا ملک صاحب؟'' اس نے بے حد الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور وہ بھی اس قدر ٹھنڈی رات میں۔''

''نبی بخش! مجھے لگتا ہے، سردی نے تمہارے حواس کو جما دیا ہے۔'' میں نے لہر میں تیرتے ہوئے ٹارگٹ کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ تم ایسی احمقانہ بات کبھی نہ کرتے۔''

''میں نے کیا کیا ہے جی؟'' وہ حیرت بھرے انداز میں بولا۔

''تیراکی کرتے وقت انسان اپنے لباس میں نہیں ہوتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ اپنے کپڑوں کو بدن سے جدا کرکے تیراکی کا مخصوص جانگیا یا نیکر

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پہن لیتا ہے جبکہ ہماری آنکھیں اس کے برعکس نظارہ کر رہی ہیں۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر نظر آ رہا ہے۔"

میں نے آخری جملہ اتنے سنسنی خیز انداز میں ادا کیا تھا کہ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ "کیسا چکر ملک صاحب؟"

"یہ کسی انسان کی لاش بھی تو ہو سکتی ہے۔" میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

"اوہ......!" نبی بخش نے تشویش بھری سانس خارج کی۔

"تیاری پکڑ لو نبی بخش۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ جو کچھ بھی ہے، لگ بھگ دس منٹ میں ہمارے سامنے سے گزرے گا اور ہم نے اسے نہر سے باہر نکالنا ہے۔"

"اس کام کے لیے تو ہمیں نہر میں اترنا پڑے گا......" وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

"بالکل!" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اور اس مہم جوئی میں بڑی حد تک ہمارے لباس بھی بھیگ جائیں گے اور ہمیں سخت سردی بھی لگے گی لیکن کیا کریں...... یہ کارِ سرکار ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنے بوٹ اتار دیے اور پتلون کے پائنچوں کو اڑسنے میں مصروف ہو گیا۔ اپنے سینئر کو اس کام میں مصروف دیکھ کر نبی بخش کے پاس کوئی جائے فرار نہ رہی چنانچہ وہ بھی میرا ساتھ دینے کی تیاری کرنے لگا۔

جن دنوں اپر چناب نہر اپنے کناروں تک بھر کر بہہ رہی ہوتی ہے اس وقت اس کے قلب کی گہرائی کم و بیش بیس فٹ ہوتی ہے۔ یہ میں نے اوسط گہرائی بتائی ہے ورنہ بعض مقامات پر خصوصاً کسی پل کے بعد اس کے قلب میں پانی کی گہرائی پچیس سے تیس فٹ تک بھی چلی جاتی ہے لیکن ان دنوں پانی کا زور ٹوٹا ہوا تھا۔ نہر کے وسط میں پانی کا جو نالا سا بہہ رہا تھا، میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی گہرائی پانچ چھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ ہم آسانی سے اپنے ٹارگٹ کو کھینچ کر پانی سے باہر لا سکتے تھے۔

ہم نے جلد ہی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی اور یہ دیکھ کر میرے تمام اندازوں کی تصدیق ہو گئی کہ گٹھڑی کی صورت دکھائی دینے والی وہ "چیز" ایک انسان تھا۔ ایک مرد...... جو میرے فوری خیال کے تحت دارِ فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ میں نے نبی بخش کی مدد سے اس شخص کی لاش کو کھینچ کر اپنی کمین گاہ والی جھاڑیوں کے نزدیک ڈال دیا۔

"ملک صاحب! یہ بدنصیب کون ہو سکتا ہے؟" نبی بخش نے تشویش ناک انداز میں کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے، یہ مر چکا ہے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "اس کی شناخت کا معاملہ تو صبح ہونے کے بعد ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ جب تک میں اس کا تفصیلی معائنہ نہ کر لوں، حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہہ سکتا اور یہ کام دن کی روشنی ہی میں کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔" نبی بخش نے کپکپائی ہوئی آواز میں کہا۔

نصف سے زیادہ لباس بھیگ جانے کے سبب نبی بخش کی بقول کسے قلفی جم چکی تھی۔ ان لمحات میں وہ شدید سردی کی لپیٹ میں تھا۔ حالت میری بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی تاہم میں حالات اور موسم کی سختی کو جھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں زیادہ دیر تک اس کیفیت میں نہیں رہنا پڑا۔ جس مقصد کے حصول کی خاطر ہم نے جھاڑیوں کے اس جھنڈ میں پڑاؤ ڈالا ہوا تھا، اس مقصد کے پورا ہونے کے آثار نمودار ہو گئے۔ چاندنی رات نے مجھے اور نبی بخش کو بڑے واضح انداز میں دکھایا کہ لگ بھگ چار درجن مویشی نہر کے ایک کنارے سے اندر اتر رہے تھے......

میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کچھ ایسا ہی حال نبی بخش کا بھی تھا۔ شوکا ڈنگر چور مالِ مسروقہ سمیت ہماری نگاہ میں آ گیا تھا۔ ریاست کی اطلاع حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔ موسم کی شدت کا احساس ہم سے کوسوں دور جا چکا تھا۔ ایسے میں سردی لگنے کا کیا سوال۔

ہم پورے جوش و خروش کے ساتھ شوکا کو چھاپنے کے لیے آگے بڑھنے لگے جو ہم سے چند قدموں کی دوری پر چوری شدہ مویشیوں کے ساتھ نہر کے اندر اتر چکا تھا۔

☆☆☆

میں نے تجربہ کار نگاہ کا استعمال کر کے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس بدبخت کو پلک جھپکتے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ پہلوانی، کبڈی یا کسی اور شہ زوری کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا کیونکہ مقتول کی گردن کا منکا توڑ کر جس طرح اسے زندگی کی قید سے آزاد کیا گیا تھا اس نوعیت کا تکنیکی کام کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ کسی داؤ پیچ کے ماہر کاریگر کا کارنامہ تھا جس نے مقتول کی گردن کو طوفانی جھٹکا دے کر اس جہاں سے اس جہاں میں پہنچا دیا تھا۔ مجھے اس ماہرِ فن قاتل کا سراغ لگانا تھا اور اس

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے قبل مقتول کی شناخت ضروری تھی۔

قارئین! یہ کہانی شونکا ڈنگر چور کے ذکر سے شروع ہوئی تھی۔ بعدازاں ایک نامعلوم شخص کی لاش اس کہانی کے اندر داخل ہوگئی۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ فوری توجہ کے طالب معاملے کو پہلے بیان کیا جائے اور ظاہر ہے، کسی انسان کا قتل، کسی پیشہ ور چور کی گرفتاری سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے لہٰذا میں شونکا کے ذکر کو پھر کسی وقت کے لیے محفوظ رکھتے ہوئے نامعلوم مقتول کی طرف آتا ہوں۔ آگے بڑھنے سے پہلے آپ کی معلومات کے لیے اتنا بتادوں کہ اس ٹھنڈی ٹھار رات میں نے شونکا کو اس کے دو ساتھیوں الیاس اور افضل سمیت گرفتار کرلیا تھا۔ شونکا کے قبضے سے چوری شدہ بیالیس مویشی بھی میرے ہتھے چڑھے تھے جن میں تیس بھینسیں اور بارہ گائے شامل تھیں۔

مقتول کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ مضبوط جسم کا مالک ایک قبول صورت شخص تھا۔ اس نے بڑی رعب دار موٹی تازی مونچھیں پال رکھی تھیں۔ اس کے بدن پر گرم لباس تھا اور موسم کی مناسبت سے اس نے اونی سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ اس کی جامہ تلاشی سے مجھے کوئی ایسی شے نہیں ملی جس کا یہاں ذکر کیا جائے۔ میں نے اچھی طرح ٹٹول کر اس کے سارے وجود کا معائنہ بھی کرلیا تھا لیکن اس کے جسم پر کہیں بھی ایسا کوئی زخم دریافت نہیں ہوا جسے اس کی موت سے منسوب کیا جاتا جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ گردن کا منکا توڑ کر چشم زدن میں اس بدنصیب کو سپردِ موت کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس اجل رسیدہ کو نہر کی سست رفتار لہروں کے حوالے کردیا گیا تھا۔

اس نامعلوم مقتول کی لاش کی دریافت کا سہرا میرے اور حوالدار نبی بخش کے سر بندھتا تھا۔ گزشتہ شب جب ہم نے اس مردہ شخص کو نہر سے نکالا تو ہم دونوں کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا لیکن اب درجن بھر افراد وہاں موجود تھے اور یہ صبح کے لگ بھگ نو بجے کا وقت تھا۔ سورج طلوع ہوچکا تھا تاہم ابھی تک اس کی دھوپ میں تمازت اور تپش شامل نہیں ہوئی تھی، پھر بھی گزشتہ شب کی بہ نسبت اس وقت موسم خاصا خوشگوار تھا۔

میں نے موقع پر موجود مختلف لوگوں کو مردہ شخص کا چہرہ دکھا کر اس کی بابت دریافت کیا۔ ان میں زیادہ تر کھیت مزدور تھے جو حسبِ معمول نہر کی دونوں جانب واقع کھیتوں میں کام کرنے آئے تھے لیکن وہاں پولیس کی موجودگی نے انہیں خوف و ہراس میں مبتلا کردیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے فرداً فرداً اس مردہ شخص کو پہچاننے سے انکار کردیا۔ ایک عمر رسیدہ بڈھے بابے نے قدرے امید افزا بات کی۔

''تھانے دار صاحب! میں نے اس بندے کو چودھری کی حویلی میں دیکھا ہے۔'' وہ آنکھیں سکوڑ کر مردہ شخص کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ یاد نہیں آرہا کہ اس کا نام کیا ہے۔''

میں نے چونک کر اس بزرگ کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''چاچا! تمہیں اپنا نام تو یاد ہے نا؟''

''جی سرکار۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اللہ رکھا کہتے ہیں۔''

''چاچا اللہ رکھا! اللہ تمہاری حفاظت کرے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس بندے کا نام یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ بتادو کہ تم نے اسے کس چودھری کی حویلی میں دیکھا تھا؟''

''چودھری سکندر علی کی حویلی میں تھانے دار صاحب۔'' وہ بڑے وثوق کے ساتھ بولا۔ ''میں فرید پور کے چودھری صاحب کی بات کررہا ہوں۔''

میں چودھری سکندر کو جانتا تھا۔ دو تین مرتبہ اس سے میری ملاقات بھی ہوچکی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے چودھری سکندر کو فالج کا اٹیک ہوا تھا جس نے اس کے جسم کا زیریں حصہ بالکل ناکارہ کردیا تھا جس کے بعد وہ بستر کا ہوکر رہ گیا تھا۔ چودھری سکندر روایتی چودھریوں سے بہت مختلف تھا۔ اس کے اندر مجھے غرور، تکبر اور حد سے متجاوز خود پسندی بالکل نظر نہیں آتی تھی۔

''اس کے علاوہ تم اس بندے کے حوالے سے کچھ جانتے ہو تو مجھے بتاؤ۔'' میں نے اللہ رکھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا اس کا تعلق فرید پور ہی سے ہے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہوسکتا ہے، یہ ادھر ہی کا رہنے والا ہو یا کہیں اور سے آیا ہو......''

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد اللہ رکھا کو فارغ کردیا۔

آج صبح اس طرف آتے ہوئے میں اپنے ساتھ کانسٹیبل باسط اور سرکاری فوٹو گرافر آفتاب کو بھی لے آیا تھا۔ ہم تینوں گھوڑوں پر سوار ہوکر یہاں پہنچے تھے۔ اگر مقتول مکمل طور پر نامعلوم رہتا تو میں سرکاری فوٹو گرافر سے مختلف زاویوں کی تین چار تصویریں بنوانے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوادیتا لیکن اللہ رکھا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے مجھے ایک اور انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم تو ہر صورت میں ہونا ہی تھا لیکن اس سے پہلے چودھری سکندر علی کو مطلع کرنا میں ضروری سمجھتا تھا۔

میں نے کانسٹیبل باسط کو لاش کے پاس چھوڑا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر فرید پور کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے باسط کو ہدایت کر دی تھی کہ میری واپسی تک وہ لاش کو سرکاری اسپتال پہنچانے کے انتظامات مکمل کر لے۔

جس مقام پر ہم نے نہر سے وہ لاش نکالی تھی، وہاں سے فرید پور کم و بیش آٹھ میل کے فاصلے پر مشرق کی سمت نہر کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ان دونوں مقامات کے بیچ میں اور کوئی آبادی نہیں تھی۔ بابا اللہ رکھا کی بات میں مجھے اس لیے بھی وزن محسوس ہوا کہ نامعلوم مقتول کا تعلق فرید پور سے ہو سکتا تھا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ کسی نے اسے قتل کر کے اس کی لاش کو حوالۂ نہر کر دیا ہوگا۔

آج اگرچہ آسمان پر سورج موجود تھا لیکن اس کی دھوپ سردی کی ماری ہوئی تھی۔ اگر مجھے واپسی میں تین چار گھنٹے بھی لگ جاتے تو لاش کے لیے کسی قسم کی تشویش والی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے سوچا تو تین چار گھنٹے کا تھا لیکن تین چار منٹ کے بعد ہی صورتِ حال میں سنسنی خیز تبدیلی رونما ہو گئی۔ جائے وقوعہ سے فرید پور جانے کے لیے مجھے نہر کے کنارے اور کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے کچے راستے پر سفر کرنا تھا۔ ابھی میرے گھوڑے نے دو تین سو گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ دو گھڑسوار میرے قریب پہنچ کر رک گئے۔ وہ دونوں میری مخالف سمت یعنی فرید پور کی طرف سے آ رہے تھے۔ مجبوراً مجھے بھی اپنا گھوڑا روکنا پڑا۔ ان دونوں گھڑسواروں کے چہرے کے تاثرات نے مجھے بتا دیا کہ ان کے پاس خوشی کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔

''کیا بات ہے۔'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو اور یہ تمہارے چہروں پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ کیا راستے میں کسی چھل پیری کو دیکھ لیا ہے؟''

''ہم لوگ آپ کے پاس تھانے جا رہے تھے۔'' ان میں سے ایک نے بدحواسی کے عالم میں بتایا۔ ''اچھا ہوا آپ راستے ہی میں مل گئے۔ اب آپ ہمارے ساتھ چلیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''کہاں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟'' میں نے تیز نظر سے انہیں گھورا۔

''فرید پور......'' دوسرے نے جواب دیا۔

فرید پور کا نام سن کر میں چونک اٹھا کیونکہ میں تو خود فرید پور ہی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''فرید پور میں ایسا کیا ہو گیا ہے جو تم مجھے اپنے ساتھ وہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''چودھری صاحب کو کسی نے قتل کر دیا ہے تھانے دار صاحب۔'' ایک نے دکھی لہجے میں بتایا۔

دوسرا بولا۔ ''ہم اسی واقعے کی اطلاع دینے آپ کے پاس تھانے آ رہے تھے کہ آپ ہمیں راستے ہی میں مل گئے۔''

بعدازاں مجھے ان دونوں گھڑسواروں کے نام راشد اور منہاس معلوم ہوئے جن میں راشد پستہ قامت اور منہاس دراز قد تھا۔ ''چودھری صاحب کے قتل'' کے الفاظ نے میرے اندر کھلبلی مچا دی تھی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''تم چودھری سکندر کی بات کر رہے ہو؟''

''نہیں جناب! انہیں کوئی کیا قتل کرے گا۔'' راشد نے بتایا۔ ''وہ تو ہلنے جلنے کے بھی قابل نہیں ہیں۔''

''پھر؟'' میں نے باری باری سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''ہم چودھری رستم کی بات کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' منہاس وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ چودھری سکندر کے اکلوتے بیٹے ہیں...... میرا مطلب ہے، اکلوتے بیٹے تھے۔''

''چودھری رستم کو کس نے قتل کیا ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ ''اور یہ واقعہ کب پیش آیا؟''

ہمارے درمیان یہ تمام تر گفتگو گھوڑوں پر سوار رہ کر ہو رہی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں منہاس نے بتایا۔

''قاتل کے بارے میں تو فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ واقعہ پچھلی رات کا ہے۔ چھوٹے چودھری صاحب کی لاش ادھر ڈیرے پر پڑی ہے۔''

''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اسی لمحے بابا اللہ رکھا سے حاصل ہونے والی معلومات میرے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ فرید پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ بہ مشکل ستر سے اسّی گھر ہوں گے وہاں۔ لگ بھگ تین سو نفوس کی آبادی میں ہر شخص دوسرے کا صورت آشنا ہوتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، کیا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس واقعے کے بعد فرید پور سے کوئی بندہ غائب ہوا ہے؟“

”بالکل ہوا ہے تھانے دار صاحب۔“ راشد جلدی سے بولا۔

منہاس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔”لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ قادو گاؤں سے غائب ہے؟“

”تو اس کا نام قادو ہے؟“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اصل نام تو قادر ہے جناب لیکن سب اسے قادو کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔“ راشد نے بتایا۔”قادو کی ڈیوٹی ڈیرے پر ہوتی ہے لیکن وہ صبح ہی سے غائب ہے یا...... شاید رات سے۔“

”وہ ڈیوٹی پر اس لیے حاضر نہیں کہ اب وہ ڈیوٹی کرنے کے قابل نہیں رہا۔“ میں نے معنی خیز مگر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ڈیوٹی کرنے کے قابل نہیں رہا......؟“ راشد بھونچکا نظر سے مجھے تکنے لگا۔

منہاس نے کہا۔”آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھانے دار صاحب۔ ہمیں تو شک تھا کہ قادو چھوٹے چودھری صاحب کے قتل میں ملوث ہے اس لیے وہ ڈیرے سے کہیں فرار ہو گیا ہے۔“

”ہو سکتا ہے، قادو ہی نے چودھری رستم کو قتل کیا ہو۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔”لیکن پچھلی رات وہ خود بھی مقتول ہو چکا ہے، اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو...... اور میرے اس اندازے کی تصدیق یا تردید تم دونوں کرو گے۔“

بات کے اختتام پر میں نے باری باری راشد اور منہاس کی آنکھوں میں جھانکا تو راشد نے بے حد الجھے ہوئے انداز میں مجھ سے استفسار کیا۔

”ہم یہ کام کس طرح کر سکتے ہیں تھانے دار صاحب؟“

”اس طرح......“ میں نے اپنے گھوڑے کو واپسی کے لیے موڑتے ہوئے کہا۔”آؤ میرے ساتھ۔ پہلے میں تمہیں قادو سے ملوا دوں۔ اس کے بعد ہم فرید پور کا رخ کریں گے۔“

وہ دونوں ہکا بکا ہو کر میری تقلید میں اپنے گھوڑے دوڑانے لگے۔

چند منٹ کے بعد ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے یعنی اس مقام پر جہاں جھاڑیوں کے جھنڈ کے نزدیک نامعلوم شخص کی گردن ٹوٹی لاش رکھی ہوئی تھی۔ راشد اور منہاس کے وہاں پہنچتے ہی وہ مردہ شخص نامعلوم نہیں رہا تھا۔ ان دونوں نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی یعنی وہ چودھری کے نمک خوار قادر عرف قادو ہی کی لاش تھی۔

”اس کو کیا ہوا ہے تھانے دار صاحب......“ راشد نے سہمی ہوئی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔”اسے کس نے قتل کیا ہے؟“

”تم لوگوں کا خیال تھا کہ چھوٹے چودھری کے قتل میں قادو کا ہاتھ ہو گا۔“ میں نے کہا۔”لیکن یہ بے چارہ تو خود بھی قتل ہو چکا ہے۔ قادو کی گردن توڑ کر اسے سپرد موت کیا گیا ہے اور یہ واقعہ فرید پور کے قریب ہی کہیں پیش آیا ہے۔ اس کی لاش نہر کے پانی میں بہتی ہوئی گزشتہ رات ساڑھے بارہ بجے یہاں پہنچی تھی۔ اس مقام سے فرید پور کا فاصلہ لگ بھگ آٹھ میل ہے اور آج کل اپر چناب کم و بیش چار پانچ میل فی گھنٹا کی رفتار سے بہہ رہی ہے جو ایک شخص کے پیدل چلنے کی عمومی رفتار ہے۔ اس حساب سے میرے محتاط اندازے کے مطابق قادو کو پچھلی رات ساڑھے دس بجے کے قریب فنا کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔“

وہ بے حد الجھن زدہ انداز میں کبھی مجھے اور کبھی قادو کی لاش کو تکنے لگے۔ میں نے پہلی فرصت میں تھانے سے اے ایس آئی یعقوب کو وہاں بلا لیا۔ دوسری فرصت میں، میں نے قادو کی لاش کو ایک ریڑھے پر لدوا کر یعقوب کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوا دیا اور تیسری فرصت میں، میں کانسٹیبل باسط کو ساتھ لے کر راشد اور منہاس کے ہمراہ فرید پور کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

فرید پور کا شمار چھوٹے گاؤں میں ہوتا تھا۔ نہر کے کنارے پر واقع اس گاؤں کی آبادی تین سے چار سو افراد کے درمیان رہی ہو گی۔ فرید پور نامی اس مختصر سے گاؤں پر چودھری سکندر علی کا راج تھا جو پچھلے کچھ عرصے سے فالج کا شکار ہو کر بے بسی اور محتاجی کی زندگی گزار رہا تھا اور اسی لاچار چودھری کے اکلوتے بیٹے رستم علی کو گزشتہ رات کسی نے قتل کر دیا تھا۔

ہم دوپہر کے بعد فرید پور پہنچے تھے۔ میں نے راشد سے کہا۔”تم لوگوں نے بتایا ہے کہ چھوٹے چودھری کی لاش ڈیرے پر پڑی ہے؟“

”جی تھانے دار صاحب۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔”بڑے چودھری صاحب نے ہمیں حکم دیا تھا کہ جب تک پولیس اپنی کارروائی مکمل نہ کر لے، کوئی شخص

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ڈیرے کے اندر نہ جائے اسی لیے ہم نے ڈیرے کے بیرونی دروازے پر تالا ڈال دیا ہے۔''

''یہ تم لوگوں نے عقل مندی کا کام کیا ہے۔'' میں نے ستائشی نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تو چلیں، پہلے ڈیرے والی کارروائی مکمل کرلیتے ہیں۔ اس کے بعد چودھری سکندر سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔''

وہ دونوں میرے ساتھ چل پڑے۔

مذکورہ ڈیرا نہر کے کنارے کھیتوں کے بیچ بنا ہوا تھا۔ ڈیرے کے اندر اور باہر دیواروں کے ساتھ قدآور درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ ڈیرا اونچی چھتوں والے تین کمروں پر مشتمل تھا جو ایک ہی قطار میں احاطے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے تھے۔ اس کے آگے ڈیرے کا کشادہ صحن تھا۔ کراچی کے باسی اس صحن کی کشادگی کو سمجھنے کے لیے اس کو ہزار گز کا کوئی پلاٹ تصور کرلیں۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کو گھنے درختوں کے نیچے باندھ دیا اور ڈیرے کے اندر داخل ہوگئے۔ ڈیرے کی بیرونی دیوار کے ساتھ پیپل اور سفیدے کے قدآور درخت ایستادہ تھے۔ جس دوران میں ہم اپنے گھوڑوں کو ''پارک'' کررہے تھے، منہاس نے آگے بڑھ کر ڈیرے کا گیٹ نما چوبی دروازہ کھول دیا تھا۔

مجھے وہاں پر ڈیرے کے آس پاس کچھ لوگ بھی کھڑے دکھائی دیے جو یقیناً چھوٹے چودھری کی موت پر دکھی اور پریشان تھے۔

ڈیرے کے صحن میں ایک دیوار کے ساتھ چند مویشی بھی بندھے ہوئے تھے جو موجودہ حالات سے بے نیاز اپنی کھرلیوں میں چارے پر منہ مارنے میں مصروف تھے۔ انہیں اس بات کی مطلق فکر نہیں تھی کہ ان کے مالک کا اکلوتا بیٹا دارِ فانی سے کوچ کرگیا تھا۔

''چھوٹے چودھری کی لاش کس کمرے میں ہے؟'' میں نے راشد سے سوال کیا۔

اس نے درمیان والے کمرے کی جانب اشارہ کردیا۔

میں کانسٹیبل باسط کے ساتھ مذکورہ کمرے کے اندر داخل ہوگیا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کمرا کسی عالیشان بیڈروم کا منظر پیش کرتا تھا جس کی ایک دیوار کے ساتھ آرام دہ پلنگ بچھا ہوا تھا اور چودھری رستم کی لاش اسی پلنگ پر پڑی تھی۔

میں نے رستم کی لاش کا بغور جائزہ لیا تو اس کے سر کی چوٹ فوراً ہی میری نگاہ میں آگئی۔ چودھری کی کھوپڑی کا عقبی حصہ بری طرح چٹخا ہوا تھا اور وہاں سے نکلنے والے خون نے چودھری کے لباس کو بھی جگہ جگہ سے آلودہ کررکھا تھا حتیٰ کہ بستر کے بعض حصے بھی خون کے دھبوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ قاتل نے کسی آہنی شے کی مدد سے چودھری رستم کے عقب سے وار کرکے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ چوٹ اتنی کاری ثابت ہوئی کہ چودھری کی کھوپڑی کا حشر نشر ہوگیا تھا اور اسے زندگی سے موت کی طرف جانے میں چند سیکنڈ ہی لگے ہوں گے۔ قاتل کے حملے میں بہت زیادہ غم وغصے کی نشان دہی ہوتی تھی۔

لاش کے تفصیلی معائنے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اس سجے سجائے بیڈروم کا تنقیدی جائزہ لیا تو ایک میز پر مجھے شراب کی بوتل رکھی دکھائی دی۔ ساتھ ہی ایک گلاس بھی پڑا ہوا تھا جو ایک چوتھائی شراب سے بھرا ہوا تھا۔ بوتل بھی کھلی ہوئی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اپنی موت سے قبل وہ دخترِ انگور سے دل بہلا رہا تھا اور بے خبری میں کسی سفاک شخص نے اسے زندگی کی قید سے آزاد کردیا تھا۔

دخترِ انگور، دخترِ انسان کا تقاضا کرتی ہے۔ چھوٹا چودھری اس ڈیرے پر عبادت گزاری کی نیت سے نہیں آیا تھا۔ کمرے کی سجاوٹ اور جام و مینا سے پتا چلتا تھا کہ ڈیرے کا یہ کمرا چودھری رستم کا عشرت کدہ ہے جہاں پر وہ عیش وعیاشی کے لمحات گزارنے آیا کرتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے مذکورہ کمرے میں دخترِ انسان کے آثار بھی دریافت کرلیے۔

بیڈ کے نزدیک کمرے کے فرش پر مجھے چوڑیوں کے چند ٹکڑے پڑے دکھائی دیے۔ میں نے جھک کر بڑی احتیاط کے ساتھ کچے فرش پر سے سرخ اور سبز چوڑیوں کے ٹکڑے اٹھالیے۔ چوڑیاں خواتین کا ایک زیور ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ پچھلی رات اس کمرے میں چھوٹے چودھری کے ساتھ کوئی عورت بھی موجود تھی اور چوڑیوں کے ٹکڑے یہ کہانی سنا رہے تھے کہ چودھری نے اس عورت کے ساتھ زور زبردستی کی کوشش کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مذکورہ عورت اپنی مرضی سے وہاں نہیں آئی تھی بلکہ اسے زبردستی چودھری کی عیاشی کے سامان کے طور پر وہاں پہنچایا گیا تھا۔ ایک خیال برق رفتاری سے میرے ذہن میں چمکا...... کہیں اسی عورت نے تو چودھری رستم کو موت کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گھاٹ نہیں اتارا.....؟

یہ ممکنات میں تھا۔ ان لمحات میں میرے رگ و پے میں خون کی گردش میں خاصی تیزی آگئی تھی۔ راشد اور منہاس کمرے کے باہر موجود تھے۔ میں نے انہیں اندر بلالیا پھر باری باری دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''رات کو چودھری رستم کے ساتھ ڈیرے پر اور کون تھا؟''

''یہاں پر تو صرف قادو ہی ہوتا ہے۔'' منہاس نے جواب دیا۔ ''پچھلی رات بھی وہی تھا جناب۔''

میں نے اپنی ناک پر انگلی رکھ کر مخصوص انداز میں کہا۔ ''میں اس کی بات کررہا ہوں۔ کون تھی وہ؟''

''آپ کسی عورت کا پوچھ رہے ہیں.....'' راشد نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں!'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا پھر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے انہیں دکھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''یہ مجھے کمرے کے کچے فرش پر پڑے ملے ہیں، یقیناً پچھلی رات کوئی عورت یہاں موجود تھی اور چودھری نے شراب کے نشے میں اس کے ساتھ دست درازی بھی کی تھی۔ بتاؤ، کون تھی وہ؟''

''ہم کسی عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے سرکار۔'' راشد نے منت ریز انداز میں کہا۔ ''اگر کوئی عورت رات کو ڈیرے پر آئی تھی تو قادو کو اس کا پتا ہوگا۔''

''تم جس قادو کا نام لے رہے ہو وہ خود ہمیشہ کے لیے لاپتا ہوچکا ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب مجھے جو کچھ بھی بتانا ہے وہ آپ لوگوں ہی نے بتانا ہے۔ اگر تم لوگوں نے شرافت سے زبان نہیں کھولی تو تم دونوں طویل مدت کے لیے جاؤ گے سیدھے جیل میں۔''

''جناب! آپ ہماری بات کا یقین کریں۔'' منہاس گھگیایا۔ ''ہمیں واقعی اس معاملے کی کوئی خبر نہیں۔ قادو پر چھوٹے چودھری صاحب بہت اعتماد کرتے تھے۔ قادو ان کے ہر راز میں شریک تھا۔''

''مگر وہ شریکِ راز اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا لہٰذا قادو سے پوچھ گچھ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور چودھری رستم کا انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔ قادو کی لاش کو میں تم دونوں کے سامنے پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا چکا ہوں۔ تھوڑی دیر میں اسی مقصد کے لیے چودھری رستم کی لاش کو بھی روانہ کردوں گا.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لاشوں کی چیر پھاڑ سے سارے حقائق کھل کر سامنے آجائیں گے۔ جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا تو پھر مجھ سے کسی رورعایت کی توقع نہیں رکھنا اس لیے تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ اگر تم اس واقعے کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو مجھے سچ سچ بتادو۔''

میرے انداز میں واضح دھمکی موجود تھی۔ وہ دونوں منت سماجت کرنے لگے کہ ان کا اس اندوہناک واقعے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اور وہ پچھلی رات ڈیرے پر کسی عورت کی موجودگی سے بھی واقف نہیں ہیں۔ میں نے ان کا ابتدائی بیان نوٹ کرلیا۔ جس کے مطابق چھوٹا چودھری کبھی کبھار رات گزارنے ڈیرے پر آجایا کرتا تھا۔ اپنے ''آرام'' کی غرض سے رستم نے ڈیرے کے ایک کمرے کو شاہانہ انداز میں سیٹ کررکھا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ رستم شراب نوشی کرتا تھا اور وہ طبعاً عیاش بھی تھا لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ گزشتہ رات ڈیرے پر کون عورت موجود تھی۔

راشد اور منہاس نے مجھے بتایا کہ عموماً چھوٹا چودھری رات کے کسی پہر یا صبح ہونے سے پہلے کسی وقت واپس حویلی پہنچ جایا کرتا تھا۔ آج صبح جب رستم علی حویلی کے اندر دکھائی نہیں دیا تو اس کی تلاش شروع ہوئی۔ اس بات کی کوئی تک نہیں بنتی تھی کہ چھوٹے چودھری کو فرید پور کے گھروں کے اندر ڈھونڈا جاتا۔ وہ ایک ہی جگہ پایا جاسکتا تھا اور وہ مقام تھا ڈیرا۔ چودھری سکندر علی نے راشد کو ڈیرے کی جانب دوڑایا۔ راشد اور منہاس کا شمار چودھری سکندر کے قابلِ اعتماد خدمت گاروں میں ہوتا تھا۔ وہ حویلی کے اندر مفلوج چودھری کا بہت خیال رکھتے تھے۔ راشد جب ڈیرے پر پہنچا تو قادو اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ چودھری کی کھوج میں جب اس کے لیے مخصوص کمرے میں داخل ہوا تو ایک خونچکاں منظر نے اس کا استقبال کیا۔ وہ بھاگم بھاگ حویلی پہنچا اور چودھری سکندر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس اطلاع سے حویلی میں کہرام مچ گیا۔ چودھری سکندر نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے راشد اور منہاس کو میری جانب دوڑا دیا تھا۔

میں مفلوج چودھری کے متحرک بندوں کے انٹرویو میں مصروف تھا کہ کانسٹیبل باسط کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

وہ انکشاف انگیز انداز میں بتارہا تھا۔

''ملک صاحب! یہ دیکھیں...... مجھے کچھ ملا ہے۔''

میں فی الفور باسط کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ ہاتھ میں ایک آہنی رینچ تھامے کھڑا تھا۔ مذکورہ پانے کا سائز کافی بڑا تھا۔ ایسے رینچ پانے ٹریکٹرز اور بھاری مشینری کے نٹ بولٹ کھولنے اور کسنے کے کام آتے ہیں۔ سب سے اہم اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ متذکرہ رینچ پانے کے ہیڈ پر جمے ہوئے خون کے آثار پائے جاتے تھے۔ میں نے جب پانے کے سر کا بغور جائزہ لیا تو جمے ہوئے خون کے اندر مجھے چند انسانی بال بھی چپکے ہوئے نظر آئے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اسی پانے کی طوفانی ضرب نے چودھری رستم کی کھوپڑی کا ستیاناس ماردیا تھا۔ پانے کے سر پر لگا ہوا خون سرد موسم کی وجہ سے جم گیا تھا۔ لیبارٹری ٹیسٹ سے بخوبی یہ پتا چلایا جاسکتا تھا کہ رینچ کے ہیڈ پر جما ہوا خون اور اس خون کے اندر چپکے ہوئے بال چودھری رستم کے ہی تھے یا کسی اور کے تھے۔ اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور عدالت بھی اسے کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی ورنہ اس رینچ کے دستے پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات بہ آسانی قاتل تک راہنمائی کرسکتے تھے۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''یہ پلنگ کے سرہانے والی دیوار کے قریب پڑا ہوا تھا۔'' باسط نے بتایا اور بیان کردہ لوکیشن کی سمت اشارہ بھی کردیا۔ ''مجھے لگتا ہے، ہم نے آلۂ قتل بازیاب کرلیا ہے۔''

''سردست مجھے بھی یہی محسوس ہورہا ہے۔'' میں نے باسط کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''اغلب امکان اسی بات کا ہے کہ اس رینچ کی کاری ضرب نے چودھری رستم کی زندگی کا چراغ گل کیا ہے تاہم حتمی رائے قائم کرنے کے لیے لیبارٹری رپورٹ کا انتظار کرنا ہوگا۔ تم اس آہنی رینچ کو اپنے پاس محفوظ کرلو۔''

کانسٹیبل باسط نے میرے حکم پر اپنے ساتھ لائے ہوئے ریگزین کے تھیلے میں مذکورہ رینچ کو بہ حفاظت رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے راشد اور منہاس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جلد از جلد چودھری رستم کی لاش کو اسپتال بھجوانے کے لیے کسی سواری کا بندوبست کرو۔ جب تک میں دیگر کام نمٹاتا ہوں۔''

''گاؤں سے اس وقت بشیر کوچوان کا تانگا بہ آسانی مل سکتا ہے۔'' راشد نے بتایا۔ ''بشیر کوچوان کو رات سے تیز بخار ہے۔ آج اس نے تانگا نکالا ہی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تانگا، ریڑھا، بیل گاڑی...... جو بھی میسر ہو، فوراً یہاں لے آؤ تاکہ لاش کو اسپتال روانہ کیا جاسکے۔''

وہ دونوں میرے حکم کی تعمیل کرنے ڈیرے سے رخصت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور باسط تفصیلی خانہ تلاشی میں مصروف ہوگئے۔

اس ڈیرے میں کل تین کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ درمیان والے کمرے کا میں اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں ایک شاندار بیڈ پر چودھری رستم کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اسی کمرے میں سے باسط نے آلۂ قتل بھی برآمد کرلیا تھا۔ اس کمرے میں مزید کسی ریسرچ کی ضرورت نہیں تھی۔

چودھری رستم مقتول کے بیڈروم کی ایک بغل میں قادو مقتول کا کمرا تھا اور دوسری بغل میں اسٹور روم یعنی تیسرا کمرا اسٹور روم کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ مذکورہ کمرے میں مویشیوں کے چارے کے علاوہ چند زرعی آلات بھی رکھے دکھائی دیے۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ قاتل نے وہ آہنی رینچ یہیں سے اٹھایا ہوگا کیونکہ اسی نوعیت کے مختلف اوزار کمرے کے ایک کونے میں فرش پر پڑے نظر آرہے تھے۔

قادر عرف قادو کے زیر استعمال کمرے میں سے مجھے کوئی قابلِ ذکر چیز ہاتھ نہیں لگی جس کی مدد سے میں قاتل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرسکتا۔ قانون کی نظر میں اس ڈیرے پر سے مجھے کام کی صرف تین چیزیں ہی ملی تھیں جن کی مدد سے میں تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھا سکتا تھا اور وہ تین چیزیں یہ تھیں۔ نمبر ایک، خون آلود سر والا آہنی رینچ، نمبر دو ٹوٹی ہوئی سرخ اور سبز چوڑیوں کے ٹکڑے، نمبر تین، چودھری سکندر علی کے اکلوتے سپوت چودھری رستم کی لاش۔

تھوڑی ہی دیر میں راشد اور منہاس بشیر کوچوان کا تانگا لے کر ڈیرے پر پہنچ گئے۔ اس وقت منہاس تانگے کو ''ڈرائیو'' کررہا تھا۔ میں نے یہ اعزاز اسی کے پاس رہنے دیا اور چودھری رستم کی لاش کو تانگے پر رکھوا کر میں نے کانسٹیبل باسط کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوادیا اور خود میں راشد کے ہمراہ چودھری سکندر کے پاس پہنچ گیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

چودھری سکندر علی ایک عمر رسیدہ، بے بس اور لاچار شخص تھا۔ فالج کے اٹیک نے پچھلے کچھ عرصے سے چودھری کو بستر تک محدود کرکے دوسرے انسانوں کا محتاج بنا دیا تھا۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ بے جان اور ناکارہ ہو چکا تھا۔ راشد مجھے چودھری سکندر کے پاس پہنچا کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

اس وقت چودھری کمرے میں اکیلا ہی تھا اور اس کی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ فالج نے پہلے ہی اسے کافی مجبور کر رکھا تھا۔ اس پر اکلوتے بیٹے کی موت نے اسے اندر باہر سے توڑ ڈالا تھا۔ وہ بیڈ پر ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھا خاموش آنسو بہا رہا تھا۔ میں اسے سلام کرکے پلنگ کے نزدیک رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''چودھری صاحب! مجھے آپ کے جوان بیٹے کی موت کا بڑا دکھ ہے۔''

''آپ کے دکھی ہونے سے رستم واپس تو نہیں آجائے گا ملک صاحب!'' وہ پُرنم آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چودھری صاحب! یہ ایک سفاک حقیقت ہے کہ آپ کا بیٹا جہاں چلا گیا ہے وہاں سے تو کوئی بھی اسے واپس نہیں لاسکتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم سب کو اس سچائی کو تسلیم کرنا پڑے گا لیکن آپ سے میرا وعدہ ہے کہ میں بہت جلد رستم کے قاتل کو گرفتار کرکے اسے عبرت ناک سزا دلواؤں گا۔ اس مقصد کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔''

''میرا سب کچھ ختم ہوگیا ملک صاحب۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''میری نسل آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ میں بے اولاد، بے نام ونشان اس دنیا سے جاؤں گا......''

میں چودھری کی دلی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اپنے کام کی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی ضروری تھی۔ وہ جذباتی صدمے سے کسی حد تک باہر نکلتا تو تب ہی اس کے ساتھ سودمند گفتگو کی جاسکتی تھی۔

''آپ بے اولاد نہیں ہیں چودھری صاحب!'' میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''ماشاء اللہ! آپ کی تین اولادیں اور بھی ہیں۔ وہ سب اور ان کی اولادیں آپ کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔''

''ملک صاحب! نسل ہمیشہ بیٹے سے چلتی ہے اور رستم میری اکلوتی اولادِ نرینہ تھا۔'' وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''رستم پچیس سال کا ہو چکا تھا۔ میں کافی عرصے سے اس کی شادی کرنے کا سوچ رہا تھا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی مسئلہ آڑے آجاتا تھا۔ شاید میرے نصیب ہی میں نہیں تھا کہ میری نسل آگے بڑھے۔ باقی جہاں تک میری دیگر اولادوں کی بات ہے تو......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''وہ تینوں میری بیٹیاں ہیں اور تینوں ہی شادی شدہ ہیں۔ ان سے پیدا ہونے والی اولادیں میری نسل میں شمار نہیں ہوں گی۔ سلمٰی، خالدہ اور رفعت اپنے شوہروں کی نسل کو آگے بڑھائیں گی۔ رفعت، رستم سے پانچ سال چھوٹی ہے۔ مناسب وقت پر میں نے اس کی بھی شادی کردی۔ بس، رستم ہی کا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ آہ...... انسان اپنے نصیب سے نہیں لڑسکتا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں چودھری صاحب۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''واقعی، انسان اپنے نصیب اور نصیب بنانے والے سے کبھی نہیں جیت سکتا۔ اس کے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''رخسانہ کی موت کے وقت میں کاتبِ تقدیر سے بہت لڑا تھا۔'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ ''لیکن میری کوئی پیش نہیں چلی۔ وہ جیت گیا، میں ہار گیا، میری شریکِ حیات رخسانہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ رخسانہ کی موت نے مجھے توڑ ڈالا تھا اور...... رستم کی موت نے مجھے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔''

میں چند لمحات تک چودھری سکندر کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ میری مخلصانہ اور ہمدردی بھری باتوں نے اس کے صدمے کو خاصی حد تک کم کردیا۔ میں نے محسوس کیا چودھری کی ذہنی حالت اس حد تک ہموار اور سازگار ہوچکی ہے کہ اب اس کے ساتھ نہایت ہی اہم اور سنجیدہ گفتگو کی جاسکتی ہے۔

میں نے جائے وقوعہ پر جو کچھ دیکھا تھا اس کا خلاصہ چودھری سکندر کے گوش گزار کرنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ کو کس پر شک ہے؟''

''آج صبح جب مجھے اس اندوہناک واقعے کی اطلاع ملی تو اس وقت میرا شک قادو کی طرف گیا تھا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ قادو منظر سے غائب ہے۔'' چودھری

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نقاہت بھرے انداز میں بولا۔ ''لیکن تھوڑی دیر پہلے راشد اور منہاس کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کو قادو کی لاش مل گئی ہے جو فرید پور سے نہر کے پانی میں بہتے ہوئے آپ کے علاقے میں چلی گئی تھی۔''

میں سمجھ گیا کہ میں نے جب راشد اور منہاس کو سواری کا بندوبست کرنے بھیجا تھا تو انہوں نے چودھری سکندر کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے چودھری کے ہاتھ کو بہ آہستگی بستر پر رکھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تو اس کا مطلب ہے، اب آپ کو قادو پر شک نہیں رہا؟''

''میرا شک پوری طرح رفع نہیں ہوا۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ اس شک کے ساتھ یہ سوال بھی نتھی ہو گیا ہے کہ قادو کو قتل کر کے کس نے نہر میں پھینکا؟''

''چودھری صاحب! آپ کے اس سوال اور اس سے جڑے دیگر درجنوں سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے مجھے آپ کی مدد درکار ہوگی۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''آپ حکم کریں۔'' وہ پُرعزم انداز میں بولا۔ ''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔''

''قادو اور رستم کی موت دو مختلف انداز میں واقع ہوئی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''قادو کی گردن کا منکا توڑ کر اسے سپرد اجل کیا گیا ہے جبکہ رستم کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر آہنی وزنی رینچ کا خطرناک وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پہلے قادو نے رینچ کی مدد سے رستم کی جان لی اور جب وہ جائے وقوعہ سے فرار ہو رہا تھا تو کسی نے اس کی گردن کا منکا توڑ کر، اس کی لاش کو نہر میں پھینک دیا۔''

''کس نے......؟'' چودھری سکندر نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''چودھری صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو فرید پور کی آبادی تین سو افراد سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''فرید پور ایک چھوٹا گاؤں ہے۔ اس کی آبادی کم و بیش اتنی ہی ہوگی۔''

''کیا آپ ملازموں سے کہہ کر فرید پور کے تمام افراد کو حویلی میں بلا سکتے ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''صرف مرد و زن کو، بچوں کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔''

''بالکل لا سکتا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''اگر بچوں کو نکال دیا جائے تو یہ تعداد ویسے ہی گھٹ کر دو، سوا دو سو رہ جائے گی لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر آپ کرنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''آپ پہلے فرید پور کے تمام جوان مرد اور عورتوں کو حویلی میں بلانے کے لیے احکامات صادر کریں پھر میں اپنا مقصد بھی آپ پر واضح کر دوں گا۔'' میں نے پُرمعنی انداز میں کہا۔ ''آپ یوں سمجھیں کہ میں یہ سارا کشٹ قاتل کی تلاش کے سلسلے میں اٹھا رہا ہوں۔''

''تو آپ کے خیال میں رستم اور قادو کا قاتل فرید پور میں چھپا بیٹھا ہے؟'' چودھری نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

''اس بات کو خارج از امکان نہیں سمجھا جا سکتا۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''مجھے ایک مرد اور ایک عورت کی تلاش ہے۔ اگر میرے مطلوبہ یہ دونوں افراد مجھے مل جائیں تو میں پچھلی رات پیش آنے والے دہرے قتل کے سنگین واقعے کی تہ تک پہنچ سکتا ہوں۔''

''ہوں......'' چودھری نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تو یہ بات ہے......'' پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کو کس قسم کے ایک مرد اور ایک عورت کی تلاش ہے؟''

''ایسا مرد جو شہ زور ہو۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلوانی اور کبڈی کا ماہر...... شہ زوری کے تمام داؤ پیچ میں طاق یعنی چاق و چوبند......''

''فرید پور میں تو ایسا ایک ہی بندہ ہے ملک صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس کا نام صدیق ہے لیکن وہ ''کالا بھولا'' کے نام سے مشہور ہے۔ کچھ لوگ اسے ''کالا پہلوان'' بھی کہتے ہیں۔''

''اوہ...... تو یہ بھولا پہلوانی کرتا ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''جی!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بھولا ہمارے گاؤں کی آبرو ہے ملک صاحب۔ آلے دوالے کے کسی گاؤں دیہات میں اس جیسا پھرتیلا اور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کوئی پہلوان نہیں ہے۔"

"بس تو پھر آپ مردوں میں صرف اسی پھرتیلے پہلوان کالا بھولا کو یہاں بلالیں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں بھولا سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ قادو کی گردن کا منکا توڑنے میں اسے... کتنا وقت لگا ہوگا......"

میرے آخری جملے نے چودھری سکندر علی کے چہرے پر سنسنی سی دوڑا دی۔ اس نے بے حد حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ قادو کی گردن کا منکا بھولا نے توڑ کر اسے ہلاک کیا ہے؟"

"میں بھولا کے تفصیلی انٹرویو کے بعد ہی کسی حتمی نتیجے پر پہنچ پاؤں گا۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ "لیکن ایسا سوچنے میں فی الحال کوئی حرج بھی نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ......" میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ڈرامائی انداز میں چودھری سکندر کی طرف دیکھا اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"...کہ رستم کو بھی بھولا پہلوان ہی نے قتل کیا ہو۔"

"آپ ایک ناممکن بات کر رہے ہیں ملک صاحب۔" وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بھولا ایسی سنگین غلطی کبھی نہیں کرسکتا۔ وہ ایک نامور پہلوان ضرور ہے مگر اس کے اندر اتنی جرأت نہیں کہ وہ میرے بیٹے کی زندگی سے کھیلنے کے بارے میں کبھی خواب میں بھی سوچ سکے۔"

"میں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ بھولا پہلوان نے قادو یا رستم کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے ایک امکان کی جانب اشارہ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں آپ کے حکم کے مطابق بھولا کو حویلی بلاتا ہوں۔" وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ "اس سے پوچھ تاچھ کر کے آپ اپنی تسلی کرلیں۔"

"اور گاؤں کی تمام عورتوں کو بھی یہاں بلانا ہے چودھری صاحب!" میں نے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔

اس نے راشد کو اپنے پاس بلا کر میرے حسبِ منشا ہدایات جاری کردیں پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی ملک صاحب؟"

"کون سی بات؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"یہ آپ فرید پور کی عورتوں کو کس سلسلے میں لائن حاضر کر رہے ہیں؟"

"شناخت پریڈ کا سلسلہ ہے چودھری صاحب!" میں نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

اس کی الجھن میں حیرت بھی شامل ہوگئی۔ "کس نوعیت کی شناخت پریڈ؟"

"مجھے ایک ایسی عورت کی تلاش ہے جو گزشتہ رات آپ کے بیٹے رستم علی کے ساتھ ڈیرے پر موجود تھی۔" میں نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب......؟" وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے چودھری سکندر کو بتایا کہ ادھر ڈیرے پر رستم والے کمرے میں، میں نے کیا کیا دیکھا ہے۔ یہ سب تھوڑی دیر پہلے بھی میں اس کے گوش گزار کر چکا تھا تاہم اس وقت چودھری، رستم کی موت کے صدمے میں اس قدر غرق تھا کہ اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب کی بار اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

"رستم کی مے نوشی تو میرے علم میں ہے لیکن اس عورتوں والے چکر کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا کبھی قادو نے بھی آپ کو اس حوالے سے کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں!" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

"اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ گزشتہ رات ڈیرے پر رستم علی کے ساتھ ایک عورت بھی موجود تھی۔" میں نے اپنے تجربے کو چودھری سکندر کے علم میں لاتے ہوئے کہا۔ "رستم شراب کے نشے میں چُور تھا۔ لیبارٹری ٹیسٹ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میری بات کی تصدیق کردے گی۔ نشے کی حالت میں رستم نے اس عورت کے ساتھ دست درازی کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے عورت کی کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ میرے خیال میں چار پانچ چوڑیاں تو لازمی ٹوٹی ہوں گی......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ہری اور لال چوڑیوں کے درجن بھر ٹکڑے چودھری کو دکھاتے ہوئے ان الفاظ میں اپنی بات پوری کردی۔

"ڈیرے پر رستم کے کمرے کے فرش سے میں نے چوڑیوں کے ان ٹکڑوں کو اٹھایا ہے۔ اب تو ساری کہانی آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی؟"

"آپ کی بات تو میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ملک

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

صاحب۔" وہ پُرخیال انداز میں بولا۔" لیکن یقین نہیں آرہا کہ ایسا کچھ ہوا ہوگا۔"

"جب ٹھوس اور جیتا جاگتا ثبوت آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائے گا تو پھر آپ کو یقین بھی آجائے گا۔" میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔" میں نے فرید پور کی عورتوں کی شناخت پریڈ اسی مقصد سے رکھی ہے۔ اگر اس گاؤں کی کوئی عورت پچھلی رات رستم کے کمرے میں موجود تھی تو اس کی کلائیوں پر تازہ زخموں کے نشانات لازمی ہوں گے۔ یہ ممکن نہیں کہ اتنی چوڑیاں ٹوٹ جائیں اور کلائیوں پر خراش تک نہ آئے۔ آپ یقیناً میری بات کی تہ تک پہنچ گئے ہوں گے چودھری صاحب!"

اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں نے کہا۔" شناخت پریڈ میں جس بھی عورت کی کلائی یا کلائیاں زخمی پائی جائیں گی، میں صرف اسی سے تفتیش کروں گا اور مجھے یقین ہے، وہ گھائل عورت اور بھولا پہلوان اس دہرے قتل کے معمے کو حل کرنے میں بہت معاون اور مفید ثابت ہوں گے۔"

اگلے ایک گھنٹے میں میرے مطالبے کو ادھورے انداز میں پورا کر دیا گیا۔ وہ اس طرح کہ بھولا پہلوان حویلی میں حاضر نہیں ہوسکا تھا۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ آج صبح ایمن آباد چلا گیا تھا۔ ایمن آباد میں بھولا کی چاچی رہتی تھی۔ اس کی واپسی آئندہ روز متوقع تھی۔

میں نے حویلی میں بلائی جانے والی تمام عورتوں کی کلائیوں کو اچھی طرح چیک کیا تو پتا چلا کہ کسی ایک عورت کی کلائی پر بھی چوٹ یا زخم کا کوئی تازہ نشان موجود نہیں تھا۔ اس بات نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں نے تھوڑا وقت مزید صرف کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ گاؤں کی کوئی عورت چیکنگ سے رہ تو نہیں گئی۔

مجھے بتایا گیا کہ سوائے ایک عورت کے میں نے فرید پور کی وسنیک تمام عورتوں کی کلائیاں چیک کر لی ہیں۔ چیکنگ والا یہ پروسس حویلی کے کشادہ صحن میں جاری تھا۔ چودھری سکندر اس عمل میں شامل نہیں تھا۔ وہ حویلی کے اندر اپنے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے" ایک عورت" کی خبر دینے والے سے استفسار کیا۔

" کون عورت چیکنگ کے مرحلے سے گزرنے سے رہ گئی ہے؟"

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جاذب نظر آئیں

بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹائیٹنگ کریم (ہربل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔

گزشتہ 30 سال سے آزمودہ

گلیسی یونانی کریم
چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

اپنی PIC روانہ کریں
watsap: 0311-5800057
Email: bdhdeva@yahoo.com
skype: devapak
0322-2916250 کراچی ہوم ڈلیوری
0300-2500026 پنڈی ڈلیوری

بادشاہ ورائٹی یو بٹر بازار راولپنڈی 051-5502903-553352 اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹریچر مفت منگوائیں

042-7666264 فون 021-32720328

پورے پاکستان میں گھر پر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کمی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ ڈولپر آلہ کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔
Cell: 0333-5203553, Website: www.devaherbal.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"اس کا نام نوری ہے۔" مجھے بتایا گیا۔

میں نے پوچھا۔ "نوری یہاں کیوں نہیں آئی۔کیا وہ فرید پور میں موجود نہیں؟"

"نوری ماسی ادھر ہی ہے تھانے دار صاحب۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔وہ اپنے گھر میں ہے۔"

"نوری ماسی" کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔میں نے پوچھا۔ "نوری کی عمر کیا ہوگی؟"

"ماسی" کا لفظ کراچی میں گھریلو ملازمہ یا نوکرانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر گاؤں دیہات خصوصاً پنجاب کے گاؤں اور شہروں میں ماسی کا مطلب ہے خالہ۔اگر کوئی عورت رشتے میں کسی کی خالہ نہ بھی ہو تو عموماً ادھیڑ عمر یا ضعیف عورتوں کو خالہ اور چاچی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔میں نے اسی نسبت سے نوری ماسی کی عمر کے بارے میں سوال کیا تھا۔

"نوری ماسی کی عمر پچاس کے اریب قریب ہے تھانے دار صاحب۔" راشد نے مجھے بتایا۔ "بس دونوں میاں بیوی ہی ہیں گھر میں۔نوری کا گھر والا دین محمد عرف بابا دینا ایک اندھا انسان ہے۔نوری ماسی ایک ہوشیار عورت ہے لیکن اس وقت طبیعت کی خرابی نے اسے چارپائی سے لگایا ہوا ہے،اسی سبب وہ یہاں نہیں آسکی۔"

نوری کی عمر کا سن کر میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔نوری میری مطلوبہ عورت نہیں ہوسکتی تھی۔رستم خود سے دگنی عمر کی عورت کے ساتھ رات گزارنے کا پروگرام نہیں بناسکتا تھا تاہم میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں۔میں خود نوری کے گھر جا کر اس کی طبیعت کی خبر لوں گا اور ساتھ ہی اس کی کلائیاں بھی چیک کرلوں گا۔تم نوری کے گھر تک میری راہنمائی کرو گے۔"

"ٹھیک ہے تھانے دار صاحب۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "جو آپ کا حکم۔میں حاضر ہوں۔"

"میں ذرا چودھری صاحب سے ایک ضروری بات کرلوں۔" میں نے کہا۔ "پھر چلتے ہیں نوری کی طرف۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں حویلی کے اندرونی حصے میں چودھری سکندر علی کے پاس پہنچ گیا۔ایک مرتبہ پھر بیٹے کی موت کے صدمے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ان لمحات میں وہ صدیوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔اس نے امید بھری نگاہ سے مجھے دیکھا اور غم زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"کچھ پتا چلا ملک صاحب......!"

"بہت جلد سب پتا چل جائے گا۔" میں نے گول مول جواب دیا پھر کہا۔ "آپ کے گاؤں کی عزت وآبرو بھولا پہلوان جیسے ہی ایمن آباد سے واپس آئے،آپ اسے میرے پاس تھانے بھیجیں گے۔مجھے یقین ہے،بھولا سے پوچھ تاچھ کافی سودمند ثابت ہوگی۔"

"فرید پور کی عورتوں کی کلائیاں چیک کرنے سے آپ کو کام کی کوئی بات پتا چلی؟" چودھری نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ایک عورت کے سوا میں نے گاؤں کی تمام عورتوں کی کلائیاں اچھی طرح چیک کرلی ہیں۔" میں نے بتایا۔ "اور ان میں سے کسی ایک کی بھی کلائی پر تازہ زخم کے نشان حتیٰ کہ ایک خراش تک موجود نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پچھلی رات رستم کے ساتھ ڈیرے پر گاؤں کی کوئی عورت موجود نہیں تھی۔" اس نے تصدیق طلب انداز میں کہا۔

"فی الحال تو یہی کہا جاسکتا ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن یہ بات طے ہے کہ وقوعہ کی رات رستم کے کمرے میں کوئی عورت موجود تھی اور رستم نے اس کے ساتھ زور زبردستی کرنے کی بھی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں مذکورہ عورت کی چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔"

"لیکن آپ نے تو فرید پور کی ساری عورتوں کی کلائیوں کا معائنہ کرلیا ہے۔" چودھری سکندر نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "کہیں آپ ایسا تو نہیں سمجھ رہے کہ وہ عورت کہیں اور سے لائی گئی تھی؟"

"کیا ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے؟" الٹا میں نے چودھری سے سوال کرڈالا۔

"نہیں،ایسا ہوسکتا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی مطلوبہ عورت گئی کہاں؟"

"میں اس سوال کا جواب بہت جلد تلاش کرلوں گا۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "ایک بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ پچھلی رات ڈیرے پر رستم کے کمرے میں کوئی عورت موجود تھی اور مجھے اس بات کا بھی پکا یقین ہے کہ وہ عورت راضی خوشی اپنی مرضی سے وہاں نہیں گئی تھی۔اگر اس شب بسری میں اس عورت کا ارادہ شامل ہوتا تو وہ رستم کی کسی بھی خرمستی کی مزاحمت نہ کرتی۔رستم شراب کے نشے میں اس کے ساتھ جیسے بھی پیش آتا،وہ اسے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

برداشت کرتی لہٰذا اس کی چوڑیاں ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......"

"آپ کا تجزیہ میری سمجھ میں آرہا ہے ملک صاحب۔" وہ فکرمندی سے بولا۔ "آپ کی باتیں سن کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا ہوں کہ کہیں اسی عورت نے تو رستم کی جان نہیں لی......؟"

"ایسا ہو سکتا ہے چودھری صاحب۔" میں نے اس کی سوچ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے تو میں ایک مرد اور ایک عورت کی تلاش میں ہوں تاکہ رستم اور قادو کی پراسرار موت کا معما حل کیا جاسکے۔ عورت نے کسی کو قتل کیا یا نہیں لیکن وہ پچھلی رات رستم کے کمرے میں موجود ضرور تھی اور قادو کی گردن کا منکا جس مہارت کے ساتھ توڑ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، وہ کسی شہ زور مرد کا کام ہے۔"

"اگر قادو نہ مارا جاتا تو اس عورت کے بارے میں ساری معلومات فراہم کر سکتا تھا۔" چودھری سکندر نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "وہ رستم کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ رستم قادو پر بڑا بھروسا کرتا تھا۔"

"آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں بہت جلد آپ کو کوئی خوش خبری سناؤں گا۔"

"میرے لیے سب سے بڑی سکون کی خبر... تو یہ ہوگی کہ رستم کا قاتل گرفتار ہو جائے اور اسے آپ عبرت ناک سزا دلوائیں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب مجھے اجازت دیں۔ میں بہت جلد دوبارہ حاضر ہوں گا۔"

"میں کتنا لاچار اور بدنصیب ہوں کہ آپ کو رخصت کرنے کے لیے حویلی کے گیٹ تک بھی نہیں جا سکتا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"کوئی بات نہیں چودھری صاحب۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "میری دعا ہے کہ اللہ پاک جلد از جلد آپ کو صحت یاب کردے تاکہ آپ حویلی کے گیٹ تک ہی نہیں بلکہ اس گاؤں سے باہر آنے جانے کے قابل بھی ہو جائیں۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب!" وہ امید بھرے لہجے میں بولا۔

میں چودھری سکندر علی کو تسلی تشفی دینے کے بعد حویلی سے نکل آیا اور راشد کے ہمراہ ماسی نوری کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

نوری کی عمر کے بارے میں جان لینے کے بعد اس امر کے امکانات صفر کے برابر رہ گئے تھے کہ گزشتہ شب وہ رستم کے کمرے میں ڈیرے پر موجود ہوگی لیکن یہ دو افراد کے پراسرار قتل کا معاملہ تھا لہٰذا تفتیش کے معمولی سے امکان کو نظرانداز کرنا ایک سنگین غلطی ہوتی۔ اگر نوری کی چیکنگ باقی رہ گئی تھی تو مجھے ہر حال میں اس کام کو مکمل کرنا تھا۔

راشد مجھے نوری کے گھر میں داخل کر کے خود باہر ہی رک گیا تھا۔ نوری کو خاصا تیز بخار تھا تاہم وہ اس قابل تھی کہ میں اس سے پوچھ تاچھ کر سکوں۔ نوری پچاس سے متجاوز ایک عام سی گھریلو عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ بخار کی زیادتی نے اسے خاصا کمزور کر دیا تھا۔ اس کا گھر والا بابا دینا بھی ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ دین محمد نے میری آمد کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ یا تو وہ سویا ہوا تھا اور یا پھر وہ اندھا ہونے کے علاوہ بہرہ بھی تھا۔ بعدازاں مجھے پتا چلا کہ دین محمد پیدائشی اندھا نہیں تھا۔ اس کی نگاہ اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ اس کا شمار نابینا افراد ہی میں کیا جا سکتا تھا۔ دین محمد کی عمر ستر سے کچھ اوپر ہی تھی۔ یہ ایک بے اولاد جوڑا تھا۔

میں نے نوری کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ "ماسی! میں تمہاری کلائیاں چیک کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا اپنی آستینیں اوپر چڑھالو۔"

نوری قادو اور چودھری رستم کو پیش آنے والے واقعے سے آگاہ تھی۔ وہ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"تھوڑی دیر پہلے ایک عورت مجھے بتا کر گئی ہے کہ آپ نے گاؤں کی ساری عورتوں کو چودھری صاحب کی حویلی میں بلا کر ان کی کلائیاں چیک کی ہیں۔ یہ کیا چکر ہے؟"

میں نے اس کی کلائیوں کا بغور معائنہ کرتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ "ماسی! تمہیں بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔ مجھے ایک ایسی عورت کی تلاش ہے جس کی کلائیوں پر تازہ زخموں کے نشان ہوں۔ وہ عورت پچھلی رات ڈیرے پر چودھری رستم کے کمرے میں موجود تھی۔"

پھر میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں نوری کو نامعلوم عورت کے ساتھ رستم کی دست درازی اور چوڑیوں کے ٹوٹنے کا قصہ سنا ڈالا۔ وہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے میری بات سنتی رہی پھر اپنی کلائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"تو آپ اس بات کی تصدیق کے لیے یہاں آئے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہیں کہ کہیں پچھلی رات ڈیرے پر چودھری کے ساتھ میں تو نہیں تھی؟''

اس کے سوال میں خفگی پائی جاتی تھی اور میں سمجھتا ہوں، وہ اپنے جذبات کے اظہار کا حق رکھتی تھی۔ میں نے اس کی تسلی اور اطمینان کی خاطر کہا۔

''نوری ماسی! پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ یہ سب معمول کی پوچھ تاچھ ہے۔ اس علاقے میں دو جیتے جاگتے انسانوں کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ مجھے ہر قیمت پر ان کے قاتل یا قاتلوں تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ یہ چیکنگ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ میں نے گاؤں کی تمام عورتوں کی کلائیوں کا معائنہ کیا ہے۔ اس حوالے سے تمہیں برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری کلائیوں پر زخموں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ تم میری طرف سے کلیئر ہو۔''

''مجھے تو چوڑیاں پہنے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔'' وہ کمزور مگر بے پروا لہجے میں بولی۔ ''آپ بتائیں، گاؤں کی کسی عورت کی کلائیوں پر آپ کو زخموں کے نشان ملے ہیں..... کہیں بھی نہیں نا؟''

تیز بخار کے باعث نوری کی جو حالت ہو رہی تھی اس میں سوال و جواب کرتے ہوئے مجھے ایک حد تک شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی کلائیوں کی چیکنگ کے بعد یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے گھر سے نکل جاؤں گا لیکن اس کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے نوری۔ مجھے کسی بھی عورت کی کلائیوں پر تازہ زخموں کے نشان نہیں ملے لیکن تم نے اتنے وثوق کے ساتھ کیسے کہا ہے؟''

''میرے درست اندازے کا ایک سبب ہے تھانے دار صاحب!'' وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کون سا سبب؟''

''اگر پچھلی رات واقعی ڈیرے پر چودھری رستم کے ساتھ کوئی عورت موجود تھی اور اس کی چوڑیاں بھی ٹوٹی تھیں تو پھر میرے خیال میں اس عورت کا تعلق فرید پور سے نہیں ہو سکتا۔''

میں نے اب تک اس معاملے کی جتنی تحقیق کی تھی، اس سے میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ گویا نوری میرے اندازے کی تصدیق کر رہی تھی مگر کیسے.....؟ میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''نوری! تمہارے خیال میں اس عورت کا تعلق کسی اور علاقے سے ہے؟''

''جی، میرا بھی خیال ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''اس خیال کی کوئی معقول وجہ تو ہو گی؟''

''جی۔'' اس نے ایک بار پھر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور بولی۔ ''میں نے کل دن میں دو اجنبی عورتوں کو قادو سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔''

نوری کی بات سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم نے ان دو عورتوں کو کہاں دیکھا تھا؟''

''ڈیرے کے نزدیک ہی نہر کے کنارے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ.....!'' میں نے کھوجتی ہوئی نظر سے نوری کو دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ ان لوگوں کے بیچ کس نوعیت کی بات چیت ہو رہی تھی؟''

''نہیں جناب! میں اتنے فاصلے پر تھی کہ ان کی باتیں نہیں سن سکی۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ''وہ دونوں عورتیں میرے لیے اجنبی تھیں۔ ان کا تعلق فرید پور سے نہیں تھا۔ میں ان پر ایک نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئی تھی۔''

نوری کے انکشاف نے میرے من میں کھلبلی مچا دی تھی۔ اس کی فراہم کردہ معلومات میری نظر میں گراں قدر اہمیت کی حامل تھیں۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''نوری! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ تم بخار میں پھنک رہی ہو اور میں تم سے سوال پر سوال کیے جا رہا ہوں۔ تم میری مجبوری کو سمجھ سکتی ہو۔ یہ کوئی چوری، ڈکیتی یا راہزنی کا معمولی سا واقعہ نہیں۔ میں اس وقت دہرے قتل کے ایک سنگین سانحے کی تفتیش کر رہا ہوں۔ تمہارا تعاون مجھے قادو اور رستم کے قتل کا معما حل کرنے میں بہت مدد دے سکتا ہے۔''

''میں آپ کی ذمے داری کو سمجھ رہی ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''پوچھیں، آپ کو کیا پوچھنا ہے؟''

''یہ تو طے ہو گیا کہ کل تم نے جن دو عورتوں کو قادر کے ساتھ دیکھا تھا وہ فرید پور کی وسنیک نہیں ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس تم مجھے ان عورتوں کے حلیوں کے بارے میں تفصیل سے بتا دو تا کہ انہیں تلاش کرنے میں مجھے آسانی ہو جائے۔ تم نے ان لوگوں کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بات چیت نہیں سنی مگر ان عورتوں کی شکلیں تو غور سے دیکھی ہوں گی؟"

"جی دیکھی تھیں...... اور چونکہ وہ دونوں میرے لیے اجنبی تھیں اس لیے کچھ زیادہ ہی غور سے دیکھی تھیں۔" نوری نے جواب دیا اور بتانے لگی۔ "ان میں سے ایک عورت ادھیڑ عمر تھی اور اس کی رنگت گندمی تھی جبکہ دوسری ایک خوب صورت گوری چٹی جوان لڑکی تھی۔ لڑکی کا قد مناسب سے نکلتا ہوا تھا۔ اسے دراز قامت کہا جاسکتا تھا اور وہ دبلی پتلی تھی مگر اس کی ساتھی ادھیڑ عمر عورت پستہ قامت اور حد سے زیادہ موٹی تھی۔ اس کی لمبائی چوڑائی میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ ایک بڑے سائز کا فٹ بال نظر آتی تھی۔ میں اس سے زیادہ تفصیل آپ کو نہیں بتاسکتی۔ ان کے بارے میں، میرے ذہن میں جو کچھ تھا وہ میں نے آپ کو بتادیا ہے۔"

"یہ بھی کافی ہے نوری۔" میں نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ "تم نے ان عورتوں کے حلیوں اور قدوقامت کو بڑی وضاحت کے ساتھ میرے ذہن میں نقش کردیا۔ میں سرکاری آرٹسٹ سے ان کے خاکے بنوا کر انہیں تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم سے بس میرا آخری سوال ہے......"

لحاتی توقف کرکے میں نے ایک اطمینان بھری سانس لی پھر اس سے پوچھا۔

"نوری! ان اجنبی عورتوں نے کس قسم کے لباس پہن رکھے تھے؟"

"گوری چٹی دراز قد لڑکی نے گرم پھول دار قمیص کے ساتھ کالی شلوار پہن رکھی تھی۔" نوری نے بتایا۔ "علاوہ ازیں اس نے کالے ہی رنگ کی گرم شال بھی اوڑھ رکھی تھی جبکہ اس کی ساتھی ادھیڑ عمر عورت نے گہرے بھورے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس موٹی عورت نے لباس کے اوپر نیلے رنگ کا اونی سویٹر بھی پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر سفید دوپٹا تھا۔"

"بس ٹھیک ہے۔" میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "تمہاری بتائی ہوئی تفصیل سے کام چل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "نوری! پولیس سے اس تعاون کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ اللہ پاک جلد از جلد تمہیں اس بخار سے نجات دلائے۔"

"آمین......!" وہ دھیرے سے بولی۔

میں اس کے گھر سے نکل آیا۔ فرید پور میں میرا کام ایک لحاظ سے ختم ہوگیا تھا۔ اب مجھے پہلی فرصت میں دو اجنبی عورتوں کا سراغ لگانا تھا۔ اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بھی میرے ہتھے چڑھ جاتی تو میں بہ آسانی قادو اور چودھری رستم کے قتل کے راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔

جب میں تھانہ صدر پہنچا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ میں پچھلے اٹھارہ بیس گھنٹے سے مسلسل معروفِ کار رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس دوران میں پیٹ پوجا کرنے کا تھوڑا بہت آسرا ہوگیا تھا لیکن آرام کرنے کا ذرا سا بھی موقع نہیں مل سکا تھا۔ میں تھک کر چور ہوچکا تھا لہٰذا تھانے پہنچتے ہی ضروری اندراج کے بعد میں نے اپنے کوارٹر کا رخ کیا۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے ابتدا میں آپ کو بتایا تھا کہ وہ موسم سرما کے دن تھے اور دسمبر کا مہینا اپنا نصف سفر طے کرچکا تھا۔ میں دسمبر کی تاریخوں کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا چنانچہ واقعات کو ترتیب میں رکھنے کے لیے ہم فرض کرلیتے ہیں کہ میرے مخبر ریاست علی نے پندرہ دسمبر کو شوکا ڈنگر چور کے بارے میں مجھے اطلاع دی تھی کہ آئندہ رات وہ نہر کے راستے چوری شدہ مویشیوں کی ایک کثیر تعداد گوجرانوالہ کی مویشی منڈی پہنچانے والا ہے۔ سولہ دسمبر کی رات میں اور حوالدار نبی بخش نہر کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ میں مورچا سنبھال کر شوکا کا انتظار کرنے لگے۔ شوکا مالِ مسروقہ یعنی تیس بھینسوں اور بارہ گائے کے ساتھ ہمارے ہاتھ لگا۔ علاوہ ازیں ہم نے سست روی سے رواں دواں نہر میں سے قادو کی گردن ٹوٹی ہوئی لاش بھی نکالی۔ آئندہ روز یعنی سترہ دسمبر کو میں تفتیش کی غرض سے فرید پور روانہ ہوا اور شام کو واپس آگیا۔

اگلی صبح یعنی اٹھارہ دسمبر کو میں نے سرکاری فوٹو گرافر اور ایک آرٹسٹ کو تھانے بلالیا۔ مذکورہ آرٹسٹ چین ورک میں یدِطولیٰ رکھتا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار اس سے مدد لے چکا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے خاکے اصل شخصیت سے بہت قریب ہوتے تھے۔ اس آرٹسٹ کا نام نصیر علی تھا۔ میں نے نوری سے حاصل ہونے والے اجنبی عورتوں کے حلیوں اور قدوقامت کی تفصیلات نصیر اور آفتاب کو بتانے کے بعد کہا۔

"نصیر! تم ان دونوں عورتوں کے خاکے تیار کرو گے۔" پھر میں نے اپنا روئے سخن سرکاری فوٹو گرافر کی جانب موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔ "آفتاب! تم نصیر کے بنائے ہوئے تصویری خاکوں کے درجن بھر پرنٹ تیار کرو گے۔ تم لوگ میری بات سمجھ رہے ہونا؟"

وہ بیک زبان ہوکر بولے۔ "جی ملک صاحب۔ ہم اچھی طرح سمجھ گئے، آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے رزلٹ چاہیے۔" میں نے تاکیدی نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔" نصیر نے کہا۔ آفتاب بولا۔ "ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔"

میں نے انہیں رخصت کر دیا تو ایک کانسٹیبل نے میرے پاس آکر بتایا۔ "ملک صاحب! شونکا آپ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔"

"تم لوگوں نے ان تینوں کی خاطر تواضع میں کوئی کمی تو نہیں چھوڑی۔" میں نے معنی خیز نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ "جس کی شونکا مجھ سے شکایت کرنا چاہتا ہے۔"

"نہیں جناب! ہم نے ہر طرح سے شونکا اور اس کے ساتھیوں کا "خیال" رکھا ہوا ہے۔" وہ میری بات کی تہ میں اترتے ہوئے باچھیں پھیلا کر بولا۔ "لیکن لگتا ہے، ہماری مہمان نوازی اسے پسند نہیں آرہی۔ وہ آپ سے بات کر کے یہاں سے رخصت ہونا چاہتا ہے۔"

"یہاں سے رخصت ہو کر تو وہ سیدھا جیل جائے گا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "البتہ اس سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسے یہاں لے کر آؤ۔"

پانچ منٹ کے بعد شونکا میرے سامنے حاضر تھا۔ اس کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ حوالات میں باقاعدگی کے ساتھ اس کی "خاطر مدارات" ہو رہی تھی۔ میں نے جب اس سے یہ پوچھا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے تو اس نے روتی دھوتی کہانی سنا کر مجھ سے معافی کی درخواست کی۔

"تھانے دار صاحب! میں وعدہ کرتا ہوں کہ مویشیوں کی چوری والا پیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا اور یہ تمام جانور بھی ان کے مالکان تک پہنچا دوں گا۔ بس، آپ مجھے معاف کر کے یہاں سے جانے دیں۔"

"یہ مذموم دھندا ترک کرنے میں تم کس حد تک راسخ النیت ہو، یہ صرف خدا جانتا ہے یا تم جانتے ہو۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "یا پھر مستقبل قریب میں تمہارے کردار کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکے گا کہ تم اپنی زبان کے کتنے دھنی ہو۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں، وہ سچ کر دکھاؤں گا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"مگر میں تمہاری بات کا یقین کر کے تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"آپ مجھے چھوڑ نہیں سکتے تو پھر حوالات میں رہتے ہوئے مجھے کام کرنے دیں۔" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "میں ثابت کر دوں گا کہ جھوٹا نہیں ہوں۔"

میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم حوالات میں بیٹھ کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"میں نے یہ بیالیس ڈنگر قرب وجوار کے گاؤں دیہات سے چوری کیے ہیں۔" وہ اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی قید میں رہ کر ان مویشیوں کے اصل مالکان تک انہیں پہنچا سکتا ہوں۔"

"کیا تم کسی قسم کا جادو جانتے ہو۔" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں اور میرے یہ دونوں ساتھی الیاس اور افضل اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم نے کون سا ڈنگر کہاں سے چرایا ہے اور......"

"تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ......" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی غصیلے انداز میں کہا۔ "کہ میں تمہیں حوالات میں بند رکھ کر تمہارے دونوں ساتھیوں کو چوری کے جانوروں سمیت یہاں سے جانے دوں۔ یہ لوگ ان مویشیوں کو ان کے مالکان تک پہنچا کر واپس آئیں گے اور مجھے رپورٹ دیں گے کہ...... تھانے دار صاحب! ہم نے سب کے جانور واپس کر دیے۔ اب آپ ہمارے سرغنہ کو چھوڑ دیں تاکہ ہم شریفانہ زندگی کا آغاز کر سکیں۔ تمہارے ذہن میں یہی منصوبہ ہے نا؟"

"نہیں تھانے دار صاحب۔" وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "میں آپ سے کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ آپ میری بات تو سنیں۔"

"ٹھیک ہے، سناؤ۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا اور ٹٹولنے والی نظر سے اسے تکنے لگا۔

"آپ میرے کسی ایک ساتھی کو اپنے عملے کے کسی ہوشیار بندے کے ساتھ یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں۔" وہ اپنی تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میرا بندہ آپ کے آدمی کی نگرانی میں ایک ایک مویشی کے مالک کو جا کر بتائے گا کہ اس کا جانور تھانے میں ہے۔ وہ جا کر وہاں سے وصول کر لے۔ اس طرح ہر شخص یہاں آکر اپنا جانور لے جائے گا یعنی تمام مویشی اپنے اصل مالکان تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد تو میں آپ سے اپنی خطائیں معاف کرانے کا حق رکھتا ہوں نا تھانے دار صاحب......!"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس کی پیشکش سے نیک نیتی کی بو آتی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''شونکا! آج تو میں کسی اور معاملے میں الجھا ہوا ہوں اور یہ دن بے حد مصروف گزرے گا۔ تمہاری تجویز میں دم ہے۔ میں کل اس سلسلے میں تم سے بات کروں گا۔''

وہ حد سے زیادہ میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔ میں نے اسے واپس حوالات میں بھیج دیا اور حوالدار نبی بخش کو اپنے پاس بلا کر ہدایت کردی کہ شونکا اور اس کے دونوں ساتھیوں کو دال روٹی پر ٹرخائیں۔ ان کی زیادہ ''خاطریں'' کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

''جو حکم ملک صاحب۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''میں نے شونکا سے اپنا قرض مع سود وصول کرلیا ہے۔''

''تم کون سے قرض کی بات کررہے ہو نبی بخش؟'' میں نے چونک کر حوالدار کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم نے پہلے سے اسے کوئی رقم دے رکھی ہے......''

''نہیں ملک صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ ذومعنی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ رقم کا نہیں، کوئی دوسرا حساب کتاب ہے۔ اس کمبخت کے انتظار میں اس برفیلی رات میرا ایک ایک جوڑ اکڑ کر رہ گیا تھا۔ میں نے شونکا کے ایک ایک جوڑ پر اپنے ہاتھ پاؤں کی طبع آزمائی کرکے دل کی بھڑاس نکال لی ہے۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب قادو کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اسپتال سے یہاں پہنچے گی تو میں اسے بھی تھوڑی دیر کے لیے تمہارے حوالے کردوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس رات قادو کی لاش کو نہر سے نکالتے وقت بھی تمہیں بے پناہ سردی لگی تھی اور تمہارا آدھے سے زیادہ لباس بھی بھیگ گیا تھا۔ قادو کی لاش سے حساب چکتا کرنے کے لیے بھی تمہارے من میں بہت سے ارمان مچل رہے ہوں گے...... ہیں نا؟''

میری اس گہری چوٹ پر وہ شرمندہ ہوکر رہ گیا۔

دوپہر کے بعد بھولا پہلوان مجھ سے ملنے تھانے چلا آیا۔ اس کا اصل نام صدیق تھا مگر وہ بھولا پہلوان کے نام سے مشہور تھا۔ کچھ لوگ اسے کالا بھولا یا کالا پہلوان بھی کہتے تھے اور اس سے ملاقات کے بعد مجھے اس ٹائٹل کا سبب بھی معلوم ہوگیا۔ وہ ایک صحت مند گبرو جوان تھا جیسا کہ عموماً شہ زور ہوا کرتے ہیں مگر اس کی رنگت سیاہ تھی۔

بھولا بہت ہی سادہ مزاج انسان تھا۔ چودھری سکندر نے اس کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا، وہ من وعن درست تھا۔ میں لگ بھگ آدھے گھنٹے تک گھما پھرا کر بھولا سے مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا۔ اس دوران میں فنِ پہلوانی اور مختلف داؤ پیچ بھی زیرِ بحث آئے۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ بھولا کسی بھی طور قادو کے قتل میں ملوث نہیں اور نہ ہی رستم کی موت میں اس کا ہاتھ ہے تو میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی تاہم اس پر نفسیاتی دباؤ رکھنے کی غرض سے میں نے کہا۔

''بھولا! میں اس وقت تو تمہیں جانے دے رہا ہوں لیکن جب بھی بلاؤں، تمہیں تھانے آنا ہوگا اور اس دوران میں تم تھانے میں پیشگی اطلاع دیے بغیر فرید پور سے باہر کہیں نہیں جاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ اپنی گردن کو فرماں بردارانہ جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ جیسا کہہ رہے ہیں، میں ویسا ہی کروں گا۔''

''قادو کی لاش تو نہر کے پانی میں بہتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے تیکھے انداز میں کہا۔ ''اس کی گردن پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات دھل دھلا گئے تھے لیکن جو رینچ پانا ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری گیا ہوا ہے اس کے دستے پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی تھانے دار صاحب! میں سمجھ رہا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس رینچ کے دستے پر آپ کو میری انگلیوں کے نشانات نہیں ملیں گے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں بھی نہیں چاہتا کہ تم کسی مصیبت میں پھنسو۔ تم ایک اچھے انسان ہو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم فرید پور کی آبرو ہو۔ وہاں کے وسنیکوں کو تم پر بڑا مان ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں تھانے دار صاحب۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''میں فرید پور کی آبرو پر کبھی کوئی حرف نہیں آنے دوں گا اور وہاں کے وسنیکوں کا مان بھی سدا قائم ودائم رہے گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم جیسا کہہ رہے ہو ویسا کرکے بھی دکھاؤ گے۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہوگیا۔

انگلیوں کے نشانات والی بات میں نے اس پر دباؤ رکھنے کے لیے کہی تھی ورنہ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، اس

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ بعض اوقات حالات کے تقاضوں کے مطابق معاملات کو نمٹانے کے لیے ہمیں تھوڑی بہت غلط بیانی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

سہ پہر میں دونوں پوسٹ مارٹم شدہ لاشیں اسپتال سے تھانے پہنچا دی گئیں۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ نے میرے تمام تر اندازوں کی تصدیق کر دی تھی۔ قادر عرف قادو کی موت گردن کا منکا ٹوٹنے ہی سے واقع ہوئی تھی اور اس کی فوری موت کا وقت سولہ دسمبر کی رات دس اور بارہ بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ دوسرے مقتول یعنی چودھری رستم کی موت کا بھی یہی وقت بتایا گیا تھا۔ یعنی ان دونوں مالک اور ملازم کو یکے بعد دیگرے ہلاک کیا گیا تھا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ ان میں سے پہلے کس کی موت واقع ہوئی تھی اور کس کی بعد میں بہرحال ان دونوں کو وقوعہ کی رات دس اور بارہ کے بیچ موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے نہر کے پانی کی رفتار کے حساب سے اندازہ لگایا تھا کہ قادو کو لگ بھگ رات ساڑھے دس بجے ہلاک کیا گیا ہوگا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ دونوں دس اور گیارہ بجے کے درمیان اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق بہ وقتِ رخصت رستم شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اس کے معدے سے بھی مے نوشی کے بڑے واضح ثبوت ملے تھے۔ نشے ہی کی حالت میں عقب سے اس کی کھوپڑی پر بھاری آہنی رینچ پانے سے وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ آلۂ قتل یعنی رینچ کے سر پر جو خون لگا ملا تھا وہ رستم کے خون سے میچ کر گیا تھا اور اسی خون کے اندر چپکے ہوئے بالوں کا جب رستم کے بالوں سے موازنہ کیا گیا تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ رستم ہی کے بال تھے۔ میں نے ضروری قانونی کارروائی کے بعد دونوں مقتولین کی لاشوں کو راشد، منہاس اور اپنے عملے کے ایک شخص کی نگرانی میں شام سے پہلے موضع فرید پور روانہ کر دیا۔ راشد اور منہاس آج دوپہر کے بعد ایک تانگے پر سوار ہو کر تھانے آئے تھے۔ ان کی آمد کا مقصد لاشوں کی وصولی ہی تھا۔

پوسٹ مارٹم اور لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ نے اگرچہ میرے اندازوں کی تصدیق کر دی تھی تاہم تفتیش کی گاڑی بیابان علاقے میں ایک ویران اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس گاڑی کو آگے کس سمت لے جاؤں۔ میں اس تفتیشی گاڑی کا ڈرائیور تھا اس لیے تمام تر سوچ بچار بھی مجھے ہی کرنا تھی۔

نوری ماسی کی فراہم کردہ معلومات میں میرے لیے روشنی کی ایک کرن موجود تھی۔ اگرچہ وہ تیز بخار کی لپیٹ میں تھی تاہم اس سے ہونے والی ملاقات لاحاصل نہیں رہی تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ابھی تک میری تفتیش کا حاصل یہ ملاقات ہی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ نوری ماسی نے سولہ دسمبر کی دوپہر میں دو عورتوں کو نہر کے کنارے ڈیرے کے نزدیک قادو کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا اور اسی رات یہ دونوں افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے اور چودھری رستم کے کمرے میں بھی کسی عورت کی موجودگی کے ناقابلِ تردید ثبوت ملے تھے۔ یہ بھی ثابت شدہ تھا کہ وقوعہ کی رات رستم کے کمرے میں پائی جانے والی عورت کا تعلق فرید پور سے نہیں تھا۔

گھوم پھر کر معاملہ انہی دو اجنبی عورتوں پر آ کر ٹھہر جاتا تھا جن میں ایک پستہ قامت اور حد سے زیادہ موٹی تھی جبکہ دوسری دراز قد، گوری چٹی اور دبلی پتلی تھی۔ میں نے اپنے لوگوں سے ان دونوں عورتوں کے درجن بھر خاکے تیار کروا لیے تھے جن کی مدد سے مجھے ان دونوں کو تلاش کرنا تھا۔ اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بھی میرے ہتھے چڑھ جاتی تو دوہرے قتل کی اس واردات کا معما حل ہو سکتا تھا۔

یہ بات تو طے ہو گئی تھی کہ ان کا فرید پور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ کسی اور علاقے سے وہاں پہنچی تھیں۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ اگر وہ مقتول قادو کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں تو کیا قادو انہیں جانتا تھا؟ اس سوال کا سب سے مناسب جواب تو قادو ہی دے سکتا تھا لیکن وہ ہمیشہ کے لیے سوال و جواب کی پہنچ سے نکل چکا تھا لہٰذا یہ جواب بھی مجھے ہی تلاش کرنا تھا۔ آئندہ روز کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

☆☆☆

انیس دسمبر کی صبح میں نے مذکورہ دونوں نامعلوم عورتوں کے خاکوں کو اپنے بندوں کو حوالے کر کے انہیں تلاش کی مہم پر روانہ کر دیا۔ اگر وہ فرید پور کی رہنے والی نہیں تھیں تو ایک امکان یہ بھی تھا کہ اردگرد کے کسی گاؤں سے ان کا تعلق ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی اور ضلع سے آئی ہوں۔ اس پوائنٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اپنے اہلکاروں کو خصوصی ہدایات دی تھیں کہ وہ ریلوے اسٹیشن،

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بس اسٹینڈ اور تانگا اسٹینڈ وغیرہ کو خاص طور پر چیک کریں۔ اگر ان کا تعلق کسی اور علاقے یا کسی اور شہر سے تھا تو ان مقامات پر لازمی کسی نے انہیں دیکھا ہوگا۔

میری اختیار کی ہوئی حکمتِ عملی کارگر ثابت ہوئی۔ دوپہر سے پہلے ایک کانسٹیبل نے آکر مجھے بتایا۔

"ملک صاحب! ان عورتوں کا مسئلہ تو حل ہوگیا۔"

مذکورہ کانسٹیبل کا نام رفیق تھا اور وہ ایسے اطمینان بھرے انداز میں یہ اطلاع دے رہا تھا جیسے وہ نامعلوم عورتوں کو کہیں سے پکڑ کر لے آیا ہو۔ میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"کہاں ہیں وہ دونوں؟"

"جج......جی......" وہ میرے سوال پر گڑبڑا کر رہ گیا۔

"رفیق! میں تم سے ان عورتوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جن کا مسئلہ تم نے حل کرلیا ہے؟" میں نے تیز نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جناب! میرا مطلب تھا کہ ان کے بارے میں پتا چلا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "انہیں ریلوے اسٹیشن پر دیکھا گیا ہے۔"

"کس نے دیکھا ہے؟" میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ "تفصیلات کیا ہیں؟"

"ملک صاحب! اسٹیشن ماسٹر نے انہیں چودہ دسمبر کو وہاں پلیٹ فارم پر دیکھا تھا۔" رفیق نے بتایا۔

"پھر......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"پھر کچھ بھی نہیں جناب۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "پھر وہ دونوں کہیں چلی گئیں۔ کسی کو نہیں معلوم، وہ کہاں گئیں......"

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ کانسٹیبل رفیق سے مزید سوال وجواب، وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا لہٰذا میں فی الفور ریلوے اسٹیشن کی جانب روانہ ہوگیا۔

میرے تھانے سے ریلوے اسٹیشن کم وبیش آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں چند منٹ لگے ہوں گے۔ میں چاہتا تو کسی سینئر اہلکار کو اسٹیشن ماسٹر سے معلومات حاصل کرنے بھیج سکتا تھا لیکن میں نے خود ہی یہ مہم سر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پچھلے دو روز سے اس کیس نے میرے ذہن کو بہت منتشر کررکھا تھا۔

اسٹیشن ماسٹر بڑے تپاک سے ملا اور میرے لیے گرما گرم چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس وقت کسی ٹرین کی آمد کا وقت نہیں تھا لہٰذا اس کے پاس بات چیت کے لیے مہلت تھی۔ ہم بہ آسانی اس سنگین معاملے پر گفتگو کرسکتے تھے۔

جب میں نے اسٹیشن ماسٹر کو اپنی غرض وغایت کے بارے میں بتایا تو وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

"ملک صاحب! میں ان دونوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تاہم مجھے جتنا معلوم ہے، اگر وہ آپ کے کام آسکتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔ ویسے اتنا بتادوں کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھا۔ "اگر ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا تو پھر وہ ایک ساتھ کیوں تھیں؟"

"وہ لڑکی غلطی سے اس اسٹیشن پر اتر گئی تھی۔" اسٹیشن ماسٹر نے بتایا۔ "وہ پریشان تھی۔ اسی دوران میں یہ موٹی عورت اسے مل گئی۔" اس نے اسکیچ کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ دونوں پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ اس کے بعد اٹھ کر کہیں چلی گئیں۔"

"ہوسکتا ہے، یہ موٹی عورت اس لڑکی کی کوئی جاننے والی ہو۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اور وہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئی ہو۔"

"ہاں......ایسا ہوسکتا ہے۔" اس نے گول مول بات کی۔

اگرچہ اسٹیشن ماسٹر نے میری بات کی تائید کی تھی لیکن "ایسا ہوسکتا ہے" سے میرا کام نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے ان دونوں نامعلوم عورتوں کا سراغ لگانا تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب مجھے ان کے بارے میں معلومات حاصل ہوتیں۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔

"آپ نے بتایا ہے کہ وہ لڑکی غلطی سے اس اسٹیشن پر اتر گئی تھی۔ کیا آپ نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے آرہی تھی اور اسے جانا کہاں تھا؟"

"جس گاڑی میں سے وہ اتری تھی وہ راولپنڈی سے لاہور کی سمت جارہی تھی۔" اسٹیشن ماسٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میری ڈائریکٹ اس لڑکی سے بات نہیں ہوئی اس لیے اس کے سفر کے آغاز اور اس کی منزل کے بارے میں، میں آپ کو ٹھیک سے نہیں بتاسکتا۔ مجھے اپنے عملے کی زبانی پتا چلا تھا کہ وہ غلطی سے اس اسٹیشن پر اتر گئی تھی پھر اسے وہ موٹی عورت مل گئی۔ دونوں تھوڑی دیر تک پلیٹ فارم کی بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرتی رہیں۔ پھر یہاں سے رخصت ہوگئیں۔"

"اس بات کا تو آپ کو یقین ہے ناکہ وہ آپ کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اسٹیشن سے کسی ٹرین پر سوار نہیں ہوئی تھیں؟" میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر پوچھ لیا۔

"نہیں ملک صاحب!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے یہی بتایا گیا ہے کہ وہ تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد اسٹیشن کی بلڈنگ سے باہر نکل گئی تھیں۔"

میں نے اسٹیشن ماسٹر کے تعاون اور چائے کا شکریہ ادا کیا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔

اسٹیشن ماسٹر سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں، میں نے پلیٹ فارم پر گھوم پھر کر اپنے طور پر بعض لوگوں سے پوچھ تاچھ بھی کی جو کہ کافی مفید ثابت ہوئی۔ ایک قلی نے مجھے بتایا کہ اسٹیشن سے نکل کر وہ دونوں عورتیں تانگا اسٹینڈ کی جانب گئی تھیں۔

یہ جن دنوں کا واقعہ ہے اس زمانے میں آج کی طرح تانگا اسٹینڈز پر تانگوں کا میلا نہیں لگا رہتا تھا۔ تانگوں کی محدود تعداد ہوا کرتی تھی جو اپنے کام کے لحاظ سے مسافروں کو ریلوے اسٹیشن، لاری اڈا اور شہر کے دوسرے حصوں سے گرد و نواح کے گاؤں دیہات تک پہنچایا کرتے تھے۔ اس وقت اسٹینڈ پر صرف ایک تانگا سواریوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر میں نے تانگا اسٹینڈ کا رخ کیا۔

میں اس وقت سرکاری وردی میں تھا۔ تانگا اسٹینڈ پر چائے سگریٹ کے کھوکھے والے اور پھل فروش مجھے دیکھتے ہی الرٹ ہو گئے۔ میں نے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے خالی تانگے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ کوچوان نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو باادب، باملاحظہ، ہوشیار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا تو وہ بڑے احترام سے بولا۔

"سرکار! حکم کریں۔ آپ کو کہاں لے چلوں؟"

میں نے اپنا گھوڑا اسٹیشن کی عمارت کی ایک دیوار کے ساتھ باندھ رکھا تھا اور چہل قدمی کرتے ہوئے تانگا اسٹینڈ کی سمت بڑھا تھا۔ میں نے کوچوان کی پیشکش کے جواب میں کہا۔

"چاچا! تمہارا نام کیا ہے؟"

"کرامت علی۔" اس نے بتایا۔

کرامت کی عمر ساٹھ کے اریب قریب تھی۔ میں نے اس کے بالکل قریب پہنچ کر کہا۔ "چاچا! فی الحال تو میں تم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔ اگر میرا مقصد پورا نہیں ہوا تو پھر کہیں جانے کے بارے میں بھی سوچا جا سکتا ہے۔"

"جی...... ضرور۔ میں حاضر ہوں۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "آپ پوچھیں جی۔"

میں اسے اس کے تانگے میں لے کر بیٹھ گیا اور ان نامعلوم عورتوں کے خاکے کا پرنٹ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان دونوں کی تلاش ہے۔ یہ آج سے چار پانچ دن پہلے لگ بھگ اسی وقت اسٹیشن سے نکل کر تانگا اسٹینڈ کی طرف آئی تھیں پھر تمہارے تانگے پر سوار ہو کر کہیں چلی گئی تھیں۔ بتاؤ، تم نے انہیں کہاں پہنچایا تھا؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنی نگاہ کرامت علی کے چہرے پر گاڑ دی۔ آخری جملہ میں نے کوچوان کو چکر دینے کے لیے بولا تھا تاکہ اگر وہ انہیں جانتا ہو یا چودہ دسمبر کو اگر اس نے ان دونوں کو کہیں دیکھا ہو تو میں اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکوں۔

"آپ کی بات ایک حد تک درست ہے تھانے دار صاحب۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "میں نے چودہ تاریخ کو لگ بھگ اسی وقت انہیں یہاں دیکھا تھا لیکن یہ میرے تانگے میں نہیں بیٹھی تھیں۔"

میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ "تو پھر کس کے تانگے پر سوار ہوئی تھیں؟"

"غلام عباس کے تانگے پر۔" اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ "انہیں جھجھر والی جانا تھا اور میں اس طرف جاتا نہیں۔ میں نے اپنا روٹ جی ٹی روڈ کے اوپر ہی رکھا ہوا ہے۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غلام عباس والی کے روٹ پر چلتا ہے؟" میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی بالکل!" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "غلام عباس جھجھر والی ہی کا رہنے والا ہے اس لیے وہ جھجھر والی اور گوجرانوالہ شہر کے بیچ تانگا چلاتا ہے۔"

کرامت علی نے مجھے گراں قدر معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ ان دونوں نامعلوم عورتوں کے حوالے سے اب میں بالکل ہی لاعلم نہیں رہا تھا۔ میں نے کوچوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس وقت غلام عباس کہاں ملے گا؟"

"وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو تانگا لے کر اسٹینڈ سے نکلا ہے۔" کرامت علی نے بتایا۔ "اس وقت وہ جھجھر والی کے آدھے راستے میں ہو گا۔"

"کیا غلام عباس کوئی اور پھیرا اٹھانے ریلوے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اسٹیشن کی طرف آئے گا؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''ہوسکتا ہے، آجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تانگا کھڑا کر کے اپنے گھر چلا جائے۔''

کرامت علی کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے چاچا! آج کا دن تم سرکار کی ڈیوٹی پر ہو۔ تمہیں ابھی میرے ساتھ چھچھر والی جانا ہوگا۔ پہلے ہم یہاں سے تھانے چلیں گے۔ وہاں سے میں کسی کو اپنے ساتھ لوں گا۔ پھر ہم چھچھر والی کی جانب روانہ ہوجائیں گے۔''

کرامت علی کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ چند لمحات تک تذبذب میں رہنے کے بعد وہ رضامندانہ لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے سرکار۔ جو آپ کا حکم......''

میں نے اس کے اطمینان کی غرض سے وضاحت کردی۔ ''چاچا! یہ نہ سمجھنا کہ کارِسرکار میں تمہارا کسی قسم کا مالی نقصان ہوجائے گا۔ میں ان پولیس والوں میں سے نہیں ہوں جو شہریوں کی جیب سے کچھ نہ کچھ نکلوانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ تم ایک دن میں جتنا کما لیتے ہو، میں وہ رقم تمہیں اپنی جیب خاص میں سے دوں گا۔ تم ہمیں چھچھر والی غلام عباس کے پاس پہنچاؤ گے اور اگر وہ ہمیں راستے میں کہیں مل گیا تو اسی وقت تمہاری چھٹی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم تھانے پہنچ گئے۔ کرامت علی نے یہ سفر اپنے تانگے میں اور میں نے اپنے گھوڑے پر طے کیا تھا۔ کرامت علی کو میں نے اس لیے اپنے ساتھ جوڑ لیا تھا کہ یہ موقع کا گواہ تھا۔ اس نے میری مطلوبہ عورتوں کو غلام عباس کے تانگے میں بیٹھ کر چھچھر والی جاتے دیکھا تھا لہٰذا غلام عباس، کرامت علی کی گواہی کو رد نہیں کرسکتا تھا۔ بڑی مشکل سے تو اس کیس کا ایک سرا میرے ہاتھ لگا تھا۔ میں اس موقع کو ہر صورت کیش کرنا چاہتا تھا ورنہ چھچھر والی گاؤں میرے لیے نیا نہیں تھا اور نہ ہی میں وہاں تک رسائی کے راستے سے ناآشنا تھا۔

میں نے تھانے سے اے ایس آئی یعقوب کو ساتھ لیا پھر ہم دونوں کرامت علی کے تانگے میں بیٹھ کر چھچھر والی کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

چھچھر والی بھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا تاہم اس کا ''سائز'' فرید پور سے زیادہ تھا۔ یہ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے نسبتاً ایک درمیانے درجے کا گاؤں تھا۔ کوچوان غلام عباس کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کرامت علی کا اندازہ درست تھا۔ غلام عباس نے گاؤں پہنچ کر اپنا تانگا کھڑا کردیا تھا۔ اب اس کا مزید دھندا کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

ایک تو پولیس کا نام ہی کافی ہوتا ہے، اوپر سے پولیس والے اگر یونیفارم میں ہوں تو ہر بند در خود بخود کھلنے لگتا ہے۔ غلام عباس نے ہمیں لے جا کر یاسمین آنٹی کے گھر کے سامنے کھڑا کردیا۔

جی...... یاسمین اسی کیم شحیم عورت کا نام تھا جسے غلام عباس نے چودہ دسمبر کی دوپہر ریلوے اسٹیشن سے چھچھر والی پہنچایا تھا۔ غلام عباس کے مطابق یاسمین آنٹی کا تعلق چھچھر والی ہی سے تھا تاہم اس روز یاسمین کے ساتھ جو گوری چٹی جوان لڑکی تھی وہ غلام عباس کے لیے نئی تھی۔ غلام عباس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یاسمین ایک فیشنی عورت ہے اور وہ خود کو آنٹی کہلاتی ہے۔ اگر اسے کوئی چاچی یا ماسی کہہ دے تو وہ برا مان جاتی ہے۔

میں نے غلام عباس کا شکریہ ادا کر کے اسے فارغ کردیا اور خود یاسمین آنٹی کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ گھر کے سامنے والے حصے میں مجھے ایک دکان نظر آئی جہاں پر ایک گنجا شخص بیٹھا پھل اور سبزی بیچ رہا تھا۔ گھر کا دروازہ اس دکان کے ساتھ ہی تھا۔ ہمیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر گنجا شخص اپنی دکان سے باہر نکل آیا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مجھے اور اے ایس آئی کو سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد گھر کے دروازے کی سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آنٹی یاسمین ادھر ہی رہتی ہے؟''

''جی...... جی۔'' وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام سردار حسین ہے۔ میں یاسمین کا گھر والا ہوں۔''

وہ جتنی مسکینیت سے اپنا تعارف کرا رہا تھا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے دباؤ میں ہے۔ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''سردار! تم آنٹی یاسمین کے گھر والے ہو تو اسے گھر سے باہر لے کر آؤ یا ہمیں اپنے گھر کے اندر کہیں بٹھاؤ۔ مجھے تمہاری بیوی سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''سب خیریت تو ہے نا جی۔'' وہ تشویش ناک انداز میں ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''گڑبڑ والی کوئی بات تو نہیں......؟''

''اوئے نا معقولا......'' اے ایس آئی نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ ''پولیس خواہ مخواہ ہی کسی کے دروازے پر نہیں آتی۔ تم اپنی بیوی کو باہر نکالتے ہو یا ہم دروازہ توڑ کر تمہارے گھر کے اندر داخل ہو جائیں؟''

''لگتا ہے، اس کمینی نے پھر کوئی گڑبڑ کر دی ہے۔'' سردار حسین نے بے حد پریشانی کے عالم میں خود کلامی کی۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔'' میں نے سردار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں اور یہ میرے ساتھ اے ایس آئی یعقوب ہے۔'' میں نے اپنے نائب کی جانب اشارہ کیا اور پوچھا۔ ''کیا تمہاری بیوی پہلے بھی گڑبڑ کرتی رہی ہے جو تم اس قدر گھبرائے ہوئے نظر آرہے ہو؟''

''بس جی، وہ ایسی ہی ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

اسی لمحے گھر کے اندر سے ایک کرخت نسوانی آواز بلند ہوئی۔ اس آواز نے سردار حسین کو سہا دیا۔ وہ سردار ہی سے استفسار کر رہی تھی۔

''اے سردار! تم کس سے باتیں کر رہے ہو۔ کیا دکان داری میں تمہارا دل نہیں لگتا؟''

''یہ تمہاری بیوی ہی ہے نا۔'' میں نے سوالیہ نظر سے سردار حسین کی طرف دیکھا۔ ''آنٹی یاسمین......؟''

''جی، ہاں۔ وہی ہے۔'' وہ جلدی سے بولا پھر قدرے جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''خود ہی باہر آکر دیکھ لو کہ تم سے کون ملنے آیا ہے۔''

''مجھ سے ملنے......!'' آنٹی یاسمین کی آواز میں حیرت شامل ہوگئی۔ ''یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو......؟''

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ آنٹی یاسمین ایک خصہ ور اور بدتمیز عورت تھی جس کی نظر میں شوہر کی حیثیت کسی زر خرید غلام سے زیادہ نہیں تھی۔

قبل اس کے کہ سردار حسین اس کے استفسار کے جواب میں گھگیا کر کچھ کہتا، ایک جھٹکے سے گھر کا دروازہ کھل گیا۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے میں جس عورت کو کھڑے دیکھا، اس کی عمر پینتالیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ گندمی رنگت کی مالک ایک پستہ قامت اور موٹی عورت تھی۔ وہ نصیر علی کے بتائے ہوئے خاکے پر پوری اترتی تھی۔ یہی میری مطلوبہ عورت تھی۔ یاسمین نے بھڑک دار لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال سلیقے سے گندھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں کاجل کی دھار بھی کافی نمایاں تھی۔ وہ اپنے چہرے مہرے سے ایک کرخت اور خرانٹ عورت دکھائی دیتی تھی، زود طیش اور پلک جھپکتے میں غصے میں آجانے والی لیکن پولیس پر نظر پڑتے ہی وہ یکایک حواس باختہ ہوگئی تھی۔

یاسمین نے میکانکی انداز میں دروازے کو بند کرنا چاہا لیکن میں غافل نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے دونوں پٹ کے درمیان اپنا پاؤں پھنسا کر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اس کے باوجود بھی وہ زور لگا کر میرے بوٹ کو کچلنے کی سعی میں مصروف رہی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہارا کھیل ختم ہوگیا آنٹی یاسمین۔ اب تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ جو میں پوچھوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو، ورنہ میں تمہیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں گا پھر وہاں حوالات میں بیٹھ کر تم آہنی زیور کے ساتھ زور آزمائی کرتی رہنا۔''

میری دھمکی کافی کارگر ثابت ہوئی۔ دروازے پر اس نے طبع آزمائی کو موقوف کر دیا۔ میرے لہجے کی خطرناکی نے اسے باور کرا دیا تھا کہ یہاں دھونس دھاندلی کے مسالے سے اس کی دال نہیں گلنے والی۔ وہ خاصی سرد و گرم چشیدہ عورت دکھائی دیتی تھی۔ بیک فٹ پر جاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟''

''سلسلہ بھی بتا دوں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''اگر دروازے پر کھڑے کھڑے میں نے تم سے پوچھ تاچھ شروع کر دی تو پورے محلے والی کو تمہارے کرتوتوں کا پتا چل جائے گا۔ کیا تمہارے گھر کے اندر بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟''

''آخر میرا قصور کیا ہے؟'' اس نے نیم احتجاجی لہجے میں پوچھا اور گھر کا دروازہ کھول دیا۔

میں سردار حسین کی راہنمائی میں اے ایس آئی کے ہمراہ گھر کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ ہم صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھنے لگے تو یاسمین آنٹی نے اپنے شوہر سے کہا۔

''تمہاری یہاں پر کوئی ضرورت نہیں۔ تم باہر جا کر

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دکان کو سنبھالو۔"

سردار حسین اتنا زیادہ بیوی کے رعب میں تھا کہ اس کے حکم کی بجا آوری کے لیے فوراً مڑ گیا۔ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

"سردار! تم بھی ادھر ہی بیٹھو۔ مجھے تم سے بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

اس نے رک کر سوالیہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جیسے اجازت طلب کر رہا ہو۔ میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔

"ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔ اس علاقے کا تھانے دار میں ہوں یا تمہاری بیوی؟"

"تھانے دار تو اس علاقے کے آپ ہی ہیں مائی باپ۔" وہ منت ریز لہجے میں بولا پھر یاسمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ "اور گھر کی تھانے داری یہ ہے۔"

"فی الحال تم گھر کی تھانے داری کو بھول جاؤ کیونکہ اس وقت وہ خود بھی علاقے کے تھانے دار کے سامنے لائن حاضر ہے۔" میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "ادھر وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔"

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے میرے اشارے پر اپنی بیوی کے پہلو میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ان کے سامنے دوسری چارپائی پر میں نے اور اے ایس آئی نے قبضہ جمالیا۔ میں نے سردار اور یاسمین کو پہلو بہ پہلو اس لیے بٹھایا تھا تاکہ اگر یاسمین، سردار کو کوئی اشارہ کرے تو وہ میری پکڑ میں آجائے۔

یاسمین نے ایک مرتبہ پھر قدرے خفگی آمیز انداز میں پوچھا۔ "یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں......؟"

"چند سوالوں کے سیدھے اور کھرے جواب۔" میں نے یاسمین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اگر تم نے تعاون کیا تو میں چپ چاپ واپس چلا جاؤں گا۔ بصورتِ دیگر تمہیں بھی میرے ساتھ تھانے جانا ہوگا۔"

میرے حتمی انداز نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔ چند لمحات تک تذبذب کا شکار رہنے کے بعد وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ لڑکی کہاں ہے؟"

میں نے اس بے ساختگی کے ساتھ یہ سوال کیا تھا کہ اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ غیر ارادی طور پر اس نے الٹا مجھ سے استفسار کیا۔

"کون سی لڑکی؟"

"میں اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں......" میں نے اپنے لہجے کی کرختگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "جو چار روز پہلے ریلوے اسٹیشن سے تمہارے ساتھ ایک تانگے پر سوار ہو کر چھمبر والی پہنچی تھی۔ کچھ یاد آیا یا میں اس لڑکی کا فوٹو بھی دکھاؤں؟"

"فوٹو......؟" اس نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

میں نے نصیر علی کے تیار کردہ اسکیچ کو آنٹی یاسمین کے سامنے رکھا پھر اس خاکے میں موجود لڑکی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ لڑکی!"

آنٹی یاسمین ایک اچھی اداکارہ بھی تھی۔ اپنے اور اس لڑکی کے اسکیچ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان بھرے تاثرات نمودار ہوئے پھر وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اچھا تو آپ فرزانہ کی بات کر رہے ہیں......"

مجھے شک ہوا کہ وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے سردار حسین کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو وہاں مجھے تذبذب کی پرچھائیں دکھائی دی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنی بیوی کے جواب سے اتفاق نہیں کرتا۔

"اچھا تو اس لڑکی کا نام فرزانہ ہے۔" میں نے یاسمین ہی کے انداز میں اسے گھسنا شروع کیا اور پوچھا۔ "تمہارا فرزانہ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"تھانے دار صاحب! فرزانہ میری بھانجی ہے، بہن خورشید کی بیٹی۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں بولی۔ "یہ لوگ ادھر لالہ موسیٰ میں رہتے ہیں۔ فرزانہ مجھ سے ملنے آئی تھی اس لیے میں اسے لینے ریلوے اسٹیشن گئی تھی۔"

یاسمین نے برمحل جواب دیا تھا لیکن پچھلے دو تین روز سے میں حالات کی جن گھمسن گھیریوں میں الجھا ہوا تھا اس کی روشنی میں، میں آنکھیں بند کر کے یاسمین کی بات پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا لہٰذا میں نے تصدیق طلب انداز میں سردار حسین کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"سردار! تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"کوئی پندرہ بیس سال تو ہو ہی گئے ہیں سرکار۔" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں نے اس سے یہ سوال کیوں کیا تھا۔ یاسمین آنٹی نے ایک بار پھر سردار کو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے کہ سردار میری بات کا جواب دیتا، وہ بیزاری سے بولی۔
''تم کیا سارا دن ادھر ہی بیٹھے رہو گے؟ جاؤ، باہر جا کر دکان داری کو دیکھو۔''
مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ یاسمین دانستہ سردار کو وہاں سے بھگانا چاہتی ہے جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی کوئی بات یاسمین کے بیان کی تردید کر دے گی۔ میں نے سردار کو وہیں بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور کہا۔
''تم ان پندرہ بیس سال میں کتنی مرتبہ اپنی سالی خورشید کے پاس لالہ موسیٰ گئے ہو؟''
''یہ تو کہیں نہیں جاتا تھانے دار صاحب۔'' یاسمین جلدی سے بولی۔ ''بس ادھر ہی دکانداری میں کھپتا رہتا ہے۔''
''میں نے تم سے نہیں، سردار سے سوال کیا تھا۔'' میں نے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے انداز میں کہا۔ ''اور جب تک میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں، تم اپنی چونچ کو بند ہی رکھو......'' پھر میں دوبارہ اس کے شوہر کی جانب متوجہ ہو گیا۔
''ہاں سردار...... یہ خورشید اور فرزانہ کے کردار ابھی ابھی تخلیق کیے گئے ہیں یا تم پہلے سے انہیں جانتے ہو؟''
''یہ تو آپ...... یاسمین ہی سے...... پوچھیں......'' وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔ اگر بیوی کے سامنے تمہاری زبان نہیں کھل رہی تو اب میں تھانے لے جا کر ہی تم سے بات کروں گا۔'' میں نے سردار سے کہا پھر روئے سخن یاسمین کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔
''تو کہاں ہے وہ تمہاری بھانجی فرزانہ؟''
''وہ تو واپس لالہ موسیٰ چلی گئی ہے جی۔'' وہ بڑی ہوشیاری سے بولی۔
وہ صد فیصد دروغ گوئی سے کام لے رہی تھی اور جھوٹے کو اس کے گھر تک چھوڑ کر آنا ہمیشہ سے میری عادت رہی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
''خیر سے اس کی واپسی کب ہوئی ہے؟''
''وہ آج صبح ہی تو گئی ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔
''اچھا اچھا...... تم غلام عباس کے تانگے میں اپنی بھانجی کو اسٹیشن چھوڑنے گئی تھیں نا؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔
''جی...... بالکل......'' وہ مکاری سے بولی۔ ''آپ کو کس نے بتایا کہ ہم غلام عباس کے تانگے میں گئے تھے؟''
''غلام عباس نے۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اس سے مل کر آیا ہوں۔''
وہ سمجھ گئی کہ میں اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے دل میں چور تھا اس لیے اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اسے اپنے جھوٹ کے پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔ ایسا خدشہ عموماً اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان نے صریحاً دروغ گوئی سے کام لیا ہو۔ ان لمحات میں یاسمین کی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔
''کیا آپ نے واقعی غلام عباس سے ملاقات کی ہے؟'' وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔
''ہاں، ہاں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''کیا مجھے اس کوچوان سے نہیں ملنا چاہیے تھا؟''
''میں نے ایسا کب کہا تھانے دار صاحب۔'' وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ ''آپ اس علاقے کے تھانے دار ہیں۔ آپ جس سے بھی ملیں، آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے۔''
''فی الحال تو میں تم سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن لگتا ہے، شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی اس لیے تمہیں تھانے ہی لے جانا پڑے گا۔''
''جناب! میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے تو رہی ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''آپ خوامخواہ ہی مجھ سے ناراض ہو رہے ہیں......''
''او آنٹی! میں خوامخواہ کچھ بھی نہیں کرتا ہوں۔'' میں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اتنی دیر سے تمہاری بک بک سن رہا ہوں اور تمہیں جھوٹ پر جھوٹ بولنے سے ہی فرصت نہیں ہے۔ تمہارے اندر شرم نام کی بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟''
وہ کمال ڈھٹائی سے بولی۔ ''میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے جی؟''
مجھے اس پر بہت غصہ آیا۔ اگر وہ عورت ذات نہ ہوتی تو میں لاتوں گھونسوں سے اس کی وہ درگت بناتا کہ سالوں تک اسے میرا یہ سلوک یاد رہتا۔ میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔
''تم نے کوئی ایک جھوٹ بولا ہو تو میں بتاؤں بھی۔ تم جس لڑکی کو اپنی بھانجی بتا رہی ہو اس کا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔ اگر وہ تمہاری بھانجی ہوتی تو تم اسے قادو کے حوالے کبھی نہ کرتیں۔ تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ ادھر فرید پور میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کون سی قیامت برپا ہو چکی ہے۔ تم جس لڑکی کو بہلا پھسلا کر یہاں لائی تھیں اور پھر دو روز کے بعد اسے قادو کے سپرد کر دیا، وہ تمہاری بھانجی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''میں تو کسی قادو کو نہیں جانتی......''

''بکواس بند کرو۔'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے گرجدار آواز میں کہا۔ ''اس بات کا مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم بہت ہی ڈھیٹ مٹی سے بنی ہوئی ہو لہٰذا تمہارے ساتھ سارے سوال وجواب اب تھانے ہی میں ہوں گے۔ وہاں پہنچ کر تمہاری زبان کے تمام قفل خود ہی کھل جائیں گے۔ ایک منٹ میں فیصلہ کرلو کہ شرافت سے میرے ساتھ چلتی ہو یا پورے چھچھر والی کے وسنیکوں کے سامنے تمہیں گھسیٹتے ہوئے میں تھانے لے جاؤں؟''

وہ چپ چاپ میرے ساتھ تھانے جانے کے لیے رضامند ہو گئی۔

میں نے اس کے نام نہاد گھر والے کو اس کے گھر ہی میں چھوڑا اور آنٹی یاسمین کو کرامت علی کے تانگے میں بٹھا کر چھچھر والی سے تھانہ صدر لے آیا۔ جب ہم تھانے پہنچے تو سورج کے غروب ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ میں نے کرامت علی کو اس کی اوسط دہاڑی سے کچھ زیادہ رقم دے کر رخصت کر دیا اور یاسمین کو حولدار نبی بخش کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ آنٹی یاسمین ہے جس نے وہ لڑکی چودھری رستم کے ڈیرے پر پہنچائی تھی۔ یاسمین بے چاری گونگی ہے لیکن میں اس کی زبان سے سچ سننا چاہتا ہوں۔ آج کی رات کے لیے میں اسے تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ سنا ہے، تمہارے پاس زبان کھلوانے کا کوئی منتر ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بے فکر ہو کر اپنے کوارٹر پر جائیں۔ صبح جب آپ اپنے کمرے میں پہنچیں گے تو آنٹی یاسمین کی زبان کا آپریشن کر کے میں اسے بولنے، خصوصاً سچ بولنے کے قابل بنا چکا ہوں گا۔''

میں بے فکر ہو کر اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ آنٹی یاسمین نے مجھ سے متعدد جھوٹ بولے تھے۔ جب انسان کسی معاملے میں دروغ گوئی کا سہارا لیتا ہے تو اس کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد ہوتا ہے۔ نفسیات داں کسی جھوٹ کے پیچھے چھپے ہوئے مقصد کی چار وجوہات بتاتے ہیں اور ان چاروں وجوہ کا تعلق انسان کے فائدے اور نقصان سے ہے۔ اول، انسان کوئی بہت بڑا فائدہ حاصل کرنے کے لیے دروغ سے کام لیتا ہے۔ دوم، وہ کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے غلط بیانی کا سہارا لیتا ہے۔ سوم، وہ اپنی جھوٹی شان دکھانے یعنی خود کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لیے دروغ گوئی کرتا ہے اور چہارم، وہ اپنی کسی کجی کو چھپانے یا کسی جرم کی پردہ پوشی کی غرض سے جھوٹ بولتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آنٹی یاسمین کے جھوٹ میں یہ چاروں وجوہات درجہ بہ درجہ موجود تھیں۔

اگلی صبح میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو حوالدار نبی بخش نے میرے پاس آ کر خوشخبری سنا دی۔ پُرمسرت لہجے میں اس نے مجھے بتایا۔

''ملک صاحب! آنٹی کے سارے کس بل میں نے نکال دیے ہیں۔ وہ اپنی تن فن بھول چکی ہے۔ میں نے اس کی زبان سے نہایت ہی سنگین انکشافات کروا لیے ہیں۔ آپ بھی اس کا باقاعدہ بیان ریکارڈ کر لیں۔''

اس زمانے میں محکمۂ پولیس کے پاس آڈیو یا وڈیو ریکارڈنگ کی کوئی سہولت موجود نہیں ہوتی تھی۔ یہاں پر ''بیان ریکارڈ'' کرنے سے مراد تحریری بیان نوٹ کرنے کے بعد اس پر ملزم یا مجرم کے دستخط یا انگوٹھے کا نشان لینا ہے۔

''تم نے اسے جسمانی تشدد سے تو نہیں گزارا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں ملک صاحب!'' نبی بخش ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں خواتین پر تشدد کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔''

''پھر تم نے آنٹی یاسمین پر ایسا کون سا جادو کیا ہے کہ وہ زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''ملک صاحب! میں نے آنٹی کے پانی میں پیشاب آور دوائی ملا دی تھی۔'' وہ ایک آنکھ دبا کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور اس کے ساتھ ہی میں نے آنٹی کے باتھ روم جانے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ رات کے کھانے کے ساتھ اس نے اچھا خاصا پانی پی لیا تھا، اوپر سے موسم بھی ٹھنڈا ٹھار ہے۔ آنٹی سے برداشت نہیں ہو سکا اور جب اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ رفع حاجت کے لیے باتھ روم نہیں گئی تو اس کا مثانہ پھٹ جائے گا، تب اس نے ہتھیار پھینک دیے اور سچ بولنے کے لیے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

آمادہ ہوگئی۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''تمہاری نظر میں یہ اتنی سی بات ہوگی نبی بخش۔'' میں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن میری نگاہ میں تم ایک جلادصفت ماہر نفسیات ہو۔''

''ملک صاحب! میں آپ کے الفاظ کو اپنی تعریف سمجھوں یا......؟'' اس نے بات نامکمل چھوڑی اور سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''اپنے بارے میں تم بعد میں غور وفکر کرتے رہنا۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''فی الحال تم آنٹی یاسمین کو یہاں لے کر آؤ تاکہ میں اس کا بیان ریکارڈ کرسکوں۔''

''ہنے گیا تے ہنے آیا ملک صاحب۔'' وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ پھر کھٹاک کی آواز کے ساتھ مجھے سیلوٹ مار کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہ سچ ہے کہ بعض اوقات خطرناک مجرموں کی زبان کھلوانے کے لیے انہیں انسانیت سوز سلوک سے بھی گزارنا پڑتا ہے اور کبھی کبھار بدقسمتی سے کوئی بے گناہ بھی اس رگڑے میں آجاتا ہے۔ بہرحال، یہ سب ہماری مجبوری ہوتی ہے۔ آپ اسے تفتیش کا ایک حصہ سمجھ لیں تاہم عورتوں کو جسمانی نہیں بلکہ نفسیاتی اور بعض اوقات ذہنی دباؤ میں لاکر ان کی زبان کا تالا کھلوایا جاتا ہے جیسا کہ نبی بخش نے آنٹی یاسمین کے ساتھ کیا تھا۔

آنٹی یاسمین ایک گھیرو (گھیرنے والی) عورت تھی۔ وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتی رہتی تھی۔ وہ بہت شاطر اور کائیاں تھی۔ اسے جہاں بھی کوئی بے آسرا یا پریشان لڑکی نظر آتی، وہ اسے اپنی ہمدردی اور محبت کا جھانسا دے کر اپنے ساتھ پھسلا کر لے آتی تھی۔ بعدازاں وہ اسے فریب میں رکھ کر آگے بڑھا دیتی تھی اور پیسے کھرے کرلیتی تھی۔ قادو اور اسی قماش کے چند افراد سے اس کی اچھی جان پہچان تھی۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے ورغلا کر لائی ہوئی لڑکی کو کہیں نہ کہیں کھپا دیا کرتی تھی۔ ماہ جبیں کو یاسمین نے قادو کے حوالے کیا تھا۔ قادو پہلے بھی اس سے رستم کے لیے کئی بار اس نوعیت کا معاملہ کرچکا تھا۔

ماہ جبیں، آنٹی یاسمین کو گوجرانوالہ کے ریلوے اسٹیشن پر ملی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی تھی کہ یہ اس کا شکار ہے۔ وہ ماہ جبیں کے نزدیک ہی بینچ پر بیٹھ گئی۔ آئندہ دس منٹ کے اندر وہ اپنے پیار بھرے انداز سے ماہ جبیں کی حقیقت سے آگاہ ہوچکی تھی۔ وہ ماہ جبیں کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد بہلا پھسلا کر اسے اسٹیشن سے پھسلا والی لے آئی تھی۔ یاسمین کا شوہر سردار حسین اس کی غیر تصابی سرگرمیوں سے آگاہ تھا تاہم وہ ایک زن مرید قسم کا شوہر تھا۔ یاسمین کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چلتی تھی۔

یاسمین آنٹی نے مجھے بتایا۔ ''ماہ جبیں کا تعلق وزیرآباد کی سبزی منڈی کے علاقے سے ہے۔''

میں نے یاسمین کو فریدپور کے حالات سے اچھی طرح آگاہ کردیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہاں قادو اور رستم کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''ماہ جبیں نے اپنا گھر کیوں چھوڑا تھا؟''

''اس کی ماں نے دوسری شادی کرلی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''سوتیلا باپ اس پر بری نیت رکھتا تھا اور گاہے بہ گاہے اسے تنگ بھی کرتا رہتا تھا۔ ماہ جبیں نے اپنی ماں سے شکایت کی لیکن اس نے ماہ جبیں کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔ جب اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہا تو اس نے گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔''

''تم دنیا کی کمینی ترین عورت ہو۔'' میں نے نفرت بھری نظر سے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جس عزت کی حفاظت کے لیے ماہ جبیں نے اپنا گھر چھوڑا تھا تم نے جھوٹی محبت کا فریب دے کر ماہ جبیں کی اسی عزت کو نیلام کرنے کی کوشش کی۔''

وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''آپ ناراض تو نہ ہوں تھانے دار صاحب۔ میں نے آپ کی بات مان کر سب کچھ سچ بتادیا ہے۔''

''یہ ادائیں اور چھل کسی اور کو دکھانا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے دام فریب میں آنے والا نہیں ہوں اور جہاں تک سچ اگلوانے کا معاملہ ہے تو......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے جیسے گھناؤنے کردار کی مالک عورتوں کی زبان کھلوانے کے لیے میں ان کے پائنچوں میں چوہے چھوڑ کر پائنچوں کا منہ بند بھی کرواسکتا ہوں۔''

ان لمحات میں مجھے اپنے غصے پر کافی حد تک قابو نہیں رہا تھا۔ وہ میری کیفیت کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''تھانے دار صاحب! غصہ تھوک دیں۔ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ یہ لڑکی اتنی منحوس ثابت ہورہی ہے کہ اس کی وجہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے وہ انسان اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور میں بھی اسی کے طفیل بیٹھے بٹھائے مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔"

"تم نے صرف مصیبت کا نام سنا ہے آنٹی یاسمین۔" میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "کبھی تم پر مصیبت آئی نہیں ہوگی۔ میں تمہارا جو حشر نشر کرنے والا ہوں نا، اسے تم تاحیات یاد رکھو گی۔"

"آپ مجھے ڈرائیں تو نہیں تھانے دار صاحب۔" وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ "جس لڑکی کی وجہ سے آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں وہ اس وقت پتا نہیں، کہاں عیش بہار کرتی پھر رہی ہوگی۔"

میں نفرت بھرے انداز میں یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔

"آپ مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہیں؟" اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم کس بے حیا اور بے عزت مٹی سے بنی ہو۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں عورت کہتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے۔"

وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی دعوتی اداؤں نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اب مجھ پر کون سا داؤ آزمائے۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا لیکن بہت کچھ ہونا ابھی باقی ہے۔ جس لڑکی کو تم منحوس کہہ رہی ہو وہ میری نظر میں مظلوم ہے۔ تم اپنے کالے کرتوتوں کے سبب میری گرفت میں آئی ہو۔ میں ہر حال میں ماہ جبیں کو تلاش کروں گا تاکہ دہرے قتل کے معاملے سے پردہ اٹھ سکے۔"

"آپ ضرور تحقیق اور تفتیش جاری رکھیں تھانے دار صاحب۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "قادو اور چودھری رستم کے قتل سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ اس لیے مجھے تو اپنے گھر جانے کی اجازت دیں۔"

"تم یہاں سے سیدھی بڑے گھر جاؤ گی آنٹی یاسمین۔" میں نے بے حد کڑوے انداز میں کہا۔ "سال، دو سال جیل میں چکی پیسو گی تو خود ہی تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے اور یہ نہیں سمجھنا کہ قادو اور چودھری رستم کے قتل سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر ماہ جبیں نہیں ملی تو میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا اس لیے دعا کرو کہ ماہ جبیں کا جلد از جلد سراغ مل جائے اور یہ ثابت ہو کہ تم ان دونوں کے قتل میں ملوث نہیں ہو۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پہلی مرتبہ وہ مجھے سراسیمہ نظر آئی۔ اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں ہوں۔

"وہ دو دن تک تمہارے گھر میں رہی۔" میں نے ایک اہم سوال کیا۔ "پھر کیا بتا کر اسے تم فرید پور والے ڈیرے پر لے گئی تھیں؟"

"قادو کے حوالے سے میں نے ماہ جبیں کو بتایا تھا کہ وہ میرا بھائی ہے۔" وہ بڑی عیاری سے بولی۔ "وہ گوجرانوالہ کے اسٹیشن پر اس لیے اتر گئی تھی کہ اسے شک ہوا تھا، کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ لوگوں کو اس نے بھی بتایا تھا کہ اسے جانا تو آگے تھا لیکن وہ غلطی سے اس اسٹیشن پر اتر گئی مگر حقیقت وہی ہے جو میں نے آپ کو بتائی۔ میں نے اس کے اسی وہم کو استعمال کیا کہ وزیرآباد سے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ میں ایک دن پہلے ہی قادو سے بات پکی کر آئی تھی۔ میں نے ماہ جبیں کو اپنے گھر سے فرید پور والے ڈیرے پر منتقل کرنے کے لیے ایک چال چلی۔ میں نے اسے بتایا کہ ادھر گاؤں میں ایک بندہ بڑے پراسرار انداز میں کسی دراز قامت گوری چٹی لڑکی کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ وہی آدمی ہے جو ٹرین میں تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔ ان حالات میں تمہاری حفاظت کی غرض سے مناسب یہی ہوگا کہ میں تمہیں اپنے بھائی قادو کے ڈیرے پر چند دن کے لیے چھپا دوں۔ بعد میں جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو میں تمہیں واپس لے آؤں گی۔"

"اور اس نے فوراً تمہاری بات مان لی؟"

"جی بالکل!" وہ بڑے فخر سے بولی۔ "اس کے پاس اور کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔"

مجھے آنٹی یاسمین کی بے حسی پر بہت غصہ آیا۔ میں نے تلخ لہجے میں دریافت کیا۔ "تو تمہارے خیال میں جب انسان کے پاس کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہتا تو وہ مجبور ہو جاتا ہے۔"

"تھانے دار صاحب! یہ تو ایک حقیقت ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر اپنے حق میں وہ تمام دعائیں کرنا شروع کر دو جو تمہیں یاد ہیں۔" میں نے بے حد سفاک لہجے میں کہا۔ "کیونکہ اب تمہارے سامنے بھی بچت کا کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہا۔ میں تمہیں بہت بری طرح

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ایک طویل عرصے کے لیے فٹ کرنے والا ہوں۔"
وہ دہشت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے وزیرآباد کا رخ کیا اور وہاں جا کر میں ماہ جبیں کی ماں اور سوتیلے باپ سے ملا اور انہیں حالات حاضرہ سے آگاہ کیا لیکن ان میں سے کسی کو ماہ جبیں کی فکر نہیں تھی۔ اس کی ماں کے نزدیک ماہ جبیں کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ہر وقت الٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کے سوتیلے باپ نے تو یہاں تک کہا کہ ایک رات ماہ جبیں نے اسے قتل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ الغرض ان دونوں کو ماہ جبیں اور اس کے حالات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں وزیرآباد سے واپس گوجرانوالہ آگیا۔ ماہ جبیں منظر سے غائب ہو چکی تھی اور مجھے ہر حال میں اس کی تلاش تھی۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور پورے ضلع میں اسے کھوجنے کی کوشش میں لگا رہا۔ چند روز کے بعد مجھے پتا چلا کہ جس روز آنٹی یاسمین نے ماہ جبیں کو اپنے گھر سے فرید پور پہنچایا تھا، اسی دن پھچھر والی سے ایک نوجوان غائب ہو گیا تھا۔ وہ بھی تا حال مفقود الخبر تھا۔ مذکورہ نوجوان کا نام زاہد بتایا گیا۔ زاہد کبڈی کا بہت ماہر کھلاڑی تھا۔

اس اطلاع نے میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑا دی۔ میری نگاہ کے سامنے قادو کی گردن ٹوٹی لاش گھوم کر رہ گئی۔ قادو کی گردن کا منکا جس ماہرانہ انداز میں توڑا گیا تھا وہ کسی پہلوان یا کبڈی کے کسی کھلاڑی کا ہی کام ہو سکتا تھا۔

میں نے پھچھر والی کے چند دانش مند افراد سے معلومات اکٹھا کر کے اپنے آرٹسٹ سے زاہد کا خاکہ تیار کروایا اور زیادہ شدومد کے ساتھ زاہد اور ماہ جبیں کو تلاش کرنے لگا۔ میرے ذہن میں اس کیس کی کڑیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اب مجھے اپنی اس سوچ کی عملی تعبیر چاہیے تھی۔

تین ماہ کے بعد مجھے یہ تعبیر مل گئی۔ محلہ شاہین آباد سے میں ان دونوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انہوں نے شادی کر لی تھی اور میاں بیوی کی حیثیت سے وہاں رہ رہے تھے۔ ماہ جبیں کی کہانی آپ کے علم میں آچکی ہے۔ زاہد کے بارے میں، میں مختصراً آپ کو بتا دیتا ہوں۔ تھوڑے لکھے کو زیادہ سمجھیں گے تو سمجھدار کہلائیں گے۔

زاہد کا تعلق پھچھر والی سے تھا اور وہ آنٹی یاسمین کے کردار سے اچھی طرح واقف تھا۔ ماہ جبیں پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ دل ہار بیٹھا۔ ماہ جبیں کو اس کے جذبات کی خبر نہیں تھی تاہم زاہد نے ٹھان لی تھی کہ وہ ماہ جبیں کو ہر قیمت پر بچائے گا۔ وہ غیر محسوس انداز میں آنٹی یاسمین کے پیچھے فرید پور والے ڈیرے پر پہنچ گیا اور اسٹور روم میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اسے رات کا انتظار تھا جب وہ چپکے سے ماہ جبیں کو لے اڑتا۔ پھر جب رات ہوئی اور چودھری رستم کی آمد کے بعد ڈیرے پر قابل مذمت گھناؤنے کھیل کا آغاز ہوا تو زاہد فوراً حرکت میں آگیا۔ اس نے اسٹور روم میں سے آہنی پانا اٹھایا اور قادو کی نظر بچا کر وہ رستم والے بیڈروم میں گھس گیا۔ رستم کو ایسی کسی مداخلت کی توقع نہیں تھی۔ پھر وہ نشے میں چُور بھی تھا۔ زاہد نے اسے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا اور اس کے سر کے عقبی حصے میں وزنی رینچ کی ضرب لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ منظر دیکھ کر ماہ جبیں نے وحشت زدہ انداز میں باہر کی سمت دوڑ لگا دی تھی۔ باہر قادو موجود تھا۔ وہ ماہ جبیں کو پکڑنے کے لیے دوڑا۔ قادو کے پیچھے زاہد نے دوڑ لگا دی۔ رینچ پانے کو وہ رستم کے کمرے ہی میں پھینک آیا تھا۔

وہ تینوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے نہر کے اندر اتر گئے۔ زاہد نے جلد ہی قادو تک رسائی حاصل کر لی اور پلک جھپکتے میں ایک جھٹکے سے اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالا۔ پہلے پہل ماہ جبیں یہی سمجھی تھی کہ یہ وہی بندہ ہے جو وزیرآباد سے اس کے تعاقب میں ہے لیکن جب زاہد نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ زاہد کے ہاتھوں سے دو انسان قتل ہو چکے تھے لہٰذا واپس پھچھر والی جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

انہوں نے باہمی مشاورت سے ایک فیصلہ کر لیا۔

ان تمام تر حالات و واقعات میں ماہ جبیں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے کسی قدم پر ایک معمولی سا جرم بھی نہیں کیا تھا اور گرفتاری کے وقت وہ امید سے بھی تھی۔ زاہد کی اولاد نے اس کے بطن میں اپنی زندگی کا سفر شروع کر دیا تھا۔ وہی زاہد جو ماہ جبیں کا اجنبی محسن اور دو افراد کا قاتل تھا۔ میں نے زاہد کے لیے جس سزا کا انتخاب کیا وہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

یہ آپ کی ذہانت کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اپنی ذہانت کو آزما کر خود کو سسپنس کا ذہین قاری ثابت کریں......

(تحریر: حُسام بٹ)

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دو پیار کرنے والے دلوں کے ارمانوں کے قتل کی عجیب روداد

بعض اوقات سب سے زیادہ اپنا... سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ انسان جس پر بھروسا کرتا ہے وہی کاری وار کرجاتا ہے۔ ایسے ہی ایک راز کی پردہ داری اسے بھی مقصود تھی کیونکہ... اسے اپنی جان کی پروا نہیں بلکہ اپنی چاہت کی عزت عزیز تھی۔

راز

اعتزاز سلیم وصلی

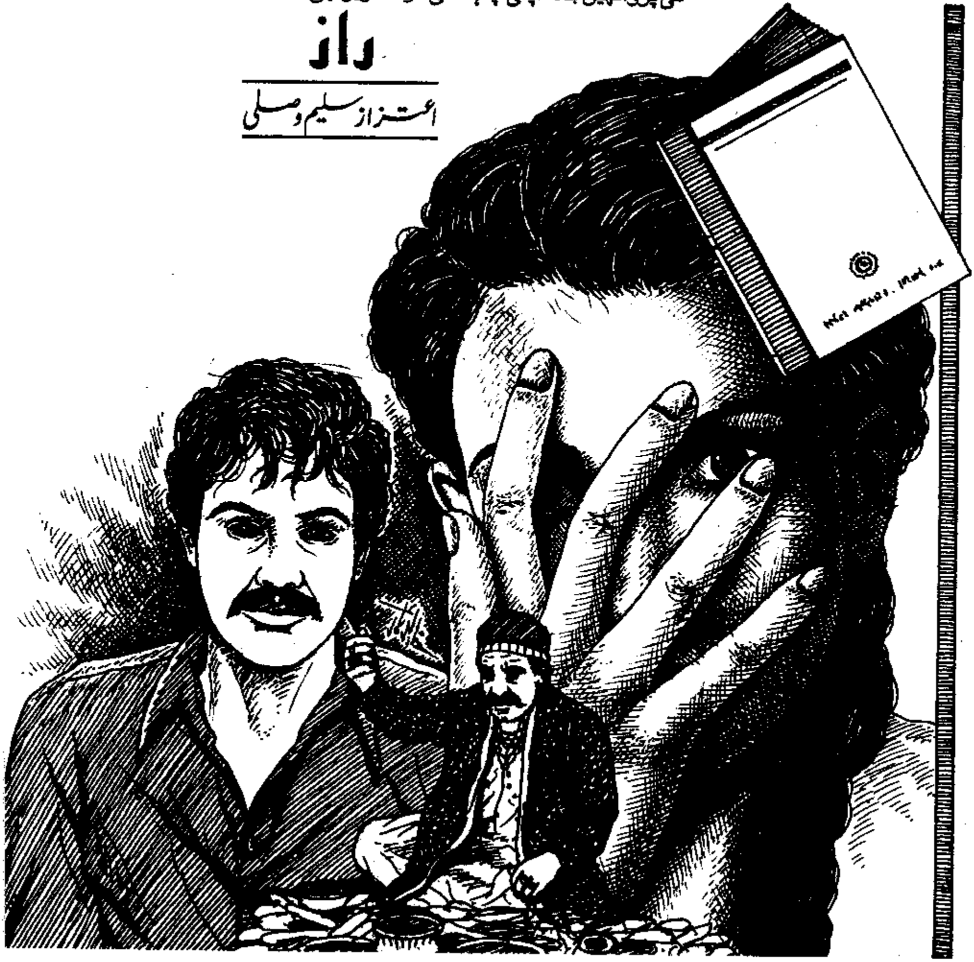

سردرات نے اپنے ڈیرے ڈالے تو بیگم نے برآمدے سے کمرے میں بلالیا۔ کھانا کھا کر اکثر میں برآمدے میں ہی بیٹھ جاتا ہوں۔ وقت اچھا گزر جاتا ہے، ان لمحات کی یاد میں جو گزرے ماہ و سال نے مجھے سونپے ہیں۔ میرے ہاتھ میں اکثر رجسٹر ہوتا ہے جس پر میں کچھ لکھتا رہتا ہوں۔

''اس رجسٹر میں کچھ خاص ہے؟'' کمرے کی طرف آتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''کیوں؟''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"اس کو بہت سنبھال کر رکھتے ہیں آپ...... کبھی پڑھنے بھی نہیں دیا۔"

"ہاں بس ویسے ہی۔" وہ رجسٹر میں نے الماری میں رکھ دیا۔ کمرے میں آتے ہی میں نے کمبل اپنے گرد لپیٹ لیا۔ "سردی بڑھ رہی ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے ناصرہ کی طرف دیکھا۔

"کہاں......؟" اس نے منہ بنایا۔ "پتا نہیں موسم کو کیا ہو گیا ہے پہلے سردی کا موسم بھی کم از کم چار ماہ کا ہوتا تھا۔ اب تو بس یہ ایک آدھ ماہ مشکل سے پڑتی ہے۔"

"ارے آپ جیسے جوان لوگوں کو کیا سردی لگے گی، مجھ غریب کو ہی لگتی ہے بس۔" یہ کچھ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں سرد ہوا اکثر درد پیدا کر دیتی تھی۔

"خبریں سنیں......!" اس نے ٹی وی آن کیا۔ ہم دونوں بس خبروں کی حد تک ٹی وی دیکھتے ہیں۔ ہیڈ لائنز سن کر ہی ناصرہ نے بور ہو کر ٹی وی بند کر دیا اور چائے بنانے چلی گئی۔ میں نے پاس پڑی کاپی اٹھالی اور پنسل سے کچھ لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں دو کپ تھے، ایک اس نے مجھے پکڑایا اور دوسرا اپنے منہ سے لگالیا۔

"آج کیا لکھ رہے ہیں جناب؟" اس نے کاپی اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم دونوں اسکول ٹیچر تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ میں ایک لکھاری ہوں۔ صبح اور شام کو کچھ بچے پڑھنے آجاتے ہیں تو ہماری تنہائی دور ہو جاتی ہے، ورنہ اکثر ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا دل بہلا رہے ہوتے ہیں۔ بے اولاد جوڑے بڑھاپے میں اکثر ایسے ہی دن گزارتے ہیں۔ کاپی پر لکھے گئے پہلے دو صفحات پڑھ کر ہی بیگم بول پڑی۔ "یہ تو سچ بیانی لگ رہی ہے مجھے؟"

"ہاں، یہ سچ بیانی ہی ہے۔"

"اچھا...... مکمل کب کریں گے؟"

"ابھی کچھ وقت ہے۔"

"مگر مجھے ابھی سننی ہے۔"

"کیوں؟"

"بس میرا دل کر رہا ہے۔"

"نہیں، میگزین میں شائع ہو گی تب پڑھ لینا۔" میں نے انکار کیا۔

"نہیں نعیم، ابھی سنائیں۔" اس نے جیسے ضد پکڑلی۔

"اچھا چلو سناتا ہوں۔" میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

رات کے گزرتے لمحات کے ساتھ میں نے ماضی کے ورق کھنگالنے شروع کر دیے جہاں دکھ اور زخموں کی یادوں کو الفاظ میں ڈھال کر بیان کرنا، میرے لیے واقعی ایک مشکل کام تھا۔

☆☆☆

بیسویں صدی کے آغاز میں دنیا ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی۔ تبدیلیاں آرہی تھیں اور جدید سے جدید ٹیکنالوجی دنیا کو اپنے گھیرے میں لے رہی تھی۔ میں نے عمر کے پچیسویں سال میں قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے جاب مل گئی۔ وہ بھی میری پسندیدہ یعنی ٹیچنگ کی فیلڈ میں۔ ٹیچنگ میرا بچپن کا جنون تھا اور ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ جاب کے آغاز میں ہی مجھے لاہور سے کافی فاصلے پر ایک چھوٹے سے گاؤں کے پرائمری اسکول میں بطور ہیڈ ماسٹر کام کرنا پڑا۔ پورا اسکول میری نگرانی میں تھا کیونکہ طلبہ کی تعداد صرف اسی تھی جن کو پڑھانے کے لیے ایک ٹیچر کافی تھا۔ وہ تو محکمۂ تعلیم کا شکریہ جنہوں نے مجھے ہیڈ ماسٹر کا گریڈ دے دیا۔ میرے جذبے جوان اور حوصلے بلند تھے۔ ان دنوں میری رہائش گاہ اسکول کا ہی کمرا تھی جبکہ کھانے پینے کا بندوبست چودھری ابراہیم نے کر دیا تھا۔ چودھری ابراہیم اس گاؤں کے سربراہ ٹائپ شخصیت تھے۔ خود تو صرف پرائمری تک پڑھے تھے مگر انہیں بچوں کو پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اس کا ثبوت ان کا بیٹا رحیم تھا جو میرے پاس پڑھنے آتا تھا۔ اکثر دیہاتوں کی طرح یہاں بھی جہالت عروج پر تھی۔ میں اس دیہات کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا، پرانی سوچ رکھنے والے لوگوں کے بجائے میں اس نئی نسل کو سدھارنے کی کوشش کرنے لگا۔ مارچ کے مہینے میں تمام بچوں کے ایگزام ہوئے اور بیس سے اکتیس مارچ تک چھٹیاں ہو گئیں۔

بہار کا موسم شاید گاؤں کے لیے آتا ہے۔ ہر طرف سبزہ، کھیتوں میں گندم کی فصل ہلکی ہلکی ہوا میں جھوم کر مستی کرتی تو میرا دل مچل اٹھتا۔ میں بچوں کے پیپر اٹھا کر کھیتوں میں چلا جاتا جہاں رحیم چارپائی ڈال دیتا اور اس خوبصورت موسم میں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر میں مارکنگ کرتا۔ میں نے گھر واپس جانے کے بجائے یہیں رہنے کا سوچ لیا تھا۔ سیل فون عام نہیں تھے۔ گھر رابطہ کرنے کے لیے اکثر مجھے دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے دوسرے قصبے میں جانا پڑتا اور وہاں سے پی سی او سے کال کرتا تھا۔ وہ بیس مارچ کی خوبصورت صبح تھی جب میں چودھری ابراہیم کے گھر آیا۔ گرمیوں کی آمد پر سورج اپنے جوبن پر تھا۔ پسینے کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہلکی ہلکی بوندیں میرے ماتھے پر چمک رہی تھیں کیونکہ میں اسکول سے یہاں پیدل آیا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ رحیم باہر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے سلام کیا۔ میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''تمہارے ابو کہاں ہیں رحیم؟''

''وہ باہر گئے ہیں استاد جی۔''

''اچھا، کتنی دیر تک آئیں گے؟''

''بس آنے والے ہیں۔ آپ آئیں بیٹھک میں بیٹھ جائیں۔'' وہ دروازے سے غائب ہوا اور بیٹھک کا دروازہ کھولا۔ بیٹھک روایتی گاؤں کے کمرے جیسی ہی تھی۔ مہمانوں کو بٹھانے کے لیے یہاں کرسیاں اور چارپائی رکھی گئی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کیا کام ہے ابو سے آپ کو استاد جی؟'' رحیم بہت سمجھ دار تھا اور میرا بہت احترام کرتا تھا۔ اس لیے میرے سامنے بیٹھنے کے بجائے زمین پر بیٹھ گیا۔

''گھر والوں کو کال کرنے جانا ہے بیٹا، موٹر سائیکل لینی تھی۔'' پورے گاؤں میں بس چند ایک ہی موٹر سائیکلیں تھیں ورنہ اکثر لوگ سائیکل پر سفر کرتے تھے۔

''اچھا، ابو جی بس آنے والے ہیں ضروری کام سے گئے تھے۔'' رحیم نے بتایا۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک اندر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ رحیم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مجھے اس کے چہرے پر خوف کے آثار دکھائی دیے۔

''کیا بات ہے رحیم؟'' میں نے پوچھا۔

''کک، کچھ نہیں استاد جی!'' وہ ہکلایا مگر وہاں کچھ تھا اور وہ جلد سامنے آگیا۔ یہ بائیس سال کی لڑکی تھی۔ چہرے کے نقوش بہت پیارے اور رنگت گندمی تھی۔ گاؤں کی اکثر جوان لڑکیوں کی طرح اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ وہ چلاتی ہوئی بیٹھک میں آگئی اور بلند آواز سے کہنے لگی۔

''چلے جاؤ یہاں سے، بھاگ جاؤ...... میں کھا جاؤں گا۔'' اس کی آنکھوں میں جنون کی سی کیفیت تھی۔ رحیم خوفزدہ انداز میں میرے پیچھے ہو گیا۔ ''میں بہت برا ہوں، میں تباہ کر دوں گا سب کو۔'' وہ اپنے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس نے اپنا دوپٹا اتار پھینکا اور واپس گھر کی جانب دوڑ گئی۔ اتنے میں باہر موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ چودھری ابراہیم واپس آ گئے تھے۔ پینتالیس سال کی عمر میں بھی ان کی صحت قابلِ رشک تھی مگر لڑکی کی یہ حالت دیکھ کر وہ سخت تکلیف میں دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ تیس سال کا درمیانے قد والا ایک شخص تھا۔ اس کی توند بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی قسم کا نشہ کرتا ہے۔ میں نے رحیم سے پوچھا۔

''یہ کون ہیں؟''

''پیر صاحب ہیں، احمد شاہ نام ہے ان کا۔''

''یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''ابو جی لے کر آئے ہیں۔ باجی پر سایہ ہے۔ اس کا علاج کرتے ہیں یہ۔''

''لعنت اس پر اور اس کے علاج پر۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور زبان سے بولا۔ ''کیسے کرتا ہے علاج؟''

''ابھی کریں گے تو آپ دیکھ لینا۔'' اور وہ شخص اندر بڑھ گیا۔ بیٹھک کا دروازہ جو گھر میں کھلتا تھا، اس سے میں نے اندر جھانکا۔ احمد شاہ نامی وہ پیر ہاتھ میں ڈنڈا لیے اندر لڑکی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے گھما کر ڈنڈا لڑکی کے پیر پر مارا اور بارعب لہجے میں بولا۔

''بھاگ جا، تو جو کوئی بھی ہے، بھاگ جا، چھوڑ دے اس بیچاری کی جان۔'' میرے دل سے آہ نکلی۔ وہ شخص صاف ڈراما کر رہا تھا۔ لڑکی چلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ کہہ رہی تھی۔

''نہیں جاؤں گا، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' کچھ دیر یہ ڈراما جاری رہا۔ وہ گھما کر ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا لڑکی کو مارتا اور لڑکی چلانے لگتی۔ آخر لڑکی گری اور بے ہوش ہو گئی۔ چودھری آگے بڑھا اور اسے سنبھال لیا۔ رحیم نے باپ کا ساتھ دیا اور لڑکی کو ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد چودھری ابراہیم اور رحیم کے ساتھ وہ پیر صاحب بیٹھک میں تشریف لے آئے۔ ابراہیم نے مجھ سے ہاتھ ملا کر دیر سے آنے کی معذرت کی۔ پیر احمد شاہ کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

''چودھری صاحب! اب کافی بہتری آجائے گی، ایک دو بار یہ عمل دہرانے سے سایہ دور ہو جائے گا۔''

''مگر پیر جی! پچھلی بار بھی آپ نے ایسا ہی کہا تھا۔'' چودھری صاحب کچھ الجھن میں تھے۔

''میرا اندازہ غلط تھا، یہ کوئی ضدی جن ہے جو اس معصوم کی جان کو چمٹ گیا ہے۔ جان چھوڑ دے گا مگر مشکل سے۔'' اس کا لہجہ اس کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے یہ بات محسوس کی مگر چپ رہا کیونکہ گاؤں کے لوگ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اکثر پیروں کے معاملے میں شدت پسند ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ روانہ ہوا تو اس کے ہاتھ میں ہزار کا نوٹ دکھائی دیا۔ البتہ چودھری صاحب کا چہرہ پریشانی کی گواہی دے رہا تھا۔

''چودھری صاحب! میں اور رحیم ساتھ والے گاؤں جا رہے ہیں، مجھے گھر کال کرنی ہے۔'' میں نے اجازت مانگی۔ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی اور اپنی موٹر سائیکل کی چابی نکال کر دے دی۔ کال کر کے واپس آتے ہوئے میں اور رحیم ایک ریڑھی کے قریب رک گئے۔ ہم نے فروٹ چاٹ منگوائی اور قریب ہی بینچ پر بیٹھ گئے۔ یہاں ایک بار پھر رحیم نے زمین پر بیٹھنا چاہا مگر میں نے زبردستی اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ فروٹ چاٹ کھاتے ہوئے میں نے رحیم سے گھر میں پیش آنے والے مسئلے کی تفصیل پوچھی۔ اس نے تھوڑے تذبذب کے بعد جو باتیں بتائیں، ان کا خلاصہ یہ تھا۔

☆☆☆

ابراہیم کی ایک ہی بیٹی سلمٰی تھی جس کی پیدائش کے تقریباً دس سال بعد بیٹا رحیم پیدا ہوا تھا۔ عام گاؤں والوں کے برعکس ابراہیم نے بیٹے اور بیٹی میں کبھی فرق نہیں کیا تھا۔ سلمٰی گھر بھر کی لاڈلی بچی تھی۔ اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی۔ یہاں تک کہ گاؤں کی وہ واحد لڑکی تھی جس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے پڑھنے کا جنون تھا۔ وہ خوبصورت بھی تھی۔ سلمٰی نے جیسے ہی عمر کے اٹھارویں سال میں قدم رکھا اس کے رشتے آنے شروع ہو گئے۔ ابراہیم کو اس کے لیے کسی اچھے پڑھے لکھے لڑکے کی تلاش تھی جو ساتھ والے گاؤں کے نمبردار کے بیٹے عادل پر ختم ہوئی۔ عادل چوبیس سال کا تھا جس نے ایف اے کیا تھا اور وہ ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ اس کا رشتہ جیسے ہی سلمٰی کے لیے آیا، قبول کر لیا گیا۔ پہلے منگنی ہوئی اور پانچ ماہ بعد نکاح بھی ہو گیا۔ عادل پُرجوش نوجوان تھا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے جب ملک سے باہر جانے کا رواج بڑھنے لگا تو اس نے بھی ویزے کے لیے اپلائی کیا اور فرانس جا بسا۔ ایسے میں اسے اپنے دل میں جگہ دینے والی سلمٰی اس کی واپسی کے دن گننے لگی۔ کچی عمر کے یہ روگ ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ایسا ہی روگ سلمٰی کو لگ گیا تھا جسے پردیس میں جانے والے پردیسی کی واپسی کا انتظار تھا۔ دو سال اس انتظار میں بیت گئے اور جب وہ واپس آیا تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اپنے گاؤں کی مٹی اسے دھول لگتی تھی جس سے سانس کی بیماری ہونے کا خطرہ تھا۔ گاؤں کے باقی لوگ اس کے نزدیک جاہل تھے۔ اس لیے اس نے گاؤں سے جانے کا فیصلہ کر لیا اور شہر میں اپنا کاروبار کرنے لگا۔

چودھری ابراہیم اس کے بدلتے رنگ دیکھ چکا تھا۔ بیٹی کے مستقبل سے خوفزدہ ہو کر اس نے عادل کے باپ سے رخصتی کی بات کی مگر عادل کے باپ کے بجائے عادل کا جواب آیا جو ایک طلاق نامے کی شکل میں تھا۔ عادل نے شہر میں ہی شادی کر لی تھی۔ ابراہیم کے گھر پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک ہی بیٹی تھی اور اس کے نصیب میں رخصتی سے پہلے ہی طلاق یافتہ ہونے کا داغ لکھ دیا گیا تھا۔ اس حادثے کے بعد پورے گھر میں چپ نے ڈیرے ڈال لیے۔ عجب اداسی کا موسم رہتا۔ رحیم کی شرارتیں بھی کسی کو ہنسانے میں ناکام رہتیں۔ سب سے زیادہ اثر سلمٰی پر پڑا جو بے قصور تھی مگر قصوروار ٹھہرائی جاتی۔ یوں زندگی کے آٹھ ماہ اسی طرح گزر گئے۔ عادل شہری بیوی کو لے کر گاؤں آ بسا۔ سننے میں آیا تھا کہ اسے کاروبار میں نقصان ہوا ہے۔ سلمٰی کے لیے اب کوئی رشتہ نہیں آتا تھا۔ طلاق یافتہ لڑکی کو سب عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے۔ رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آنے لگی تھی کہ ایک اور طوفان... تباہی لے آیا۔ سلمٰی پر عجیب قسم کے دورے پڑنے لگے تھے۔ وہ رات کو گھر سے غائب ہو جاتی اور اکثر صبح کی اذان سے کچھ پہلے چیختے ہوئے گھر میں داخل ہوتی۔ وہ خود کو مرد کہتی تھی اور سب کو کہتی کہ مجھ سے دور رہو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ ابراہیم نے ہر طرح کا علاج کروایا مگر نتیجہ صفر تھا۔ کچھ دنوں سے احمد شاہ آ کر سلمٰی کو بری طرح تشدد کا نشانہ بناتا مگر چند دن نارمل رہنے کے بعد سلمٰی دوبارہ پھر اسی طرح ہو جاتی تھی۔ نیک دل لوگوں کا یہ گھرانا سخت مشکل میں تھا۔

☆☆☆

ساری بات سننے کے بعد میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ بارہ سال کا رحیم اداس دکھائی دیا۔ مجھے اس بچے پر ترس آ رہا تھا۔ واپسی پر میں نے ابراہیم سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بیٹھک کے باہر لگے کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر حقہ منہ سے لگائے گہری سوچ میں گم تھے۔ ''چودھری صاحب! یہ حقہ بری عادت ہے، چھوڑ دیں۔'' میں ان کے قریب بیٹھ کر بے تکلفی سے بولا۔

''ارے نہیں میاں، یہ حقہ تو ہم گاؤں والوں کے لیے ایک نعمت ہے، اور کچھ نہ ہو تو اسے ہی منہ سے لگا کر دل

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بہلا لیتے ہیں۔'' وہ پھیکے انداز میں مسکرائے۔
''چودھری صاحب! ضروری بات کرنی ہے آپ سے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
''حکم کرو میاں، کیا بات ہے؟'' وہ مجھے ''میاں'' یا ''ماسٹر جی'' کہہ کر پکارتے تھے۔
''آپ کی بیٹی سلمٰی کا مسئلہ کچھ سمجھ نہیں آیا؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ انہوں نے گہری سانس لی اور اداس لہجے میں جواب دیا۔
''بس ماسٹر جی، شاید زندگی میں کیے گئے کچھ گناہوں کی سزا مل رہی ہے مجھے۔''
''مگر چودھری صاحب! جو طریقہ احمد شاہ صاحب نے اپنایا ہے وہ درست نہیں۔''
''یہاں سائے کو بھگانے کے لیے یہی علاج کیا جاتا ہے۔''
''یہ سائے، جن بھوت، بس قصے کہانیاں ہیں۔ ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر نفسیاتی مسائل میں ان کو گھسیٹ لانا کہاں کی عقل مندی ہے؟''
''تم شہر سے آئے ہو ماسٹر جی، ایسے ہی کہو گے۔ ہم دیہاتی لوگ ہیں ہمیں کیا خبر؟''
''خدا نے عقل ہر انسان کو دی ہے چودھری صاحب، چاہے وہ گاؤں میں رہتا ہو یا شہر میں...... بس چیزوں کو گہرائی سے سوچنا آنا چاہیے۔'' میں نے انہیں سمجھانا چاہا۔
''تو میاں آپ ہی بتاؤ کیا کروں میں؟'' وہ بے بسی سے بولے۔
''اس کا علاج شہر میں کروائیں کسی اچھے نفسیات کے ڈاکٹر سے۔''
''مگر کیسے لے جاؤں جوان بیٹی کو شہر میں؟''
''اگر اس کی زندگی منظور ہے تو ضرور لے جائیں ورنہ احمد شاہ مار مار کر اس کی جان لے لے گا۔'' مجھے غصہ آگیا۔
''میں کچھ سوچتا ہوں۔'' ان کے انداز میں رضامندی تھی۔ شاید وہ خود بھی احمد شاہ کے طریقہ علاج سے مطمئن نہیں تھے۔ میں نے دس پندرہ منٹ اور ان کو سمجھایا اور کافی حد مطمئن کردیا۔ کچھ دیر بعد جب میں وہاں سے اٹھا تو چودھری ابراہیم سوچ میں گم تھے۔

☆☆☆

بائیس مارچ کی دوپہر کو ٹھنڈی ہوا نے ماحول کو خوشگوار بنا رکھا تھا۔ میں اپنے ساتھ لائے ہوئے ناولوں کے ڈھیر میں سے چند ناول نکال کر لایا اور اسکول کے میدان سے تھوڑا دور ہٹ کر ایک درخت کی نرم چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ نیچے

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔
المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دری پڑی تھی جس پر بچے بیٹھتے تھے۔ میں اس پر لیٹ کر ناول پڑھنے ہی لگا تھا کہ رحیم آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں لسی سے بھرا جگ تھا۔ "ارے رحیم! یہ تکلیف کیوں کی؟"

"اباجی نے کہا ہے آج دھوپ تیز ہے تو استاد صاحب کو دے آؤ۔" ٹھنڈی اور میٹھی لسی نے موسم کا مزہ دوبالا کر دیا۔ دو تین گلاس پی کر میں نے منہ صاف کیا۔

"شکریہ بول دینا چودھری صاحب کو۔"

"آپ خود بول دیں استاد جی، انہوں نے بلایا ہے آپ کو۔" رحیم نے بتایا۔

"اچھا......" مجھے حیرت ہوئی۔ "کیا کام ہے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں ناول واپس کمرے میں رکھ کر رحیم کے ساتھ ہی چل پڑا۔

چودھری صاحب آج بیٹھک میں لیٹے ہوئے تھے۔ میں سلام کر کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"خیریت ہے چودھری صاحب؟"

"ہاں، دراصل آج میں نے نہیں، سلمٰی نے تمہیں بلایا ہے۔" انہوں نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"سلمٰی نے؟" میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ "اسے مجھ سے کیا کام؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔"

"اس کی طبیعت......"

"ایسا کچھ نہیں۔" ابراہیم نے میری بات کاٹی۔ "وہ بالکل ٹھیک ہے ابھی۔ بس ہفتے میں ایک آدھ بار دورہ پڑتا ہے جب رات کو غائب ہوتی ہے۔"

"اچھا، چلو میں مل لیتا ہوں اس سے۔" میں نے رضامندی ظاہر کی تو چودھری نے رحیم کو آواز دی۔

"ماسٹر صاحب کو سلمٰی کے کمرے میں لے جاؤ۔"

گاؤں میں پردے کی کافی سختی ہوتی ہے مگر اس وقت بات کچھ اور تھی جس کی وجہ سے چودھری صاحب نے مجھے اندر جانے دیا۔ سلمٰی ایک کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ کمرے میں بیڈ موجود تھا اور نیچے قالین بچھا تھا۔ یہ شاید اسی کا کمرا تھا جو گھر کے گیٹ کے قریب تھا۔ سلمٰی کی عمر بائیس سے کچھ اوپر ہوگی جبکہ چہرے کے نقوش بہت پیارے تھے۔ اس کی شخصیت میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز اس کی سیاہ آنکھیں تھیں جن میں آج دیوانگی کے بجائے سکون نظر آرہا تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں لگا کہ ان آنکھوں میں ایک دنیا آباد ہے۔ چند لمحات کے لیے سہی مگر میں اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب گیا۔ وہ ہلکے سے کھانسی۔ شاید میرا اس طرح دیکھنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے مدھم آواز میں مجھے سلام کیا۔ میں نے سر ہلا کے جواب دیا۔

"خیریت؟ آپ نے مجھے کیوں بلایا؟" میں ڈائریکٹ مطلب کی بات پر آ گیا۔ میں اس خطرناک حسن رکھنے والی لڑکی کے ساتھ زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔

"رحیم بتا رہا تھا آپ کہانیاں لکھتے ہیں؟"

"جی، لکھتا ہوں۔"

"میں نے چند تحریریں پڑھی ہیں آپ کی۔" اس نے قریب پڑے رسائل کی طرف اشارہ کیا جو رحیم مجھ سے چند دن پہلے لایا تھا۔ "نعیم صاحب! آپ بہت اچھا لکھتے ہیں، زندگی کی تلخ سچائیوں کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا ایک مشکل کام ہے جسے آپ بخوبی کرتے ہیں۔" وہ میری تعریف کر رہی تھی لیکن میں اس کے الفاظ سن کر حیران ہو رہا تھا۔ وہ کہیں سے بھی چند دن پہلے والی سلمٰی نہیں لگ رہی تھی۔

"شکریہ......"

"میں آج آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی بولیں؟"

"میں آپ کو کچھ باتیں بتاؤں گی جسے آپ کہانی کی شکل میں لکھیں گے۔" حیرانی کا ایک جھٹکا لگا۔

"مگر کیوں؟"

"بس ہیں کچھ وجوہات۔ بلکہ ہو سکتا ہے آپ کو میری چند باتوں کی سمجھ نہ آئے اس لیے یہ رجسٹر پاس رکھ لیں اور میری باتیں لکھنا شروع کر دیں۔" اسے جیسے یقین تھا کہ میں اس کی بات مان لوں گا اور ایسا ہی ہوا۔ کچھ سیکنڈز کے لیے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ وہ مدھم لہجے میں بولنا شروع ہوئی۔

"وہ بالکل پہلے جیسا تھا، وہی آنکھیں، وہی لہجہ، وہی باتیں...... میں اس کے سحر میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے آزاد کیا مگر مجھے آزادی نصیب نہ ہوئی۔ میری روح میں وہ موسم ٹھہر چکا تھا، میری زندگی صرف اس کے نام تھی۔" یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور دنیا میں گم ہے۔ میں تیز تیز لکھ رہا تھا۔ "وہ بدلا نہیں تھا مگر اچانک ہمارے درمیان کوئی آ گیا۔ اس نے ہماری دنیا اجاڑ دی۔ وہ جو کہتا ہم وہ کرتے تھے، یہ جانے بغیر کہ وہ ہمیں تباہ کر رہا ہے۔" مجھے ایسا لگا جیسے اس پر پھر دیوانگی طاری ہو جائے گی مگر وہ سنبھل گئی۔

"آپ کل پھر آنا میں آپ کو پوری بات بتاؤں گی۔" اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اتنے میں چودھری صاحب کے گھر کام کرنے والی ماسی نذیراں اندر داخل

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہوئی۔ سلمٰی نے مجھے باہر جانے کی اجازت دے دی اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا باہر آگیا۔ کافی وقت گزر چکا تھا۔ دھوپ ڈھل رہی تھی۔ بیٹھک میں چودھری ابراہیم میرے لیے کھانا لیے بیٹھے تھے۔ میں وہیں بیٹھ کر کھانے لگا۔ وہ کچھ جاننے کے لیے بے چین تھے مگر میرے چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ کر خاموش رہے۔ کھانا کھا کر میں نے ان سے کہا۔

"سلمٰی کچھ سیکھنا چاہ رہی ہے۔ مجھے اس لیے مجھے کچھ دن مزید یہاں آنا ہوگا۔ آپ رحیم کو بھیج دیا کریں۔" چودھری صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

اس شام وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سلمٰی پر آج پھر دیوانگی طاری ہوگی۔ رات دس بجے تک میں جاگتا رہا۔ اسکول کے پاس ہی زمیندار عبداللہ کا گھر تھا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میں نے اس سے کہہ کر چائے منگوائی اور رات کو جاگنے کا فیصلہ کرلیا۔ چائے کے تین کپ پی کر میں رات بارہ بجے کے قریب چودھری ابراہیم کے گھر کے پاس چلا گیا۔ شہری زندگی میں رات بارہ بجے کچھ زیادہ وقت نہیں، آدھے سے زیادہ شہر جاگ رہا ہوتا ہے مگر گاؤں میں ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس خاموشی میں دور کسی کھیت سے گیدڑوں کے چلانے یا کتوں کے بھونکنے کی آواز خلل دیتی تھی۔ گھر کے پاس کھڑے مجھے ابھی کچھ دیر ہوئی تھی کہ میں نے ایک سائے کو گیٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ کھیتوں کی سمت جا رہا تھا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ گاؤں میں اگر یوں ہمیں کوئی دیکھ لیتا تو قیامت آجاتی۔ چودھری ابراہیم کے گھر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ٹیوب ویل تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرا بھی بنا ہوا تھا۔ یہ کھیتوں کی رکھوالی کرنے والے استعمال کرتے تھے۔ میں نے چال سے محسوس کیا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ بہرحال وہ جو کوئی بھی تھا، ٹیوب ویل کے پاس کھڑے ایک آدمی سے ملا۔ آدمی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر میں نے گہری سانس لی۔ وہ سلمٰی نہیں تھی۔ سامنے والا آدمی بھی میرے لیے اجنبی تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن موسم گرم تھا۔ دوپہر دو بجے رحیم مجھے لینے آیا۔ میں اس کے ساتھ چلا آیا۔ آج چودھری ابراہیم گھر پر نہیں تھے۔ سلمٰی کی ماں بھی شاید کسی کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھی۔ سلمٰی نے رسمی کلمات کے بعد مجھے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "کچھ راز، راز ہی اچھے لگتے ہیں۔ یہ اگر کھل جائیں تو حقیقت تکلیف دیتی ہے، اس لیے یہ جاننے کی کوشش بھی مت کریں۔" اس کی بات سن کر ... گیا۔ ایسا لگا جیسے وہ میرے تعاقب کے بارے ...

"راز تب تک راز اچھے لگتے ہیں جب ... کسی اپنے کو تکلیف نہ ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"کہنے اور سہنے میں فرق ہے نعیم صاحب...... آپ لکھاری ہیں، لکھ سکتے ہیں، خیالی دنیا بنا سکتے ہیں مگر اپنے کردار کی تکلیف نہیں محسوس کرسکتے جن سے وہ گزر رہے ہوتے ہیں۔" وہ مسکرائی۔ آج وہ بالکل نارمل نظر آرہی تھی۔ بیڈ پر چند تصویریں بکھری پڑی تھیں۔

"یہ تصویریں کیوں بکھری پڑی ہیں۔" میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔

"عجیب چیز ہیں یہ تصویریں، ان یادوں کو سنبھال کر رکھتی ہیں جو کبھی بھولتی نہیں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر سب تصویروں کو سمیٹ لیا۔ ان تصویروں میں سلمٰی کے ساتھ اس کی فیملی نظر آرہی تھی۔ ایک تصویر شاید اس کے نکاح کے وقت کھینچی گئی تھی۔

"آپ کچھ لکھوانا چاہتی تھیں؟"

"ہاں یہ لیں۔" اس نے رجسٹر اٹھا کر دیا۔ "وقت کی ریت پر یادوں کے نشان مٹانا مشکل تھا اور داغ برداشت کرنا ناممکن۔ جب وہ لوٹ آیا تو میں نے سوچا کہ اب اس کی محبت ختم ہوچکی ہے مگر نہیں، اس کے ایک اشارے پر میں اس کے قدموں میں جھک گئی۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

اچانک اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور چلائی۔ "نذیراں......!"

نذیراں بھاگ کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں بالٹی تھی اور اس میں راکھ بھری ہوئی تھی۔ سلمٰی نے منہ بالٹی کے اندر کیا اور کھایا پیا اگل دیا۔ وہ تین منٹ تک... لمبی سانس لینے کے بعد وہ خاموش ہوگئی۔ نذیراں پانی لے کر اندر آئی۔ پانی پی کر اس کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور معذرت کرکے بولی۔ "طبیعت کبھی کبھی خراب ہوجاتی ہے۔" نذیراں چپ چاپ وہاں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے نذیراں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ "محبت کیا ہے اور ہوس کیا ہے، مرد اور عورت کا رشتہ کیا ہے۔ اس کا فیصلہ شاید کوئی نہ کرسکے مگر مجھے وہ سب کچھ غلط نہیں لگ رہا تھا۔ ہم نے بہت سارا وقت ایک ساتھ گزارا۔ مجھے اس سے ملنا تھا کسی بھی طرح، چاہے مار کھانی پڑتی یا ڈراما کرنا پڑتا۔ وہ میرے لیے سب کچھ تھا۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "آپ یہ سب سن کر مجھ سے نفرت کریں گے۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''نہیں، تم اپنی کہانی سناؤ...... قصوروار کوئی بھی ہو قلم کار کسی سے نفرت نہیں کرتا۔''

''پھر یوں ہوا کہ مجھے سب بوجھ لگنے لگا۔ طبیعت خراب ہوئی اور دیوانگی طاری ہوگئی، بس سمجھ نہیں آرہا کہ آخر کیا کروں۔ کچھ فیصلہ نہیں کر پارہی۔'' اس نے کمرے کی چھت کی طرف دیکھا۔ ''شاید ہوجائے فیصلہ، جب فیصلہ ہوا تب بلاؤں گی آپ کو۔'' اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہاں بہت کچھ دکھائی دیا، اپنے لیے۔ میں باہر جانے کے لیے مڑا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس کالمس محسوس کرنا اور برداشت کرنا دنیا کا مشکل ترین کام لگا تھا۔ ''کبھی کبھی دیر ہوجاتی ہے مگر محبت اظہار کی محتاج نہیں ہوتی۔'' اس نے عجب جذبے سے میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ کچھ دیر بعد ہونٹ ہٹا کر بولی۔ ''فیصلہ کچھ بھی ہوا، آپ کو ضرور بتاؤں گی۔'' مگر بتانے کی نوبت نہیں آئی۔ اس رات ٹیوب ویل کے قریب سلمٰی کی لاش ملی۔ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ اس کا قاتل نہ مل سکا۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ جو جن اس پر عاشق تھا اسی نے اسے مار دیا۔ اس واقعے کے چھ ماہ بعد میرا ٹرانسفر ہوگیا اور میں لاہور کے ہائی اسکول میں آگیا۔

☆☆☆

رات کا ایک بج چکا تھا۔ ناصرہ اور میں جاگ رہے تھے۔ ''آپ نے بہت کچھ نہیں بتایا ابھی؟''

''کیا؟''

''وہ شخص کون تھا جس سے سلمٰی ملنے جاتی تھی؟''

''خود اندازہ لگالو۔'' میں مسکرایا۔

''ٹھیک ہے پھر میں کل سب بتاؤں گی۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''مجھے انتظار رہے گا۔'' دوسری رات خبرنامے کے بعد ناصرہ میرے پاس لیٹی بتا رہی تھی۔

''سلمٰی عادل سے محبت کرتی تھی۔ طلاق کے بعد جب عادل واپس گاؤں آیا تو وہ اس سے ملنے جاتی تھی۔ اپنا یہ راز چھپانے کے لیے اس نے خود کو پاگل ظاہر کر رکھا تھا اور سب سمجھتے تھے اس پر جن عاشق ہے۔ اس ڈرامے نے اس کی ملاقاتوں کو آسان بنا رکھا تھا۔ نذیراں اس کے پیغام پہنچاتی تھی لیکن اس کے ضمیر پر تب بوجھ بڑھ گیا جب عادل کی خواہشات بڑھیں اور اس نے سلمٰی کو حاصل کرلیا۔ جلد سلمٰی کو اندازہ ہوگیا کہ عادل اس کے جسم سے محبت کرتا ہے مگر تب تک دیر ہوچکی تھی۔ وہ عادل کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس کی ملاقات آپ سے ہوئی، ایک ایسے شخص سے جس کو سب بتا کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی مگر اسے آپ سے محبت ہوگئی۔ آپ بھی شاید اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔'' بیگم میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ''سلمٰی امید سے تھی اور اپنے اس گناہ کے بوجھ تلے دب کر پریشان تھی اور کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تھی لیکن قتل کردی گئی یعنی اس کی موت نے اس کی منزل آسان کردی لیکن سوال یہ ہے کہ قاتل کون تھا؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''ہوں حل کرو یہ کیس، میں سونے لگا ہوں۔'' میں نے کروٹ بدلی۔ پندرہ بیس منٹ بعد اس کی آواز آئی۔

''قاتل آپ تھے۔''

میں اٹھ بیٹھا۔ ''کک...... کیسے؟''

''تین لوگ واقف تھے سلمٰی کے راز سے...... عادل، آپ اور نذیراں۔'' اس نے انگلیوں پر گنوایا۔ ''عادل اسے مار نہیں سکتا تھا، نہ ہی اس میں اتنی ہمت تھی کہ اپنے بچے کی ماں بننے والی عورت کو قتل کردے جبکہ ایک گواہ یعنی نذیراں جانتی تھی کہ عادل اس سے ملتا ہے۔ رہ گئی نذیراں تو وہ زیادہ عمر کی تھی اور ایک کمزور عورت تھی۔ باقی رہ گئے آپ...... آپ سلمٰی سے محبت کرتے تھے اور آپ نے اس کی مشکل آسان کردی۔''

''یہ صرف ایک اندازہ ہے، کوئی ثبوت یا دلیل؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی لائی۔'' وہ اٹھ کر گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بہت پرانا رجسٹر تھا جس کے صفحات بوڑھے ہوچکے تھے۔ ''یہ سلمٰی کی وہ باتیں ہیں جو آپ لکھتے تھے اور اس کے اینڈ پر آپ نے لکھا ہے...... وہ محبت ضرور تھی میری مگر اس کی مشکل آسان کرنے کے لیے مجھے یہ کرنا پڑا۔''

''اب بتائیں۔'' اس کی آخری بات سن کر میں چپ ہوگیا۔

''ہاں ایسا ہی تھا۔ مجھے مارنا پڑا اسے اور وہ چپ چاپ مرگئی، میرے ہاتھ سے۔ مجھے پہچان کر، انہی ہاتھوں کو چوما تھا اس نے اور انہی ہاتھوں نے اس کی جان لے لی۔'' میں اس کی گود میں سسکنے لگا۔ اس نے اپنے بازو میرے گرد حمائل کردیے......

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پہلے وقاص کی آمدنی بس اتنی ہی تھی کہ اس کا گزارہ ہو رہا تھا۔ اس حوالے سے وہ اکثر پریشان رہا کرتا تھا کہ اتنی کوشش کے باوجود وہ کوئی بچت کیوں نہیں کر پا رہا۔ بہ ظاہر اسے اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی تھی۔

وقاص کے دو بیٹے تھے...... کامران اور فہد۔ اس کی بیوی نورین ایک تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ وہ بھی اپنے شوہر کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے ہوئے گھریلو اخراجات کو محدود کرنے کی کوشش کرتی۔ اسی لیے تو ان کے گھر کا نظام جیسے

عبرت

صداقت حسین ساجد

آج کا بویا ہوا کل ضرور کاٹنا ہے... یہ کوئی عام سا جملہ نہیں بلکہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جسے ہر انسان نے عاقبت نااندیشی کے پردے میں لپیٹ کر کہیں رکھ چھوڑا ہے... وہ بھی اسی بھول بھلیوں کا شکار تھا مگر اس ایک پل نے... جس میں اس کا مستقبل پوشیدہ تھا... وہ بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا جو کبھی بچپن میں اسے پڑھایا گیا تھا۔

مکافاتِ عمل کے زندان سے خوفزدہ کچھ لوگوں کی شرمندگی کا قصہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تیسے چل رہا تھا۔ نورین نے کہیں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ وہ اس میں دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ تو بس اپنا گھر سنبھالنے کو ترجیح دیتی تھی۔ نورین ذرا سخت مزاج کی خاتون تھی، اس لیے اکثر وقاص پر وہ اپنی مرضی مسلط کرنے میں کامیاب ہوجاتی تھی۔

وقاص کے ساتھ اس کے والد بھی رہا کرتے تھے جن کی عمر کافی ہو چکی تھی اور اپنے زیادہ تر کاموں کے لیے انہیں دوسروں کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس وقت تو وقاص اپنے باپ کا خیال رکھتا تھا۔ کامران اور فہد بھی اپنے دادا ابو کا کام بھاگ بھاگ کر کرتے تھے۔ وہ اپنے دادا ابو سے بہت پیار کرتے تھے۔ نورین اپنے سسر سے بہت تنگ تھی۔ وہ انہیں محض بوجھ سمجھتی تھی۔ لیکن وقاص اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ والدین تو اولاد کے لیے بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ ان کی خدمت کرنی چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ خوش ہو اور اپنی رحمتیں نازل کرے، لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھی۔ اسے بچوں کا دادا کے پاس گھسے رہنا بھی پسند نہ تھا۔ وہ اکثر انہیں منع کرتی لیکن بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ وہ ادھر زیادہ جاتے ہیں، جہاں انہیں پیار ملتا ہے۔

وقاص سخت محنت کرتا رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے حالات میں بہتری آتی گئی۔ جس گھر میں وہ رہتے تھے، وہ اس کے والد کا تھا جو کافی بڑا تھا۔ وقاص نے اپنے والد صاحب سے مشورہ کر کے اچھے داموں میں وہ گھر بیچ دیا۔ وقاص کو اس کی توقع سے زیادہ رقم مل گئی۔ پھر اس نے اس رقم سے ایک اچھے سے علاقے میں جگہ خرید کر جدید گھر بنوایا۔

نیا گھر انہوں نے ایک نئی کالونی میں لیا تھا۔ اس کالونی میں ہر سہولت دستیاب تھی۔ انہوں نے اپنے گھر کو بہت خوب صورت انداز میں سجایا۔ یہاں ہر سہولت میسر تھی۔ گھر میں قالین بھی بچھ گیا۔ فرنیچر نیا آ گیا۔ پردے لگ گئے۔ نورین کی نظر میں اگر اس گھر میں کچھ پرانا تھا، تو وہ وقاص کے والد تھے۔ وہ اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح ان سے بھی جان چھوٹ جائے۔

ایک دن نورین نے وقاص سے کہا۔ ''میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں! بولو۔''

یہ سن کر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میری بات کا برا نہ منانا...... اگر آپ ابو جی کو اوپر والے کمرے میں لے جائیں، تو ہم انہیں کھانا وہیں پہنچا دیا کریں گے۔''

یہ سن کر وقاص چونک پڑا۔

''تم...... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''دیکھیں جی! وہ اب بوڑھے ہو چکے ہیں اور انہیں کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں اور کیا کر رہے ہیں...... وہ ہر وقت کھانستے رہتے ہیں اور بلغم تھوکتے رہتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے بچے بیمار نہ ہو جائیں۔''

''نورین! اس عمر میں ایسے مسائل تو ہی جاتے ہیں۔ بچے ان کے ساتھ وقت گزارتے ہیں، یہ اچھی بات ہے۔ ابو جی ان کی اچھی تربیت کر رہے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ہمارے ہاں اکثر مہمان آتے رہتے ہیں۔ ان کے سامنے مجھے بہت شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ وہ ابو جی کو کھانستے اور بلغم تھوکتے ہوئے دیکھتے ہیں تو عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ ایک اور بات بھی ہے......'' نورین نے بات ادھوری چھوڑی، تو وقاص چونک کر بولا۔

''وہ کیا......؟''

''آپ دیکھیں کہ میں اس گھر کی بھلائی کے لیے کچھ بھی کروں، ابو جی کو اعتراض ہوتا ہے کہ یہ فضول خرچی ہے ایسا نہ کرو، ویسا نہ کرو۔ ان کی اس روک ٹوک سے مجھے اکثر پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔''

یہ سن کر وقاص اسے پرخیال انداز میں دیکھنے لگا۔ اصل میں وقاص ایک ادارے میں ملازمت کرتا تھا۔ آج کا دور تو مقابلے کا دور ہے، اس لیے وہ اضافی وقت لگا رہا تھا تاکہ مالکان خوش ہو کر اسے ترقی دے دیں۔ ویسے بھی وہ اس بات کا حق دار تھا، لیکن جانے کیوں ابھی تک اسے ترقی نہیں ملی تھی۔ اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ کچھ دیر کے لیے اپنے باپ کے پاس جا کر بیٹھ جائے۔ اسے کئی کئی دن گزر جاتے تھے مگر اس کی اپنے والد سے سلام دعا نہیں ہوتی تھی۔

اسے خاموش دیکھ کر اس کی بیوی نے پوچھا۔ ''پھر کیا سوچا آپ نے؟''

''جیسا کرنا چاہو، کر لو۔'' بیوی کی بات سن کر وہ کہنے لگا۔

یہ سن کر اس کی بیوی خوش ہو گئی۔ اس کی تو جیسے دلی مراد پوری ہو گئی تھی۔

اس نے اسی دن اپنے سسر کو اس کے بستر سمیت

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اوپر والے کمرے میں پہنچا دیا پھر کچھ دنوں کے بعد اس نے ان کے برتن الگ کر دیے، تا کہ ان کے دوسرے برتن گندے نہ ہوں۔

اب بھی اس کی تکلیف دور نہیں ہوئی تھی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ وہ اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے سے تھک گئی اور بے زار ہو کر اپنے شوہر سے کہنے لگی۔

''میں اور میرے بچے ابو جی کے لیے کھانا لے جانے اور واپس آنے میں تھک جاتے ہیں......''

''اچھا! پھر کیا کیا جائے؟'' وقاص کو بھی اپنی بیوی اور بچوں کا احساس ہو رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ انہیں نیچے لے آئیں اور اسٹور والا کمرا انہیں دے دیں۔''

یہ سن کر وقاص بولا۔ ''ٹھیک ہے...... جیسے تمہاری مرضی۔''

اجازت ملنے کی دیر تھی کہ اس نے سسر کو نیچے اتارا اور انہیں اسٹور میں پہنچا دیا۔ پھر ان کے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں ان کے پاس رکھ دیں۔ ساتھ ہی کھانے پینے کے برتن بھی رکھ دیے۔

یوں ہی کئی دن گزر گئے۔

ایک دن وہ سب دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھے۔ اس دن اتوار تھا، اس لیے وقاص بھی گھر میں موجود تھا۔ اچانک فہد بولا۔

''ابو جان! جب ابا جان فوت ہو جائیں گے، تو میں ان کے برتن سنبھال کر رکھوں گا۔''

اس کی بات سن کر وقاص حیرت سے بولا۔ ''بیٹا! تم ان کا کیا کرو گے؟''

''جب آپ ابا جان کی طرح کے ہو جائیں گے، تو میں آپ کے لیے اس میں کھانا رکھا کروں گا۔''

یہ سن کر وقاص نے جو لقمہ منہ میں ڈالا تھا، وہ اس کے حلق میں اٹک گیا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسی وقت اسے اللہ تعالیٰ کا فرمان یاد آ گیا کہ اپنے والدین کے ساتھ احسان کرو۔

وقاص کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ جب وہ بچہ تھا اور اپنا کوئی کام کرنے کے قابل نہیں تھا، تو اس وقت اس کے والدین نے اس سے منہ نہیں موڑا تھا اور آج جب اس کے...... والد پر بڑھاپے کی وجہ سے یہ وقت آیا تھا اور اسے وقاص کی اشد ضرورت تھی تو اس نے اپنی بیوی کی باتوں میں آ کر اپنے والد کو اپنے آپ سے دور اسٹور میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کے والدین نے تو اپنا فرض خوش دلی سے پورا کر دیا تھا اور جب اس کا وقت آیا کہ وہ اپنا فرض ادا کرے، تو وہ والدین کے حقوق بھول بیٹھا۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''سنو! آج سے میں کھانا اور چائے ابا جان کے ساتھ ہی کھایا پیا کروں گا......''

اس کی بیوی ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

وقاص اٹھ ہی رہا تھا کہ اسے ایک اور خیال آیا اور پھر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ ہم سب مل کر ان کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔''

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ بیوی کو کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اپنے ابو کی بات سنتے ہی کامران بھاگ کر گیا اور اپنے دادا ابو کو بلا لایا۔ پھر ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کافی عرصے کے بعد وقاص اپنے ابو کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے والد کو اپنے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ ان کے پرانے برتن پھینک دیے۔

جب وہ سب کھانا کھانے بیٹھتے، تو وقاص ایک لقمہ اپنے ابو کے منہ میں رکھتا، تو دوسرا لقمہ اپنے منہ میں ڈالتا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے، وقاص ان کی دل و جان سے خدمت کرتا رہا اور ان کے حقوق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کی۔

جس ادارے میں وہ ملازمت کرتا تھا، اس میں کئی سال سے اس کی ترقی رکی ہوئی تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد اس کی قسمت جاگ اٹھی اور وہ جلد ہی اس ادارے کے اعلیٰ عہدے پر جا پہنچا اور اسے ہر طرح سے خوش حالی حاصل ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ پہلے اس سے اس کا باپ ناراض تھا، تو وہ ناکام تھا۔ اب باپ راضی ہوا تھا، تو اللہ نے بھی خوش ہو کر اسے ایک کامیاب انسان بنا دیا جس کے نتیجے میں اس کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب آ گیا تھا۔

وہ اپنے چھوٹے بیٹے کا شکر گزار تھا کہ اس نے اسے اس کا بھولا ہوا فرض یاد دلا دیا تھا۔ ورنہ! وہ جو آج اپنے باپ کے ساتھ کر رہا تھا، ویسے ہی اس کے ساتھ کل ہونا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

محفلِ شعروسخن

❁ چلبلی ہیر...... جھنگ، صدر

سب کے دلوں میں دھڑکنا ضروری تو نہیں ہوتا سرکار
کچھ لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکنے کا بھی الگ مزہ ہے

❁ حسنین عباس، کمیل عباس..... گلیانہ روڈ، کھاریاں

سب کچھ خاک ہوا ہے لیکن چہرہ کیا نورانی ہے
پتھر نیچے بیٹھ گیا ہے اوپر بہتا پانی ہے
بچپن سے میری عادت ہے پھول چھپا کر رکھتا ہوں
ہاتھوں پر جلتا سورج ہے دل میں رات کی رانی ہے

❁ مدحت...... کراچی

تجھے یقین کہ ترا حسن ہے سپردِ نقاب
مجھے یہ فکر کہ تارے چھپے نہیں رہتے

❁ ماہین بابر، فضل عباس..... گلیانہ روڈ، کھاریاں

کبھی یوں ملیں کوئی مصلحت کوئی خوف دل میں ذرا نہ ہو
مجھے اپنی کوئی خبر نہ ہو تجھے اپنا کوئی پتا نہ ہو
کبھی دھوپ دے کبھی بدلیاں دل و جان سے دونوں قبول ہیں
مگر اس محل میں نہ قید کر جہاں زندگی کی ہوا نہ ہو

❁ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس

جی اٹھے حشر میں پھر جی سے گزرنے والے
یاں بھی پیدا ہوئے پھر آپ پہ مرنے والے

❁ محمد الیاس..... لسبیلہ، بلوچستان

کرتا نہیں ہے تم سے شکایت یہ دل مگر
کہنا یہ چاہتا ہے کہ تم، تم نہیں رہے

❁ محمد علی آثم..... ڈی آئی خان

جس کو سمجھے ہیں زندگی اپنی
اس کے پل پہ کبھی اختیار نہیں

❁ ادریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

❁ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ

اب تو قسمت ہی اس سے ملا دے تو ملا دے محسن
وہ تو ہم سے بچھڑا ہے بارش میں پرندوں کی طرح

❁ مرزا طاہر الدین بیگ..... میر پور خاص

میری بے بسی میری التجا میری ضبطِ آہ پہ کر نظر
اسے مسکرا کر نہ ٹال دے میری زندگی کا سوال ہے

❁ بابر عباس، مسز بابر عباس..... کھاریاں

کچھ تو پاس بچا کر رکھو سب کچھ کاروبار نہ جانو
دل کے دروازے مت کھولو اِس گھر کو بازار نہ جانو
مانا رستہ کٹھن ہے پھر بھی سایہ دار شجر ہے
ٹہنی کو تلوار نہ سمجھو آنچل کو دیوار نہ جانو

❁ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

ذرا سی بات پہ محسن بھگو لیتے ہو آنکھیں تم
سنو ایسا نہیں کرتے زمانہ پیچ کھائے گا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

❁ شہباز اکرم نوئی...... ڈھپئی، پاک پتن شریف
جفا کی آگ تھم جائے، فخر ٹوٹے کبھی محسن
چلے آنا میرے ہوکر، میں ماضی پھر بھلا دوں گا

❁ حافظ محمد نصرت اللہ نیازی...... خانیوال
تیز بارش میں کبھی سرد ہواؤں میں رہا
اک تیرا ذکر تھا جو میری صداؤں میں رہا
کتنے لوگوں سے میرے گہرے مراسم ہیں مگر
تیرا چہرہ ہی فقط میری دعاؤں میں رہا

❁ جنید احمد ملک...... گلستانِ جوہر، کراچی
میری قسمت کہ وہ اب ہیں مرے غم خواروں میں
کل جو شامل تھے ترے حاشیہ برداروں میں
اب تو دریا کی طبیعت بھی ہے گرداب پسند
اور پہلی سی سکت بھی نہیں پتواروں میں

❁ وسیم چودھری...... مہر شاہ، خانیوال
یقین تھا کہ کوئی سانحہ گزرنا ہے
گماں نہ تھا کہ تیرا ساتھ چھوٹ جائے گا

❁ محمد عثمان...... سیالکوٹ
زیست تم، زیست کا تقاضا تم
اور کس سے کریں شکایت ہم
ابدیت بھی جمود نہ ہو
آؤ برپا کریں قیامت ہم

❁ الیاس احمد...... لاہور
کب تک یوں پردے پردے میں حسنِ محبت کو جھٹلاتا
موت کا دن بھی حشر کا دن ہے، چھپنے والو! سامنے آؤ
مرنے سے کچھ کام چلا تو اے دم سازو، مر بھی لیں گے
مرنا تو برحق ہے لیکن تم جینے سے باز نہ آؤ

❁ ماہین فاطمہ...... حجرہ شاہ مقیم
موسمِ وجد میں جاکر کہاں رقص کروں
اپنی دنیا مری وحشت کے برابر کردے

❁ داؤد اشفاق...... حجرہ شاہ مقیم
کیا ہے جو رکھ دی آخری داؤ میں نقدِ جاں
ویسے بھی ہم نے کھیل یہ ہارا ہوا تو ہے

❁ ملائکہ حریم...... حجرہ شاہ مقیم
کسی کے کرب کا احساس بھی عجب شے ہے
جو ہر گھڑی میری سانسیں بحال رکھتا ہے

❁ زوہیب احمد ملک...... گلستانِ جوہر، کراچی
ہوائیں تیز ہیں، جل جل کے بجھتے ہیں چراغ اپنے
ارادے تند ہیں، ہم شمع تو بھڑکانے آئے ہیں
وہ دیوانے جو ہمت ہار کر بیٹھے تھے صدیوں سے
اب اپنی منجمد تقدیر سے ٹکرانے آئے ہیں

❁ انجم کمال...... حیدرآباد
یہ دربدری تجھ کو کہیں کا نہ رکھے گی
میرے دلِ آوارہ مری مان لے گھر چل
یہ لوگ اٹھانے نہیں سر دیتے کسی کو
خود سر ہے اگر تو تو سنبھالے ہوئے سر چل

❁ مہتاب احمد...... حیدرآباد
اب تو کچھ غیر سا لگنے لگا تیرا غم بھی
دیکھ مایوس ہوئے جاتے ہیں کتنے ہم بھی
اس طرح ٹوٹ کے برسا ہے دکھوں کا بادل
محوِ حیرت ہے مرے ساتھ شریکِ غم بھی ہے

❁ اشفاق شاہین...... لاہور
صبر کیوں دلاتے ہو، ضبط کیوں سکھاتے ہو
مجھ کو کتنی صدیوں سے یہ سبق تو ازبر ہے

❁ ریاض بٹ...... حسن ابدال
تم کسی راستے سے آجانا
میرے چاروں طرف محبت ہے

❁ محمد جاوید خان...... تحصیل علی پور
دلچسپ واقعہ ہے کہ کل اک عزیز دوست
اپنے مفاد پر مجھے قربان کرگیا

❁ ناہید یوسف...... اسلام آباد
اس شہر میں کیا خاک شناسائی کوئی ڈھونڈیں
لوگوں کے بدن پر کوئی چہرہ ہی نہیں ہے
ایسا تو کبھی بھی کوئی موسم نہیں آیا
دامن میں کسی پیڑ کے سایہ ہی نہیں ہے

❁ انیلا رشید سیال...... خیرپور میرس سندھ
اک بار جو ہو جائے رقم صفحۂ دل پر
وہ نام کبھی دل سے مٹایا نہیں جاتا

❁ ظفر اقبال ظفر...... کامرہ شرقی
عدل کی دکانوں پر وہ کبھی نہیں جاتے
جو قبول کرتے ہیں فیصلہ محبت کا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

❋ زرین آفریدی.....حیدر آباد
تم لفظ کتابوں سے پڑھ کر لکھتے ہو
میں نے زندگی کی تلخیوں سے چنے ہیں

❋ جبران احمد ملک.....گلشنِ اقبال، کراچی
اُکتا کے ہوس ناک نگاہوں کے ستم سے
اِک پیڑ نے شعلوں سے بدن ڈھانپ لیا ہے

❋ عظیم احمد.....ملتان
ابھی آثار سے باقی ہیں دل میں
کبھی اس شہر میں میلا لگا تھا

❋ ولید رضا.....ساہیوال
کسی ملال کا اب کوئی بھی جواز نہیں
گزر گئی ہے جس انداز سے گزرنی تھی

❋ حبیب اللہ.....جہلم
ایک بار آؤ کبھی اتنے اچانک پن سے
ناامیدی کو تحیر کی سزا دے جاؤ

❋ نوروز خان.....کوئٹہ
کئی چراغ کئی آئینوں میں عکس فگن
میں راہ بھول گیا تھا اسی چراغاں میں

❋ محمد کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
جیتے ہیں جو مرنے کی تمنا میں ندیم
وہ موت سے پیشتر ہی مر جاتے ہیں

❋ انجم علی.....راولپنڈی
بہت قریب نہ آؤ، کہ دور سے بھی ہمیں
وہ آنچ آئی کہ مرجھا گئے دلوں کے چمن

❋ احسن علی.....حیدر آباد
مدت کے بعد اذنِ تبسم ملا ہمیں
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

❋ محمد طلحہ.....کراچی
معمارِ انقلاب و ضمیرِ عوام ہو
آزاد مملکت کے اسیرو! سلام ہو

❋ شگفتہ نور.....ٹنڈو آدم
یہیں سے رنگِ رخِ روزگار بدلے گا
کتھائیں دل کی بالآخر لبوں تک آئی تو ہیں

❋ عامر علی.....اسلام آباد
مرے نیاز کی تکمیل کس طرح ہوگی
اگر میں پا نہ سکا تیری بے رخی کا جواز

❋ ناصر حسین.....سکھر
ان کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

❋ عمران شیروانی.....لاہور
سر عشق کا سودا ہے ہمارے تو تمہیں کیا
تم اپنی اناؤں کے در و بام بچانا

❋ قاسم مجید.....لاڑکانہ
بے خوابی کے اس موسم میں بھی ہم نے
آنکھوں میں اک خواب بچا کر رکھا ہے

❋ امتیاز احمد.....پھالیہ
ہم نے بھی تو اک عمر گزاری ہے مگر دیکھ
دکھ کو کبھی چہرے پہ سجایا ہی نہیں ہے

❋ دانش عمیر.....کراچی
ہر کوئی مہر بہ لب ہے کسی بت کی مانند
بے زبانوں کو زباں دینے کو جی چاہتا ہے

❋ ناصر خان.....کوئٹہ
ہم بھی کچھ اپنی وضع داریاں کم کرلیں گے
پہلے یہ ضد تو طبیعت سے تمہاری جائے

❋ اسلم احمد.....کراچی
ہزار جان کا دشمن سہی مگر وہ شخص
محبتوں کے قرینے سکھا گیا ہے سب

❋ میمونہ عزیز.....کراچی
جی میں جو آئے وہ کرنے نہیں دیں گے تجھ کو
یعنی اک حد سے گزرنے نہیں دیں گے تجھ کو

کوپن برائے شمارہ مئی 2018

مُحفلِ شعر و سخن

نام: ---------------------------------------

پتا: ---------------------------------------

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پہلا قتل یکم جون کو نصف شب کے بعد کسی وقت ہوا۔

لابیرا بیچ پر ملنے والی لاش ایک غیر معمولی حسین اور نوجوان لڑکی کی تھی۔ لاش کو جھاڑ جھنکار میں چھپا دیا گیا تھا۔ پولیس نے آلۂ قتل تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ اسے سرخ رنگ کے اسکارف سے قتل کیا گیا ہے۔

ڈیلی ایکسپریس نے خاص طور سے اس واردات کو خوب اچھالا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے اپنی بہترین رپورٹر کو اس کیس کی خبریں حاصل کرنے کے لیے متعین کر دیا۔ مرنے

دیوانگی

انجم فاروق ساحلی

کچھ لوگوں کی فطرت میں احساسِ کمتری بچپن سے ہی کچھ اس طرح رچ بس جاتا ہے جیسے رگوں میں لہو کی گردش... بالکل ایسے ہی وہ بھی اس کج روی کا شکار تھا جسے اس نے اپنی قابلیت کے پردے میں چھپا تو لیا مگر... کب تک... اور ایک دن اس کا یہ احساس عجیب دیوانگی کا رخ اختیار کر گیا لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ دیوانگی بھی تو ایک مرض ہی ہے اور ہر مرض کا کوئی نہ کوئی علاج بھی ہوتا ہے۔

ایک ماہر فلکیات کے علم کی وسعت اور مفاد پرستی کے درمیان تصادم

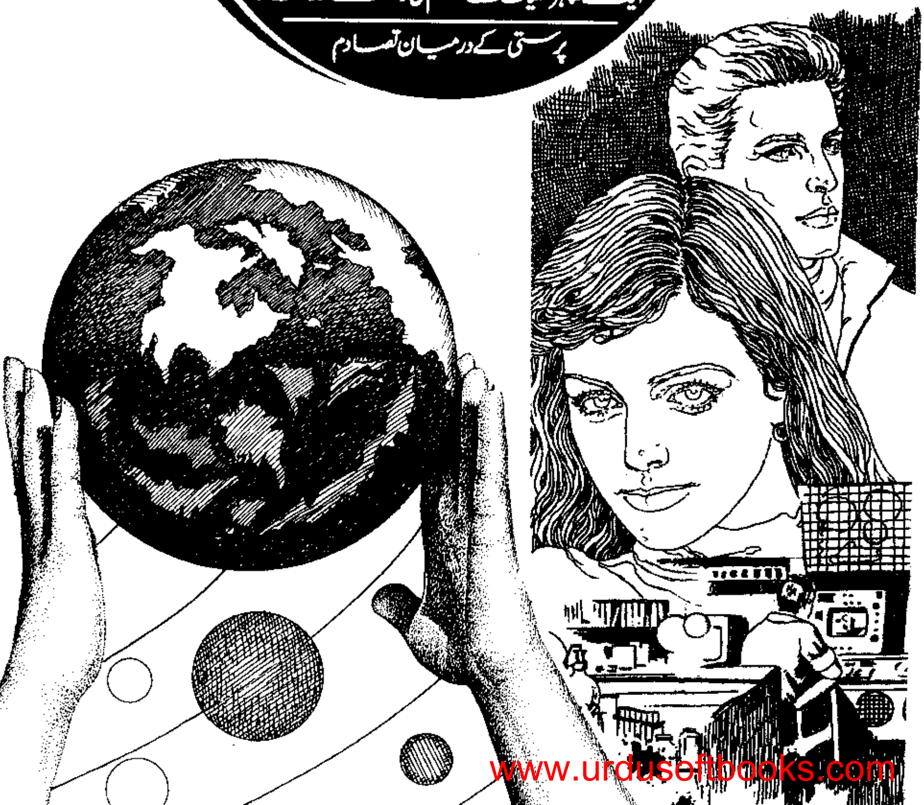

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

والی کا نام میری تھا۔ اس کی عمر اکیس سال سے زائد نہ تھی اور وہ ے کارپوریشن میں ملازمت کرتی تھی۔ میری کی عادتوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سورج ڈھلے چہل قدمی کی عادی تھی۔ اس کی مختصر سی زندگی میں کوئی جھول نظر نہیں آیا۔ وہ سادہ اور صاف ستھری عادتیں رکھنے والی ایک نیک فطرت لڑکی تھی۔ میری کے قتل کا معما لاینحل ہی رہا اور پھر ڈیلی ایکسپریس نے بھی اس قتل کی خبر-س صفحہ اول سے آخری صفحے پر منتقل کردیں۔ لوگ میری کے قتل کو بھولنے لگے۔

لیکن پھر تیرہ جون کو کم خوابی سے پریشان ایک شخص دل بہلانے کے لیے ٹہلنے نکلا وہ لاس اینجلز سٹی کے اردگرد ٹہل رہا تھا۔ یہاں چاروں طرف خاموشی تھی۔ سکون اور سکوت کا راج تھا لیکن اس شخص کی آنکھیں ایک لاش کو دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ عین اس وقت کالج کے گھنٹا گھر نے رات ساڑھے دس بجے کا اعلان کردیا۔ اس شخص نے اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں ایک لڑکی کی لاش کو بغور دیکھا۔ یہ لڑکی غیر معمولی طور پر پُرکشش اور خوبصورت تھی۔ پولیس کے مطابق بیس سالہ پامیلا واکر کو سرخ رنگ کے اسکارف سے قتل کیا گیا تھا۔ وہ بھی شام ڈھلے چہل قدمی کی عادی تھی۔

اخبارات نے ایک بار پھر ہنگامہ کھڑا کردیا۔ خبروں کے علاوہ بے شمار مراسلے شائع ہوئے۔ چالیس لاکھ سے زائد باشندوں نے پولیس کی ناکامی پر اپنے رنج وغم اور شدید غصے کا اظہار کیا۔ ادارتی کالموں میں پولیس پر بہت لعن طعن کی گئی۔ اگر وہ بے گناہ لڑکیوں کا قتل عام بند نہیں کرواسکتی تو پھر قانون اور شہریوں کے تحفظ کا دعویٰ اپنے دفتر کی عمارت سے مٹادے۔

پولیس کا عملہ انتھک کوشش کررہا تھا لیکن دونوں میں سے کسی بھی قتل کا معما حل ہونے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ سراغ رسانوں کی جماعتیں پیشہ ور قاتلوں، جنونیوں اور ذہنی مریضوں کی فائلیں کھنگالنے لگیں۔ سراغ رسانوں کے چیف پر اوپر سے جھاڑ پڑی تو اس نے اپنے سراغ رسانوں کی خوب خبر لی لیکن اس کے باوجود کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا۔

وقت گزرتا رہا۔ سورج کی قہرسامانی اور صحرا سے آنے والی لو ساحل اور بستی کے لوگوں کو تنگ کرتی رہی۔ اخبارات ایک بار پھر پولیس کی نااہلی کو بھول کر دوسرے لوگوں کی ایسی خبریں تلاش کرنے لگے جس کے چھپنے سے اشاعت بڑھتی ہے۔ پھر جون کا گرم مہینا آخری ہچکی لینے لگا۔ تین جون کی صبح قدرے خوشگوار تھی۔ دھوپ ابھی عروج پر نہیں پہنچی تھی۔

فضا میں ایک ہلکی سی خوشبو محسوس ہونے لگی لیکن لوگوں کو علم تھا کہ یہ خوشگوار صبح، شدید گرمی اور حبس کا پیغام لائی ہے۔ دن شروع ہوچکا تھا۔ لہٰذا لوگ گھروں سے نکل کر کاروبارِ زندگی میں مصروف ہوگئے۔ آسمان پر سفید اور کالے بادل چھانے لگے۔ سورج ان بادلوں کی دبیز چادر سے اپنی غضب ناک کرنیں گزارنا چاہتا تھا لیکن بادلوں نے ان شعاعوں کا راستہ روکا تو بادلوں میں جگہ جگہ بنفشی دھبے نظر آنے لگے۔

لانگ بیچ فری وے کے سائے میں اٹھارویں اسٹریٹ پر ایک فرانسیسی طرزِ تعمیر کا بورڈنگ ہاؤس سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے اسکرین ڈور سے ایک شخص نکلا اور ریلنگ کی طرف بڑھا۔ یہ جیک اسپنگر تھا، بہترین تیراک۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھے بغیر طویل جماہی لی۔ وہ صبح کے وقت پورچ ریلنگ پر جھکا کھڑا رہنے کا شوقین تھا تاکہ صبح کی تازہ ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوکر کثافت دھو ڈالے۔ رات بھر سستا مشروب پینے کے بعد صبح کی تازہ ہوا کسلمندی کو دور کرنے کا بہترین نسخہ ثابت ہوئی تھی۔

جیک نے ریلنگ کے سہارے ٹک کر کئی مرتبہ طویل سانس لی اور پھر اس کی آنکھیں مغرب میں سڑک کا نظارہ کرنے لگیں۔ پھر وہ آٹھویں اسٹریٹ کے درّے کو گھورنے لگا جو ریلنگ سے تاریک نظر آرہا تھا۔ تب ہی اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔ مخالف سمت سے ایک لڑکی نہانے کے بعد اب سمندر سے نکل کر اس کی طرف آرہی تھی۔ جیک نے فوراً اندازہ لگالیا کہ آٹھ بج کر سینتالیس منٹ ہوچکے ہیں۔ یہ لڑکی وقت کی بہت پابند تھی اور ٹھیک اس وقت نہانے کے بعد سمندر سے نکلتی تھی۔

جیک لڑکی سے واقف نہ تھا لیکن وہ جب بھی پورچ کے قریب سے گزرتی وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ ہلاتا، کوئی بوڑھا اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ جیک نے دیکھا کہ لڑکی درّے کے سایوں کی طرف جارہی ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد جیک مضطرب ہوکر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نگاہیں درے پر مرتکز تھیں لیکن اسے یہاں سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے گردن اچکا اچکا کر درّے کی دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن پہاڑی بصارت کی راہ میں مزاحم ہورہی تھی۔ پھر جیک فوراً ہی سیڑھیاں اترنے لگا۔ پانچ منٹ بعد وہ عمارت کے پورچ سے گزر رہا تھا۔ اس کے دماغ میں صرف یہی خیال تھا کہ لڑکی کہیں کسی پتھر سے ٹکرا کر نہ گر پڑی ہو کیونکہ وہ ابھی درے کے کنارے پر نمودار نہیں ہوئی تھی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

وہ سیدھا تاریک درّے میں گھسا لیکن اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔لڑکی سنگلاخ درّے میں بے جان پڑی تھی۔سرخ رنگ کا ایک اسکارف اس کی گردن میں کسا ہوا تھا۔لڑکی کی موت گلا گھٹنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔

☆☆☆

مائیک نے ان تین لڑکیوں کے وہ چہرے دیکھے جن کی تصاویر ڈیسک پر بکھری ہوئی تھیں۔ مائیک ان تینوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔میری کولا بیرا بیچ پر قتل کیا گیا تھا۔پامیلا کی لاش سٹی کالج سے ملی تھی اور پھر اس نے تیسری لڑکی کا فوٹو اٹھالیا۔اینا کی لاش آٹھویں اسٹریٹ کے درے سے ملی تھی۔اس کی عمر بھی اکیس سال تھی۔ مائیک جھنجلا گیا۔ اتنی کم عمری میں ان تینوں کی موت کا کوئی جواز نہ تھا۔

مائیک کو یہ کیس ملا تو اس نے اس کیس کی تمام فائلیں منگوالیں۔اب وہ ان تینوں لڑکیوں میں قدرِ مشترک تلاش کررہا تھا۔ان تینوں کی عمریں ایک جیسی تھیں۔کیا انہیں ایک ہی شخص نے قتل کیا ہے؟ اس نے سوچا۔مائیک کو پہلی مرتبہ ایک ''بند کیس'' تفتیش کے لیے ملا تھا۔ مائیک نے پہلی دو لڑکیوں کے قتل کی فائل کو گھورا، اب اسے اینا کے علاوہ ان دونوں لڑکیوں کے قاتل کو بھی تلاش کرنا تھا۔گزشتہ ایک ہفتے کے دوران اس نے بہت سر کھپایا لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔اس کے باوجود اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی کہ ابھی کچھ قتل اور بھی ہوں گے۔ مائیک کرسی چھوڑ کر کھڑکی کے قریب کھڑا ہوگیا۔شہر کی سڑکوں پر آج نہ جانے کیوں لڑکیاں بہت کم دکھائی دے رہی تھیں۔ مائیک ایک طویل سانس لے کر ڈیسک کی طرف پلٹ گیا۔ اس کی آنکھیں ڈیلی ایکسپریس کی شہ سرخی پر جمی ہوئی تھیں۔

''اسکارف کلر اب کس کو قتل کرے گا؟''

''اچھا سوال ہے۔'' مائیک بڑبڑایا۔اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ مائیک نے سیٹ کو اس طرح گھورا جیسے اٹھا کر اسے باہر پھینک دے گا لیکن بہرحال ریسیور اٹھانا ضروری تھا۔

''مسٹر مائیک!'' آپریٹر کیٹی کی نقرئی آواز سنائی دی۔''ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' مائیک نے قدرے جزبز ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اپنے آنے کا مقصد صرف آپ کو ہی بتانا چاہتے ہیں۔'' کیٹی نے جواب دیا۔

''تم نے اس کا نام پوچھا ہوگا؟''

''جی ہاں، مسٹر فلپ۔'' کیٹی نے بتایا۔

مائیک نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات پر نظر ڈالی اور پھر ایک کاغذ کو گھورنے لگا۔''ٹھیک ہے کیٹی! اسے میرے کمرے میں بھیج دو۔''

☆☆☆

فلپ کی شخصیت اگرچہ خوب صورت اور وجیہہ نہیں تھی لیکن پھر بھی متاثر کن ضرور تھی۔اس کی کالی آنکھوں میں جستجو کی کرنیں چمک رہی تھیں اور منتشر بھویں اس کے ذاتی کردار کی چغلی کھا رہی تھیں۔وہ جب مائیک کے سامنے کرسی پر بیٹھا تو مائیک نے اس کے جبڑوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ پُراعتماد شخص ہے۔اس کی عمر چالیس سال سے کسی طرح کم نہیں تھی۔''فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' گفتگو کا آغاز مائیک نے ہی کیا۔

''میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔'' فلپ نے اس طرح کہا جیسے اسے بھی مقصد کی بات پر پہنچنے کی جلدی ہو۔''میں لڑکیوں کے قتل کے سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں سن رہا ہوں مسٹر فلپ!'' مائیک سنجیدہ ہوگیا۔

''میں لاس اینجلز سٹی کالج میں فلکیات کا استاد ہوں۔ میری، پامیلا اور اینا تینوں میری شاگرد تھیں۔''

''اس کا مجھے علم ہے ڈاکٹر فلپ۔''

''گویا آپ کو اس خبر سے کوئی تعجب نہیں ہوا؟''

''نہیں۔'' مائیک نے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھا۔''آپ ہی ڈاکٹر فلپ ہینڈرسن ہیں۔آپ نے قانون میں ہارورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ہے، پھر آپ نے امورِفلکیات میں اعلیٰ ترین سند حاصل کی۔آپ ہی نے چند نئے ستاروں کی دریافت میں اہم کردار ادا کیا ہے اور آج کل آپ ماؤنٹ ونسٹن اور پولی رسدگاہ میں کام کررہے ہیں۔سٹی کالج میں آپ بدھ اور جمعرات کی شب امورِفلکیات کی تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔''

''اوہ......'' فلپ کے چہرے پر حیرت کے بادل امڈ آئے۔''کمال ہے، آپ کے پاس تو میرے بارے میں سب کچھ موجود ہے لیکن اتنی جامع رپورٹ سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ میں بھی آپ کی نگاہ میں مشکوک تھا۔''

''ہم پولیس والے صیغۂ ماضی استعمال نہیں کرتے ڈاکٹر۔'' مائیک دھیرے سے مسکرایا۔''آپ اب بھی مشکوک افراد کی لسٹ میں شامل ہیں۔''

''اگر آپ کے فرائض میں لوگوں پر شک کرنا شامل

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نہ ہوتا تو آپ کے اس جملے کو میں اپنی توہین سمجھتا۔" ڈاکٹر فلپ نے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ "ویسے بھی شہر میں جو کچھ ہوا ہے، وہ بہت المناک اور ہولناک ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ گیا۔

"تشریف رکھیں ڈاکٹر۔" مائیک نے درخواست کی۔ "آپ خود تشریف لائے تھے لہٰذا اب ہم کھل کر باتیں کرسکتے ہیں۔"

"بہت بہتر۔" ڈاکٹر فلپ موڈ بدل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "لیکن مجھے ڈاکٹر، ڈاکٹر کہنے کے بجائے اگر صرف فلپ کہیں تو ماحول اور اچھا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کا لفظ صرف میڈیکل پریکٹیشنر کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔" مائیک خوش دلی سے ہنس پڑا۔

یہ شخص اس کے دل کو بھا گیا تھا۔ "او کے فلپ۔" مائیک نے لڑکیوں کی تصویریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تینوں کس قسم کی لڑکیاں تھیں؟"

"اچھی لڑکیاں ضروری نہیں کہ تعلیم کے شعبے میں بھی غیر معمولی حد تک اچھی ثابت ہوں۔ ان کی تعلیمی قابلیت اوسط درجے کی تھی۔"

"کوئی نوجوان طالب علم ان تینوں میں سے کسی سے وابستہ تھا؟"

"نوجوان۔" فلپ مسکرایا۔ "میری کلاس میں تیس لڑکیاں اور پانچ لڑکے تھے۔ پانچوں مرد بوڑھے ہیں اور نسوانیت کے بجائے فلکیات سے عشق ہے۔ وہ لڑکیوں کی آنکھوں میں جھانکنے کے بجائے ستاروں پر نظریں گاڑے رہنے کے عادی ہیں۔"

"درست۔" مائیک نے دھیرے سے کہا۔ "شبینہ کالجوں میں بالعموم بوڑھے مرد ہی داخلہ لیتے ہیں۔ ان لڑکیوں نے کلاس ختم ہونے کے بعد کبھی تم سے ملاقات کی؟"

"نہیں...... میں طلبہ وطالبات کے ساتھ وقت گزارنے کا قائل نہیں ہوں۔" فلپ نے جواب دیا۔ "اور تمہارے اس سوال سے یہ بات پھر واضح ہوگئی ہے کہ میں اب بھی تمہاری نظروں میں مشکوک ہوں۔"

"میں تردید نہیں کروں گا۔" مائیک نے کہا۔ "تین لڑکیوں کا قتل میرے لیے عجیب معما ہے فلپ! لہٰذا ہر وہ شخص جو ان سے ملتا جلتا رہا ہے مشکوک ہے۔"

فلپ کا چہرہ طیش سے سرخ ہوگیا۔ وہ غصہ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ بہت بری بات ہے مائیک۔" اس نے کہا۔ "تم لوگ کبھی پولیس کے روایتی طور طریقوں سے بھی الگ ہو کر سوچا کرو۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے دفتر میں ہر جگہ شک کا راج ہے۔ اگر میں مشکوک تھا تو تم نے مجھے بلایا کیوں نہیں۔ میں معاشرے کا باوقار فرد ہوں مائیک! تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے۔" اس مرحلے پر مائیک کو احساس ہوا کہ فلپ سے بات کرنا لاحاصل ہوگا۔ مائیک پڑھے لکھے لوگوں کی انانیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ذرا سی بات بھی انہیں مشتعل کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے اور ڈاکٹر فلپ مشتعل ہو چکا تھا۔

"فلپ!" مائیک نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا۔ "اگر تم مجھے وہ اطلاعات دے چکے ہو جن کے لیے آئے تھے تب تمہارا شکریہ۔ مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔" فلپ برہمی سے اٹھا اور بل کھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی مائیک نے انٹرکام کا بٹن دبا دیا۔

"کیا بات ہے مائیک۔" چھ سراغ رسانوں کی مشترکہ سیکریٹری میبل کی چیخ نما آواز سنائی دی۔ "آج تو ہر سراغ رساں مجھ سے ہی کام لے رہا ہے۔ آج رات مجھے کسی سے ملنے جانا ہے اور اس ملاقات کے دوران میں انتہائی حسین لگنا چاہتی ہوں لیکن تم لوگ میرا موڈ چوپٹ کیے دے رہے ہو۔"

ذہنی الجھنوں کے باوجود مائیک مسکرا دیا۔ "میں تم سے زیادہ کام نہیں لوں گا پیاری لڑکی۔" اس نے کہا۔ "بس ڈاکٹر فلپ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں۔"

"اسی بوڑھے کے بارے میں جو کسی ریلوے انجن کی طرح دوڑتا ہوا میرے پاس سے گزرا ہے؟" میبل نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"لیکن تم نے تو شاید اس کے مرچیں بھر دی ہیں۔ وہ بہت غصے میں گیا ہے۔"

☆☆☆

جولائی کے بطن سے اگست نے جنم لیا۔ شہر میں اب بھی گرم ہواؤں کا راج تھا۔ گزشتہ پندرہ روز کے دوران مائیک نے کیس کی تمام فائلوں کا مطالعہ کرلیا لیکن وہ کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ تینوں لڑکیاں اپنے اپنے اپارٹمنٹ میں تنہا رہتی تھیں۔ تینوں اپارٹمنٹ ہاؤسز کے منیجروں نے ان کی پاک دامنی کی قسمیں کھائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکیاں عام طور پر زیادہ رات گئے تک گھروں سے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

باہر نہیں رہتی تھیں، کسی لڑکی کو بھی کسی لڑکے کے ساتھ واپس آتے نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی کسی مرد نے ان کے کمرے میں رات گزاری۔ تینوں لڑکیوں میں صرف ایک بات بڑی عجیب تھی۔ غیر معمولی حد تک حسین ہونے کے باوجود ان کی طبیعت میں تجسس کا مادہ کچھ زیادہ ہی تھا۔

''بہت مشکل کیس میرے سر منڈھ دیا گیا ہے۔''

مائیک نے بڑبڑاتے ہوئے دسویں مرتبہ کولر سے پانی پیا اور پھر اپنی ڈیسک پر آکر بیٹھ گیا۔ ڈیسک پر بہت سے کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ شروع شروع میں تو اسے یہ یقین نہیں تھا کہ تینوں لڑکیاں پاک باز ہوں گی لیکن اب اسے اس بات پر یقین کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ ان کے کردار کے بارے میں کوئی منفی ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ ''سرخ اسکارف......'' وہ بڑبڑایا۔ مائیک کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اچانک اپنے نتھنوں میں انسانی خوشبو کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

میبل ایک کاغذ ہلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ''ڈاکٹر فلپ ہینڈرسن کے بارے میں مکمل رپورٹ۔'' میبل نے اعلان کیا۔

''لیکن یہ رپورٹ میں نے دو ہفتے قبل مانگی تھی۔'' مائیک نے قدرے برہمی سے کہا۔

''اوہ...... تو آج جناب کا موڈ بہت خراب ہے۔'' میبل مسکرا دی۔ ''سنو! میں رپورٹ چند روز میں ہی دے سکتی تھی لیکن میں نے سوچا کہ رپورٹ مکمل ہونی چاہیے۔ چنانچہ میں نے بعض ایسے لوگوں سے بھی رابطہ قائم کیا جن کا تعلق اس شہر سے نہیں ہے اور اس باعث تاخیر ہوئی۔''

''سوری میبل۔'' مائیک نے اپنے بکھرے ہوئے بال انگلیوں کی مدد سے ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کیس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔''

''کوئی مسئلہ لاینحل نہیں ہوتا۔'' میبل نے اس کے بال کچھ اور بکھیرنے کے لیے اپنے ہاتھ سے اس کا سر سہلا دیا۔ ''اور تم اس مسئلے کو جلد ہی حل کر لوگے۔''

''کاش ایسا ہی ہو۔'' مائیک نے مسکراتے ہوئے رپورٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ میبل ایک دل فریب مسکراہٹ اچھالنے کے بعد واپس چلی گئی۔ وہ غور سے رپورٹ پڑھنے لگا۔

فلپ کو بچپن سے ہی امور فلکیات کی چھان بین کا شوق تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس شوق کی نذر کر دیا اور کامیابیاں حاصل کرتا رہا۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی عورت داخل نہیں ہوئی۔ فلپ کے بارے میں 1990ء سے لے کر 1995ء تک کے خانے خالی تھے۔ اس مدت میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ پھر مائیک کی آنکھیں آخری پیراگراف پر مرتکز ہو گئیں۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ ''ہیلو......'' مائیک نے کہا۔

''ڈاکٹر فلپ بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''کیا میں آج تم سے مل سکتا ہوں؟ میرے پاس چند اہم اطلاعات ہیں۔''

''کیوں نہیں ڈاکٹر۔'' مائیک مسکرایا۔ ''آپ تشریف لے آئیں، میں منتظر ہوں۔''

''نہیں مائیک! میں نہیں آ سکتا...... تم میری رسدگاہ آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے میں تین بجے تک آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔'' مائیک نے جواب دیا۔

ڈاکٹر فلپ نے ریسیور رکھا تو مائیک سوچ رہا تھا کہ اب گاڑی چل نکلی ہے۔

☆☆☆

مائیک شہری حدود سے نکل کر پہاڑی علاقے میں داخل ہوا اور جب اس نے رسدگاہ کی طرف جانے والی سڑک پر کار موڑی تو اسے شہر کی بلند و بالا عمارتیں کھلونوں کی طرح نظر آئیں۔ یہاں گرمی کی شدت بھی کچھ کم تھی۔ مزید دس میل آگے جا کر اس نے رسدگاہ کی طرف کار کو موڑا تو اب اس کی گاڑی ایک تنگ پہاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ بل کھاتی ہوئی سڑک پر بڑی احتیاط سے ڈرائیونگ کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ برسوں بعد اس علاقے سے گزر رہا تھا۔ سڑک تنگ اور دشوار تھی۔ موڑ کاٹتے ہی اچانک ایک اور کار سامنے آگئی۔ مائیک نے پوری قوت سے بریک لگائے اور اس کی گاڑی ایک پہاڑی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ دوسری کار تیزی سے گزر گئی۔ اڑتی ہوئی دھول کے باوجود مائیک نے کار کا ماڈل پہچان لیا۔ ''الو کا پٹھا!'' اس نے گالی دی اور جب اپنی کار آگے بڑھائی تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بریک لگاتے وقت اگر اس کی گاڑی ذرا سی بھی ترچھی ہوتی تو ہزاروں فٹ نیچے موت ہی اس کا استقبال کرتی۔ مائیک کچھ دیر بعد سکون سے کار چلانے لگا اور پھر اس نے ایک کشادہ سڑک دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ اس سڑک کے ایک طرف ہوٹل تھا۔ مائیک نے اپنی کار وہیں روک دی۔ سامنے ہی کچھ دور بلندی پر سبز درختوں کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

درمیان رسدگاہ کے نقرئی گنبد نظر آرہے تھے۔ سب سے بلند چیز ''سن ٹاور'' تھا جس سے روزانہ ہر گھنٹے بعد سورج کی تصویریں لی جاتی تھیں۔

مائیک ہوٹل کے پورچ میں داخل ہوا۔ پورچ کے قریب ہی ایک خالی تالاب تھا۔ اس نے شمال کی طرف دیکھا لیکن اسے اپنے شہر کی عمارتیں نظر نہ آسکیں۔ عمارتیں دبیز دھند میں چھپی ہوئی تھیں۔ مائیک اسکرین ڈور کھینچ کر ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ کلرک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں ڈاکٹر فلپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' مائیک بولا۔

''وہ کہاں مل سکیں گے؟''

''وہاں۔'' کلرک نے نقرئی گنبدوں کی طرف اشارہ کیا۔ مائیک ہوٹل سے نکل آیا اور رسدگاہ کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ رسدگاہ خاصی بلندی پر واقع تھی لہٰذا وہاں پہنچتے پہنچتے مائیک کی سانس پھول گئی۔ اس کے بالکل سامنے ایک دروازہ تھا۔ مائیک نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازہ کھلا ہوا ملا۔ وہ بلا کسی ہچکچاہٹ کے اندر داخل ہوگیا۔ رسدگاہ کا ماحول کچھ زیادہ ہی سرد تھا۔ ہلکی سی خوشبو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر کے برعکس اندر تاریکی تھی۔ لہٰذا وہ فوری طور پر ماحول نہیں دیکھ سکا۔ جب اس کی آنکھیں بتدریج اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو اس نے غور سے دیکھا کہ کمرے کے وسط سے چھت تک ایک بلند آلہ نصب ہے۔ مائیک نے فوراً پہچان لیا کہ یہ ٹیلی اسکوپ ہے۔

''ڈاکٹر فلپ۔'' مائیک نے ٹیلی اسکوپ کا جائزہ لینے کے بعد آواز لگائی۔ آواز بازگشت بن کر واپس آگئی۔ اس نے پھر آواز دی لیکن ایک بار پھر بازگشت ہی سنائی دی۔ مائیک کو یقین تھا کہ ڈاکٹر ٹیلی اسکوپ کے بلند پلیٹ فارم پر بیٹھا ہوگا۔ اس نے گردن اٹھا کر ادھر کی طرف دیکھا۔ ٹیلی اسکوپ کا کنٹرول بورڈ سرخ ہورہا تھا۔ مائیک فوراً سمجھ گیا کہ کسی نے کنٹرول بورڈ سوئچ آن کررکھا ہے۔

''لیکن ڈاکٹر کہاں مرگیا؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ گردن اٹھائے ہال میں گھومتا رہا اور پھر اسے وہ نظر آ گیا۔ وہ اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ اس نے مائیک کی آواز ہی نہیں سنی تھی۔ ڈاکٹر فلپ ٹیلی اسکوپ کے بلند پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ مائیک فوراً لوہے کی سیڑھی کی جانب بڑھ گیا جو پلیٹ فارم سے منسلک تھی۔

وہ ابھی چھت تک جانے والی سیڑھی کے درمیان میں ہی تھا کہ اچانک اسے آہنی ریلنگ سے چپک جانا پڑا۔ ایک سرد لہر اس کے جسم میں سرایت کرگئی۔ یہ خوف کی لہر تھی۔ مائیک نے بیس فٹ بلندی پر ڈاکٹر فلپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر اس کا جسم کانپنے لگا۔ ڈاکٹر کے دونوں ہاتھ بے جان انداز میں جھول رہے تھے۔ ڈاکٹر کا جسم پلیٹ فارم سے اوپر ایک آہنی ستون کے ساتھ لٹکا ہوا نظر آیا۔

ڈاکٹر کی گردن میں سرخ رنگ کا اسکارف بھی تھا۔ گویا اسے بھی کسی نے اسکارف سے باندھ کر پھانسی دے دی تھی۔

☆☆☆

''ہمیں کھل کر بات کرنا چاہیے۔'' مائیک نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان سے کہا۔ ''تم ڈاکٹر فلپ کے اسسٹنٹ تھے؟''

''ہاں۔'' اس نوجوان نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔ اس کی عمر کا اندازہ اس کے چہرے سے لگانا مشکل تھا لیکن عمر پچیس تیس کے درمیان ہی ہوگی۔ اس کے چہرے سے رنج وغم کے آثار عیاں تھے۔ ''میں ڈاکٹر کے معاونین میں سے ایک ہوں۔'' مائیک کچھ سوچتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ ڈاکٹر فلپ کی لاش ملے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ سورج دھند ہی میں کہیں کھو کر گم ہوچکا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ رسدگاہ کے گنبد میں ڈاکٹر کی موت کے باوجود کام جاری رہا۔

''ڈاکٹر کے معاونین کی تعداد کتنی ہے؟'' مائیک نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

''دو۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

''وہ دوسرا کون ہے؟'' مائیک نے پھر سوال کیا۔ یہ نوجوان ہی سب سے پہلے اس ہال میں داخل ہوا تھا جہاں مائیک، فلپ کی لاش دیکھنے کے بعد ہکا بکا کھڑا اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نوجوان کا نام اسٹیو تھا جس سے وہ ہم کلام تھا۔

''نارما۔'' اسٹیو نے جواب دیا۔

''اوہ..... عورت۔ کیا تمہیں علم ہے ڈاکٹر فلپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟''

''ہاں جانتا ہوں۔'' اسٹیو نے مائیک کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کے سلگایا۔ اس کے جواب سے مائیک کا دل دھڑکنے لگا۔

''مجھے بتاؤ کہ ڈاکٹر مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا؟'' مائیک نے مضطرب ہوکر نوجوان سے کہا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اسٹیو نے جواب میں جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کے مائیک کے حوالے کر دیا۔ ''یہ کاغذ کا وہ ٹکڑا ہے جس پر ڈاکٹر ہم سے باتیں کرتے وقت کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اس ٹکڑے کو محفوظ کر لیا تھا۔'' مائیک نے کاغذ پر نظر ڈالی اس پر مختلف اشکال بنی ہوئی تھیں۔

مائیک کچھ سمجھ نہ سکا۔ ''کیا تم ان اشکال کی وضاحت کر سکتے ہو؟''

''میں۔'' اسٹیو مسکرا دیا۔ ''آج صبح جب میں رسد گاہ میں پہنچا تو ڈاکٹر نے مجھے طلب کیا اور کہا کہ وہ لڑکیوں کے قتل کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ قتل کے سلسلے میں اس کا ایک نظریہ بن چکا ہے اور وہ ایک ایسے شخص سے بھی واقف ہے جس پر شک کیا جا سکتا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اسٹیو اٹھا اور اس نے کاغذ پر نظر ڈالی۔ ''پہلی شکل چند ہندسوں کا مجموعہ ہے۔ اگر شکل کو ہندسوں میں بدلا جائے تو یہ یکم جون ہے۔ وہی تاریخ جب پہلا قتل ہوا اس شکل کے ساتھ ایک اور شکل ہے جو بھرپور چاند کو ظاہر کرتی ہے۔ گویا پہلا قتل یکم جون کی شب اس وقت ہوا جب پورا چاند تھا۔ دوسری شکل ڈی کوڈ کرنے سے ہمیں تیرہ جون کی تاریخ اور چاند کی مکمل کیفیت ملتی ہے۔ تیسری شکل ڈی کوڈ کی جائے تو تیس جولائی کی تاریخ بنتی ہے اور وقت ہے آٹھ بج کر سینتالیس منٹ جب تیسرا قتل ہوا۔''

''یہ کیا حماقت ہے۔'' مائیک جھنجلا گیا۔

''یہ حماقت نہیں۔ آپ ذرا تینوں قتل کے وقت دیکھیں، وہ بھی ہوں گے۔'' اسٹیو نے جواب دیا۔

مائیک نے نوٹ بک نکال کر دیکھی اور اس کے چہرے پر حیرت کے بادل چھا گئے۔ ''تقریباً درست۔'' وہ بڑبڑایا۔

''مجھے یقین تھا کہ زیادہ فرق نہیں ہوگا۔'' اسٹیو مسکراتے ہوئے میز کے کونے پر ٹک گیا۔ ''ڈاکٹر فلپ بہت چالاک اور ہوشیار شخص تھے۔ نوے فیصد لوگوں کو مکمل چاند کی اس حقیقت کا علم نہیں کہ چاند صرف ایک لمحے تک مکمل رہتا ہے، لوگوں کے نزدیک تو مکمل چاند رات بھر اور کئی راتوں تک رہتا ہے۔''

مائیک نے اس نئے تجزیے کو ذہن میں دہرایا اور سوچنے لگا کہ یہ نکتہ کس نتیجے پر لے جا سکتا ہے۔ ''گویا...... قاتل کوئی ایسا شخص ہے جو چاند کی کیفیتوں سے واقف ہے...... کوئی ماہر فلکیات۔''

''نہیں۔'' اسٹیو نے سگریٹ کے ٹوٹے سے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''لائبریریوں میں بہت سی کتابیں موجود ہیں جن کو پڑھ کر کوئی عام سا شخص بھی معلوم کر سکتا ہے کہ چاند کس رات اور کس لمحے مکمل ہوگا۔''

''تب پھر اس نکتے پر بات کرنے کے لیے ڈاکٹر نے مجھے کیوں بلایا تھا؟'' مائیک نے تعجب سے پوچھا۔ اسٹیو نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میز سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کے باہر اب مکمل تاریکی تھی۔ اسٹیو کچھ دیر تک یونہی گھورتا رہا اور پھر اچانک مائیک کی طرف پلٹا۔

''یہی وہ سوال ہے جس کے بعد ہماری مشکلات شروع ہوتی ہیں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر کو دو افراد کی مدد حاصل ہے، ایک میں اور دوسری نارما...... نارما دس سال سے اور میں آٹھ سال سے ڈاکٹر کے ساتھ ہیں۔ اسے ڈاکٹر سے بہت محبت تھی۔ وہ ڈاکٹر کے ایک ایک لفظ کو مقدس موتیوں کی طرح سمجھتی تھی۔ اس نے کبھی ڈاکٹر کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ وہ بہت ذہین ماہر فلکیات ہے اور اگر چاہتی تو بہت ترقی کر سکتی تھی۔''

''چاہتی کیا مطلب؟''

''ہاں...... لیکن وہ ڈاکٹر سے جلتی بھی تھی۔''

''تمہاری اس لایعنی بات سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔'' مائیک نے نوجوان کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نکل آئے گا۔'' اسٹیو نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔ ''بس میری باتیں سنتے رہو، حتمی نتیجے پر پہنچ جاؤ گے۔ مجھے علم نہیں کہ ڈاکٹر نے ان تینوں لڑکیوں کے بارے میں تمہیں کیا کچھ بتایا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تینوں لڑکیاں کلاس ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر سے ملتی تھیں۔ میری رائے میں ڈاکٹر فلپ ایک ایسا بھوکا بھیڑیا تھا جس نے پروفیسری کی قبا پہن رکھی تھی۔''

اس لمحے مائیک کو ڈاکٹر فلپ کے بارے میں جیل کی رپورٹ کا آخری پیراگراف یاد آیا۔ ہر لڑکی قتل ہونے والی شب، قتل سے پہلے رات کے کھانے پر ڈاکٹر فلپ کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔

''اچھا۔'' مائیک نے طویل سانس لی۔ ''لیکن نارما کے بارے میں تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''میں چغلی کھانے سے نفرت کرتا ہوں لیکن قانون کی مدد کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔'' اسٹیو نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے بجھا دیا۔ ''نارما بہترین طالبہ تھی۔ بہت ذہین اور حساس۔ وہ ہارورڈ میں زیر تعلیم تھی کہ شدید

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بیمار ہوگئی اور اس کی صحت ناگفتہ بہ حد تک گر گئی۔ صحت کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی متاثر ہوا۔ چنانچہ ایک روز نارما نے اس جنونی کیفیت میں اپنی ایک عزیز سہیلی کو قتل کر دیا جس کے بعد اسے دماغی امراض کے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا......"

"لیکن......" اس نے بات کاٹی۔

"سنتے رہو۔" اسٹیو کے لہجے میں سختی تھی۔ "اہم بات یہ ہے کہ نارما نے وہ قتل ایک ایسی شب اور ایسے لمحے میں کیا جب چاند مکمل تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ نارما نے قتل کے لیے وہ لمحہ کیوں منتخب کیا۔ ممکن ہے اس کی یہ بیماری کسی قسم کی قمری بیماری ہو۔ بہرحال نارما کو اسپتال بھیج دیا گیا...... جہاں وہ صحت یاب ہوگئی۔ جب اسپتال سے ڈسچارج ہوئی تو ڈاکٹر نے اسے انٹرویو کے بعد ملازم رکھ لیا۔"

"لیکن ان تمام باتوں کا علم تمہیں کس طرح ہوا؟" مائیک نے جلدی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر فلپ نے آج صبح ہی مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا۔" اسٹیو نے فوراً جواب دیا۔

"نارما کے پاس کس ماڈل کی کار ہے؟" مائیک نے سوال کیا۔

"2010ء کی شیورلیٹ۔" اسٹیو بولا۔ مائیک کو فوراً یاد آ گیا کہ اس ماڈل کی کار نے رسد گاہ کے راستے میں اسے ٹکر مارنے کی کوشش کی تھی۔

"ٹھیک ہے اسٹیو۔" اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ "اب تم جا سکتے ہو لیکن پولیس کی اجازت کے بغیر قصبے سے باہر نہیں جاؤ گے۔"

"تم نارما کو گرفتار کرو گے؟" اسٹیو نے چلتے چلتے پوچھا۔

"ہاں، یہ ناخوشگوار فرض مجھے ہی ادا کرنا پڑے گا۔" مائیک اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اسٹیو مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ مائیک سوچ رہا تھا کہ اسٹیو کے بیان کی روشنی میں نارما نامی لڑکی مجرم ہو سکتی ہے۔ پھر وہ ان لڑکیوں کے قتل کا مقصد تلاش کرنے لگا تو رقابت اور حسد کے علاوہ اور کوئی بات نہیں جچی۔ اگر قتل نارما نے کیے ہیں تو اس کا سبب نسوانی حسد ہی ہو سکتا ہے۔ مائیک نے کچھ دیر بعد ہیڈ کوارٹر فون کر کے نارما کو حراست میں لینے کا حکم دیا لیکن پھر ایک منٹ بعد ہی وہ اپنا حکم منسوخ کر رہا تھا۔ اس نے مزید احتیاط سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز مائیک نے سرچ وارنٹ حاصل کر کے ڈاکٹر فلپ کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی۔ اپارٹمنٹ مختلف قسم کے آلات اور کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک میز پر ہارورڈ ڈائریکٹری پڑی تھی۔ مائیک ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور کتاب کے ورق پلٹنے لگا۔

پھر اس کی آنکھیں ماہ جون میں امتحان پاس کرنے والوں کی فہرست پر جم گئیں۔ اس صفحے پر دو آشنا تصویریں تھیں۔ ایک ڈاکٹر فلپ اور دوسری نارما کی۔ اس تصویر میں نارما بہت کم عمر نظر آ رہی تھی اور تصویر کے نیچے لکھی عبارت بھی بہت دلچسپ تھی۔ "مس نارما امورِ فلکیات کے بجائے اب نرسنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ انہوں نے نرس بننے کا فیصلہ کیا ہے۔" اس فقرے کے باعث مائیک کے دماغ میں کچھ خیالات کلبلانے لگے۔ اس نے ایک بار پھر اپارٹمنٹ کی تلاشی لی اور ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد اسے مڑا تڑا ایک کاغذ ملا جو ردی کی ٹوکری میں پڑا تھا۔ براؤن رنگ کے اس لفافے پر ڈاکٹر فلپ کا نام لکھا تھا اور یہ شکاگو سے پوسٹ کیا گیا تھا۔

مائیک نے ٹیلی فون اٹھا کر اپنے دفتر رنگ کیا۔

"ہیلو......"

"مائیک تم کہاں ہو؟" میبل کی مضطرب آواز سنائی دی۔

"بس آوارہ گردی کرتا پھر رہا ہوں۔" مائیک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فلپ کے ہاتھوں کے بارے میں کیا اطلاعات ملی ہیں؟"

"اس کے ہاتھوں پر فوٹوگرافک کیمیکل اجزا پائے گئے ہیں لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ماہرین فلکیات بالعموم تصویریں بناتے اور دھوتے ہیں۔"

"اسٹیو کے بارے میں کیا علم ہوا؟"

"اسی قسم کا نتیجہ ظاہر ہوا ہے۔"

"اسکارف؟"

"اوہ......" میبل نے طویل سانس لی۔ "اس بارے میں تمہاری رائے بہتر ثابت ہوئی۔ میں نے جب لیبارٹری جا کر پیٹر سے درخواست کی کہ وہ ہر اسکارف کا پھر تجزیہ کرے۔ اس نے غصے میں چیلنج کیا کہ نتیجہ پہلے جیسا ہی ہوگا اور ہوا بھی یہی۔"

"تم تمام اسپتالوں سے رابطہ قائم کر کے یہ معلوم کرو کہ انہوں نے کبھی نارما نامی لڑکی کا علاج کیا ہے۔ میں ڈائریکٹر کے آفس میں ملوں گا۔"

☆☆☆

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مائیک ڈاکٹر کوشرن کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ''میں پیشہ ورانہ دیانت اور ضابطوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تم سے تعاون کرنے کو تیار ہوں مائیک۔'' کوشرن نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر فلپ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟'' مائیک نے میز پر کہنیاں ٹیکتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کوشرن نے بجھا ہوا سگار ایک طرف رکھ دیا۔

''جب میری ملاقات ڈاکٹر سے ہوئی تو اس وقت اس کی عمر تیس سال کے قریب تھی لیکن ستاروں کی دریافت کے سلسلے میں عزت و شہرت میں کوئی اور اس کا مدمقابل نہ تھا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ویسے میں نے ایک رپورٹ تیار کرلی ہے جس سے تمہیں بہت کچھ مل جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک فائل مائیک کی طرف سرکا دی۔

مائیک نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ''لیکن ڈاکٹر، اس کی عمر کے پانچ سالوں میں رپورٹ خاموش ہے۔ فلپ 1990ء سے 1995ء تک کیا کرتا رہا؟'' مائیک نے فائل بند کردی۔

''یہ غیر معمولی بات نہیں۔'' ڈاکٹر کوشرن نے کندھے اچکائے۔ ''بہت سے سائنس دان تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لیے منظر سے غائب ہوجاتے ہیں تاکہ علم و تحقیق کے سلسلے میں منصوبہ بندی کرسکیں لیکن میرے نزدیک یہ غیر معمولی بات ہے کہ تم قاتل کے بجائے مقتول کے ماضی کو کھنگال رہے ہو۔ فلپ قتل ہوچکا ہے اور تمہیں اس کے قاتل کو تلاش کرنا چاہیے۔''

''میں چور دروازے سے قاتل تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں ڈاکٹر۔'' مائیک مسکرایا۔ ''اور نارما کیسی لڑکی ہے؟''

''لیکن نارما کا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟''

''ممکن ہے وہی قاتل ہو۔'' مائیک نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کوشرن نے بہت تیزی سے اپنی کرسی چھوڑ دی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ ''ناممکن......'' وہ غرایا۔ ''میں ایسی بے سروپا بات پر کبھی یقین نہیں کرسکتا۔''

''دھیرج ڈاکٹر، دھیرج۔'' مائیک نے اسے پچکارا۔ ''میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ قاتل ہے۔ میں صرف ایک امکان کا ذکر کررہا تھا۔''

''اور تمہاری اس طفلانہ بات نے مجھے مجبور کردیا ہے کہ میں تمہیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں۔'' ڈاکٹر کوشرن پھر غرایا۔ ''نارما بہت پیاری لڑکی ہے۔ فلکیات کے شعبے میں مجھے اس سے بہت سی توقعات ہیں۔''

''اسٹیو کے بارے میں بھی آپ کی یہی رائے ہوگی؟'' مائیک ڈاکٹر کی ناراضگی کے باوجود بے مزہ نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر کوشرن نے طویل سانس لی، اس کے چہرے سے غصے کی پرچھائیاں دور ہونے لگیں اور وہ میز کے کونے پر ٹک گیا۔ اس نے بجھا ہوا سگار اٹھا کر سلگا لیا۔ ''وہ بھی اچھا لڑکا ہے۔ میرے نزدیک اسٹیو ذہین لڑکا ہے جو اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ وہ ہماری رسدگاہ میں آٹھ برس قبل ملازم ہوا تھا۔''

''اور نارما؟''

''وہ اسٹیو سے دو سال پہلے ملازم ہوئی تھی۔''

''اتنی طویل ملازمت کے باوجود دونوں ابھی تک اسسٹنٹ ہی کیوں ہیں؟'' مائیک نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''صرف اس وجہ سے کہ ان کی ترقی ڈاکٹر فلپ کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔'' ڈاکٹر کوشرن کچھ دیر بعد مسکرایا۔ ''اگر فلپ کسی اور جگہ چلا جاتا تو دونوں میں سے کسی ایک کو اس کی جگہ مل جاتی۔''

''چلا جاتا...... یا...... مرجاتا۔'' مائیک معنی خیز انداز میں بڑبڑایا۔

''اوہ......'' کوشرن بھی مائیک کا مطلب سمجھ گیا۔ ''تو تم اب اس لائن پر سوچ رہے ہو؟''

مائیک نے کہا۔ ''فلپ کی موت کے بعد ترقی کے لیے سب سے پہلے کس کا نام زیر غور آتا ہے؟''

''نارما کا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ مائیک اٹھ کھڑا ہوا۔

''شکریہ ڈاکٹر...... آپ نے میری بہت مدد کی۔ اب صرف ایک بات اور بتا دیں کہ متحرک ستارے کیا ہوتے ہیں؟''

''امورِ فلکیات کی پہلی کلاس کا پہلا لیکچر۔'' ڈاکٹر کوشرن خوش دلی سے مسکرایا۔ ''متحرک ستارہ...... متحرک ہوتا ہے۔ پھیلتا ہے، اس کی روشنی تیز ہوتی ہے اور اس روشنی کی وجہ سے ستارے کی سطح پر دھماکے بھی ہوسکتے ہیں۔ روشنی کی دوسری وجوہ بھی ہیں جن کا فی الحال ہمیں علم نہیں۔''

''اگر ہم آسمان کو مسلسل دیکھتے رہیں تو متحرک ستارہ نظر آسکتا ہے؟'' مائیک نے پھر پوچھا۔

''نہیں میرے دوست! لوگوں نے صرف ایک متحرک ستارہ تلاش کرنے کے لیے عمریں گزار دیں۔''

''اس کی تلاش کا عام طریقہ کیا ہے؟''

''کئی کئی راتوں تک آسمان کے کسی حصے کی تصویریں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اتاری جاتی ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ دو مختلف راتوں میں آسمان کے ایک ہی حصے کے دو نیگیٹو بنائے جاتے ہیں۔ اگر تصویر میں دو ستارے ایک ہی طرح روشن ہوں تو انہیں متحرک ستارہ نہیں کہتے۔ اگر دونوں کی روشنی مختلف ہو تو یہ متحرک ستارے کہلاتے ہیں۔"

"ڈاکٹر فلپ اس کام میں مصروف تھا؟" مائیک نے پوچھا۔

کوشرن نے دراز سے دو بڑے لفافے نکال کر میز پر رکھ دیے جن میں فوٹوگرافک پلیٹیں تھیں۔

"یہ ڈاکٹر فلپ کی تحقیق کا ایک حصہ تھیں۔"

"یہ تصویریں ٹیلی اسکوپ کے ذریعے بنتی ہوں گی؟"

"ہاں اور تصویریں اتارنے کے بعد دھلائی میں چار پانچ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ مشین کا آپریٹر ٹیلی اسکوپ کے سامنے کھڑا رہ کر ستاروں پر نگاہ رکھتا ہے تاکہ زمین کی معمولی سی حرکت کو بھی محسوس کر کے ٹیلی اسکوپ کو دوبارہ ستارے کی طرف کر دے کیونکہ ذرا سی بھی حرکت ٹیلی اسکوپ اور ستارے کو فریم سے باہر کر دیتی ہے۔"

"فرض کریں کہ تصویریں بنانے والا تصویر ایکسپوز ہونے کے وقت ٹیلی اسکوپ سے چلا جائے تو کیا ہوگا؟" مائیک نے پوچھا۔

"تب فوٹوگرافک پلیٹ ناقص بنے گی۔" کوشرن نے جواب دیا۔ "ستاروں کے اردگرد دھند نظر آئے گی۔"

"ڈاکٹر فلپ نے یکم جون اور تیس جون کو فوٹوگرافک پلیٹیں بنائی تھیں؟" مائیک نے پوچھا۔

کوشرن نے جواب دینے کے بجائے دو پلیٹیں اس کے حوالے کر دیں۔ مائیک نے پلیٹیں دیکھیں اور سر ہلا دیا۔ "ان سے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ واضح اور صاف تصویریں ہیں۔" ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور مائیک وہاں سے چل دیا۔

☆☆☆

مائیک کو مزید معلومات حاصل کرنے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ اگست کی اٹھائیس تاریخ اب قریب آرہی تھی اور مائیک کو اسی کا انتظار تھا۔ اٹھائیس تاریخ کو وہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا بہت کچھ سوچ رہا تھا کہ میبل کمرے میں داخل ہوئی۔ مائیک نے میبل کی طرف دیکھے بغیر چائے کا کپ منہ سے لگایا۔ وہ فی الوقت کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے مائیک؟" میبل اچانک پھٹ پڑی۔ "ہر وقت خاموش رہتے ہو۔ میں اتنی دیر سے کھڑی ہوں لیکن تمہیں احساس ہی نہیں۔ اگر اسپتالوں اور نارما کے بارے میں مجھے ناکامی ہوئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے ہر اسپتال فون کیا۔ اب اگر شکاگو والے ایک ہفتے کے بعد بھی جواب نہ بھیجیں تو میں کیا کروں؟"

"تم بہت جذباتی ہو میبل۔" وہ مسکرایا۔ "میں تمہاری رپورٹ کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں۔ میں نے تو بس یونہی تمہیں ایک کام پر لگا دیا تھا لیکن اب ہر شخص یہی فرمائش کر رہا ہے کہ نارما کو گرفتار کر لیا جائے۔"

"اور تم اُسے گرفتار نہیں کرنا چاہتے۔" میبل نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میرے پاس نارما کے خلاف ثبوت نہیں ہے۔ مجھے سب سے پہلے اُس اسپتال کا ریکارڈ مطلوب ہے جہاں بقول اسٹیو، نارما قتل کرنے کے بعد زیرِ علاج رہی تھی۔"

☆☆☆

اگست کا مہینا اپنے اختتام کے قریب پہنچنے لگا اور پھر آخری روز سہ پہر کے وقت سڑکوں پر ٹریفک جام ہو گیا۔ مائیک سڑک پر ٹریفک کو گھورتے ہوئے کیس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ تب اُس نے سہ پہر کی ڈاک اٹھائی۔ اُس میں شکاگو سے آیا ہوا ایک لفافہ بھی موجود تھا اور اُس لفافے کو دیکھتے ہی مائیک کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس کا خیال درست نکلا تھا۔ لیکن وہ اب بھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

سورج ڈوب گیا۔ ہزاروں بلب روشن ہو گئے۔ مائیک گھر واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رُک گیا۔ اُس کی نظریں فیکس مشین پر تھیں۔ ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ فیکس سے کاغذ باہر نکلنے لگا۔ مائیک نے فوراً گردن جھکا کر عبارت کا جائزہ لیا۔ جنوب کے چھوٹے سے قصبے کے ایک پاگل خانے کا پیغام درج کیا گیا تھا۔ اس کا پہلا اندازہ درست تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ کل رسدگاہ جا کر اسٹیو سے کچھ باتیں کرے گا۔ اب وہ گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ لفٹ کی طرف جاتے ہوئے سارجنٹ بل نے اُسے دیکھ لیا۔

"ریڈ اسکارف کیس تم کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" مائیک نے تھکن کے احساس کے باوجود مسکرانا ضروری سمجھا۔ وہ مزید بولا۔

"اور اب کامیابی کے بہت قریب ہوں۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بل نے دونوں گال پھلا کر منہ سے ہوا چھوڑی۔
''لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ کیس کبھی حل نہیں ہوگا۔''
''کبھی کبھی خوش بختی ساتھ دے جاتی ہے۔'' مائیک نے جواب دیا۔
''میرا خیال ہے تمہیں قاتل نہیں قاحلہ کی تلاش ہے۔'' بل نے اپنے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔
''تمہیں کس نے بتایا؟'' مائیک سنجیدہ ہوگیا۔
''میبل نے۔ وہ بہت ہلکے پیٹ کی لڑکی ہے۔'' بل نے کہا اور مائیک کا ہاتھ تھام کر لان میں لے گیا۔ ''ذرا دیکھو تو چاند کتنا حسین لگ رہا ہے۔ آج چودھویں رات کا چاند ہے۔''
مائیک کو اچانک جھرجھری سی آگئی۔ مکمل چاند...... اس نے سوچا۔ پھر اُسے تصور میں ڈاکٹر فلپ کی جھولتی ہوئی لاش نظر آئی۔ اُس کی نظروں کے سامنے اسٹیو اور نارما کی تصویریں بھی ناچنے لگیں۔ اُس نے دیکھا۔ پیلے رنگ کا ایک تھال آسمان میں ٹنگا ہوا تھا بالکل گول۔
''تمہارے پاس ایئر بک ہے؟'' مائیک نے مضطرب ہوکر اُس کا کندھا تھام لیا۔
''ہاں...... کمرے میں پڑی ہے۔''
''بھاگ کر لے آؤ...... جلدی پلیز۔'' مائیک چلّایا۔
سارجنٹ بل اپنے بھدے اور موٹے ڈیل ڈول کے باوجود پوری رفتار کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر واقع آپریشن روم کی طرف بھاگا اور مائیک چاند کو گھورنے لگا۔
ایک منٹ بعد ہی بل ہانپتا کانپتا واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب دبی ہوئی تھی۔ مائیک نے فوراً کتاب کھولی اور اگست کے مہینے پر نظر ڈالی۔
''30 اگست مکمل چاند۔ رات نو بج کر ترپن منٹ پر۔'' مائیک نے گھڑی دیکھی۔ ٹھیک نو بجے تھے۔ ''بل! ہمیں ترپن منٹ کے اندر اندر پہاڑی رسدگاہ تک پہنچنا ہے۔''
''تو...... تو...... کیا کوئی اور قتل......''
''ہاں اگر ہم وہاں نہ پہنچے تو ممکن ہے ایک اور قتل ہوجائے گا۔''

☆☆☆

رات بہت حسین تھی۔ مائیک نے پولیس کار کی کھڑکی سے جھانکا۔ سرو کے قدآور درخت چاند کی روشنی میں ایستادہ تھے۔ مائیک کا ذہن ایک نئی کشیدگی کا شکار تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ بل چودھویں کے چاند کا ذکر نہ کرتا تو شاید کامیابی نہ مل پاتی۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔
موٹا بل بڑی مہارت سے کار چلا رہا تھا۔
''بل۔'' مائیک نے سرگوشی کی۔ ''رسدگاہ کے بجائے فیئرویو کی طرف چلو۔ آٹھ سو بیس فیئرویو اسٹریٹ۔ آگے چل کر بائیں طرف موڑ لینا۔''
''نارما کے گھر۔'' بل نے پوچھا۔ مائیک نے اثبات میں سر ہلایا تو بل نے بائیں طرف کار موڑ لی۔ ''لیکن اگر وہیں جانا ہے تو وائرلیس کے ذریعے فیئرویو کی چوکی کو خبردار کردو، وہ لوگ ہم سے پہلے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔'' بل نے تجویز پیش کی۔
''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔'' مائیک نے جواب دیا۔ اس نے کار کے کلاک کو گھورا۔ پانچ بج کر اکیاون منٹ ہورہے تھے۔ ''جلدی کرو بل...... دیر ہورہی ہے۔'' بل نے سائرن کار کی سرخ بتی روشن کردی۔ اب پولیس کار ٹریفک کے تمام ضابطوں کو کچلتی ہوئی اڑی جارہی تھی۔
''سائرن بند کردو۔ وہ ہوشیار ہوجائے گا۔'' مائیک نے حکم دیا۔
''ہوجائے گا سے کیا مراد ہے؟'' بل کے موٹے گال پھڑکنے لگے۔ ''تم تو نارما کو......''
''مجھے قاحلہ کی نہیں قاتل کی تلاش ہے۔'' مائیک غرایا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ دو منٹ بعد ہی وہ ایک اپارٹمنٹ ہاؤس کے پارکنگ ایریا میں تھے جہاں ایک شیورلیٹ کار کھڑی تھی۔ مائیک اور بل دونوں پھرتی سے اترے۔ مائیک نے ایک اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا۔ ایک کمرے میں ایک ٹیلی ویژن چل رہا تھا اور باہر شیورلیٹ کے ساتھ کوئی دوسری کار نہیں کھڑی تھی۔ بظاہر ایسا لگتا تھا کہ اپارٹمنٹ اندر سے بالکل خالی ہے۔
مائیک نے بل کی طرف دیکھا اور اچانک دونوں ہی اچھل پڑے۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور فضا میں تحلیل ہوتی چلی گئی۔ اپنے موٹاپے کے باوجود بل مائیک کے ساتھ دوڑا۔ اس نے اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ مقفل تھا۔ بل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر اس نے دروازے پر کندھے سے ٹکر ماری۔ دروازہ دو سو ساٹھ پونڈ وزنی بل کا دھکا برداشت نہ کرسکا۔
چند لمحے بعد مائیک بیرونی کمرے میں تھا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں ملا۔ وہ بیڈروم کی طرف بھاگا جہاں سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی لیکن بیڈروم بھی خالی تھا۔ البتہ واش روم خالی نہیں تھا۔ شاور کی راڈ کے ساتھ نارما کا جسم جھول رہا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا۔ گردن میں سرخ اسکارف نظر آیا۔ ”میرے خدا۔“ بل کی سرگوشی سنائی دی۔ ”اُس نے اپنے جرائم سے تنگ آ کر خودکشی کرلی۔“

”نہیں۔“ مائیک بڑبڑایا۔ ”نارما نے خودکشی نہیں کی، یہ ابھی زندہ ہوگی، آؤ اسے اتارتے ہیں۔“

☆☆☆

صبح تین بجے بل اور مائیک کی کار رسدگاہ کے دروازے کے باہر رکی۔ دونوں پھرتی سے اترے۔ ”لیکن اب یہاں کیا رکھا ہے۔ وہ لڑکی تو اسپتال میں پڑی ہے۔ کیا اس نے تمہیں کچھ بتایا ہے؟“ بل نے پوچھا۔

”ہاں...... لیکن اس نے جو مجھے بتایا ہے اُس کا مجھے پہلے سے علم تھا۔“ مائیک نے کہا اور اس وقت دونوں رسدگاہ کے ہال میں داخل ہوئے پھر دونوں ایک تاریک کمرے میں جا گھسے۔

”باپ رے...... کتنا اندھیرا ہے۔“ بل نے سرگوشی کی لیکن پھر اُس کی نظر کمرے کے وسط میں سرخ روشنی پر پڑی۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا، چھت کے کھلے حصے سے ستارے نظر آرہے تھے۔ کمرے میں ٹیلی اسکوپ کو چلانے والی مشین کی آواز گونج رہی تھی۔

”ڈاکٹر اسٹیو......“ مائیک نے آہنی سیڑھی کے قریب پہنچ کر آواز لگائی۔

”کون ہے؟“ چند لمحوں بعد جواب کی شکل میں سوال کیا گیا۔

”کیپٹن مائیک...... مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

”کس بارے میں؟“ پھر سوال کیا گیا۔

”نیچے آ کر بات کرو اور ہاں کوئی حماقت نہ کرنا، میرے ہاتھ میں ریوالور موجود ہے۔“ مائیک چلایا۔ اسی لمحے بل نے بھی اپنا سروس ریوالور نکال لیا۔ ایک منٹ تک خاموشی رہی پھر آہنی سیڑھی سے ایک ہیولا نیچے اترنے لگا۔ مزید ایک لمحے بعد اسٹیو مائیک سے چند فٹ دور کھڑا تھا۔

”تم شاید اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو کیپٹن۔“ اسٹیو نے کہا۔ ”رات گئے رسدگاہ میں بلا اجازت داخل ہونا جرم ہے۔“

”اپنے دفتر میں چلو، وہیں بات کریں گے۔“ مائیک نے بل کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اپنا ریوالور ہولسٹر میں ڈال لیا۔ مائیک اور اسٹیو ایک ساتھ آگے چلے۔ بل نے اسٹیو کو دیکھ کر دانت نکالنے کی کوشش کی۔ اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ مائیک کیا کرنا چاہتا ہے۔ البتہ یہ احساس ضرور تھا کہ نارما نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وسیع دفتر میں داخل ہو کر اسٹیو نے چند بلب جلائے تو کمرا روشن ہوگیا۔ بل نے مائیک کے دائیں طرف ایک میز سے ٹیک لگالی۔

”ہاں کیپٹن...... اب کہو۔“ اسٹیو ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم بالکل احمق ہو۔“ مائیک نے گھورتے ہوئے کہا اور بل ہنسنے لگا۔ اس کا پورا جسم اس طرح تھل تھل کر رہا تھا جیسے کسی نے گدگدی کردی ہو۔

”تب پھر مجھے اجازت دو۔ میرے کیمرے میں ایک فلم ہے جس کی پلیٹ بنانا ہے۔“ اسٹیو طیش کے عالم میں کھڑا ہوگیا۔

”ابھی کہاں جارہے ہو پیارے۔“ بل نے ریوالور نچایا۔ ”کیپٹن یہ ثابت کرے گا کہ تم احمق ہو اور تمہیں کیپٹن کی بات سننی چاہیے۔“

”میں سہ پہر تین بجے سے اوپر ہی تھا۔“ اسٹیو نے جواب دیا۔ ”اور متحرک ستاروں کی تصویریں لے رہا تھا؟“

”تب پھر رات دس بجے کے قریب تمہارے کیمرے میں کوئی تصویر تو ہوگی؟“ مائیک نے سوال کیا۔

”ہاں پہلی پلیٹ رات آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک کی ہے۔“

”میں پلیٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ مائیک نے فرمائش کی۔

اسٹیو نے ایک لمحے تک ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن پھر ایک دراز کھول کر لفافہ نکالا اور مائیک کی طرف بڑھا دیا۔ مائیک نے سیاہ پلیٹ ایک بلب کے سامنے رکھ کر دیکھی اور پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے واپس کردی۔

”اب میں جاؤں؟“ اسٹیو کھڑا ہوگیا۔

”ہاں اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن یہ سن لو کہ نارما زندہ ہے۔“ مائیک کھڑا ہوگیا۔ اس لمحے اسٹیو کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”اوہ۔“ وہ کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔

”اب مزید حماقتیں مت کرنا اسٹیو۔“ مائیک غرایا۔

”تم نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”لیکن میں تو اوپر تھا۔ تین بجے سے اب تک۔“

”سنو۔“ مائیک میز پر جھک گیا۔ ”تم اوپر ضرور تھے لیکن کچھ دیر کے لیے نیچے اترے تھے۔ اس باعث تمہاری

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پلیٹ پر جو تصویر ہے اس میں ستارے واضح اور صاف نہیں۔ ستاروں کے گرد دھند ہے۔"

"ہاں...... ہاں۔" اسٹیو چلّا اٹھا۔ "میں اسے قتل کرنا چاہتا تھا تاکہ معاشرہ اس کے نجس وجود سے پاک ہوجائے۔ اس نے کئی قتل کیے۔ وہ آج رات بھی کسی کو قتل کرتی لیکن میں نے کسی بے گناہ کی زندگی بچالی۔"

"تم کسی کو سزا دینے والے کون ہو بیٹھے؟" بل غرایا۔

"اگر نارما قاتل ہے تو اس کا فیصلہ عدالت کرتی۔"

"نارما قاتل نہیں۔" مائیک نے کہا۔ "اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"میں ثابت کرسکتا ہوں کہ وہ قتل کرنے کے بعد پاگل خانے بھیج دی گئی تھی۔" اسٹیو دہاڑا۔

"کچھ نہیں اسٹیو، یہ سب بے کار ہے۔" مائیک نے مایوسی سے گردن جھٹکی۔ "تم نے فلپ کی سنی سنائی باتوں پر یقین کرلیا اور یہ سوچا کہ پہلے ڈاکٹر کو اور پھر نارما کو قتل کرکے ڈاکٹر کی جگہ حاصل کرلو گے۔ لوگ یہی کہتے کہ احساسِ جرم کی وجہ سے نارما نے خودکشی کرلی۔ تم نے نارما اور مکمل چاند کے بارے میں ڈاکٹر فلپ کے تبصرے کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا کہ مکمل چاند کے وقت ہی نارما کو قتل کیا جائے۔ دوسرے قتل بھی اس وقت ہوئے لیکن تم نے اس نکتے پر غور نہیں کیا کہ اگر نارما مکمل چاند کے وقت جان لیوا کام کرنے کی عادی ہے تو پھر وہ گھر میں کیوں تھی۔ پھر تم نے دوسری غلطی خودکشی والا خط چھپا کر کی۔" مائیک کا آخری تبصرہ اندھیرے میں تیر کی طرح تھا لیکن عین نشانے پر لگا۔ اب مائیک نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر میز پر پھینک دیا۔ "تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ نارما ایک اسپتال میں تھی۔ لیکن میرے عزیز! وہ وہاں علاج کروانے کے لیے نہیں بلکہ علاج کرنے کے لیے گئی تھی۔ وہ وہاں نرس بن کر کام کرتی رہی۔ وہاں اس کے ایک مریض کا نام ڈاکٹر فلپ تھا۔"

"تم احمق ہو۔" اسٹیو نے سسکی لی۔

"نہیں۔" مائیک نے تردید کی۔ "ڈاکٹر فلپ چار سال تک وہاں زیر علاج رہا۔ وہ ذہین ہونے کے علاوہ سنکی بھی تھا اور اس مرض کا وہاں چار سال تک علاج کرواتا رہا۔ اس نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ اسے عورتوں سے نفرت تھی۔"

"تم خیالی گھوڑے دوڑا رہے ہو۔" اسٹیو نے طنز کیا۔

"میرے پاس ثبوت موجود ہے فرزند!"

"تب پھر لڑکیوں کا قاتل کون ہے؟" بل نے اپنی پیشانی سہلائی۔

"فلپ...... ڈاکٹر فلپ!"

"اور فلپ کو کس نے قتل کیا؟"

"وہ بعد میں بتاتا ہوں۔" مائیک نے گردن ہلائی۔

"جن راتوں کو لڑکیوں کا قتل ہوا، وہ مکمل چاند کی راتیں تھیں۔ میں نے وہ فوٹو پلیٹیں دیکھیں جو ڈاکٹر نے ان راتوں کو بنائی تھیں۔ تمام پلیٹیں دھندلی ہیں پھر اسکارف نے ثبوت فراہم کیا کہ قاتل فلپ ہے۔ مجھے ڈاکٹر کے کمرے سے ایک لفافہ ملا جو شکاگو سے آیا تھا۔ اس لفافے پر ایک گارمنٹ فیکٹری کا نام تھا اور یہ لفافہ فلپ کے نام آیا تھا۔ میں نے گارمنٹ فیکٹری کو خط لکھا تو انہوں نے تصدیق کی کہ فلپ نے ایک درجن سرخ اسکارف منگوائے تھے۔ میں نے فلپ کا ماضی کھنگالا تو معلوم ہوا کہ وہ اسکول کے زمانے میں سرخ اسکارف باندھتا تھا۔ پھر ہر اسکارف پر ہمیں فوٹو کیمیکل کے دھبے ملے۔ ہمیں علم تھا کہ فلپ ڈارک روم میں خود ہی فلمیں دھوتا ہے۔ اسے عورتوں سے نفرت تھی لیکن اس کے باوجود اس نے نارما کو اسپتال کی ملازمت چھوڑ کر اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کردیا۔ اس نے جان بوجھ کر تمہیں نارما کے متعلق غلط اطلاعات دیں تاکہ تم پولیس سے رابطہ قائم کرکے اسے پھنسوا دو لیکن پھر ایک روز اس نے خودکشی کرلی۔ شاید ضمیر کی خلش نے اسے خودسوزی پر مجبور کردیا تھا۔ تم بہت چالاک ہو اسٹیو...... تم نے ڈاکٹر کا خط جس میں اس نے خودکشی کی وجہ لکھی تھی، چھپایا تاکہ نارما پھنس جائے لیکن تم یہ بھول گئے کہ ایک نازک لڑکی ایک جسیم مرد کو کس طرح لٹکا سکتی ہے۔"

"میں واقعی احمق تھا لیکن میں نے صرف نارما کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" اسٹیو تقریباً رو پڑا۔

"مجھے علم ہے، میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر فلپ اپنی ذہنی کیفیت سے مجبور ہوکر حسین لڑکیوں کو قتل کرتا رہا۔ تینوں لڑکیوں نے ڈاکٹر کے ساتھ رات گزارنے سے انکار کردیا تھا۔"

"ہاں عورتوں کو اس سے نہ جانے کیوں نفرت تھی۔"

اسٹیو بڑبڑایا۔ "لیکن اب...... اب میرا کیا ہوگا؟"

"بل......" مائیک نے اچانک ہی بل کی طرف دیکھا۔

"یس سر!" بل کی ایڑیاں بجیں۔

"اسٹیو کو اقدامِ قتل اور مجرمانہ حملے کے الزام میں گرفتار کرلو۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

قسط نمبر: 13

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

قت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا ... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج ... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

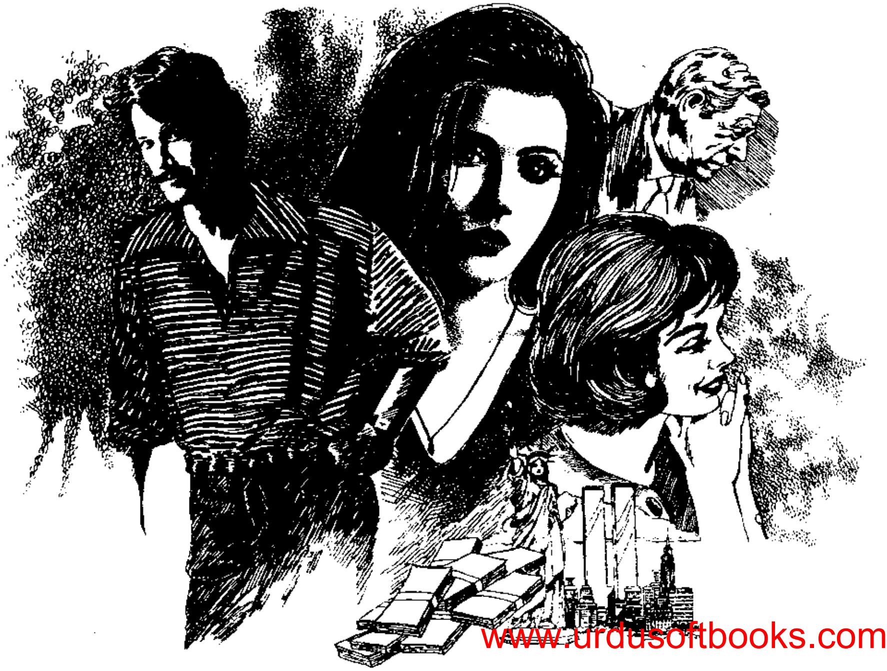

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ''علی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کردیا تھا۔اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈ الین سے علیحدگی ہوچکی تھی۔وقتِ رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی ٹفنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم وتربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد دایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔اس نے جب بھی اپنے محسن ومربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا تھا۔یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے ایمنگلٹن میں واقع ''سرکل اے'' نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کرلی تھی۔بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کرلی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ''سرکل اے'' میں گھس آئے۔تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کرگئے۔پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کرلیا۔علی کا دامن صاف تھا۔پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کردیا۔بعدازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو فی نکس (ایری زونا) سے گرفتار کرلیا گیا۔علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔''وِنی لاؤنج'' نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے در دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ایک رات وِنی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔اس مارا ماری کو ایک امیر وکبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوگئی...... ''مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔زندگی میں جب کبھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کرلینا۔'' اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہوگیا تھا۔آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مڈھ بھیڑ ہوتی رہی۔لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔وِنی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ایک روز جب شارو اسٹیپلے اسٹورز سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کرلیا۔علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیبلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر پیبلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیبلو کو ادھ موا کردیا۔آئندہ روز پیبلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب وجوار میں گردش کررہی تھی۔پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہوسکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائے اسپورٹس کار میں لیک جیکسن سے ہوسٹن پہنچ گیا۔پھر سرخ ہنڈائے اسپورٹس میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑادیے۔اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلادے گی۔راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرکے علی کو پیبلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال...... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کرکے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کردے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہوگیا۔پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی...... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک باروخ لاؤ اور ریما ایبل بام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کرکے کہیں روپوش ہوگئے تھے۔ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ''اسکل اینڈ بونز'' کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کردے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرادیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آگیا۔یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کردیا۔علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کردیا تھا۔علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کررہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہوگئی تھی جس سے مرزا عامر نے بھی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہوجانا چاہیے۔علی سلطان اور مرزا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کرسکتا تھا۔اس صورتِ حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔علی نے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔وہ ائرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنادیا۔علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہوگئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہوگئی۔علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہوگیا ہے۔علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے وزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کردیں۔علی کو ایک رات خواب میں ڈیلفینا نظر آئی۔اس نے علی کو دھمکی دی کہ وہ کہیں بھی چلا جائے اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کردیا۔علی نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔علی نے تمام حقیقت بینا کو بھی بتادی۔وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔علی کو اس کی رہائشگاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔علی نے نادرشاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادرشاہ کو اغوا کر کے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادرشاہ کو اغوا کرایا۔تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کر کے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔یہ سن کر وہ ہکا بکا رہ گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

ہر سوال کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور ہوتا ہے لیکن جب معاملہ توقع کے برعکس آن پڑے تو تھوڑی دیر کے لیے انسان کا دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا اور ان لمحات میں ہم تینوں بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال سے گزر رہے تھے۔

شاکر کے فون نے ہماری بساط الٹ دی تھی۔ ہم مطمئن تھے کہ تھوڑی دیر کے بعد ”نامعلوم افراد“ نادرشاہ کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔نہ صرف اس مقصد میں انہیں کامیابی حاصل ہوگی بلکہ وہ اس مثالی انٹرویو کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ بھی کرلیتے جس کی بنیاد پر میں نے شاہ جی کی درگت بنانا تھی اور ماں کے سارے مالی معاملات کا انتظام اس سے چھین کر عظیم کے ہاتھ میں دینا تھا تاکہ وہ خود یا اپنے کسی قابل اعتماد بندے کے ذریعے ماں کے اس فلاحی مشن کی تکمیل کرسکے لیکن آنا فانا میں سچویشن ہماری خواہش کے خلاف ہوگئی تھی۔

”مجھے تو یہ کافی گمبھیر معاملہ لگ رہا ہے۔“ عظیم نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔”چار پولیس موبائلز کا ہائی روف کو گھیرے میں لینا کوئی معمولی بات نہیں......“

”تم ٹھیک کہتے ہو عظیم!“ بینا نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنی تمام تر توجہ دل پر مرکوز کردی۔چند لمحات کے لیے میں اپنے اردگرد کے ماحول سے غافل ہوگیا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوگیا تھا۔میرے اس عمل میں کسی سوچ کا دخل نہیں تھا۔درحقیقت یہ میرا ایک غیر ارادی فعل تھا۔دل پر ارتکاز توجہ سے مجھے بہت طاقتور احساس ہوا۔کوئی واضح اشارہ نہیں تھا تاہم میں شدت سے محسوس کررہا تھا کہ اس واقعے کے پیچھے بالواسطہ یا بلاواسطہ ڈیلفینا کا ہاتھ ہے اور ...... نادرشاہ کے چھاپ لیے جانے کے بعد اب یہ بنگلا میرے لیے قطعی غیر محفوظ ہوگیا تھا۔

”یار! تم کس دھیان گیان میں لگ گئے ہو؟“ عظیم کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بینا نے بڑی گہری نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور چونکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کیا ہوا علی! تم اتنے سنجیدہ کیوں نظر آرہے ہو؟“

”صورت حال کے پیش نظر اسد قہقہے تو لگا نہیں سکتا۔“ عظیم نے کہا۔

بینا جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔”میرا مطلب یہ تھا کہ میں نے پہلے علی کو کبھی اتنا الجھا ہوا نہیں دیکھا۔“

”برو! تم بھی تو منہ سے کچھ بولو۔“ عظیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔”کیا مہاتما بدھ بنے بیٹھے ہو......؟“

”اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے ہیں۔“ میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالنے کے بعد عظیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔”تم فی الفور اپنے گھر روانہ ہوجاؤ اور کم ازکم آج کی رات گھر سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرنا۔ نامعلوم افراد یقینا قانون کی گرفت میں آچکے ہوں گے۔ تمہارا نام سامنے آسکتا ہے۔“

”میرا رابطہ صرف شاکر سے تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔”اور وہ منظر سے غائب ہوچکا ہے۔ابھی تم نے خود اسپیکر پر اس کی بات سنی ہے۔ باقی جو دو نامعلوم افراد نادرشاہ کے ساتھ ہائی روف کے اندر ہیں، میرا ان

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے بھی کوئی تعلق واسطہ نہیں رہا۔ وہ مجھے اور میں انہیں بالکل نہیں جانتا۔''

''لیکن وہ دونوں شاکر اور اس کے ساتھی موٹر سائیکل سوار کو لازمی جانتے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اسی طرح شاکر اور اس کا ساتھی، ہائی روف میں موجود اپنے دونوں ہم پیشہ افراد سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ چاروں نامعلوم افراد ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ جب پولیس ہائی روف والے دونوں اغوا کنندگان سے تفتیش کرے گی تو وہ اپنے باقی دو ساتھیوں کے حوالے سے زبان کھول دیں گے اور پھر پولیس کو شاکر تک رسائی حاصل کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔''

''علی بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے عظیم۔'' بینا نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تمہیں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اگر شاکر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو پھر تمہارا نام بھی سامنے آئے گا۔''

''آپ دونوں کا فوکس نامعلوم افراد پر ہے اور میں کسی اور زاویے سے بھی سوچ رہا ہوں......'' عظیم نے یکے بعد دیگرے ہماری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

بینا نے پوچھا۔ ''کس زاویے سے؟''

''جب دو نامعلوم افراد پولیس کی تحویل میں جائیں گے تو ان کے ساتھ ہی نادر شاہ بھی ہوگا۔'' عظیم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس میں شاہ جی کی حیثیت ایک مغوی کی ہے۔ پولیس جب اس سے پوچھ تاچھ کرے گی تو علی کا نام بھی لازماً سامنے آئے گا اور بینا!'' اس نے انگلی سے بینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''تمہارا تذکرہ بھی ہوگا۔''

''اور..... خان ہاؤس والا جنید خان بھی تو زیر بحث آئے گا۔'' بینا نے ایک اہم پہلو کی سمت توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ ''نادر شاہ'' علی، عظیم اور بینا'' کے پاس سے اٹھ کر ''جنید خان وغیرہ'' کے پاس جا رہا تھا کہ راستے میں نامعلوم افراد نے اسے اغوا کرلیا۔ نامعلوم افراد کے ساتھ ہی ان دونوں بنگلوں کے مکین بھی زیر تفتیش آسکتے ہیں۔''

''یہ سارے نکات میرے ذہن میں موجود ہیں۔'' میں نے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں نے تمہیں احتیاطی تدبیر کی ہدایت کی ہے اور اگر مناسب سمجھو تو اپنے کزن ارباب کو اعتماد میں لے کر صورت حال سے آگاہ کردو۔ وہ پولیس والا ہے، کوئی مفید مشورہ ہی دے گا۔''

''اور تم......'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''تم کیا کرو گے۔ تمہارے لیے بھی تو یہاں خطرہ ہے!''

''میں اور بینا بھی ہنگامی بنیادوں پر یہ بنگلا چھوڑ رہے ہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آگے کیا کرنا ہے، اس کے بارے میں بعد میں لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔''

میری بات عظیم کی سمجھ میں آگئی اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''اوکے برو! میں جا رہا ہوں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اپنا بہت خیال رکھنا اور مجھ سے رابطے میں رہنا۔''

''تم بھی اپنا خیال رکھنا۔'' میں نے کہا۔ ''اور جہاں تک رابطے میں رہنے کی بات ہے تو ایک نکتہ ذہن نشین کرلو کہ جب تک میں خود تم سے کانٹیکٹ نہ کروں، تم مجھے کال نہیں کرو گے۔ اگر میرا فون تمہیں آف ملے تو پریشان نہیں ہونا، میں جب مناسب سمجھوں گا تم سے رابطہ کرلوں گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا......؟''

''سمجھ رہا ہوں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا، پھر پوچھا۔ ''کیا ہمارے لیے حالات اتنے ہی سنگین ہوچکے ہیں؟''

میں نے ''ہاں'' کہنے پر اکتفا کیا۔

''تمہیں یہ سب کیسے احساس ہوا؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرے انٹیوشن نے مجھے بتایا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا...... وہ تھوڑی دیر پہلے تم جو مراقبہ کر رہے تھے؟'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔

میں نے جواب دیا۔ ''یہی سمجھ لو۔''

''انٹیوشن، وجدان، دھیان گیان اور الہام......'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''ایک آئی پی (الہامی بابا) مقبول کیا کم تھا جو اب تم نے بھی یہی کام شروع کردیا ہے؟''

''عظیم! میں کوئی الہامی بابا وابا نہیں ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے اپنے محسوسات تم تک پہنچائے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ غلط نہیں ہیں۔ تم صورت حال کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ کوئی سیدھا سادہ معاملہ نہیں ہے۔ اگلے چند گھنٹوں میں کچھ بھی ہوسکتا ہے...... کچھ بھی!''

''یار، ڈراؤ تو نہیں......'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''بحث نہیں کرو یار۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''اگر میں ڈرا رہا ہوں تو ڈر جاؤ اور اپنی حفاظت پر توجہ دینے کی کوشش کرو۔ میں جب مناسب سمجھوں گا تو خود تم سے رابطہ کروں گا۔ اگر کوئی بہت ہی ضروری بات ہو تو تم ٹیکسٹ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کر دینا......او کے؟"

"او کے۔"اس نے متذبذب انداز میں جواب دیا۔

میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ میری باتیں عظیم کو ہضم نہیں ہو پا رہیں لیکن میں اسے سر دست کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ اور ویسے بھی... میں خود بھی واضح طور پر کچھ نہیں جانتا تھا۔ جی ایم سر کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنے دل پر توجہ مرتکز کر کے پیش آمدہ حالات کو محسوس کرنے کی کوشش کی تھی اور بڑی اسٹرانگ فیلنگ آئی تھی کہ کچھ بہت ہی بھیانک ہونے جا رہا ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے ڈیلفینا سے جڑا ہوا ہے۔

عظیم بنگلے سے رخصت ہوا تو بینا نے تشویش ناک انداز میں دریافت کیا۔"علی! میں تمہارے ذرائع پر فی الحال کوئی سوال نہیں کروں گی لیکن کیا واقعی اس ایشو کے ہماری زندگی پر برے اثرات پڑنے والے ہیں؟"

"اگر ہم نے ہوشیاری نہیں دکھائی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"میں نے اپنے بیڈروم کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔"ہماری ذرا سی کوتاہی کوئی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتی ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"او کے....." وہ تائیدی انداز میں بولی۔

"تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟"

"اپنی انتہائی ضروری چند چیزیں ساتھ رکھ لو اور گاڑی میں بیٹھ کر بنگلے سے باہر نکلو۔" میں نے کہا۔"میں بھی آ رہا ہوں۔ پھر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں گاڑی کی طرف۔" وہ بولی۔

"ہم تمہاری سرخ کلٹس میں جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"او کے۔"وہ اپنے بیڈروم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔"جب تم گیٹ پر پہنچو تو جمشید کو میرے پاس بھیج دینا۔ اسے کچھ ضروری ہدایات دینا ہیں۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے بنگلے سے نکلنے میں تھوڑی دیر ہو جائے تو تم گاڑی میں باہر میرا انتظار کرنا اور پریشان نہیں ہونا۔ میں اہم معاملات سے نمٹ کر آ رہا ہوں۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنے بیڈروم میں داخل ہو گئی۔ میں ماں والے بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے اپنا بیگ تیار کیا۔ لیپ ٹاپ، پاسپورٹ، سارے کرنسی نوٹ اور دیگر چند ضروری چیزیں بھی بیگ میں رکھ لیں۔ میں نے ماں کا پاسپورٹ بھی اٹھا لیا تھا۔ میرے تمام کریڈٹ کارڈ والٹ میں موجود تھے اور میرے کپڑے بیگ میں رکھے تھے۔ یہ وہی بیگ تھا جو میں امریکا سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد میں نے بیگ اٹھایا، دونوں بیڈرومز کو لاک کیا اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ جہاں جمشید میرے انتظار میں کھڑا تھا۔

"سر! آپ نے مجھے یاد کیا؟" مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے پوچھا۔

"ہاں جمشید، مجھے تم سے چند انتہائی اہم باتیں کرنا ہیں۔" میں نے کہا۔"تم اپنی میڈم کے پرانے نمک خوار اور وفادار ہو۔ میڈم اب اس دنیا میں باقی نہیں رہیں۔ تمہیں اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا آخری ثبوت دینا ہے۔ اس کے بعد تم ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤ گے۔"

"آپ حکم کریں سر، کرنا کیا ہے.....!" وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا پھر میرے بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔"سر! آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

"ہاں!" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔"جمشید، میرے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا۔ میں جو بھی کہوں اسے پوری توجہ سے سننا ہے اور اس پر عمل بھی کرنا ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ تمہاری میڈم کا حکم ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں سر۔" وہ سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔

"آپ جیسا کہیں گے، ویسا ہی ہوگا۔ آپ میڈم کے عزیز ہیں۔ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے اور اس حکم کی تعمیل کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ کے ذہن میں جو بھی ہے، مجھ پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے بتا سکتے ہیں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

وہ جو بھی کہہ رہا تھا ویسا کر کے بھی دکھا سکتا تھا۔ مجھے اس کی بات کا یقین تھا اور یہ یقین اس لیے تھا کہ میں اس کے پس منظر سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس کی فیملی پر ماں کے ان گنت احسانات تھے۔ اس کے گھر کے ایک ایک فرد کا بال بال ماں کی نوازشات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور میں نے جمشید کے خون میں وفاداری کو دوڑتے دیکھا تھا۔ وہ ماں کی خاطر سردھڑ کی بازی لگا سکتا تھا لیکن چونکہ وہ اس راز سے واقف نہیں تھا کہ میں اس کی میڈم کا سگا بیٹا ہوں، وہ مجھے سطحی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

صاحبہ کا کوئی قریبی عزیز سمجھتا تھا اس لیے میں نے اپنے بارے میں اس کے ذہن میں موجود معلومات کی روشنی میں ہی بولنا شروع کیا۔

''جمشید! تم جانتے ہو کہ تمہاری میڈم کو ٹارگٹ کر کے قتل کیا گیا ہے۔ یہ کام جس شخص کے حکم پر کیا گیا اس سے سلمٰی صاحبہ کی پرانی دشمنی تھی۔ اسی بدذات نے تمہاری میڈم کے شوہر کو بھی قتل کروایا تھا اور اب وہ سفاک شخص میری زندگی کا چراغ گل کرنا چاہتا ہے۔ اس بنگلے پر میری جان کو شدید نوعیت کا خطرہ لاحق ہے اس لیے میں یہاں سے جا رہا ہوں......''

''سر! جمشید کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔ ''آپ کہیں نہ جائیں۔ میں اسی بنگلے پر آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ کوئی بڑے سے بڑا اطرم خان بھی آپ کا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ آپ کی جانب بری نیت سے اٹھنے والی آنکھ کو میں حلقے سے نکال کر پھینک دوں گا۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم انتہائی ذمے دار اور بہادر انسان ہو۔'' میں نے سراہنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی جان پر کھیل کر میری حفاظت کرو گے مگر اس وقت تمہیں اپنا دماغ استعمال نہیں کرنا۔ تمہیں حرف بہ حرف وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' وہ یکدم بے حد سنجیدہ ہوگیا۔

''آپ حکم کریں......''

''جیسا کہ تم جانتے ہو، میں تمہاری میڈم کا ایک قریبی رشتے دار ہوں اور جدہ سے یہاں آیا ہوں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہاری میڈم میرے ساتھ عمرہ پر جانے والی تھیں لیکن ان کی قسمت میں یہ سب نہیں تھا اس لیے وہ اپنی زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوگئیں اور میں......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ٹٹولنے والی نگاہ سے اسے دیکھا پھر جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور میں جدہ واپس چلا گیا۔''

اس نے چونک کر بے یقینی سے مجھے دیکھا اور بے ساختہ پوچھا۔ ''سر! کیا آپ اس وقت واقعی جدہ جا رہے ہیں؟''

''نہیں!'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہ پالیسی بیان ہے جو تم نے سب کو دینا ہے۔ نادر شاہ، عظیم، نگینہ......اور کوئی بھی تم سے میرے بارے میں سوال کرے، تم نے اسے یہی بتانا ہے۔ اس کے سوا تم کچھ نہیں جانتے۔''

''میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ گیا سر۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں یہاں کے معاملات کو آپ کی ہدایت کے مطابق خوش اسلوبی سے سنبھال لوں گا۔''

''مجھے تم سے یہی توقع ہے جمشید۔'' میں نے کہا پھر دونوں بیڈ رومز کی چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''یہ اپنے پاس رکھ لو۔ اگر کسی ہنگامی صورتِ حال میں تمہیں یہ کمرے کھولنے کی ضرورت پیش آئے تو تم ان چابیوں کو استعمال کرسکتے ہو مگر نادر شاہ یا اسی ٹائپ کے کسی اور عام شخص کو اس وقت تک اندر نہیں گھسنے دینا جب تک میں اجازت نہ دوں۔''

وہ بولا۔ ''میں آپ کی توقع پر پورا اتروں گا۔'' اس کے لہجے سے چٹانی عزم جھلکتا تھا۔ ''لیکن میرا اندازہ یہ کہتا ہے کہ آپ اس وقت جدہ نہیں جا رہے ہے......''

بات کے اختتام پر اس نے تصدیق طلب نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے جمشید۔''

''آپ جب تک پاکستان میں ہیں، مجھ سے رابطہ تو رکھیں گے نا۔'' اس نے امید بھری نگاہ سے مجھے دیکھا۔

''ہاں!'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''لیکن یہ رابطہ میری طرف سے ہوگا۔ تم کبھی کسی بھی حال میں اور کسی بھی قیمت پر مجھے فون نہیں کرو گے......ٹھیک ہے؟''

''اچھی طرح سمجھ گیا سر۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''شاباش!'' میں نے تعریفی نظر سے اسے دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم سمجھو کہ کوئی نہایت ہی اہم بات مجھ تک پہنچانا ضروری ہے تو تم مجھے میسج کر دینا۔''

''سر...... مجھے میسج کرنا نہیں آتا۔'' وہ اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''مس کال تو کر سکتے ہو نا......؟''

''جی سر!'' وہ جلدی سے بولا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی اور جمشید سے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''اپنا بہت بہت خیال رکھنا۔ جلد ہی ہماری ملاقات ہوگی۔''

''انشاءاللہ......!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

☆☆☆

اسٹیئرنگ پر بینا کا قبضہ تھا اور میں اس کے پہلو میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا ونڈ اسکرین کے پار سڑک کو گھور رہا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ریڈ کلکس کراچی کی ایک معروف شاہراہ پر رواں دواں تھی اور میری نگاہ کے سامنے پھیلی ہوئی سڑک بڑی تیزی سے ہماری گاڑی کی قدم بوسی میں لگی ہوئی تھی۔ گاڑی کے اندر بڑی گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ ان لمحات میں، میں موجودہ سنسنی خیز حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا اور یقیناً پینا کا ذہن بھی اسی ادھیڑبن میں مصروف تھا۔

''کہاں جانا ہے؟'' پینا کے سوال نے گاڑی کے اندر چھائے سناٹے کا دامن تار تار کر دیا۔

میں نے اس کی جانب دیکھے بنا جواب دیا۔ ''جہاں کا تم نے ذکر کیا تھا وہیں چلتے ہیں۔''

''میں نے کہاں جانے کی بات کی تھی؟'' اس کے لہجے سے الجھن جھلک رہی تھی۔

''یاد ہے، گزشتہ رات جب ہم ڈیلفینا کی خطرناکی کے موضوع پر سنجیدہ گفتگو کر رہے تھے تو تم نے کیا کہا تھا......'' میں نے یاددہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ''تم نے بڑے عزم سے کہا تھا، علی! میں تمہارے لیے ایک ایسی محفوظ پناہ گاہ کا بندوبست کردوں گی جو ڈیلفینا کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہوگی۔ اس کمینی کی سوچ کا پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکے گا۔ بس، مجھے ہوم ورک کے لیے ایک دن کی مہلت چاہیے۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی جانب دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''ایک دن گزر چکا۔ اس وقت مجھے کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش ہے جس کی طرف ڈیلفینا کا دھیان نہ جا سکے۔ کیا تم نے اس سلسلے میں کوئی انتظام کیا ہے؟''

''نہیں علی! ابھی تک ایسا نہیں ہوسکا۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ''کل یہ بندوبست ہوجائے گا۔''

''کل ہونے میں تو ابھی پوری رات پڑی ہے۔'' میں نے گاڑی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی ہمیں بنگلا چھوڑنا پڑے گا۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ اس وقت ڈیلفینا تمہارے تعاقب میں ہے؟''

''اس وقت نہ بھی سہی تو اگلے چند منٹ یا چند گھنٹے بعد وہ میری تلاش میں، نادرشاہ کی گردن دبوچ کر ماں کے بنگلے پر پہنچ جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم تو اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہو جیسے اس نے تم سے مشورہ کر کے اپنا منصوبہ تیار کیا ہو۔'' وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یا پھر تم نے اپنے کسی ذرائع سے اس کا پلان چرا لیا ہو......''

''ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تم اس رخ پر سوچ کر اپنی توانائی ضائع کر رہی ہو۔ میرا ڈیلفینا سے کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔''

''تو پھر تم خود ہی بتا دو کہ کس بنیاد پر اتنے اعتماد کے ساتھ یہ سب کہہ رہے ہو؟''

''جی ایم سر نے مجھے فیلنگز کو سمجھنے کا ہنر سکھایا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بتایا۔ ''وہ میرے گرو ہیں۔ میں نے ان سے ایک خاص گر حاصل کیا ہے جس کے ذریعے انسان اپنے محسوسات کو استعمال کر کے آنے والے وقت سے آگاہی پا سکتا ہے۔''

''تم مستقبل بینی کی بات کر رہے ہو؟'' اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مستقبل بینی، انٹیوشن، چھٹی حس، وجدان، الہام......'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تم اسے کوئی بھی نام دے دو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''کیا تم مجھے بھی محسوسات سے کام لینے کا یہ فن سکھاؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر زندگی نے مہلت دی تو ضرور سکھاؤں گا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تو خود کو محفوظ کرنے کے بارے میں سوچنا ہوگا۔''

''میرے پاس ایک آئیڈیا ہے......'' وہ بولی۔

''اس آئیڈیا کو اپنے دماغ سے نکال کر میرے سامنے لاؤ۔'' میں نے کہا۔

''ہم سیدھے ائرپورٹ چلتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا ائرپورٹ کے ویٹنگ ایریا میں رات گزارنے کا ارادہ ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ ''ابھی اتنا وقت ہے کہ کم از کم دو ڈومیسٹک فلائٹس اس ائرپورٹ سے روانہ ہوں گی۔ ہمیں کسی نہ کسی فلائٹ میں سیٹیں مل جائیں گی۔''

''تم کراچی سے باہر جانا چاہتی ہو؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''اسلام آباد یا لاہور جانے والی جس بھی فلائٹ میں جگہ مل جائے، ہم نکل جائیں گے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

''آئیڈیا تو اچھا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں سردست کراچی کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہاں کے معاملات سے نگاہ چرانا بزدلی ہوگی۔ میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اپنے دشمنوں کا مقروض ہوں جو میرے دل و دماغ پر ماؤنٹ ایوریسٹ کے مانند براجمان ہیں۔ میرا ضمیر اس ''ادھار'' کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ جب تک میں اپنے والدین کے قاتلوں کے قرض کی ایک ایک پائی ادا نہیں کر دیتا، اس شہر سے باہر قدم نہیں نکالوں گا۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' وہ فکر آمیز لہجے میں بولی۔

''یہ تمہارا شہر ہے۔ تم ہی کچھ سوچو۔'' میں نے کہا۔

''میں فوری طور پر عظیم کے گھر میں بھی پناہ لے سکتا ہوں لیکن میں کچھ وقت کے لیے اس کے اریب قریب قیام نہیں کرنا چاہتا۔ ''نامعلوم افراد'' کے حوالے سے اسے مجھ سے دور ہی رہنا چاہیے۔ پیسوں کو بانٹ کر رکھنا چاہیے......''

میرے آخری جملے پر اس نے ردعمل ظاہر کرتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ پیسوں کو بانٹ کر رکھنے کا قصہ کہاں سے آگیا؟''

''سیانے کہتے ہیں کہ جب بھی گھر سے نکلو تو اپنے پاس موجود رقم کو کسی ایک ہی جیب میں ڈال کر نہ رکھو بلکہ ساری رقم کو تین، چار حصوں میں بانٹ کر مختلف جیبوں میں رکھنا چاہیے۔ اس طرح پیسوں کو تقسیم کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی جیب کترا آپ کی پاکٹ مارنے میں کامیاب ہوجائے تو پھر بھی آپ کی ساٹھ ستر فیصد رقم محفوظ رہتی ہے۔'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس وقت ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں اس کا پہلا اور آخری تقاضا یہی ہے کہ ہم تینوں کسی ایک جگہ پر جمع نہ ہوں، ورنہ اگر ایک ساتھ ہی چھاپ لیے گئے ...تو سمجھو ہوگیا کام تمام...... کم سے کم نقصان کے لیے ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا ضروری ہے۔''

''اور یہ سب کسی سیانے نے کہا ہے......؟'' اس نے شک زدہ نظر سے مجھے گھورا۔ ''اور اس بہانے تم مجھے بھی خود سے دور کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو......!''

''ظاہر ہے، اس نوعیت کی دانش مندانہ باتیں ہما شا کے بس کی بات تو ہو نہیں سکتی۔'' میں نے گول مول سا جواب دیا۔ ''تمہیں خود سے دور کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''پیالے میں زہر تھا ہی نہیں ورنہ سقراط مر گیا ہوتا......'' وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں بولی۔

''یہ سقراط صاحب اچانک ہمارے بیچ میں کہاں سے آگئے؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

وہ اپنے سیل فون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''جب سے تم سے ملی ہوں، زندگی میں سب کچھ اچانک ہی ہونے لگا ہے جیسے میرے اور گاڑی کے بیچ میں ایک سقراط بھی موجود ہے۔ سقراط آج بھی کسی نہ کسی انسان کے اندر زندہ ہے اور اپنی باتوں کی بندوق کو کسی نامعلوم سیانے کے کندھے پر رکھ کر چلاتا ہے۔''

''کیا تم کسی کو کال کرنے جارہی ہو؟'' میں نے اس کی فلسفیانہ وضاحت کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''جب تم نے سارا ملبا میرے سر پر ڈال دیا ہے تو اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل مجھے ہی نکالنا ہوگا۔ ویسے بھی میں نے تمہیں ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔'' اس کے لہجے میں طنز نہیں بلکہ گہری سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ وہ میرے لیے خاصی فکر مند نظر آرہی تھی۔

''فون کو ضرور استعمال کرو لیکن پہلے گاڑی کو کہیں روک دو۔'' میں نے بھی اس کی حفاظت کی فکر کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈرائیونگ کے دوران میں سیل فون کا استعمال خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے اور یہ خلافِ قانون بھی ہے۔''

''تم ایک قانون پسند اور مہذب معاشرے سے تعلق رکھتے ہو۔'' وہ اپنے سیل فون کو کان سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن یہاں سب چلتا ہے۔''

بینا کے اس بیان کے جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ تھا لیکن مجھے خاموش رہنا پڑا کیونکہ اسی لمحے دوسری جانب اس کا کسی سے رابطہ ہوگیا تھا۔

''ہیلو......کیسی ہو یار؟'' بینا نے استفسار کیا۔

پھر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگی۔ یہ گفتگو یکطرفہ طور پر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بینا کس سے مخاطب ہے البتہ اس کے طرزِ تکلم سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی خاتون سے ہم کلام تھی۔ اس نے خاصے جوشیلے انداز میں دوسری جانب بولنے والی کو وش کیا۔

''مبارک ہو بھئی...... آخر تمہاری کوشش رنگ لے ہی آئی۔ جوائننگ کب ہے؟''

بینا کے استفسار پر ادھر سے کچھ کہا گیا ہوگا۔ اس نے چہک کر جواب دیا۔ ''تم جب بولو...... کہو تو ابھی آجاتی ہوں۔''

یقیناً دوسری طرف بولنے والی نے بینا کو بلا لیا ہوگا جبھی اس نے متذبذب انداز میں کہا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''ہوں...... میں ابھی اسی وقت بھی تمہارے پاس آسکتی ہوں لیکن یار، میرے ساتھ ایک پرابلم ہے۔''

ادھر سے بینا کی متذکرہ پرابلم کے بارے میں دریافت کیا گیا ہوگا۔ اس نے جواب دیا۔ ''میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ اگر آؤں گی تو وہ بھی ہمراہ ہوگا۔ تمہیں ہم دونوں کو افورڈ کرنا ہوگا۔''

دوسری جانب سے لازمی بے تکلفی سے چٹکی لی گئی ہوگی۔ بینا نے ہلکے سروں والا ایک توانا قہقہہ لگایا اور بڑی بے باکی سے بولی۔

''یس......ڈیٹنگ ہی سمجھ لو......!''

یہ جملہ ادا کرنے کے بعد بینا نے بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھا پھر دوسری طرف بولنے والی سے کہا۔ ''اوکے۔ میں آدھے گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔ ہم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ ہمارے لیے کچھ آرڈر کردو۔''

پھر اختتامی کلمات کے بعد اس نے رابطہ موقوف کردیا اور فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''علی! کام بن گیا ہے۔''

''گویا تم نے رات گزارنے کا بندوبست کرلیا ہے۔'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ''رات نہیں، راتیں...... تم جب تک چاہو، وہاں رہ سکتے ہو۔''

''گڈ!'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''وھاٹ این ارینجمنٹ!''

''میرے ذہن میں، موجودہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے دو آپشنز تھے۔'' وہ گاڑی کو واپسی کے راستے پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''دوسرے آپشن کو ٹچ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے پہلا آپشن کلک کیا اور ہمارا مقصد حاصل ہوگیا۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ابھی تم نے کس خاتون سے بات کی ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ بھی کہ تمہارے ذہن میں دوسرا آپشن کون سا تھا؟''

''دوسرا آپشن کسی ہوٹل میں رات گزارنے کا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اگرچہ مقامی افراد کو اصولاً ہوٹل میں کمرا نہیں دیا جاتا لیکن شارع فیصل کے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں میری لائن ہے۔ میں اگر چاہتی تو وہاں کمرا حاصل کرنے میں مجھے دقت پیش نہ آتی لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ابھی میں نے اپنی ایک دوست کو فون کیا تھا۔ ہم اسی کے پاس جارہے ہیں۔''

''تم لوگوں کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا ہے، یہ تمہاری کوئی بہت ہی بے تکلف دوست ہے......'' میں نے کہا۔

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''یوں سمجھ لو کہ ہم اپنے ہی گھر جارہے ہیں۔''

''اپنے گھر......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے یار! میں نادیہ کی بات کررہی ہوں۔''

''نادیہ...... تمہاری کرائے دار؟''

''بالکل وہی۔'' اس نے بتایا۔ ''نادیہ اس اپارٹمنٹ پر محض ایک دو دن کی مہمان ہے۔ وہ اتوار کی صبح اسلام آباد روانہ ہوجائے گی، مستقل طور پر۔''

''اوہ...... اب سمجھا۔'' میں نے رسان بھرے انداز میں کہا۔ ''جبھی میں کہوں، تم اتنی مطمئن کیوں ہو۔ تم نے نادیہ کو کسی بات کی مبارک باد بھی دی تھی۔ یہ کیا معاملہ ہے؟''

''وہ پچھلے تین چار ماہ سے اپنے تبادلے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔'' بینا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی سلسلے میں وہ پچھلے دنوں اسلام آباد بھی گئی تھی۔ اس کا کام ہوگیا ہے۔ وہ اتوار کی صبح کراچی سے روانہ ہوجائے گی۔ پیر کی صبح اسے ڈیوٹی جوائن کرنا ہے۔ اسلام آباد میں اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہوگیا ہے۔ میں نے اس سے اپارٹمنٹ خالی کرنے کی جو بات کی تھی وہ اس طرح پایہ تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ یہ میرا ذاتی اپارٹمنٹ ہے لہٰذا ہمارے لیے اس سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ اور کوئی ہو نہیں سکتی۔''

''نادیہ کرتی کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

میں بظاہر بینا سے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا لیکن میں موجودہ ہنگامی صورتِ حال سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس سنسنی خیز سچویشن سے نمٹنے کا جو خاکہ بنایا تھا اس میں رنگ اسی وقت بھرے جاسکتے تھے جب میں کسی ایک مقام پر ٹک کر بیٹھ جاتا اور بینا کا اپارٹمنٹ اس مقصد کے لیے انتہائی موزوں اور مناسب تھا۔

''نادیہ بینکر ہے۔'' بینا نے جواب دیا۔ ''وہ ایک معروف پرائیویٹ بینک کے نہایت ہی حساس ڈیپارٹمنٹ ''آر ایم ڈی'' میں اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ اسلام آباد میں بھی وہ اسی شعبے میں گئی ہے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''آر ایم ڈی.....'' میں نے زیرلب دہرایا۔ ''یعنی رسک مینجمنٹ ڈیپارٹمنٹ۔ واقعی، یہ تو بہت ہی اہم شعبہ ہے۔ یہ ڈیپارٹمنٹ منی لانڈرنگ اور ہر نوعیت کی کرپشن کو پکڑنے پر کمربستہ رہتا ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی.....''

میں نے الجھن زدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے فوراً پوچھ لیا۔ ''کون سی بات؟''

''میری معلومات اور اندازے کے مطابق اسلام آباد کی بہ نسبت کراچی میں بینکنگ کا اسکوپ زیادہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''پھر تمہاری دوست نے کراچی کو خیرباد کہہ کر اسلام آباد کا رخ کیوں کیا ہے؟''

وہ بڑی جاذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''دل کے معاملات ہیں......''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تو وہاں اسلام آباد میں کہیں ان کا دل اٹکا ہوا ہے؟''

''نہیں!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''وہاں وہ اپنے گھائل دل کی رفوگری کے لیے جارہی ہیں۔''

''گویا ان کا دل کراچی میں کہیں اٹکا ہوا تھا۔'' میں نے معاملے کی تہ میں پہنچتے ہوئے کہا۔ ''مگر دلبر نے دل داری نہیں کی۔ وہ دل برداشتہ ہوکر اسلام آباد جارہی ہیں؟''

''کسی حد تک یہی بات ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھتی ہوں، یہ یکطرفہ معاملہ تھا۔ نادیہ، عمران کے ساتھ بہت سیریس تھی اور وہ نادیہ کی محبت کو ایک کھیل سمجھ کر کھیلتا رہا اور پھر کسی اور کا ہوگیا۔''

''اوہ...... ویری سیڈ۔'' میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اکثر کہانیوں کا انجام ایسا ہی ہوا کرتا ہے...... خصوصاً یک طرفہ محبت والی کہانیوں کا۔''

''اے محبت! تیرے انجام پہ رونا آیا۔'' اس نے کسی شعر کا مصرع پڑھا۔

میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام بہت سوچ سمجھ کر کرنے کا ہے۔''

''بالکل غلط!'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔ ''اس کام کا سوچ سمجھ سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ سوچ سمجھ کر تو کاروبار کیا جاسکتا ہے، محبت نہیں۔''

''ہوسکتا ہے، تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ، نادیہ کے ساتھ کیا ٹریجڈی ہوئی ہے؟''

وہ چند لمحات تک ٹٹولنے والی نگاہ سے مجھے دیکھتی رہی۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہی تھی کہ کیا میں محبت نام کی چیز سے واقعی ناواقف ہوں یا میں لاعلمی کی اداکاری کررہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ اپنے اس اندازے میں کہاں تک پہنچی تھی۔ چند لمحات کے بعد اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی اور مجھے بتانے لگی۔

''نادیہ، عمران نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی۔ عمران ایک تجربہ کار بینکر کا بیٹا تھا جس کا باپ سلمان ایک معروف پرائیویٹ بینک کا پریذیڈنٹ تھا۔ عمران بھی نادیہ میں گہری دلچسپی رکھتا تھا لیکن شادی والا معاملہ کسی نہ کسی وجہ سے رہ جاتا تھا۔ عمران کا باپ اس رشتے کے لیے قطعاً راضی نہیں تھا جبکہ عمران کی والدہ نیم رضامند تھی لیکن گھر کے اندر سلمان کا حکم چلتا تھا۔ نادیہ اور عمران کے بیچ دس سال تک تعلقات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر اسی سال فروری میں عمران نے اپنے والد کی خواہش پر کسی اور لڑکی سے شادی کرلی......''

''بڑی دردناک کہانی ہے۔'' میں نے بس اتنا ہی کہا۔

''اس واقعے کے بعد سے نادیہ ٹوٹ کر رہ گئی۔'' بینا نے اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''وہ پچھلے تین چار ماہ سے اپنے ٹرانسفر کے لیے کوشش کررہی تھی۔ اللہ اسے سکونِ قلب عطا فرمائے......''

''آمین!'' میں نے خلوصِ دل سے کہا پھر پوچھا۔ ''میں نے اس روز اپارٹمنٹ کے فریج میں مختلف برانڈ کی مشروب کی بوتلیں رکھی دیکھی تھیں۔ کیا نادیہ ڈرنک بھی کرتی ہے؟''

میں چند روز پہلے بینا کے ساتھ مذکورہ اپارٹمنٹ پر آچکا تھا۔ تب بینا نے مجھے پینے کی پیشکش کی تھی اور مجھے بتایا تھا بعدازاں میں نے یہ سارے مشروب فریج میں رکھے دیکھے تھے۔ اسی لیے میں نے اس وقت بینا سے یہ سوال کیا تھا۔

''بالکل بھی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اس معاملے میں وہ تمہاری طرح زاہد و پارسا ہے۔''

میں نے اس روز بینا کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس کا آخری جملہ اسی حوالے سے تھا۔ اس نے کھلے دل سے یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ کبھی کبھار ایک آدھ ڈرنک لے لیا کرتی ہے۔ اس کی زبانی یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ نادیہ شراب نوشی نہیں کرتی تھی۔ جب وہ ڈرنک نہیں کرتی تھی تو پھر اس کے فریج میں اس کا یہ ذخیرہ کیا معنی رکھتا تھا۔

جب میں نے یہی سوال بینا سے کیا تو اس نے بتایا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"نادیہ کا محبوب اس شوق میں مبتلا تھا اور نادیہ نے عمران کی خاطر داری کے لیے یہ اسٹاک کر رکھا تھا۔"

"بہت ہی کم ظرف تھا وہ۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ نادیہ کے ساتھ سیریس نہیں تھا تو پھر وہ دس سال تک یہ کھیل کیوں کھیلتا رہا......؟"

"بس علی......" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "یہ سارا نصیب کا کھیل ہے۔ اگر نادیہ کے مقدر میں عمران کی محبت لکھی ہوتی تو پھر وہ کم ظرفی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "بینا! اپنا سیل فون آف کر دو اور جب تک میں نہ کہوں، اسے آن نہیں کرنا...... او کے!"

"او کے......!" اس نے کوئی سوال کیے بغیر میری خواہش کی تکمیل کر دی۔

"میں نے ماں کے بنگلے سے نکلنے سے پہلے ہی اپنا سیل فون آف کر دیا تھا۔ میں اس وقت جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا وہ بے حد احتیاط کے متقاضی تھے۔ میں نے بینا سے پوچھا۔

"نادیہ کو تم نے میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

"تمہارے سامنے ہی تو میری اس سے بات ہوئی ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "لیکن یہ یکطرفہ سماعتی پروگرام تھا۔ میں نہیں جانتا، دوسری جانب وہ کیا بول رہی تھی۔ میں نے تو یہی سنا کہ تم میرے ساتھ ڈیٹنگ پر ہو......"

"تو تمہیں اس ڈیٹنگ پر کوئی اعتراض ہے؟" اس نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "ہماری ڈیٹنگ کو تو ابھی چار دن ہوئے ہیں اور تمہاری چہیتی نے پورے چار سال تک ڈیٹنگ کی تھی......"

میرا دھیان کئی جگہ بٹا ہوا تھا اس لیے میں بینا کی بات پر پوری طرح متوجہ نہیں تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"کون چہیتی؟"

"ارے یار! میں شکیرا کی بات کر رہی ہوں۔"

"چھوڑو ساری باتوں کو یہ بتاؤ نادیہ کو میرے بارے میں کیا بتاؤ گی؟"

"وہی جو پہلے بتایا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"میں نہیں جانتا، تم اسے پہلے کیا بتا چکی ہو؟"

"یہی کہ میں نے مستقل طور پر جدہ میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور میں وہاں کوئی بزنس کرنا چاہتی ہوں اسی لیے اپنا اپارٹمنٹ سیل آؤٹ کرنے جا رہی ہوں۔ یہ ہے وہ اسکرپٹ جو میں نے نادیہ کو سنایا تھا۔ اس کی ڈرامائی تشکیل کے لیے میں تمہیں اس سے ملواؤں گی اور کہوں گی کہ میں تمہارے پاس جدہ جا رہی ہوں۔"

"اسٹوری جان دار ہے۔" میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "تمہارے پاس کوئی ایکسٹرا سم کارڈ ہے؟"

اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"جان دار اسٹوری سے ایکسٹرا سم کارڈ کا کیا تعلق ہے؟"

"سم کارڈ کا موجودہ صورتِ حال سے گہرا تعلق ہے۔" میں نے کہا۔ "میں فی الحال اپنا فون نمبر استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ سوچ رہا ہوں کہ ضروری نمبرز کسی دوسری سم میں کاپی کر کے کام چلاتا ہوں۔"

"سمجھ گئی۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس ایک ایکسٹرا سم کارڈ اور سیل فون بھی ہے۔ تم اسے استعمال کر سکتے ہو۔"

"دو مجھے......" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "گھر پہنچ کر دیتی ہوں۔"

اس کی بات پر اعتبار کر کے میں مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

نادیہ ایک دبلی پتلی، دراز قامت اور اسمارٹ لڑکی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس کے قریب لگایا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ نفیس، بیش قیمت فریم لیس گلاسز اس کے چہرے پر بہت جچ رہے تھے۔ وہ معصوم صورت والی ایک پرکشش لڑکی تھی۔ اس کے لیے میرے دل میں بڑی عقیدت تھی۔

میں اس اپارٹمنٹ میں بینا کے ساتھ ایک مرتبہ پہلے بھی آ چکا تھا۔ وہ دو بیڈ روم ایک کشادہ سٹنگ روم پر مشتمل ایک شاندار اپارٹمنٹ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ چائنا ٹاؤن کے علاقے میں سمندر کے کنارے ایستادہ ایک کثیر المنزلہ عمارت کے آٹھویں فلور پر واقع تھا جہاں سے تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے خوب صورت سمندر کا سحر انگیز نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

ہم لگ بھگ گیارہ بجے رات اس اپارٹمنٹ پر پہنچے تھے۔ بینا نے مجھے اور نادیہ کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا تو کھانا بھی آ گیا۔ بینا کی فرمائش پر نادیہ نے ہوم ڈیلیوری کھانے کا آرڈر دے دیا تھا۔ ہم اور ہمارا ڈنر آ گئے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پیچھے ہی اس اپارٹمنٹ پر پہنچے تھے۔
کھانے کے دوران میں ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے ہلکا ڈنر لیا اور پھر "بینڈز اپ" ہوتے ہوئے کہا۔
"تم لوگ آپس میں باتیں کرو۔ میں تھوڑا ریسٹ کروں گا۔"
"آپ چند منٹ بیٹھو۔" نادیہ نے کہا۔ "میں آپ کے لیے بیڈروم سیٹ کر دیتی ہوں۔"
میں دوبارہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا اور ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ نادیہ نے بینا سے پوچھا۔
"علی ڈنر کے بعد کیا لیتے ہیں؟"
بینا نے جواب دینے سے پہلے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی نگاہ میں کون کون سے اشارے چھپے ہوئے ہیں۔ میں اس پر واضح کر چکا تھا کس چیز میں میری دلچسپی کتنی ہے۔ وہ محض مجھے چھیڑنے کے لیے یہ حرکت کر رہی تھی۔ میں نے اس کے کچھ بولنے سے قبل ہی براہِ راست نادیہ سے کہہ دیا۔
"فوری طور پر تو مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آدھے گھنٹے کے بعد اگر ایک اچھی سی کافی مل جائے تو ڈنر کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔"
"کافی کا سامان تو گھر میں ہے نا؟" بینا نے نادیہ سے استفسار کیا۔
"سب رکھا ہے اور ہاں......" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "سامان کے ذکر پر یاد آیا کہ وہاں اسلام آباد والی رہائش گاہ فلی فرنشڈ ہے۔ میں سامان کے نام پر یہاں سے ایک تنکا بھی لے کر نہیں جاؤں گی۔"
"جیسی تمہاری مرضی۔" بینا نے سادگی سے کہا۔
"مجھے تو پہلی فرصت میں یہ اپارٹمنٹ سیل آؤٹ کرنا ہے۔ اگر تم اپنی چیزیں اور فرنیچر وغیرہ نہیں اٹھاؤ گی تو میں تمام تر سامان کے ساتھ گھر کو فروخت کر دوں گی۔"
نادیہ نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
"ابھی چند منٹ کے بعد بارہ جولائی ہفتے کا دن شروع ہو جائے گا اور یہ کراچی میں میرا آخری دن ہوگا۔ اتوار کی صبح میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گی...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!"
"کیا اس کے بعد تم کبھی پلٹ کر کراچی کا رخ نہیں کرو گی؟" بینا نے پوچھا۔
"قطعی نہیں!" وہ دوٹوک انداز میں بولی پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "علی کب سے انتظار کر رہا ہے۔ میں ذرا آپ لوگوں کو کمرا سیٹ کر دوں۔"

بات ختم کرتے ہی وہ ایک بیڈروم کی جانب بڑھ گئی۔
"بھئی! ہم تو کسی گنتی میں نہیں ہیں۔" بینا نے کہا۔
"کیا کوئی اور بھی یاد نہیں آئے گا......؟"
بینا کی "کسی اور" سے جو بھی مراد تھی وہ میں بھی جانتا تھا اور نادیہ بھی اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ بینا نے دراصل نادیہ کے بے وفا محبوب عمران کی طرف اشارہ کیا تھا۔ بینا کی بات سن کر نادیہ رکی، اس نے پلٹ کر گہری توجہ سے بینا کو دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔
"ایک محبت کافی ہے۔ باقی عمر اضافی ہے۔"
پھر وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے بیڈروم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ میں نے بینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اس حرکت کی کیا ضرورت تھی؟ تم نے خوامخواہ ایک دکھیاری کو اور رنجیدہ کر دیا......"
"میرا ہرگز اسے افسردہ کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔
"میں آئندہ احتیاط کروں گی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں مزید بولی پھر ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ "تم تو یہ باتیں اس طرح کر رہے ہو جیسے دو چار بار اس تجربے سے گزر چکے ہو۔"
میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان خود تجربہ کر کے ہی کچھ سیکھے، انسان دوسروں کے تجربے سے بھی تو فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بس، انسان کے اندر تھوڑی عقل ہونا چاہیے۔"
"اور عقل......" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "بادام کھانے سے نہیں، ٹھوکر کھانے سے آتی ہے۔"
"ٹھیک کہتی ہو تم۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر عقل کا تعلق بادام سے ہوتا تو تمام ڈرائی فروٹ مرچنٹس کی اولادیں نوبل انعام یافتہ ہوتیں۔"
"باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔" وہ دل آویز انداز میں مسکرائی۔
"فی الحال باتیں بنانے کی نہیں ہو رہی۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "تم مجھے وہ ایکسٹرا سم کارڈ دو تاکہ میں بیڈروم میں بیٹھ کر سکون سے اپنی کارروائی کر سکوں اور ہاں......" لمحے بھر کو توقف کرنے کے بعد میں نے اضافہ کیا۔
"تم کچھ دیر نادیہ کے پاس ہی بیٹھنا اور اس کی دلجوئی کرنا۔ وہ تمہارے پاس ایک دن کی مہمان ہے۔ اسے خوشی خوشی یہاں سے رخصت کرو اور اس کے دل سے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دعائیں لو۔"

"ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گی۔" وہ اپنے پرس میں سے سم کارڈ نکالتے ہوئے بولی۔ "میری اس سم میں کسی کا کوئی کانٹیکٹ نمبر سیو نہیں ہے۔ میں اسے بہت کم استعمال کرتی ہوں۔ تم اگر اس کی فون بک میں کوئی نمبر فیڈ کرنا چاہو تو کر لینا۔"

میں نے پینا سے مذکورہ سم کارڈ لیا اور بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔ اسی لمحے نادیہ بیڈروم سے نکلی۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس نے کہا۔

"میں نے کمرا سیٹ کر دیا ہے۔ ٹی وی اور اے سی بھی آن ہے۔ اگر آپ کوئی وی دیکھنا ہو تو اپنی مرضی کا چینل لگا لینا۔ میں کافی بنوا رہی ہوں۔"

"تھینکس!" میں نے شائستہ انداز میں کہا۔

بیڈروم میں داخل ہو کر میں نے چہار سو ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جہاں چند روز قبل میں نے پینا کے ساتھ نشاط انگیز اور فرحت آفریں لمحات گزارے تھے۔ اے سی نے کولنگ کا آغاز کر دیا تھا اور ٹی وی پر کوئی میوزک چینل چل رہا تھا۔ میں بیڈ پر بیٹھ گیا اور چینل کو میوٹ کرنے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میں نے گزشتہ رات جی ایم سر کی ہدایت پر امریکا والے نمبر کا سم کارڈ پہلے ہی اپنے فون سے نکال باہر کیا تھا۔ اب میں نے عظیم کے دیے ہوئے نمبر کو بھی خیرباد کہہ دیا تاہم یہ سم کارڈ نکالنے سے پہلے میں نے اس میں موجود پینا، نادرشاہ، جمشید اور عظیم کے تمام نمبرز کو...... سیل فون میں کاپی کر لیا تھا تاکہ پینا والی خالی سم کو استعمال کرنے میں مجھے کسی وقت کا سامنا نہ ہو۔ میں نے پینا والے سم کارڈ کو خالی ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنا کام چلانے کے لیے مجھے سیل فون کی میموری کو استعمال کرنا تھا جہاں میرے مطلوبہ نمبرز محفوظ تھے۔

اس وقت رات کے بارہ بج کر چند منٹ ہوئے تھے گویا ہفتے کے دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ جب میں نے اپنا سیل فون آن کیا تھا تو وہاں پر کوئی بھی ٹیکسٹ میسج یا مس کال موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ کہ ابھی تک عظیم یا جمشید نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں نے عظیم کے نمبر پر یہ ٹیکسٹ میسج کیا۔ "میں اسد علی تمہارے ٹیکسٹ ریپلائی کے بعد تمہیں اس نمبر سے کال کروں گا۔ یہ نمبر میں نے عارضی استعمال کے لیے حاصل کیا ہے۔ تم اس نمبر کو احتیاطاً کسی کاغذ پر نوٹ کر لو مگر اپنے سیل فون میں سیو نہیں کرنا۔"

"اوکے برو۔" فوراً اس کا ریپلائی...... آ گیا۔ "تم کہاں ہو اور کیسے ہو؟"

میں نے اسے کال کی اور جواباً بتایا۔ "میں ٹھیک ہوں اور ایک محفوظ مقام پر بیٹھا ہوں۔ تم اپنی سناؤ، سب خیریت ہے نا؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں اور ٹی وی کے سامنے بیٹھا مختلف نیوز چینلز کو چیک کر رہا ہوں کہ کہیں سے نادرشاہ کے اغوا کی خبر بریک ہو یا پولیس کی کسی ہنگامی سرگرمی کا ذکر سننے کو ملے۔ لیکن ابھی تک کہیں سے کچھ دیکھنے اور سننے کو نہیں ملا۔" اس نے بتایا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ یار! چار پولیس موبائلز نے ان کی ہائی روف کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ یہ کوئی معمولی کارروائی نہیں ہے۔ شاکر بھی بتا رہا تھا کہ پولیس والوں کے ارادے بڑے خطرناک ہیں مگر ابھی تک اس حوالے سے مکمل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شاکر نے تم سے غلط بیانی کی ہو۔" میں نے ایک ممکنہ زاویے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پولیس کی کسی کارروائی کی کوئی حقیقت نہ ہو۔"

"پہلی بات تو یہ کہ شاکر مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میں اس سے پہلے بھی شاکر سے کئی مرتبہ کام لے چکا ہوں اور اس نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ دوسری بات یہ کہ ایسا کرنے میں اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ نامعلوم افراد والی ہائی روف پولیس کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔"

"اگر شاکر پر تمہارا بھروسا اتنا ہی پختہ ہے تو پھر میرا شک یقین میں بدل جاتا ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ "تم اپنے کون سے شک اور یقین کی بات کر رہے ہو؟"

"یہی کہ پولیس نے واقعی کوئی کارروائی کی ہے۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اور اس کا ٹارگٹ نادرشاہ یا نامعلوم افراد ہرگز نہیں ہیں اور یہ کہ...... وہ اپنی اس کارروائی کو خفیہ رکھ رہے ہیں۔"

"پھر پولیس کا ٹارگٹ کون ہے؟" عظیم نے سنسناتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"میں......!" میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ "اسد علی...... اور پولیس کے اس مشن کے پیچھے کوئی اور ہی طاقت کارفرما ہے اسی لیے اس کارروائی پر پردہ ڈال دیا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گیا ہے۔“

”او مائی گاڈ.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے وثوق کو دیکھ کر مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے۔“

”تمہیں خوف زدہ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”مالک کرم کرے گا۔“

”یار! یہ تو بڑی واہیات صورتِ حال ہے۔“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”کیا میں یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے گھر میں چھپا بیٹھا رہوں گا؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہارے لیے معروفیت نکالی ہے۔ کل دوپہر میں تمہیں ایک اہم کام کرنا ہے۔“

”کیا کام؟“ اس نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تم نے اپنے دوست کا کیا نام بتایا تھا.....“ میں نے کہا۔ ”وہ جو ادھر محمد علی سوسائٹی میں ”خان ہاؤس“ کے قریب رہتا ہے؟“

”ساجد.....اس کا نام ساجد محمود ہے۔“

”اور تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ جنید خان کے پروڈکشن ہاؤس یعنی ”خان ہاؤس“ میں اس کا آنا جانا بھی ہے؟“

”ہاں۔ یہی حقیقت ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم کل دوپہر میں جا کر ساجد سے ملو۔“ میں نے اپنے ذہن میں موجود منصوبے سے عظیم کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم ساجد کو بتاؤ کہ تمہارا ایک دوست یاسر بیگ امریکا سے آیا ہوا ہے اور وہ ڈراما پروڈیوس کرنے میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ یاسر بیگ کے پاس سرمائے کی کوئی کمی نہیں مگر وہ اس لائن میں زیرو بٹا زیرو ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی تجربہ کار پروڈیوسر اس کے سرمائے سے ٹی وی ڈراما بنائے اور اس کا نام ہو اور مالی منافع بھی ملے لہٰذا ساجد کل آفٹرنون میں کسی وقت یاسر بیگ اور جنید خان کی میٹنگ ارینج کروا دے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟“

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں برو۔“ وہ چہک کر بولا۔

”اور یہ یاسر بیگ کوئی اور نہیں بلکہ تم ہو..... ہیں نا؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں اس پروڈکشن ہاؤس میں گھس کر ایک خاص قسم کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں، مجھے یقین ہے کہ ”خان ہاؤس“ کے اندر سے مجھے چنگیز خان تک رسائی کا راستہ ملے گا۔ میں کچھ عرصہ وہاں قیام کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”قیام.....!“ اس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ”مگر یہ کیسے ممکن ہوگا؟“

”تم فکر نہ کرو۔ میں اپنے ہتھکنڈوں سے اسے ممکن بنا لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم ساجد کے کان میں پھونک دینا کہ تمہارا دوست یاسر بیگ بڑا رنگین مزاج ہے اسی لیے اس نے شوبز کا رخ کیا ہے تاکہ حسیناؤں تک رسائی آسان ہو یا اسی نوعیت کی کوئی اور بات بھی کر سکتے ہو.....ساجد یہ بات جنید خان تک پہنچائے گا باقی میں سنبھال لوں گا۔“

”تم بے فکر ہو جاؤ۔“ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ”سمجھ لو کہ یہ کام ہو گیا۔ میں جنید خان کے ساتھ تمہاری میٹنگ فکس کرنے کے بعد اسی نمبر پر تمہیں ٹیکسٹ کر دوں گا۔“

”او کے۔ ٹیک کیئر۔“ میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔

”یو ٹو برو۔“ اس نے کہا۔

عظیم کے بعد میں نے جمشید کے نمبر پر کال کی۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹینڈ کر لیا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”جمشید! یہ میں ہوں علی.....تمہاری میڈم کا جدہ والا رشتے دار۔“

”سر! آپ کہاں ہیں۔“ اس نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔ ”آپ خیریت سے تو ہیں نا؟“

”میں جہاں بھی ہوں، بالکل خیریت سے ہوں۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”لیکن تمہاری آواز سے گھبراہٹ جھلک رہی ہے۔ کیا کوئی پریشانی ہے؟“

”سر! تھوڑی دیر پہلے یہاں پولیس آئی تھی۔“ اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”انہوں نے بنگلے کا ایک ایک کونا کھنگالا ہے۔ ان کے ساتھ نادر شاہ بھی تھا۔“

”وہ وہاں کیا لینے آئے تھے۔“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں کچھ اندازہ ہوا؟“

اس نے میرے استفسار کے جواب میں تفصیل بتائی۔ جمشید کے بیان کے مطابق لگ بھگ بارہ بجے رات ایک پولیس موبائل ماں کے بنگلے پر پہنچی تھی تاہم اس موبائل میں سے وردی پوش اور سادہ لباس دونوں قسم کے افراد برآمد ہوئے تھے جن میں نادر شاہ بھی شامل تھا۔ مذکورہ موبائل کے ساتھ ایک قیمتی گاڑی بھی آئی تھی جو موبائل سے کچھ فاصلے پر کھڑی رہی تھی۔ اس بیش قیمت سفید گاڑی میں سے کوئی باہر نہیں نکلا تھا مگر جمشید نے گاڑی کی عقبی نشست پر کسی غیر ملکی عورت کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کے بعد سادہ لباس اور وردی پوش پولیس والوں نے ماں کے پورے بنگلے کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تلاشی لی تھی پھر وہ واپس چلے گئے تھے۔ اپنی بات کے اختتام پر جمشید نے بتایا۔

''وہ لوگ آپ کی تلاش میں آئے تھے اور انہوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ واپس جدہ چلے گئے ہیں۔ اس پر انہوں نے نادر شاہ سے بڑے کرخت لہجے میں سوال کیا کہ تم تو کہہ رہے تھے کہ اس کی فلائٹ ہفتے کی صبح دس بجے کی ہے، پھر وہ رات ہی میں جدہ کیسے چلا گیا؟''

نادر شاہ نے لجاجت آمیز انداز میں جواب دیا۔ ''پتا نہیں سر، وہ کہاں چلا گیا۔ اس نے تو مجھے اپنا ٹکٹ بھی دکھایا تھا جس کے مطابق اس کی فلائٹ ہفتہ بارہ جولائی کی صبح دس بجے کی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا، یہ کیا معما ہے......''

''ہم تمہیں سارے معمے سمجھا دیں گے۔'' ایک پولیس والے نے شاہ جی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم نے آج کی شام اس بندے کا ٹکٹ دیکھا، آج کی رات ہم تمہیں اپنا ٹکٹ دکھائیں گے۔ اس کے بعد یا تو تمہاری زبان اس بندے کے بارے میں سچ اگلنے پر آمادہ ہوجائے گی یا پھر تمہاری روح اس بندے کے پاس جدہ پہنچ جائے گی......''

''پھر وہ لوگ نادر شاہ کو موبائل میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے......''

جمشید نے بات مکمل کی تو میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اور وہ سفید قیمتی گاڑی......؟''

جمشید نے جب سے مجھے بتایا تھا کہ اس نے سفید گاڑی کی عقبی نشست پر کسی غیر ملکی عورت کو براجمان دیکھا تھا اسی لمحے سے میرے پورے وجود میں بے چینی بھر گئی تھی۔ میرا دھیان فی الفور ڈیلفینا کی طرف چلا گیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ڈیلفینا کے سوا اور کوئی نہیں ہوگی۔ اگرچہ اس ذیل میں کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر بھی میں نے جمشید کو کریدنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسی لمحے وہ میرے سوال کے جواب میں بولا۔

''سر! وہ سفید لیکسس گاڑی بھی موبائل کے پیچھے ہی روانہ ہوگئی تھی۔''

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں گاڑیوں کے برانڈ کی پہچان ہے؟''

جمشید کے منہ سے ''لیکسس'' کا نام سن کر میں چونک اٹھا تھا۔ لیکسس پریمیم برانڈ کی لگژری کار تھی جو پہلی مرتبہ ٹویوٹا کار کمپنی نے انیس سو نواسی میں میری پیدائش سے بھی قبل امریکا میں لانچ کی تھی۔ جو شخص سپیج کرنا نہیں جانتا تھا اس کی زبان سے لیکسس کے ذکر نے مجھے حیران کیا تھا۔

''سر! مجھے قیمتی گاڑیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔'' اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''خاص طور پر میں لوگو سے گاڑیوں کو پہچان لیتا ہوں۔ جب میں نے اس سفید لگژری گاڑی پر مخصوص قسم کا ''ایل'' والا لوگو دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ لیکسس کار ہے......'' اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''اور تو اور...... میں نے لیکسس کا نمبر بھی نوٹ کرلیا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''یہ نمبر تم مجھے بھی بتادو۔''

اس نے گاڑی کا نمبر مجھے بھی نوٹ کروادیا۔

میں نے وہائٹ لیکسس کی عقبی نشست پر نظر آنے والی غیر ملکی عورت کے بارے میں جمشید سے مختلف سوال کیے تو اس کے جوابات سے اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ وہ ڈیلفینا ہی تھی جو میری تلاش میں نادر شاہ کے توسط سے ماں کے بنگلے تک پہنچی تھی۔ نادر شاہ تک اس نے کیونکر رسائی حاصل کی تھی اس کے بارے میں، میں فی الوقت حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ ایک اتفاق بھی ہوسکتا تھا کہ پولیس کی کارروائی کے نتیجے میں نادر شاہ ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ بھی ہوسکتا تھا۔ ڈیلفینا جس درجے کی کلاکار تھی اور وہ جتنے بااختیار اور اثر رسوخ والے لوگوں کی آلۂ کار تھی ان کے معاملات میں اتفاقات کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ لوگ جو سوچتے تھے، وہ کر گزرتے تھے۔

''میری بات دھیان سے سنو جمشید۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر پولیس والے یا وہ لیکسس والی خاتون دوبارہ تمہاری طرف آئیں اور بنگلے میں داخل ہوکر تلاشی وغیرہ لینا چاہیں تو تم نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرنا بلکہ ایک امن پسند شہری کی طرح تم نے ان لوگوں کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا ہے۔ وہ تم سے جو بھی سوال کریں، پورے اعتماد کے ساتھ اس کا نارمل انداز میں جواب دینا ہے۔ میرے بارے میں تمہارا بیان یہی ہونا چاہیے کہ میں تمہاری میڈم کا ایک قریبی رشتے دار ہوں جو ادھر جدہ میں ہوتا ہوں۔ میں تمہاری میڈم سے ملنے کراچی آیا تھا پھر تمہاری میڈم کا عمرہ پر جانے کا پروگرام بن گیا۔ وہ میرے ساتھ پاکستان سے سعودی عرب جانے والی تھیں کہ ان کا مرڈر ہوگیا اور میں واپس جدہ چلا گیا۔ بس، اس سے زیادہ تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''میں سمجھ گیا سر۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں لیکن......''

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے پوچھا۔ ''لیکن کیا جمشید؟''

''لیکن میرا ذہن کہتا ہے، حقیقت اس سے کافی مختلف ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''آپ میڈم کے کسی قریبی رشتے دار سے بہت بڑھ کر ہو سر!'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے جمشید۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اپنی میڈم کے سچے وفادار ہو اس لیے تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تم میرے ہر راز کو اپنی میڈم کا راز جان کر اس کی حفاظت کرو گے۔''

''میں آپ کے راز کی حفاظت کے لیے اور آپ کی جان کے تحفظ کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل سکتا ہوں سر......!'' وہ جوش و جذبات کی آمیزش سے بولا۔ ''آپ کا جب دل چاہے، مجھے آزما سکتے ہیں۔''

''آزمائش سے ان لوگوں کو گزارا جاتا ہے جن کی وفاداری پر شک ہو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تم پر اندھا بھروسا کر سکتا ہوں۔''

''اگر آپ کو مجھ پر اندھا اعتماد ہے تو پھر بتائیں کہ میڈم سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟'' اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

میں نے اس کی امید کو توڑنا مناسب نہ جانا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں جدہ سے نہیں، امریکا سے آیا ہوں اور میں تمہاری میڈم کا سگا بیٹا ہوں۔''

''تو میرا اندازہ درست تھا......'' وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''امریکا کی طرف تو میرا دھیان نہیں گیا لیکن میڈم کے والہانہ پن کو دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کا ان کے ساتھ ممتا کا رشتہ ہے۔''

آئندہ پانچ منٹ میں، میں نے جمشید کو اپنے بارے میں مختصراً بتایا پھر کہا۔ ''تفصیلی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔ فی الحال تم یہ جان لو کہ جن لوگوں نے میرے باپ کو انیس سال پہلے موت کے گھاٹ اتارا تھا انہی نے تمہاری میڈم یعنی میری ماں کو بھی قتل کروایا ہے اور اب وہ لوگ میری تلاش میں ہیں اور اس مشن میں نادر شاہ ان سے تعاون کر رہا ہے۔''

''پھر تو یہ شاہ جی بہت ہی ناپاک بندہ ہے۔'' وہ نفرت انگیز انداز میں بولا۔ ''میں تو آئندہ اس شیطان کو بنگلے کے اندر قدم بھی نہیں رکھنے دوں گا۔''

''تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گے۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''ویسے تو پولیس اسے آسانی سے چھوڑنے والی نہیں لیکن پھر بھی تمہاری کسی ادا سے یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ تم حالات کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہو۔ ماں نے اپنا یہ بنگلا نادر شاہ کے توسط سے فروخت کیا ہے اور وہی دو ماہ کے لیے بنگلے کو کرائے پر اٹھائے گا۔ وہ جو کرتا ہے، اسے کرنے دو۔ تم نے اس کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرنا تاکہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو مگر اس کی ایک ایک حرکت پر تم نے گہری نظر رکھنا ہے اور جب بھی ہماری بات ہو، تم نے مجھے تفصیلی رپورٹ دینا ہے......'' لمحاتی توقف کے بعد میں نے ایک طویل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میرا یہ نمبر اپنے سیل فون میں فیڈ نہیں کرنا بلکہ اسے کسی کاغذ پر نوٹ کر لو۔ جب بھی کوئی گڑبڑ محسوس کرو، مجھے مس کال کر دینا۔ پھر میں جب مناسب سمجھوں گا، تم سے رابطہ کر لوں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں سر۔'' وہ بڑے کرارے لہجے میں بولا۔ ''مجھے آپ کا نمبر کسی کاغذ پر لکھ کر رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس نمبر کا ورد کر کے اسے زبانی یاد کر لوں گا۔ آپ میرے مالک ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ میں میڈم سے کتنی عقیدت رکھتا تھا اور...... رکھتا ہوں۔''

بات کے اختتام پر وہ اچھا خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر مجھے تمہاری محبت اور عقیدت کا اندازہ نہ ہوتا تو میں اپنی زندگی کے اہم معاملات تم سے ڈسکس نہ کرتا۔ اس حوالے سے تم بالکل پرسکون رہو۔''

''پرسکون کیسے رہوں سر......!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ اتنے مشکل حالات میں گھرے ہوئے ہیں اور میں عملاً آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا۔''

''تم عملاً میرے لیے کیا کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ جو کہیں سر۔'' وہ جاں نثار کرنے والے انداز میں بولا۔

''تمہارا کوئی قریبی رشتے دار ہے کراچی میں؟''

''نہیں سر۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کوئی سچا دوست؟''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"غلام عباس نامی ایک شخص ہے۔" اس نے بتایا۔ "یہ میرا جگری یار ہے۔"

"کیا یہ فیملی والا ہے، اس کے بچے ہیں؟" میں نے استفسار کیا۔ "اس کی رہائش کراچی کے کس علاقے میں ہے؟"

"اس کے بیوی بچے مردان کے ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ غلام عباس ریلوے کالونی کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں چھڑا ہی رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "اگر کبھی کسی ایمرجنسی میں مجھے ایک دو رات کے لیے اس کے پاس ٹھہرنے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ انکار تو نہیں کرے گا؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سر!" وہ پورے تیقن سے بولا۔ "غلام عباس میری بات کو کسی بھی صورت میں ٹال نہیں سکتا۔"

"او کے۔" میں نے مختصراً کہا۔

وہ بولا۔ "لیکن سر! ریلوے کالونی کا علاقہ آپ کے شایانِ شان نہیں۔ آپ ایسی جگہ کس طرح رہ پائیں گے؟"

"مجبوری کا نام شکریہ۔" میں نے کہا۔ "فی الحال میں ایک محفوظ اور آرام دہ ٹھکانے پر ہوں۔ یہ تو میں احتیاطاً پوچھ رہا ہوں تاکہ مستقبل قریب میں اگر ہنگامی بنیادوں پر مجھے کہیں پناہ لینے کی ضرورت پیش آئے تو اس وقت میرے سامنے ایک منزل موجود ہو۔"

"آپ میرے پاس کیوں نہیں آجاتے سر۔" اس نے محبت بھرے انداز میں کہا۔ "میں آپ کو اس بنگلے میں اس طرح چھپا کر رکھوں گا کہ کسی دشمن کی نگاہ آپ تک رسائی حاصل نہیں کرسکے گی۔"

"میں تمہارے اخلاص کی قدر کرتا ہوں جمشید لیکن وہ بنگلا اب کئی زاویوں سے میرے لیے محفوظ نہیں رہا۔" میں نے اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔ "وہ پولیس والے میری تلاش میں دوبارہ، سہ بارہ ادھر کا رخ کرسکتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ انہوں نے بنگلے کے بیڈ روم کو بگ کردیا ہو یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے کمروں میں مائیکرو ریکارڈنگ ڈیوائسز چھپا دی ہوں۔ کیا تم اس وقت ان کے ساتھ تھے جب وہ لوگ کمروں کی تلاشی لے رہے تھے؟"

"نہیں سر۔" اس نے نفی میں جواب دیا۔ "میں تو گیٹ پر موجود رہا تھا اور انہوں نے نادر شاہ کو بھی میرے پاس چھوڑ دیا تھا۔ بنگلے کے اندر صرف پولیس والے ہی گئے تھے۔"

"تب تو میرے خدشات اور بھی مستحکم ہوجاتے ہیں۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اینی ہاؤ...... تم اپنا خیال رکھنا۔ مالک بہت جلد سب ٹھیک کردے گا۔"

"او کے سر۔ آپ بھی اپنا خیال رکھنا۔" جمشید نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔

میں اسے "گڈ نائٹ" کہہ کر اپنے کمرے میں حاضر ہوگیا۔ اسی لمحے نادیہ ایک ٹرے میں کافی کا مگ لے کر بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ کافی والے مگ کے علاوہ ٹرے میں، ایک پلیٹ میں چند کوکیز بھی رکھے ہوئے تھے۔ میں نے "شکریے" کے ساتھ ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی۔

اس نے کہا۔

"بینا میرے ساتھ بیٹھی ہے۔ اگر تم کہو تو اسے اندر بھیج دوں۔"

"نو ایشو۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ اپنی گپ شپ جاری رکھو۔ وہ جب خود آنا چاہے تو بھیج دینا۔"

وہ "او کے" کہتے ہوئے بیڈ روم سے نکل گئی۔

میں موجودہ حالات پر غور کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کافی نوشی کا عمل بھی شروع ہوگیا۔ جمشید نے مجھے جو کچھ بتایا تھا، وہ بہت تشویش ناک اور فکر انگیز تھا۔ پچھلی رات جی ایم سر نے ڈیلفینا کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوا تھا۔ وہ ہسپانوی دوشیزہ میرے حصول کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئی تھی۔ ویسے میں گزشتہ رات اس کی آمد کی توقع کر رہا تھا مگر وہ آج سرگرم عمل ہوئی تھی۔ اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس بنگلے تک نادر شاہ نے اسے پہنچایا تھا۔ نادر شاہ کو ماں نے بتا دیا تھا کہ میں ان کا وہی بیٹا ہوں جو انیس سال پہلے ان سے بچھڑ گیا تھا۔ تاہم نادر شاہ کے علم میں یہی تھا کہ میں جدہ سے آیا ہوں اور وہاں کوئی ریسٹورنٹ چلاتا ہوں اور یہ کہ...... ماں یہاں کی زندگی کو خیر باد کہہ کر مستقل طور پر دبئی میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کرچکی تھیں لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔ نادر شاہ کا پولیس کے ہتھے چڑھ جانے کا سیدھا سیدھا یہ مطلب تھا کہ اب یہ ساری معلومات ڈیلفینا تک پہنچ چکی تھیں جبھی وہ میری تلاش میں ماں کے بنگلے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی تاہم میری خوش قسمتی کہ اس کے چھاپا مارنے سے پہلے ہی میں بینا کے ساتھ ماں کے بنگلے سے نکل گیا تھا۔ میری بروقت حکمتِ عملی نے مجھے ڈیلفی کے شر سے محفوظ کردیا تھا۔ اگر میں اپنی فیلنگز کو نظر انداز کرنے کی غلطی کر بیٹھتا تو وہ آفت کی پرکالہ بہ آسانی ہمیں چھاپ چکی ہوتی......

تیکسس کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ڈیلفی کو یہاں کس درجے کا پروٹوکول دیا جارہا تھا اور ایسا کیوں نہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہوتا، وہ جن لوگوں کے پینل پر کام کر رہی تھی وہ پوری دنیا کو چلانے کے دعوے دار تھے۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ چار موبائلز والی پولیس کی کارروائی بھی اسی کی خوشنودی کے لیے کی گئی تھی، گویا اس نے کراچی میں قدم رکھتے ہی یہاں کی مشینری کو فعال کر دیا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ پولیس درحقیقت نادر شاہ کے تعاقب میں تھی، نامعلوم افراد بدقسمتی سے پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔

جی ایم سر کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق اسکل اینڈ بونز والوں نے ڈیلفینا کو ایک خاص ٹاسک دے کر راولپنڈی بھیجا تھا۔ اسے غریدہ، الفریڈ اور ان کے بیس سالہ بیٹے کا سراغ لگانا تھا لیکن اس کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ غریدہ اور اس کا شوہر الفریڈ اب اس دنیا میں باقی نہیں تھے۔ اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ جب وہ لوگ امریکا سے پاکستان آئے تو ان کے ساتھ کوئی بچہ نہیں تھا۔ گویا وہ لوگ مذکورہ بچے کو امریکا ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ اس ٹوئسٹ نے ڈیلفینا کے چندرہ طبق روشن کر دیے ہوں گے۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ انہیں جس غیر معمولی شخص کی تلاش تھی وہ میں ہوں یا سوسائٹی والوں نے اسے ایسا سمجھا دیا تھا۔ اب اگر منطقی انداز میں سوچا جاتا تو ڈیلفینا کے ذہن میں پھیلے ہوئے گراؤنڈ میپ کو بہ آسانی پڑھا جا سکتا تھا جو کچھ اس طرح تھا۔

میں پچھلے انیس سال سے امریکا میں تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ میرے ماں باپ کون ہیں۔ مجھے انکل علی سلطان نے پال پوس کر پروان چڑھایا تھا۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ انیس سال پہلے غریدہ اور الفریڈ مجھے علی سلطان کی نگہداشت میں دے کر پاکستان چلے آئے تھے۔ اس تھیوری کی رو سے میں ہی ڈیلفینا کا موسٹ وانٹیڈ پرسن تھا لیکن یہ تھیوری کراچی کے حالات کے تناظر میں فیل ہو جاتی تھی۔ ڈیلفینا میری تلاش میں کراچی تو پہنچ گئی تھی مگر یہاں آ کر نادر شاہ کی زبانی اسے پتا چلا ہوگا کہ میں سلمٰی اور حیدر علی کا بیٹا ہوں جو ایک سال کی عمر میں اغوا کر لیا گیا تھا اور اب ماں کے قتل کے بعد میں جدہ میں ہوتا ہوں۔

میں چشم تصور سے ڈیلفینا کو جھنجلاتے، پیچ و تاب کھاتے اور ادھر سے ادھر ٹہلتے دیکھ سکتا تھا۔ موجودہ صورت حال نے اسے چکرا کر رکھ دیا ہوگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ میری اصلیت اور میری حقیقت کیا ہے؟ کیا میں ہی ان کا مطلوبہ نوجوان ہوں؟ اگر میں وہ شخص نہیں ہوں تو پھر وہ کہاں ہے؟

جب کوئی بات انسان کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر اس کے دماغ پر دباؤ بڑھنے لگتا ہے۔ یہ دباؤ اعصاب میں تناؤ پیدا کرتا ہے جس سے جذبات و احساسات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے جو انسان کو کسی بھی غیر تفصیلی کارروائی پر اکسا سکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ڈیلفینا کی پہلی اور آخری کوشش یہی ہوگی کہ میں جلد از جلد اس کی تحویل میں چلا جاؤں تاکہ وہ میری شخصیت کا آپریشن کر سکے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی تھی اور...... اگر اس مرتبہ میں اس کے ہاتھ لگ جاتا تو اس کا انداز پرسٹن ہالو، ڈیلس والے بنگلے پر بہتر گھنٹے کے قیام کی طرح ہرگز ہرگز دوستانہ نہ ہوتا۔ اب کی بار اس کا برتاؤ کسی تفتیشی افسر جیسا ہوتا اور...... ٹرائل کے دوران میں زبان کھلوانے اور میری حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی بھی سنگین حربہ استعمال کر سکتی تھی لہٰذا مجھے کسی بھی قیمت پر اس کے ہتھے نہیں چڑھنا تھا۔

لگ بھگ ڈیڑھ بجے بینا کمرے میں آ گئی۔ اس نے ایک طویل جماہی لینے کے بعد پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے ٹی وی کو آف کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میدان جنگ کا سروے کر رہا ہوں۔''

''اس سروے کی رپورٹ کیا ہے؟'' وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک اور جماہی لیتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

میں نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ''کیا تمہیں نیند آ رہی ہے؟''

''ہوں......'' وہ مخمور لہجے میں بولی پھر منہ پر ہتھیلی سے ''آوا وا وا'' کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''پتا نہیں، اس زور کی مست نیند کیوں آ رہی ہے۔ لگتا ہے، نادیہ کی بچی نے کافی میں کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔''

''نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟''

''ایسے کیسے سو جاؤں۔'' وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''پہلے تمہاری سروے رپورٹ سنوں گی۔ اس کے بعد سونے کے بارے میں سوچا جائے گا۔''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے عظیم و جمشید سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر گمبھیر لہجے میں کہا۔

''حالات تو میری توقع سے بھی زیادہ سنگین ہیں۔''

''میں اس سے بھی زیادہ سنگینی اور خطرناکی کی توقع کر رہا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"بات ڈرنے کی نہیں علی۔" اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے تشویش اس بات کی ہے کہ ہماری واپسی کے دروازے ایک ایک کر کے بند ہو رہے ہیں۔"

"آگے بڑھنے والے واپسی کے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی پروا نہیں کیا کرتے۔" میں نے کہا۔ "ان کی نگاہیں آگے ہی آگے اپنی منزل پر جمی ہوتی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو علی۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُرسوچ انداز میں بولی۔ "کیا "خان ہاؤس" میں تم اکیلے ہی جاؤ گے؟"

"جاؤں گا تو عظیم کے دوست ساجد کے ساتھ لیکن جنید خان کے ساتھ میری میٹنگ ون ٹو ون ہوگی۔ ساجد کو میں واپس بھیج دوں گا۔"

"اور تم خان ہاؤس میں رکنے کے بارے میں بھی سوچ رہے ہو......" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ہاں۔ کم از کم ایک رات تو لازمی رکنا پڑے گا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "باقی وہاں کے حالات پر منحصر ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میرا قیام طول بھی پکڑ سکتا ہے۔"

"اور اس دوران میں میرا کیا ہوگا؟" وہ میرے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے بولی۔

"تم اپنے اپارٹمنٹ پر رہو گی...... یہاں!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں......!" وہ قطعی لہجے میں بولی۔ "میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آگئی پھر میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ "علی! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں بینا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن یہ کڑوا گھونٹ تمہیں حلق سے اتارنا ہی پڑے گا کیونکہ یہ وقت کا تقاضا اور حالات کی مجبوری ہے۔"

"تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔" وہ میرے ساتھ لگتے ہوئے بولی۔

"اور میں جب تک واپس نہیں آجاتا، تم اسی اپارٹمنٹ میں رہو گی۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "کتنے لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ تم اس اپارٹمنٹ کی مالک ہو؟"

"نادیہ اور تم یہ بات جانتے ہو۔" اس نے بتایا۔ "یا ایک دو اور لوگ۔"

میں نے استفسار کیا۔ "ان 'ایک دو لوگوں' میں نادر شاہ تو شامل نہیں؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ پورے تیقن سے بولی۔ "جب میں نے اس راز کو میڈم سے چھپا کر رکھا ہوا تھا تو یہ نادر شاہ کیا بیچتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر دریافت کیا۔ "اور نادر شاہ کے پاس تمہارا سیل فون نمبر بھی نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں......" اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"لیکن اس سے قبل تم جن لڑکیوں کے ساتھ اس بنگلے میں رہ رہی تھیں ان سب کے پاس تو یقیناً تمہارا یہ کانٹیکٹ نمبر ہوگا؟"

"بالکل۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کچھ عرصے کے لیے تمہیں یہ نمبر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "پولیس ڈیلفینا کے ایما پر جس شد و مد سے مجھے تلاش کر رہی ہے اس کی روشنی میں کچھ بعید نہیں کہ وہ نادر شاہ کے اشارے پر مذکورہ بنگلے کا بھی رخ کرے کیونکہ میرے ساتھ تم بھی منظر سے غائب ہو۔ نادر شاہ نے وہ بنگلا دیکھا ہوا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم میرے پیچھے جدہ جانے والی ہو لہٰذا وہ مجھے شکار کرنے کے لیے تمہاری تلاش میں پولیس کو وہاں پہنچا سکتا ہے...... اگر تمہارا نمبر پولیس کو مل گیا اور یہ نمبر آن بھی رہا تو وہ لوگ آسانی سے تمہاری لوکیشن ٹریس کر سکتے ہیں مجھے یہ کسی بھی طور گوارا نہیں کہ تم پولیس کی کسٹڈی میں چلی جاؤ۔"

"یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو علی۔" اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن سیل نمبر کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے پاس ایک اور ایکسٹرا سم کارڈ بھی ہے۔ میں اس نمبر کو نکال کر اس نمبر کو سیل فون میں لگا لیتی ہوں۔"

"اوہ...... ایک اور ایکسٹرا سم کارڈ......!" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں کے تو خوب مزے لگے ہوئے ہیں۔"

عظیم کے پاس بھی چار، پانچ نمبر کے سم کارڈز موجود تھے۔ یہ عیش اور بہاریں امریکا میں عوام کو میسر نہیں تھیں۔

بینا نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

"یہ کوئی ایشو نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر تم اس نمبر کو محفوظ سمجھتی ہو تو اسے ہی اپنے یوز میں رکھو اور یہ نمبر مجھے بھی بتا دو۔"

اس نے وہ نمبر دہرایا تو میں نے اسے اپنے سیل فون میں فیڈ کر لیا پھر سمجھانے والے انداز میں کہا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"جب تک میں "خان ہاؤس" سے واپس نہیں آجاتا، تم اپنی ریڈ کلفس کو اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کی پارکنگ سے باہر نہیں نکالو گی۔ تمہیں خود کہیں جانا ہو تو کوئی اور ذریعہ استعمال کرنا۔ ہم لوگ جتنی احتیاط کریں گے اتنے ہی محفوظ رہیں گے۔"

"میں تمہاری ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی پھر ایک جماہی لیتے ہوئے مخمور آواز میں اضافہ کیا۔ "مجھے پھر نیند آنے لگی ہے۔"

"ادھر سو جاؤ......" میں نے بیڈ پر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

وہ بیڈ پر دراز ہو گئی پھر مجھ سے بولی۔ "مجھے سلاؤ......"

"جسے نیند آرہی ہو اسے سلانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری آنکھوں میں خمار کے چشمے ابل رہے ہیں۔ پلکیں گراؤ اور نیند کی حسین وادیوں کی سیر کو نکل جاؤ۔"

"اکیلے ہی......؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور کسی ساحرہ کے انداز میں مجھے تکنے لگی۔

بینا کی مدھ بھری آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ ان لحات میں وہ کٹورا آنکھیں مدھوشالا بن گئی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی مے خانے میں بیٹھا ہوں اور اس کی آنکھوں سے مقناطیسی شعاعیں خارج ہو کر میری آنکھوں کے راستے دماغ تک رسائی حاصل کر رہی ہیں۔

"تم نے میری نیند کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔" وہ روٹھے ہوئے انداز میں بولی۔

"میں نے بیڑا غرق کیا ہے تو میں ہی اس بیڑے کو کنارے پر بھی لگاؤں گا۔" میں نے اپنا بازو دراز کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں آجاؤ۔"

اس نے کسی فرماں بردار بچے کے مانند میرے پھیلے ہوئے بازو پر اپنا سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے شہد رنگ بالوں کو لوری سنانے لگا۔ بینا کی فرمائش تھی کہ میں اسے سلاؤں۔ کسی بھی انداز میں سہی مگر میں اس کی یہ خواہش پوری کر رہا تھا۔

بینا کا سر میرے بازو پر تھا اور دلکش چہرہ میری آنکھوں سے چند انچ کی دوری پر۔ میں اس کی سانسوں کی سنسنی خیز تپش کو اپنے حواس میں جذب ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے زرخیز سینے کا زیر و بم احساس پر بجلیاں گراتا تھا، دل میں گدگدی جگاتا تھا اور نیت میں فتور بھرتا تھا۔ میں نے گردن جھکا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ وہ لمس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے اپنے اس عمل کو اس کے چہرے کے مختلف حصوں پر آزمایا۔ اس کے بدن میں کسی قسم کی کوئی تائیدی یا احترازی جنبش نمودار نہ ہوئی۔ وہ بڑے سکون سے بے حس و حرکت پڑی رہی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ سو چکی ہے۔

میں نے چند منٹ تک اسے اسی پوزیشن میں پڑا رہنے دیا تاکہ اس کی نیند پکی ہو جائے پھر میں نے بہ آہستگی اپنے بازو کو اس کے سر کے نیچے سے نکال دیا۔ وہ مزے سے پڑی سوتی رہی۔ اس کی بے خبری سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند میں اتر چکی ہے۔ میں نے نائٹ بلب کو آن کرنے کے بعد لائٹ کو آف کیا اور بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ میں سٹنگ روم میں بیٹھ کر کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

اس اپارٹمنٹ کے دونوں بیڈ رومز سٹنگ روم میں کھلتے تھے۔ میں نے سٹنگ روم میں قدم رکھا تو ایک صوفے پر مجھے نادیہ بیٹھی دکھائی دی۔ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ وہ اب تک سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں جا چکی ہو گی لیکن وہ میری توقع کے برعکس سٹنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھی اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف تھی۔ میں اپنی کو بھول کر نادیہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

مجھ پر نگاہ پڑی تو اس نے سیل فون ایک طرف رکھ دیا اور شائستگی سے استفسار کیا۔

"خیریت...... کچھ چاہیے تمہیں؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے باہر نکل آیا۔"

اس نے شک آلود نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کا یہ دیکھنا مشکل سے دو سیکنڈ کا تھا۔ اس دیکھن دکھن میں، میں سمجھ گیا کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے پھر اگلے ہی لمحے دل کی بات اس کی زبان پر آگئی۔

"کیا بینا بھی ابھی تک جاگ رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ تو گہری نیند سو رہی ہے۔" میں نے بتایا۔

"وہ تو کافی پیتے ہوئے بھی یہ لمبی لمبی جماہیاں لے رہی تھی۔" نادیہ نے کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت بولی۔

"تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ نا......!"

میں نادیہ کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"چائے کافی سے لوگوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔" وہ معتدل انداز میں بولی۔ "لیکن بینا پر تو کافی کا الٹا ہی اثر ہوا ہے۔"

"وہ کافی اثر والی کافی تھی نا...... اس لیے!" میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''میں کچھ بھی نہیں؟''

''بینا کو شک ہے کہ تم نے کافی میں کچھ گھول کر اسے پلا دیا ہے۔'' میں نے بہ دستور معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ قطعیت کے ساتھ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''جو کافی میں نے پی اور تمہیں دی وہی کافی بینا نے بھی پی ہے۔ اگر میں نے کافی میں کوئی خواب آور شے ملائی ہوتی تو اس وقت ہم تینوں دنیا ومافیہا سے بے خبر پڑے سو رہے ہوتے۔''

''تمہاری دلیل تو اپنی جگہ خاصی مضبوط ہے لیکن!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ میری سنجیدگی کے پیش نظر اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''لیکن کیا؟''

''تم نے اگر صرف بینا کی کافی میں کچھ ملایا ہو تو؟''

میں نے ایک مرتبہ پھر جملے کو نامکمل چھوڑ دیا۔

''کیا تم میری نیت پر شک کر رہے ہو؟'' اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں محبت کرنے والوں کی نیت پر شک کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسا سوچنا میرے نزدیک ایک سنگین غلطی بلکہ گناہِ عظیم ہے۔''

وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''تو پھر یہ سب کیا ہے؟''

''میں نے تو ابنا غفیل ہونے والی تمہاری دوست کی بات کو تم تک پہنچایا ہے۔'' میں نے نادیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس نے طویل جماہیاں لیتے ہوئے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ لگتا ہے، نادیہ کی بچی نے کافی میں کچھ گھول کر پلا دیا ہے......''

''ارے...... وہ مذاق کر رہی ہوگی۔'' وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' میں نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ مجھے تو اس اپارٹمنٹ میں تمہاری کوئی بچی دکھائی نہیں دی۔''

وہ بے اختیار ہنس پڑی پھر معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا مذاق مجھے پسند آیا۔''

''شکریہ!'' میں نے کہا۔ ''ورنہ مذاق ایک ایسی چیز ہے جو بہت کم لوگوں کو اچھا لگتا ہے...... پسند آنا تو بہت دور کی بات ہے۔ آپ کافی اہل ذوق لگتی ہو۔''

''یہ خواب آور دوائی والی کافی تو نہیں؟'' وہ شرارت آمیز انداز میں بولی۔

''جو بھی سمجھ لیں، میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ویسے مجھے ایک بات کا افسوس ہے۔'' وہ ذومعنی لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کس بات کا؟''

''بینا کی نیند نے تمہاری رات کالی کر دی......!''

''رات تو کالی ہی ہوتی ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''چاہے کوئی بینا کی طرح دنیا ومافیہا سے بے خبر سوتا رہے یا ہم دونوں کے مانند الوؤں کے انداز میں جاگتا رہے۔''

''ایک لحاظ سے تمہاری بات درست ہی ہے لیکن بعض راتیں سفید بھی ہوتی ہیں۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جو کسی کے سونے یا جاگنے سے متاثر نہیں ہوتیں جیسی کہ آج کی رات ہے...... اجلی اجلی اور نکھری ہوئی، چاندنی میں نہائی ہوئی، پاکیزہ اور معطر۔''

میں نے چونک کر نادیہ کی طرف دیکھا اور سیکنڈ کے دس ویں حصے میں اس کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ آج چاند کی پندرہ تاریخ تھی۔ چودہ، پندرہ تاریخ کو چاند مکمل ہوتا ہے اور اپنی رومان پرور چاندنی سے ماحول کو نشاط انگیز بنا دیتا ہے۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نادیہ نے گھبرائے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔ ''کیا ہوا؟''

''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں تمہارے بیڈروم سے گزر کر گیلری کی طرف جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''لیکن یہ تو بتاؤ، تمہیں گیلری میں کیا کام ہے؟''

''نادیہ! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''رات کالی ہونے کے غم میں، میں آٹھویں فلور کی گیلری سے ہرگز ہرگز کودنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

''پھر......؟'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''میں تمہاری بات کی تصدیق کے لیے وہاں جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

اس نے الجھن بھرے انداز میں دریافت کیا۔ ''کون سی بات؟''

''یہی کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''بعض راتیں سفید بھی ہوتی ہیں۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''اوہ......!'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''تو یہ بات ہے۔''

''بالکل یہی بات ہے۔'' میں نے اس کے بیڈ روم کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم بھی اجلی اور نکھری ہوئی چاندنی رات کا نظارہ کرنا چاہتی ہو تو آ جاؤ۔''

میں نے بات کے اختتام پر پلٹ کر دیکھنا ضروری نہ سمجھا اور نادیہ کے بیڈ روم کے اندر سے گزر کر گیلری میں پہنچ گیا۔ اس بیڈ روم میں چند روز پہلے میں نے بینا کی معیت میں کچھ لمحات گزارے تھے۔ یہ مختصر سی سنگت بڑی فرحت بخش اور ناقابل فراموش تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب نادیہ اسلام آباد گئی ہوئی تھی اور بینا اس کی مچھلیوں کو خوراک اور پودوں کو پانی دینے میرے ساتھ یہاں آئی تھی اور اب صورت حال یہ تھی کہ بینا برابر والے بیڈ روم میں گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی اور میں اس کی قربت سے نکل کر نادیہ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

اپارٹمنٹ کی گیلری میں دو گارڈن چیئر بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں ایک چیئر پر بیٹھ کر آسمان پر چمکتے فل مون کو تکنے لگا۔ چاند پوری آب و تاب کے ساتھ اپنے حسن کی خیرات کو ماحول کی نذر کر رہا تھا۔ فضا میں ہر طرف اس کی دل فریب چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ پورے چاند کی چاندنی ساحل و کوہ و دمن میں ہر نظارے کو جاذب نظر اور سحر انگیز بنا دیتی ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس طلسماتی ماحول کا حصہ بن جاتا، مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ نادیہ تھی۔ میں نے ادھر کا رخ کرتے ہوئے اس سے کہا تھا، اگر تم بھی اجلی اور نکھری ہوئی چاندنی رات کا نظارہ کرنا چاہتی ہو تو آ جاؤ...... اور وہ میری توقع کی تکمیل کرتے ہوئے چلی آئی تھی۔

اس نے دوسری کرسی کھینچ لی اور مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''چاندنی رات میں کتنا جادو ہوتا ہے نا......!''

''بہت زیادہ۔'' میں نے انگلی سے چاند کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بڑا عجیب و غریب جادوگر ہے اور...... پتا نہیں، کس کس کا محبوب...... بے وفا دلبر...!''

''بے وفا کیوں؟'' اس نے بڑی جاذب نظر سے مجھے دیکھا۔

''بہت سے انسان، پرندے خصوصاً چکور اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے

ذرا غور کیجیے

☆ حسد کی انتہا اور نفرت کی انتہا انتقام ہے۔ غم کتنا ہی سنگین ہو نیند سے پہلے تک ہے۔

☆ اللہ نہایت کریم ہے اس نے ہمیں بھولنے کی صفت دی کہ ہم غموں اور بُرے واقعات کو بھول سکیں لیکن ہم اسے بھول بیٹھے۔

☆ وہ لوگ جن کے پاس بولنے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے، وہ عام طور پر مختصر ترین لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔

☆ عادتیں بے شک آپ کی اپنی ہوتی ہیں مگر آپ دوسروں کے لیے ہوتے ہیں۔

☆ تعجب ہے اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ کو جانتا ہے اور پھر غیروں کا ذکر کرتا ہے اور ان پر بھروسا کرتا ہے۔

سنہرے حروف

☆ ہر چیز اس طرح دیکھو جیسے پہلی دفعہ دیکھ رہے ہو پھر اس دنیا میں تمہارا وقت بہت شادمانی سے گزرے گا۔

☆ موت تکلیف دہ ہے لیکن اتنی نہیں جتنی زندگی۔

☆ جہاں جاؤ، خوشیاں چھوڑ آؤ تاکہ لوگ تمہیں یاد کریں۔

☆ دعا کبھی بیکار نہیں جاتی البتہ قبول ہونے کی صورتیں مختلف ہیں۔ اہم ہونا خوب صورت ہے، خوب صورت ہونا اہم نہیں۔ اسی طرح بعض خوب صورت لوگوں میں خوب صورتی نہیں ہوتی۔

سادگی

کالج کے ایک پروفیسر کو کسی وجہ سے مکان چھوڑ کر دوسری جگہ فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا۔ فلیٹ چوتھی منزل پر واقع تھا اور لفٹ نہیں تھی۔ مزدور کتابوں کے بنڈل چوتھی منزل پر پہنچاتے پہنچاتے تھک گیا۔ ساتویں پھیرے میں وہ سر پکڑ کر عاجزی سے بولا۔ ''پروفیسر صاحب! یہاں منتقل ہونے سے پہلے اگر آپ یہ سب کتابیں پڑھ لیتے تو مجھے اتنی مصیبت نہ اٹھانی پڑتی۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں کہا۔ "یہ سب کو تسلی، دلاسا اور آسرا دیتا ہے مگر کسی کا بھی ہو کر نہیں رہتا۔"

میں نے نادیہ کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ محبت میں چوٹ کھائی ہوئی ایک زخم خوردہ عورت تھی۔ میری وضاحت نے اسے رنجیدہ کر دیا۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر صرف اتنا کہا۔

"یہ تو سراسر خود غرضی ہوئی نا......!"

میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کہ نادیہ کا یہ جواب چاند کی بے وفائی کے ذیل میں ہرگز نہیں تھا۔ اس نے "خود غرضی" کے الفاظ اپنے محبوب عمران کے لیے استعمال کیے تھے جو چند ماہ پہلے اسے انگور مار کر کسی اور کا ہو گیا تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ ابھی تک عمران کی بے وفائی کے صدمے میں گرفتار تھی۔ میں اسے اس ذہنی کیفیت سے نکالنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا لیکن اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی معیت کی جتنی بھی ساعتیں مجھے میسر ہیں، میں اس کے زخموں پر مرہم رکھ کر اسے غم واندوہ کے طوفان سے باہر نکالنے کی کوشش کروں گا۔

"نادیہ! تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں۔" میں نے آسمان پر چمکتے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ دلچسپ بات اسی بے وفا کے بارے میں ہے؟" اس نے چاند پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ "بتاؤ، کیا بات ہے؟"

"ساؤتھ ایشیا کے ممالک خصوصاً ملائیشیا، سنگاپور، تائیوان، ہانگ کانگ، بورنیو، جاوا، سماٹرا، انڈونیشیا اور بالی میں پورے چاند کو ایک خاص حوالے سے بہت اہمیت دی جاتی ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے عقیدے کے مطابق.... آسمان پر چمکتے ہوئے پورے چاند پر نگاہ جما کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کا یہ ایمان ہے کہ اس عمل سے انہیں پتا چل جاتا ہے کہ ان کا جیون ساتھی کون ہے یعنی چاند کے اندر انہیں اپنے لائف پارٹنر کی شکل نظر آ جاتی ہے۔"

"ایسا میں نے بھی سن رکھا ہے۔" وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ "علی! تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم نے دنیا کے کئی ملکوں کی سیر کر رکھی ہے۔"

"تمہارا اندازہ صد فیصد درست ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی ایشیا، ساؤتھ افریقا کے علاوہ یورپ کے کئی ممالک دیکھ رکھے ہیں۔"

"واؤ......" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم نے تھوڑی دیر پہلے فل مون کے حوالے سے لوگوں کے جس عقیدے کا ذکر کیا، تم نے خود بھی اس کا تجربہ کیا ہے؟"

"نہیں!" میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"کیوں؟" اس نے استفسار کیا۔ "کیا تم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی یا تم شادی شدہ ہو......" پھر جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "علی! میرے کسی سوال کا برا نہیں منانا......"

"ایک بات ذہن نشین کر لو کہ میں دوستوں کی کسی بات کا برا نہیں مناتا۔" اس کی وضاحت مکمل ہونے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔ "تم بینا کی بہت اچھی دوست ہو اور بینا کی مجھ سے دوستی ہو چکی لہٰذا اس چین سے تم میری بھی دوست ہو۔ باقی جہاں تک میرے شادی شدہ ہونے کی بات ہے تو میں فی الحال ایسی جکڑ بندی میں نہیں ہوں اور مستقبل قریب میں دور دور تک اس کا کوئی امکان بھی دکھائی نہیں دیتا۔" میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھوڑی دیر کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے لائف پارٹنر کی تلاش کے سلسلے میں فل مون والا تجربہ کرنے کی اس لیے ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں اس عقیدے پر یقین نہیں رکھتا۔ لہٰذا جیون ساتھی کی تلاش کا یہ طریقہ میری نظر میں تو ہم پرستی سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو علی۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں تم سے مکمل اتفاق کرتی ہوں۔ میرا ایمان یہ ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ کاتب تقدیر نے کس کے نصیب میں کس کو لکھ رکھا ہے۔"

بات کے اختتام پر اس کی آواز میں نمی اتر آئی تھی۔ میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ دل کے زخموں پر گرنے والے نمکین آنسوؤں نے اس کی آواز کو بھگو دیا تھا۔ اندر گرنے والے آنسو بڑے بے زبان ہوتے ہیں کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ کس کی یاد نے روح کو تار تار اور جگر کو پاش پاش کر دیا۔

میں نے جذبات واحساسات کا لوہا گرم دیکھا تو ٹریٹمنٹ کی چوٹوں کا آغاز کر دیا۔ "نادیہ جی......" میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "جب انسان کا یہ ایمان ہو کہ محبت،

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

قسمت کا کھیل ہے تو پھر قسمت کے اس کھیل کے نتائج کو تقدیر کے مالک کا لکھا سمجھ کر دل و جان سے قبول کر لینا چاہیے۔''

''میں نے قبول کر لیا ہے۔'' وہ سسک پڑی۔

''قبولیت کے دو چہرے ہوتے ہیں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے خلاف برآمد ہونے والے کھیل کے نتیجے کو ایک بہادر انسان کی طرح فخر سے سینہ تان کر قبول کرنا یا پھر کسی بزدل کے مانند گردن جھکا کر آنسو بہاتے ہوئے سسک پڑنا......''

''میں بزدل نہیں ہوں علی!'' وہ اپنی بھیگی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ٹوٹا ہوا دل جب تک جڑ نہیں جاتا، یہ کمزوری تو رہے گی......!''

''عمران کم ظرف تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور ایسے لوگوں کے لیے اپنے آنسوؤں کے قیمتی خزانے کو برباد نہیں کرنا چاہیے۔''

''لگتا ہے، پینا نے تمہیں میرے اور عمران کے بارے میں کافی تفصیل سے بتا رکھا ہے۔'' اس نے چونک کر میری جانب دیکھا پھر الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''پینا نے تمہارے بارے میں مجھے بہت کم بتایا تھا لیکن جب میں نے تمہیں دیکھا تو بہت زیادہ سمجھ لیا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور میری جو بات تمہارے ذہن کو الجھا رہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دلِ صد چاک کسی انٹینا کی طرح سگنلز کو کیچ کرتا ہے۔ ان زخموں کو سلنا نہیں چاہیے۔ ان کا منہ کھلا رہے تو انٹری بہت آسان ہو جاتی ہے۔''

''تم نے تو میری الجھن کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیا ہے۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم کس کی انٹری کا ذکر کر رہے ہو؟''

''تمہارے خالق اور مالک کی انٹری کا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''اللہ تو ہر دل کے اندر موجود ہے۔'' اس نے کہا۔

''بے شک!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مالک کو ٹوٹے ہوئے دلوں سے خصوصی محبت ہے۔ انسان کا دل مالک کا گھر ہے اور وہ اپنے شکستہ حال گھر پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور جب وہ ایسے گھر میں پناہ گزیں ہوتا ہے تو تمام زخموں کے منہ خود بخود سل جاتے ہیں۔ زخم خوردہ دل اپنے مالک کی جانب یکسو ہو جاتا ہے پھر مجازی عشق، عشقِ حقیقی میں ڈھل جاتا ہے۔ تب حقیقی محبوب کائنات کے ذرے ذرے میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر انسان سے کیے جانے والے عشق کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ کبھی بھولے بھٹکے محبوب سامنے سے گزر بھی جائے تو آنکھ اسے پہچان نہیں پاتی کیونکہ بصارت، بصیرت میں بدل چکی ہوتی ہے۔''

نادیہ آنکھیں پھاڑ کر حیرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں خاموش ہوا تو وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو عابدہ آپا والی بات ہو گئی...... یار کو ہم نے جا بجا دیکھا۔ کبھی ظاہر، کبھی چھپا دیکھا۔''

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مالک جس کا یار ہے، اس کا بیڑا پار ہے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کسی قریبی مسجد میں مالک کی حمد و ثنا بلند ہوئی۔ نادیہ نے مجھ سے پوچھا۔

''علی! تم روزہ رکھو گے؟''

''اگر تم کہو گی تو رکھ لوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں محبت کرنے والوں کی فرمائش کو ٹال نہیں سکتا۔''

''اس میں میری فرمائش کا کوئی عمل دخل نہیں۔'' اس نے بڑی رسان سے کہا۔ ''روزے تو ہم پر فرض کیے گئے ہیں۔ چلو پھر اٹھو۔''

وہ مجھے روزہ رکھوانے پر تل گئی تھی۔ میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ''ا۔ب۔پ۔''

''الف، بے، پے......؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

''ا سے انڈا، ب سے بالائی اور پ سے پراٹھا۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور اگر اس کے ساتھ ہی ایک اچھی سی چائے بھی مل جائے تو سحری کا لطف دوبالا ہو جائے گا لیکن......'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے لمحاتی توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''لیکن اس اچھی سی چائے کے اندر کوئی زود اثر نیند کی دوائی گھولنا نہیں بھولنا کیونکہ سحری کے بعد مجھے ایک بھرپور نیند لینا ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میری گفتگو کے نتیجے میں اس کی اداسی جاتی رہی تھی۔ اب اس کے چہرے پر شادمانی اور تازگی نے جگہ بنالی تھی۔ اس کے اندر پیدا ہونے والی اس خوشگوار تبدیلی سے مجھے گہرا اطمینان حاصل ہوا۔

''میں سحری تیار کرنے کچن میں جا رہی ہوں۔'' اس

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے کہا۔ ”دس پندرہ منٹ میں تم بھی فریش ہو کر ڈائننگ میں آ جاؤ۔ اگر یہاں بیٹھے رہے تو......“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مڑی تو میں نے اصراری لہجے میں کہا۔ ”اگر میں یہاں بیٹھا رہا تو کیا ہوگا۔“

”تو بار بار تمہاری نگاہ آسمان کی جانب اٹھے گی۔“ وہ شرارت بھرے انداز میں بولی۔ ”اور کیا پتا، جنوبی ایشیا کے ممالک میں رہنے والے افراد کا عقیدہ حقیقت کا روپ دھار لے!“

بات مکمل کرتے ہی وہ گیلری سے نکل کر بیڈروم میں داخل ہوگئی۔ وہ چند الفاظ میں بہت کچھ کہہ گئی تھی۔ میں اس کی بات پر غور کر رہا تھا کہ میرے سیل فون پر مس کال ریسیو ہوئی۔ مطلب یہ کہ کسی نے مس کال کی تھی۔ یہ عظیم یا جمشید میں سے کوئی ایک ہو سکتا تھا۔ میں نے وقت دیکھا۔ صبح کے ساڑھے تین بجنے والے تھے۔ میں نے سیل فون کو چیک کیا تو وہاں جمشید کی مس کال لگی ہوئی تھی۔ رات کے آخری پہر کسی خوش خبری کے لیے تو اس نے مس کال نہیں کی ہوگی۔ میں نے فوراً اسے کال کی۔ دوسری گھنٹی پر اس نے میری کال ریسیو کر لی۔ میں نے کہا۔

”جمشید! خیریت تو ہے نا۔ تم نے اس وقت مجھے یاد کیا ہے......؟“

”سر! آپ جاگ رہے ہیں۔“ جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھ سے سوال کیا ”آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”میں خیر و عافیت سے ہوں اور سحری کے لیے اٹھا ہوں۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ اس وقت مجھے کال کیوں کی ہے؟ پولیس والوں نے دوبارہ بنگلے کی طرف رخ تو نہیں کیا؟“

”نہیں سر! وہ دوبارہ اس جانب نہیں آئے لیکن ان کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں ہے۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔

”تم اس وقت بنگلے کے کس حصے میں ہو؟“

میرے محتاط اندازے کے مطابق آج نصف شب پولیس والوں نے ماں کے بنگلے پر جس نوعیت کی ہنگامی کارروائی کی تھی اس میں انہوں نے بنگلے کے مختلف حصوں کو لازماً بگ کیا ہوگا یا بعض مقامات پر حساس آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ ڈیوائسز نصب کی ہوں گی تاکہ وہ اس بنگلے میں ہونے والی نقل و حمل اور بات چیت سے باخبر ہو سکیں۔ اسی خدشے کے پیش نظر میں نے جمشید کی لوکیشن معلوم کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ بے خبری میں ہم سے سنگین نوعیت کا کوئی بلنڈر نہ ہو جائے۔

”سر! میں اس وقت اپنے کمرے میں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں مطمئن ہوگیا کیونکہ میری اطلاعات کے مطابق جمشید والا کمرا پولیس والوں کے ”شر“ سے محفوظ رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”تمہارا دل ان کی طرف سے مطمئن کیوں نہیں ہے؟“

”سر! وہ لوگ جب سے گئے ہیں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بنگلے کے آس پاس موجود ہوں۔“ جمشید نے گھبراہٹ آمیز انداز میں بتایا۔

میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے، یہ تمہارا وہم ہو!“

”پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”لیکن ابھی چند منٹ پہلے میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے اسے میں وہم کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتا سر......“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”تم نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے؟“

”سر! ان لوگوں کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ نادیدہ آنکھیں مسلسل اس بنگلے کی نگرانی کر رہی ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے سامنے والے بنگلے کی چھت پر دو افراد کو بڑے مشکوک انداز میں ٹہلتے دیکھا ہے پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ غائب ہوگئے اس کے بعد ہی میں نے مجبور ہو کر آپ کو مس کال کیا ہے۔“

”سامنے والے بنگلے میں کون رہتا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”عمر رسیدہ جوڑا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جو ساٹھ اور ستر کے پیٹے میں ہیں۔ ان کی بیٹی آسٹریلیا میں سیٹل ہے اور بیٹا امریکا میں مقیم ہے۔ ان دونوں بڈھے بڈھی کے سوا اس بنگلے میں کوئی تیسرا شخص نہیں رہتا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے، پولیس والوں نے ہمارے بنگلے پر کڑی نگاہ رکھنے کے لیے سامنے والے بنگلے کی چھت پر مورچا بنا لیا ہے۔“

”ایسا ہو سکتا ہے......“ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

”اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر انہوں نے اس نگرانی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے مذکورہ بنگلے کی چھت پر لانگ رینج کی ٹیلی اسکوپ بھی نصب کی ہوں گی جن میں زومنگ لینسس کی سہولت موجود ہوگی تاکہ نگرانی کا مقصد پورا ہو سکے۔“

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''سر! یہ تو بڑی تشویش ناک صورتِ حال ہے......''

''کیا تمہیں کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس ہو رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں سر......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں صرف آپ کے لیے فکرمند ہوں۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''مالک ہر پل میرے ساتھ ہے۔''

''میری بھی یہی دعا ہے کہ آپ کو کبھی کچھ نہ ہو۔'' وہ خلوص بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس بنگلے میں آپ کے لیے بہت زیادہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔''

''یہ بات میں نے بنگلا چھوڑنے سے پہلے ہی بھانپ لی تھی جمشید۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس لیے طوفان کی آمد سے قبل ہی میں وہاں سے نکل گیا تھا۔''

''اللہ آپ کی حفاظت فرمائے سر......!''

''آمین!'' میں نے تہِ دل سے کہا۔ ''تمہیں بھی بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ سامنے والے بنگلے پر اس طرح نظر رکھو کہ انہیں ذرا شک نہ ہو کہ تم ان کی وہاں موجودگی سے آگاہ ہو چکے ہو۔ تم جتنی زیادہ احتیاط برتو گے، ہم اتنے ہی محفوظ رہیں گے۔''

''آپ فکر نہ کریں سر! میں پوری احتیاط سے کام لے رہا ہوں۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''اس وقت بھی میں اپنے کوارٹر میں ایک ایسے زاویے سے بیٹھ کر آپ سے بات کر رہا ہوں کہ سامنے والے بنگلے کے کسی بھی حصے سے مجھے دیکھا نہیں جا سکتا۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''وہ تمام ہدایات ذہن نشین ہیں نا جو میں نے تمہیں دی تھیں؟''

''یس سر!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آپ کی ایک ایک نصیحت مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

میں نے دو چار باتوں کے بعد سیلولر رابطہ موقوف کر دیا۔

جمشید کی، سامنے والے بنگلے کے حوالے سے فراہم کردہ اطلاعات خاصی تشویش ناک تھیں۔ جمشید نے اس بنگلے کی چھت پر جو کچھ دیکھا تھا اگر اس میں کسی ابہام یا مغالطے کا عمل دخل نہیں تھا تو پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ ڈیلفینا میرے جدہ چلے جانے والی اسٹوری سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں کراچی ہی میں ہوں اور کبھی نہ کبھی اس بنگلے کی طرف ضرور آؤں گا لہٰذا اس نے مجھے چھاپنے کا مکمل بندوبست کر ڈالا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر مجھے اپنی تحویل میں دیکھنا چاہتی تھی۔

اگر ایک لمحے کے لیے ڈیلفینا کو اس اسٹوری سے مائنس کر دیا جائے تو پھر پولیس کی اس کارروائی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا تھا۔ میں نے ایسا کوئی بھی جرم نہیں کیا تھا کہ پولیس اتنی شدومد سے مجھے ڈھونڈتی پھرتی۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ پاکستان میں ایسی مستعدی اسی وقت دکھاتی ہے جب ان پر اوپر سے پریشر آتا ہے اور ڈیلفینا جس کیلیبر کی عورت تھی وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدے داروں سے ہنگامی احکامات سے پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو تگنی کا ناچ نچا سکتی تھی۔ پھر جمشید نے مجھے لیکسس کی عقبی نشست پر بیٹھی ہوئی اس غیر ملکی عورت کا جو حلیہ بتایا تھا وہ ڈیلفینا کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا مجھے اس امر میں شمہ بھر شک وشبہ نہیں تھا کہ وہ ہسپانوی دوشیزہ میرے تعاقب میں تھی۔

میں نے ڈیلفینا کی آنکھ مچولی والی فلم کو ذہن میں چلنے دیا اور گیلری سے اٹھ کر ڈائننگ میں آ گیا۔ نادیہ نے میرے حسبِ خواہش سحری کا انتظام کر دیا تھا۔ جس دوران میں، میں سیل فون پر جمشید سے بات کر رہا تھا، نادیہ کچن میں مصروف رہی تھی جس کا نتیجہ ڈائننگ ٹیبل پر نظر آ رہا تھا۔ سحری کا وقت ختم ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی اس لیے ہم کھانے میں لگ گئے۔ ہماری باتیں بھی جاری تھیں۔

ہم سحری کے اختتام پر تھے کہ بینا آنکھیں ملتے ہوئے بیڈروم سے باہر نکل آئی۔ اس نے شک بھری نظر سے یکے بعد دیگرے ہم دونوں کو دیکھا پھر سرسری انداز میں پوچھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے بھئی؟''

''روزہ رکھا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تمہارا ابھی ارادہ ہے تو آ جاؤ۔ کھانے پینے کا کافی سامان موجود ہے۔''

''میں واش روم جانے کے لیے اٹھی تھی۔'' وہ ایک طویل جماہی لیتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں بستر سے غائب پایا تو مجھے حیرت ہوئی پھر میں نے آپ لوگوں کی باتیں کرنے کی آواز سنی تو ادھر آ گئی۔''

''اب آ ہی گئی ہو تو ناشتا کر لو۔'' نادیہ نے کہا۔ ''سحری کا وقت تو رہا نہیں کہ روزہ رکھ سکو۔''

ادھر نادیہ کی بات ختم ہوئی، ادھر مسجد میں سحری کے وقت کے اختتام کا اعلان ہونے لگا۔ میں نے بینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''روزہ تو گیا ہاتھ سے۔ اب تم بھی واش روم کا رخ کرو۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نادیہ نے اس سے پوچھا۔ ''اگر تمہارا ناشتے کا موڈ ہو تو میں خوردونوش کی اشیا کو ڈائننگ ٹیبل پر ہی چھوڑ دیتی ہوں؟''

''نہیں...... میں ابھی اور سونا چاہوں گی۔'' بینا نے نیند بھرے لہجے میں کہا اور واپس بیڈروم میں گھس گئی۔

نادیہ نے ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولی۔ ''لگتا ہے، تم نے کئی راتوں سے اسے جگا رکھا ہے۔ موقع ملتے ہی بے چاری نیند پوری کرنے میں جت گئی ہے۔''

''شاید ایسا ہی ہے۔'' میں نے ذومعنی انداز میں جواب دیا اور دانت برش کرنے کے لیے واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

دوپہر کو میری آنکھ کھل گئی تھی اور مجھ سے قبل بینا جاگ چکی تھی۔ نہ صرف وہ بیدار ہو چکی تھی بلکہ وہ ناشتے وغیرہ سے نمٹ کر ایک دم تروتازہ بھی ہو گئی تھی۔ دس پندرہ منٹ میں، میں بھی فریش ہو کر اس کے پاس آگیا اور اس سے پوچھا۔

''کیا تمہاری نیند پوری ہو گئی؟''

''یہ سوال تو مجھے پوچھنا چاہیے۔'' اس نے شرارت بھری نظر سے مجھے گھور کر دیکھا۔ ''مجھے بیڈروم میں سلا کر پوری رات خوش گپیوں میں گزار دی......''

''مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے تمہیں بیڈروم میں سوتا چھوڑ کر میں باہر نکل گیا تھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''نادیہ تمہاری دوست ہے اور یہ بات تم بھی جانتی ہو کہ وہ محبت میں چوٹ کھا کر اندر باہر سے ٹوٹ چکی ہے۔ اگر میں نے تھوڑی دیر اس کی دلجوئی کر دی تو کون سی قیامت برپا ہو گئی ہے؟''

''صرف دلجوئی کی ہے یا اس دکھیاری کے آنسو بھی پونچھے ہیں؟'' وہ کریدنے والے انداز میں مستفسر ہوئی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ میرے نزدیک کسی دوسری عورت کو برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ چاہے وہ کوئی جیتی جاگتی میرے قریب موجود نادیہ ہو یا غائبانہ طور پر زیربحث شکیرا کی ذات ہو۔ یہ اس کی محبت کا اپنا ایک انداز تھا کہ وہ مجھے دوسری عورتوں کے سائے سے بھی بچا کر اپنے لیے مخصوص رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے تپانے کی غرض سے کہا۔

''صرف دلجوئی اور اشک شوئی ہی نہیں کی بلکہ اس سے دو ہاتھ آگے بڑھ کر نادیہ کو گلے بھی لگایا ہے اور...... اور...... خیر چھوڑو......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولی۔

''خیر چھوڑو کیا؟''

''تم برداشت نہیں کر پاؤ گی......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میرے اندر بہت برداشت ہے۔ تم بولو، جو بھی بولنا چاہتے ہو۔'' وہ اکسانے والے انداز میں مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''لیکن تم مجھے جو بھی کہانی سناؤ گے، میں نادیہ سے اس کی تصدیق بھی کروں گی۔''

''تو پھر جا کر اسی نوٹری پبلک سے تصدیق کرا لو۔'' میں نے ہلکی برہمی سے کہا۔ ''اب میں کچھ نہیں بتا رہا۔''

وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر سپاٹ آواز میں بولی۔ ''علی! تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو نا؟''

''میں تمہیں کوئی جوکر دکھتا ہوں؟'' میں نے خفگی آمیز انداز میں پوچھا۔

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے استفسار کیا۔ ''کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

''کیوں......'' میں نے سوالیہ انداز میں اسے گھورا۔ ''کیا تم نے کوئی ایسی حرکت کی ہے جس پر مجھے ناراض ہونا چاہیے؟''

''میں بھی پاگل ہوں۔'' وہ پسپائی اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں، کیا کیا بولتی رہتی ہوں۔''

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بے بی۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے پاگل پن کا علاج کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ! بہت جلد تم بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔''

''میرا علاج صرف تم ہی کر سکتے ہو علی!'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم صرف میرے ڈاکٹر بن کر رہو۔ دوسری مریضاؤں کے لیے دنیا میں اور بہت سے ڈاکٹر پڑے ہیں۔ تمہیں سب کی فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ گئے نا......!''

آخری جملے کے ساتھ ہی بینا نے بڑے محبوبانہ انداز میں مجھے آنکھیں بھی دکھائی تھیں۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا کر کہا۔

''کافی حد تک سمجھ گیا۔''

''کافی حد تک نہیں، تمہیں مکمل سمجھنا ہوگا۔'' وہ اصراری لہجے میں بولی۔

''تم کوشش جاری رکھو۔'' میں نے کہا۔ ''عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی۔ اگر تمہاری روک ٹوک اسی طرح جاری رہی تو جلد یا بدیر اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوگا۔''

''نتیجہ مثبت برآمد ہونا چاہیے......!''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''لیٹس ہوپ فار دی بیسٹ۔'' میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ بینا مزید کچھ کہتی، میرے سیل فون پر جمشید کی مس کال موصول ہوئی۔ میں نے فوراً سے پیشتر اس سے رابطہ کرلیا۔

''ہیلو سر! آج لگ بھگ گیارہ بجے ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کی اطلاع آپ کو دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اسی لیے ابھی میں نے آپ کو مس کال کیا ہے۔''

''اوکے۔'' میں نے رسان بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا واقعہ پیش آیا ہے؟''

''ایک ہائی روف اور دو گاڑیاں بنگلے پر پہنچی تھیں۔ ہائی روف کے اندر کیمرے، لائٹس اور اسی نوعیت کا دیگر سامان بھرا ہوا تھا اور ساتھ ہی تین چار افراد بھی ہائی روف میں موجود تھے۔ دو گاڑیوں میں بھی صاف ستھرے لباس والے مردوزن موجود تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان لوگوں کا تعلق شوبزنس سے تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ اپنے تمام تر سازوسامان کے ساتھ کسی فلم کی شوٹنگ پر نکلے ہوں۔'' لحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی تو میں نے سوال داغ دیا۔

''اس کے آگے کیا ہوا؟''

''ان میں سے ایک پختہ عمر کا شخص میرے پاس آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا......'' جمشید نے بیان کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم ایک پروڈکشن ہاؤس کی طرف سے ایک ڈرامے کی شوٹنگ کے لیے یہاں آئے ہیں۔ میں پروڈکشن منیجر ہوں۔ نادر شاہ نے یہ بنگلا ہمیں شوٹنگ کے لیے کرائے پر دیا ہے لہٰذا تم گیٹ کھولو تاکہ ہماری گاڑیاں بنگلے کے اندر جاسکیں۔''

نادر شاہ کا منصوبہ کھل کر سامنے آرہا تھا۔ اس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ یہ بنگلا اس نے بیرونِ ملک سے کسی شادی میں شرکت کے لیے آنے والی ایک فیملی کو کرائے پر دے دیا تھا اور اب پتا چل رہا تھا کہ ماں کا بنگلا شوٹنگ لوکیشن کے طور پر اس نے کسی پروڈکشن ہاؤس کو دیا تھا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ مذکورہ ڈراما یونٹ جنید خان کے پروڈکشن ہاؤس سے تعلق رکھتا ہوگا جبھی شاہ جی بڑے تواتر سے محمد علی سوسائٹی میں ''خان ہاؤس'' کے پھیرے لگا رہا تھا اور ایسے ہی ایک پھیرے میں ''نامعلوم افراد'' نے اسے اغوا کرلیا تھا۔ یہ الگ بات کہ بعد میں یونیورسٹی روڈ پر پولیس ان سب کو لے اڑی تھی۔ عظیم نے تو مجھے یہاں تک بتایا تھا کہ اسے اپنے دوست ساجد کی زبانی پتا چلا تھا کہ کوئی اسٹیٹ ایجنٹ جنید خان کے پروڈکشن ہاؤس میں بھاری سرمایہ کاری کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ عظیم کا یہ خیال تھا کہ وہ اسٹیٹ ایجنٹ نادر شاہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا اور تازہ ترین صورت حال بھی اسی جانب اشارہ کررہی تھی۔

یہ تمام تر گمبھیر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور اگلے ہی لمحے میں نے جمشید سے سوال کیا۔ ''پھر تم نے اس پروڈکشن منیجر کو کیا جواب دیا؟''

''میں نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا کہ مجھے تو نادر شاہ نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی لہٰذا میں تمہیں بنگلے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' جمشید نے جواب دیا۔ ''اور سر! یہ حقیقت بھی ہے کہ نادر شاہ نے آپ کو یا مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا پھر میں کسی ڈراما یونٹ کو بنگلے میں کیوں گھسنے دیتا۔''

''تو کیا تمہارے انکار پر وہ لوگ واپس چلے گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا سر!'' جمشید نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''وہ شاہ جی کو برا بھلا کہتے ہوئے لوٹ گئے ہیں۔ میں نے پروڈکشن منیجر کو یہ کہتے بھی سنا کہ کم بخت نادر شاہ کا فون بھی مسلسل آف آرہا ہے۔ میں نے منیجر صاحب کو یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ان کا شاہ جی پولیس کے ہتھے چڑھ چکا ہے اور اس وقت خاصے مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔'' میں نے اسے شاباشی دی۔ ''مجھے نہیں امید کہ پولیس آسانی سے نادر شاہ کو چھوڑے البتہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ مجھے شکار کرنے کے لیے اس غیر ملکی عورت کے ایما پر پولیس نادر شاہ کو آزاد کردے۔''

''سر! اگر نادر شاہ اس ڈراما یونٹ کو اپنے ساتھ لے کر بنگلے پر پہنچ جائے اور مجھ سے ان کے لیے گیٹ کھولنے کو کہے تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' جمشید نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''مجھے سردست یہ ممکن نہیں لگتا اور اس کا ایک سبب بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جیسا کہ ہمارا خیال ہے کہ پولیس نے ماں کے بنگلے کے مختلف حصوں کو بگ کردیا ہوگا یا بنگلے کے بعض مقامات پر ایسے حساس آلات نصب کردیے ہوں گے جو وہاں پر ہونے والی نقل وحرکت کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ کریں گے۔ اس صورت حال میں پولیس وہاں پر کسی کو ڈراما

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

شوٹ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی اور جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے تو......'' میں نے لحاتی توقف کیا پھر دوٹوک انداز میں کہا۔

''اگر ڈراما بنانے والے نادر شاہ کے ساتھ آئیں تو تم ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنو گے۔ نادر شاہ کو تم نے بھی احساس دلانا ہے کہ تم محض ایک سیکیورٹی گارڈ ہو اور اس ڈیوٹی کے ناتے تم اس کا کہا سنتے اور مانتے ہو۔''

''میں سمجھ گیا سر!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں کال ریکارڈ کو ڈیلیٹ کرنا آتا ہے؟''

''جی سر! میں یہ کام کرسکتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''بس، میسیج وغیرہ ٹائپ کرنے میں مجھے الجھن ہوتی ہے اسی لیے میں نے کہا تھا کہ مجھے میسیج کرنا نہیں آتا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جب بھی مجھے مس کال کرو اور جواب میں، میں تمہیں جو کال کروں تو اس کا ریکارڈ فوراً ڈیلیٹ کردیا کرو۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

''جی سر! آپ بے فکر رہیں۔ میں ایسا ہی کررہا ہوں۔'' اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور وہ سامنے والے بنگلے کا کیا حال ہے؟''

''وہاں امن وامان ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بس رات ہی کو مجھے اس بنگلے کی چھت پر کچھ سرگرمی دکھائی دی تھی تو میں نے آپ کو اطلاع دے دی تھی۔''

''اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔'' میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''ہمارا واسطہ انتہائی چالاک، مکار اور عیار لوگوں سے ہے۔''

''جی سر! میں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہے۔''

''اور غلام عباس سے تمہارا کوئی رابطہ ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں نے اس سے بات کرلی ہے اور اسے ساری سچویشن بھی سمجھادی ہے۔ آپ جب اشارہ کریں گے، میں اسے ہوشیار کردوں گا۔ آپ اپنی مرضی سے جتنے دن چاہیں، اس کے پاس قیام کرسکتے ہیں۔ وہاں پر انشاءاللہ آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''جمشید! میں تکلیف سے نہیں گھبراتا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''بس، وہ ٹھکانا محفوظ اور بندہ قابلِ بھروسا ہونا چاہیے۔''

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں سر!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''غلام عباس ایسا ہی بندہ ہے۔ آپ کو اس کے کوارٹر میں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا اور پوچھا۔ ''تمہارا یہ دوست غلام عباس کرتا کیا ہے؟''

''سر! پیشے کے لحاظ سے وہ مشین مین ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایک پرنٹنگ پریس میں کام کرتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس کا موبائل نمبر آپ کو دے دیتا ہوں۔''

''ابھی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جب ضرورت ہوگی تو میں تمہیں بتادوں گا۔''

''اوکے سر!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

جمشید سے سیلولر رابطہ ختم ہوا تو عظیم کا ٹیکسٹ میسج آگیا۔

''برو! ساجد نے جنید خان کے ساتھ تمہاری میٹنگ فکس کردی ہے۔ تمہیں ٹھیک تین بجے سہ پہر خان ہاؤس پہنچنا ہے۔''

میں نے فوراً عظیم کو فون کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔ ''بتاؤ، میں تمہیں کہاں سے پک کروں؟''

''تمہیں میری طرف آنے کی ضرورت نہیں ہے عظیم۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے محمد علی سوسائٹی کا کوئی پوائنٹ بتادو۔ میں تین بجے سے دس منٹ پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''اوکے برو!'' اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔ ''ایم اے سوسائٹی میں ڈرائی فروٹس اینڈ سوئٹس کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔ تم وہاں آجاؤ۔''

''اوکے برادر۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''باقی باتیں وہیں پہنچ کر ہوں گی۔''

''ڈن......!'' وہ حتمی انداز میں بولا۔

بینا کافی دیر سے میرے فارغ ہونے کا انتظار کررہی تھی۔ یہ تمام تر حالات اس کے علم میں تھے۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا کیونکہ اب وہ میری ٹیم کا ایک اہم رکن تھی۔ میں نے سیل فون رکھا تو اس نے پوچھا۔

''تم نے جمشید سے بات کرتے ہوئے سامنے والے بنگلے کا ذکر کیا تھا۔ یہ کیا چکر ہے؟''

اس حوالے سے سحری میں جمشید سے جب میری بات ہوئی تھی اس وقت بینا اپنے بیڈروم میں سورہی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں اسے اپ ڈیٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ڈیلفینا کو یقین ہے کہ میں ابھی کراچی ہی میں موجود ہوں اسی لیے اس نے یہ اہتمام کیا ہے۔ اسے قوی امید ہے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جہانگیر بکس

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/550
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر -/475
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش -/300
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ -/625
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی -/550
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے -/500
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستان مجاہد -/300
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت -/450
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین -/500
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی -/475
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون -/550
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ -/450
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلہ حجاز -/599
راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم -/425
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی -/300
1965 کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنھیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا -/450
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان ہے جس نے اچھوتوں کو رد عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/300
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان -/450
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد -/225
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ -/325
بحر الکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین -/475
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سبق آموز کتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوال حضرت علی المرتضیٰؓ -/165
- اقوال آئمہ کرامؒ -/165
- حکایات گلستان سعدیؒ -/195
- اقوال شیخ سعدیؒ -/140
- حکایات رومیؒ -/180
- دلچسپ و عجیب حقائق -/170
- حکایات بوستان سعدیؒ -/199
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں -/150
- ایمان افروز و سبق آموز واقعات -/180
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات -/165

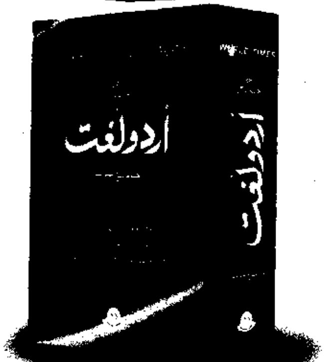

جہانگیر
اردو لغت
(جامع ترین)
ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کا پہلا لغت

جہانگیر بک ڈپو
042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کہ میں اس بنگلے کی طرف ضرور چکر لگاؤں گا۔''

''اور تم ایسی غلطی نہیں کرو گے۔'' وہ استفساریہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہرگز نہیں......!''

''اس بارے میں کوئی ہارڈ اینڈ فاسٹ رول نہیں بنایا جاسکتا۔'' میں نے راست گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں ماں کے بنگلے کی طرف چکر لگا بھی سکتا ہوں۔''

''مطلب یہ کہ تم ''آ بیل مجھے مار'' کا ڈیمو دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہو۔'' وہ نیم طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تم ضرورت پڑنے پر میڈم کے بنگلے کی طرف بھی جاؤ گے جو کہ تمہارے لیے اب ایک چوہے دان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور تم خان ہاؤس جانے سے بھی باز نہیں آؤ گے جہاں تمہارے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے......!''

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ بینا کو میرا بہت خیال تھا۔ یہ ساری باتیں وہ میری حفاظت کے پیش نظر کر رہی تھی لیکن میں اپنے حالات سے مجبور تھا۔ اگر میں ''بچاؤ، بچاؤ'' کی تسبیح پڑھتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف بیٹھ جاتا تو پھر میں اپنے دشمنوں کے لیے تر نوالہ ثابت ہوتا اور میں بزدلی کے اس آخری درجے پر فائز ہونے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔

میں نے بینا کی سوالیہ نگاہ کے جواب میں کہا۔ ''جب اوکھلی میں سر دے دیا تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا!''

''تم اردو محاورے بڑے فراٹے سے بولتے ہو۔'' اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہاں آنے سے پہلے تم نے خوب رٹے لگائے ہیں؟''

''یہ سب انکل سلطان کا احسان ہے۔'' میں نے بینا کو بتایا۔ ''ماں کی خصوصی ہدایت تھی کہ میری تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ مجھے اردو زبان اور پاکستان کے کلچر سے بھی مکمل طور پر روشناس کرایا جائے لہٰذا انکل سلطان اس حوالے سے گھر میں باقاعدہ میری کلاس لیا کرتے تھے۔''

انکل سلطان کے ذکر نے مجھے مغموم کر دیا۔ انکل کے مجھ پر ان گنت احسانات تھے۔ آج میں جو کچھ بھی تھا اس میں غالب ہاتھ انکل سلطان ہی کا تھا۔ وہ میری شخصیت کے معمار تھے۔ انہوں نے میری ذات کو اپنی محنت سے تعمیر کیا تھا اور یہ سب کچھ انہوں نے کسی مالی فائدے کی غرض سے نہیں کیا تھا۔ ان کے پاس مال و دولت کی کوئی کمی نہیں تھی اور اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت وہ اپنے ترکے میں مجھے حصے دار بھی بنا گئے تھے۔ انکل سلطان کی یاد میں میرا دل خون کے آنسو روتا تھا اور مجھے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ زندگی کے آخری لمحات میں، میں ان کے پاس نہیں تھا۔ یہ من موجی وقت کسی سیلِ رواں کے مانند انسان کی زندگی پر اپنے اچھے یا برے اثرات چھوڑتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے......!

میں نے بینا کو اپنے حالات کے بارے میں تقریباً سبھی کچھ بتا رکھا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ انکل سلطان کی یاد نے مجھے افسردہ کر دیا ہے۔ مزید بحث مباحثے کو ایک طرف رکھ کر اس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''تم مجھے تو اپنے ساتھ ''خان ہاؤس'' لے جانے کے حق میں نہیں ہو اور عظیم کو بھی تم نے آنے سے منع کر دیا ہے۔ تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟ جنید خان سے ملنے کس طرح پہنچو گے؟''

''میں نادیہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ مجھے وہاں ڈراپ کر کے واپس آجائے گی۔''

''چلو، نادیہ سے بات کرتے ہیں۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''دیکھتے ہیں، آفٹرنون میں اس کی کیا مصروفیت ہے۔''

ہم دونوں بیڈروم سے نکل کر سٹنگ روم میں آگئے۔ نادیہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ بینا نے اس سے پوچھا۔

''آفٹرنون میں تم کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ ''میں آج کا دن بالکل فری ہوں۔ بس آج کی تاریخ میں مجھے اپنی گاڑی نرسری کے علاقے میں ڈراپ کرنا ہے۔ تم جانتی ہو کہ یہ گاڑی مجھے بینک نے دے رکھی ہے۔ میں جب یہاں سے جا رہی ہوں تو گاڑی واپس کرنا لازمی ہے۔ خیر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ مجھ سے کوئی کام تھا کیا؟''

میں نے مختصر الفاظ میں نادیہ کو اپنے مقصد سے آگاہ کیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ محمد علی سوسائٹی، نرسری سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ میں پہلے تمہیں ڈراپ کروں گی۔ بتاؤ، ہمیں یہاں سے کتنے بجے نکلنا ہے؟''

''مجھے پونے تین بجے تک اسٹور پر پہنچنا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''باقی کا حساب تم خود لگا لو۔''

''یہ بمشکل پندرہ منٹ کا راستہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن پھر بھی احتیاطاً ہم سوا دو بجے گھر سے نکلیں تاکہ کسی ٹریفک جیم میں پھنس کر تم لیٹ نہ ہو جاؤ۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"اوکے!" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

بینا نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی پھر ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "زیادہ وقت نہیں ہے۔ تم لوگ فوراً تیار ہو جاؤ۔"

میں اور نادیہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے۔

ہم سٹنگ روم سے اٹھ کر دوبارہ بیڈروم میں آگئے۔

میں اپنے ساتھ امریکا سے ایک مختصر سا سفری بیگ لے کر آیا تھا جس میں میرا لیپ ٹاپ اور چند کپڑے تھے لیکن ماں کے زیورات کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو میں نے یو ایس ڈی (امریکی ڈالرز) میں تبدیل کروا کے اسی بیگ میں رکھ لیا تھا اور یہ پیسے ابھی تک میرے بیگ میں محفوظ تھے۔ بینا پر میں چونکہ مکمل بھروسا کرتا تھا اس لیے وہ بیگ میں نے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"اسے تم حفاظت سے اپنے پاس رکھنا۔ میں آج کی رات "خان ہاؤس" پر گزارنے کے ارادے سے جا رہا ہوں۔ کل واپس تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

"اللہ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔" وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنائیت بھرے لہجے میں بولی۔ "تمہاری چیزوں کا تحفظ میں دل و جان سے کروں گی۔"

ہمارے بیچ مستقبل کے حالات کے بارے میں مختلف زاویوں سے بات ہوتی رہی پھر ٹھیک سوا دو بجے میں نادیہ کی ہمراہی میں بینا کے اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ راستے بھر میرے اور نادیہ کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے اپنا کانٹیکٹ نمبر بھی شیئر کر لیا۔

میں نے اس کے ذہن میں ایک بات بٹھا دی۔

"اگر کبھی تمہیں میرا نمبر آف ملے یا میں کسی وجہ سے تمہاری کال اٹینڈ نہ کروں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے ٹیکسٹ میسیج کر دینا۔ میں بعد میں تم سے رابطہ کر لوں گا۔"

"اوکے ڈیئر! اٹس نارمل۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ "میں بھی جب کسی خاص پروجیکٹ پر کام کر رہی ہوتی ہوں تو اپنا سیل فون آف کر دیتی ہوں لیکن یہ تو تمہارا یہاں کا نمبر ہے۔ کیا تم اپنا جدہ والا کانٹیکٹ نمبر مجھے نہیں دو گے۔ کبھی عمرہ کی غرض سے اگر میرا سعودی عرب جانا ہوا تو تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"ان شاء اللہ...... ضرور!" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "تمہاری دوست بینا میرے ساتھ ہی ہے۔ تمہیں بینا سے میرا وہاں کا نمبر مل جائے گا۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ میں جدہ میں کبھی نہیں رہا تھا اس لیے میرے پاس وہاں کا کوئی نمبر تھا ہی نہیں اور امریکا والا نمبر میں نادیہ کو دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس وقت جس نوعیت کے ہنگامی حالات سے گزر رہا تھا اس میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

"اٹس اوکے۔" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

"میں بینا سے مسلسل رابطے میں رہوں گی۔ اس سے تمہاری خیر خبر بھی ملتی رہے گی۔ ویسے تم نے بینا سے میری دوستی کا حوالہ دیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے مگر میں بھی تمہیں اپنا دوست ہی سمجھتی ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو کبھی آزما کر دیکھ لینا۔ میں نے تمہیں اپنا جان کر پچھلی رات اپنی زندگی کے اہم گوشے تم سے ڈسکس کیے ہیں۔"

"مجھ پر اعتماد کرنے کا شکریہ نادیہ!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میں اپنے دوستوں کو آزماتا نہیں ہوں۔ آئندہ کبھی مجھ سے ایسی بات نہیں کرنا۔"

"اوکے۔ میں اس بات کا خیال رکھوں گی۔" وہ محمد علی سوسائٹی کے ایک پر رونق حصے میں گاڑی روکتے ہوئے بولی۔ "علی! تمہاری منزل آگئی......"

میں نے گاڑی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ میں نے الوداعی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔

"جدائی کا وقت آگیا نادیہ۔"

"میں اسے رخصت کا وقت کہوں گی۔" وہ معتدل انداز میں بولی۔ "دو دوستوں کے بیچ "جدائی" کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔"

"تم نے بڑی گہری اور وزنی بات کی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی بات کی طرح بہت گہری ہو......"

"اب یہ نہیں کہہ دینا کہ میں اپنی بات کی طرح وزنی بھی ہوں۔" وہ شرارت بھرے انداز میں بولی۔

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہرگز نہیں ہے لیکن......"

میں نے جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔ "لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ...... تمہیں وزنی ہونے کے بارے میں سوچنا ضرور چاہیے۔"

وہ بے اختیار ہنس پڑی پھر معنی خیز انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہے، میں تمہاری پسند کا خیال رکھوں گی۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب ہماری دوبارہ ملاقات

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہوتو میں تمہیں پہچان بھی نہ پاؤں......'' میں نے بھی اسی کی طرح ذومعنی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر کھل کھلا اٹھی۔ اس کے بعد نادیہ نے گاڑی سے باہر نکل کر اپنایت بھرے انداز میں مجھے الوداع کہا اور وہاں سے رخصت ہوگئی۔

اگلے ہی لمحے عظیم کی گاڑی میرے برابر آ کر لگی پھر اس نے میرے لیے پسنجر سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ میں نے گاڑی کے اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وھاٹ اے ٹائمنگ......!''

''برو! میں پندرہ منٹ پہلے ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔'' وہ گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں اس لونڈیا کے ساتھ یہاں آتے اور باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ تم اسے فارغ کر دو تو میں تمہارے پاس آؤں مگر یہ کیا چکر ہے برو......؟''

آخری جملہ اس نے بڑے عجیب انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کون سا چکر میرے دوست؟''

''بھئی! پہلے تم بینا کے ساتھ نظر آ رہے تھے اور اب اس چشما ٹوگرل کے ہمراہ دکھائی دیے ہو۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا اس حسینہ سے بھی تم نے یاری گانٹھ لی ہے؟''

عظیم نے نادیہ کے لیے ''چشما ٹو'' کا لفظ اس کے گلاسز کی وجہ سے استعمال کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا۔ ''یہ نادیہ ہے۔ بینا کی بیسٹ فرینڈ۔ یہ مجھے یہاں ڈراپ کرنے آئی تھی۔''

''اور بینا کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ گھر پر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہو......'' وہ چھیڑنے والے انداز میں بولا۔ ''ایک گھر پر، دوسری باہر ساتھ ساتھ۔ یہ تو ''گھر والی، باہر والی'' والا معاملہ ہوگیا۔''

''کیا بات ہے عظیم! آج خواتین کے حوالے سے تم کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کہیں تمہیں بھی گھر والی تو یاد نہیں آ رہی؟''

''ارے یار! تم نے خوب یاد دلایا۔'' وہ چونکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میری گھر والی امریکا سے واپس آ رہی ہے۔ ابھی رات ہی کو میری اس سے بات ہوئی ہے۔''

''مبارک ہو......!'' میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔

''تمہاری زندگی میں بہار آنے والی ہے۔''

''تازہ ترین حالات کس طرف جا رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس کے سامنے صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''لمحہ بہ لمحہ حالات کی سنگینی میں اضافہ ہو رہا ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔ ''اگر تم کہو تو میں ارباب سے بات کرتا ہوں۔''

ارباب، عظیم کا پھوپی زاد تھا اور محکمہ پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ میں عظیم کی بات کو سمجھ تو گیا تھا تاہم تصدیق کی خاطر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''تم کس سلسلے میں ارباب سے بات کرنا چاہتے ہو؟''

''یار! میرا اشارہ تمہاری طرف ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تم اس وقت خطرناک قسم کے بین الاقوامی تنظیمی افراد میں گھرے ہوئے ہو اور یہاں کی پولیس بھی تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ ان حالات میں ارباب تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ وہ پولیس والا ہے، کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لے گا۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میری تم سے درخواست ہے کہ اس سلسلے میں تم ارباب سے کوئی بات نہیں کرو گے بلکہ اگر وہ تم سے میرے بارے میں کچھ پوچھے بھی تو تم کہہ دینا، میں تمہارے رابطے میں نہیں ہوں اور یہ کہ...... تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''

''تم ایسا کیوں کر رہے ہو برو؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیا تمہیں ارباب پر بھروسا نہیں ہے؟''

''عظیم! بات بھروسے کی نہیں ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ پچھلے دنوں ارباب نے کئی مواقع پر میری مدد کی ہے لیکن اب یہ معاملہ ہائی لیول پر پہنچ چکا ہے۔ ارباب میرے لیے کچھ نہیں کر سکے گا بلکہ اس کے بیچ میں رہنے سے وہ میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' وہ جوش بھرے انداز میں بولا۔ ''تم ارباب کے حوالے سے بالکل غلط سوچ رہے ہو۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''ارباب پر تمہارے اعتبار کو میں چیلنج نہیں کروں گا لیکن میری بات کو غور سے سنو......'' میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میرے معاملات اس وقت سنگینی کے جس درجے پر پہنچ چکے ہیں اس میں سرکاری محکمے سے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص حتیٰ کہ خود سرکار بھی مجھے تحفظ فراہم کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔ تم نے جن بین الاقوامی تنظیمی افراد کا ذکر کیا ہے وہ تمہاری سوچ سے کہیں زیادہ طاقتور اور بااثر ہیں۔ ان کی مانگوں کو بڑی بڑی حکومتیں بھی رد نہیں کرسکتی ہیں۔ وہ جو مانگ لیتے ہیں، دینا پڑتا ہے۔"

"تم نے ایسا کون سا چاند چڑھایا ہے جو وہ تمہیں مانگ لیں گے؟"

"میں نے چاند، ستارے، سورج...... سب کچھ ہی چڑھا دیا ہے۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس لیے میری مانگ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ تم سے بھی میری یہی درخواست ہے کہ کچھ دنوں کے لیے مجھ سے دور رہو۔ میں تمہیں کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اگر بہت ضروری ہوا تو میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔ امید ہے، تم میرے اس مشورے پر ضرور عمل کرو گے۔"

"او کے برو!" وہ میرے سامنے سپر ڈالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تم اپنے معاملات کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔ تم نے موجودہ حالات کی سنگینی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں تمہارا مشورہ درست نظر آتا ہے لیکن میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا خاموشی سے یہ تماشا دیکھتا رہوں، اس سے بڑی بزدلی اور کیا ہوگی۔"

"یہ بزدلی نہیں، دانش مندی ہے میرے دوست۔" میں نے اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میدان جنگ کو دیکھتے ہوئے حکمت عملی تیار کی جاتی ہے۔ دشمن پر فتح حاصل کرنے کے لیے بھی دو قدم پیچھے ہٹنا پڑتا ہے اور بھی دو قدم آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ یہ سمجھو کہ تم بھی چند روز کے لیے بیک فٹ پر چلے گئے ہو۔ کیا سمجھے......؟"

"سمجھ گیا برو!" وہ ساجد کے بنگلے کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ "خان ہاؤس میں تو میں تمہارے ساتھ جارہا ہوں نا؟"

"نہیں!" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تم اپنے دوست ساجد محمود کو باہر بلاؤ۔ میں اس کے ساتھ واک کرتے ہوئے "خان ہاؤس" کی طرف جاؤں گا اور جنید خان سے ملوانے کے بعد ساجد بھی وہاں سے اٹھ جائے گا۔ میں جنید خان سے ون ٹو ون ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

میرے قطعی انداز کو دیکھ کر عظیم خاموش ہوگیا۔

☆☆☆

جنید خان کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ وہ ایک دراز قامت، ہینڈسم اور اسمارٹ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی سرخی پائی جاتی تھی جس نے اس کی شخصیت کو خاصا دلکش بنا دیا تھا۔ اس نے مناسب سائز کی بارعب مونچھیں بھی رکھ چھوڑی تھیں جو اس کے چہرے پر بڑی بھلی لگتی تھیں۔ ہماری ملاقات اس کے آفس کے لیے مخصوص ایک کمرے میں ہوئی تھی جس میں ایک صوفہ کم بیڈ کے علاوہ وزیٹرز کے لیے آرام دہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ قصہ مختصر، وہ ایک شاندار آفس تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد جب عظیم کی ہدایت کے مطابق ساجد اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہوگیا تو میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"خان صاحب! میرا نام یاسر بیگ ہے اور میں امریکا کی ریاست ٹیکساس کے شہر لیک جیکسن میں رہتا ہوں۔ ایک عزیز کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے میں اسلام آباد آیا ہوا تھا تو اپنے ایک قریبی دوست عظیم سے ملنے کراچی چلا آیا۔ ہمارے درمیان شو بزنس کے موضوع پر بات چیت کا سلسلہ جاری تھا کہ میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے عظیم نے کہا کہ میں تمہیں ایک تجربہ کار پروڈیوسر سے ملواتا ہوں۔ ساجد، عظیم کا دوست ہے۔ اس طرح میں عظیم سے ساجد اور ساجد سے آپ کے پاس پہنچ گیا۔"

"آپ ادھر امریکا میں کیا کرتے ہیں؟" جنید خان نے مجھ سے پوچھا۔

"اپنا بزنس ہے۔" میں نے اعتماد بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "میں ہوٹل لائن میں ہوں۔ لیک جیکسن میں میرا ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے۔"

"ویری گڈ۔" وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو شوبز میں سرمایہ کاری کا خیال کیوں آیا اور وہ بھی پاکستان میں۔ یہ کام آپ ادھر امریکا میں زیادہ بہتر انداز میں کرسکتے ہیں۔"

جنید خان نے بڑا اہم نکتہ اٹھایا تھا مگر میں نے بھی اس کا سامنا کرنے کے لیے اچھا خاصا ذہنی ہوم ورک کر رکھا تھا۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"خان صاحب! پہلی بات تو یہ کہ شو بزنس کا شوق میرا نہیں بلکہ دراصل یہ میرے والد مرحوم نواز بیگ کا خواب تھا۔ انہیں اس کام کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ان کے دل میں فلم بنانے کی شدید خواہش تھی لیکن سرمائے کی عدم دستیابی کے باعث وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔ افسوس کہ والد صاحب یہ تمنا دل میں لے کر اس دنیا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے رخصت ہو گئے......'' میں نے افسردگی کی اداکاری کرتے ہوئے لمحاتی توقف کیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں اضافہ کیا۔

''والد صاحب کے انتقال کے بعد میں امریکا چلا گیا تھا۔ میں نے وہاں دن رات محنت کی اور اللہ نے مجھے اس محنت کا صلہ بھی دیا۔ آج میرے پاس مالک کا دیا سب کچھ ہے اور میں گرین کارڈ ہولڈر بھی ہوں۔ پیسے کی ریل پیل ہے اس لیے میں اپنے مرحوم والد کی خواہش کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک فلم بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جتنا بھی پیسا خرچ ہو، میں ہاتھ نہیں روکوں گا۔ اب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کام پاکستان میں زیادہ اچھے انداز میں ہوسکے گا۔''

''بالکل سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی یہ خواہش تو کما حقہ، پوری ہوجائے گی کہ ہر دوسرے یا تیسرے سین میں بیگ صاحب دکھائی دیں لیکن اس سلسلے میں آپ کو ایک مفید مشورہ دینا چاہوں گا......''

''کیسا مشورہ خان صاحب؟'' میں نے چونک کر جنید خان کی جانب دیکھا۔

''جہاں تک میرے مشورے کی بات ہے تو میں یہی کہوں گا کہ فلم بنانے کا خیال دل سے نکال دیں۔''

''کیوں؟'' میں نے چہرے پر حیرت کے تاثرات سجاتے ہوئے کہا۔

''وہ اس لیے کہ ابھی پاکستان میں فلم کا وہ اسکوپ نہیں رہا جو ماضی میں ہوا کرتا تھا۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس وقت اگر آپ کی پشت پر تین چار بڑے مارکیٹنگ کے ادارے کھڑے نہ ہوں تو اپنی لاگت کو پورا کرنا بھی مشکل ہے اور اس سلسلے میں سیلف پروڈکشن تو سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' میں نے الجھن بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا تو مشورہ یہی ہے کہ آپ ٹی وی کے لیے طویل سیریل بنانے کے بارے میں سوچیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ایک سو اپی سوڈ کا ایک مکمل سیریل۔''

''آئیڈیا برا نہیں ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ کا کراچی میں کتنے دن کا قیام ہے؟''

''کوئی ایشو نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کہیں گے تو میں ایک ماہ بھی رک سکتا ہوں۔''

''بس تو پھر میں آپ کو بیگ صاحب سے ملواتا ہوں اور بڑے بڑے سپر اسٹار سے بھی۔''

''نائس آئیڈیا!'' میں نے توصیفی نظر سے جنید خان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اتنے بڑے بڑے لیجنڈ سے ملاقات کرنا میرے لیے باعثِ افتخار ہوگا۔''

اسی لمحے میرے سیل فون پر جمشید کی مس کال ابھری۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے جنید خان سے پوچھا۔

''سو اپی سوڈ والے ڈراما سیریل پر کتنا خرچہ آجائے گا؟''

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، میرے سیل فون پر دوبارہ جمشید کی مس کال موصول ہوئی۔ میں نے اس بار بھی اسے اگنور مار دیا۔

''اوسطاً ایک اپی سوڈ پر پانچ لاکھ کا خرچہ ہے۔'' جنید خان نے بتایا۔ ''اس حساب سے سو اپی سوڈ کے اخراجات پانچ کروڑ روپے بنتے ہیں یعنی پانچ لاکھ امریکی ڈالرز۔''

''اور اس انویسٹمنٹ پر پرافٹ مارجین کتنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''دو کروڑ روپے۔'' جنید خان نے جواب دیا۔ ''یعنی پانچ کروڑ کی لاگت سے تیار ہونے والا سیریل سات کروڑ میں بہ آسانی فروخت ہوجائے گا۔ منافع کے دو کروڑ میں سے ایک کروڑ آپ کا اور ایک کروڑ میرا۔''

میں نے پوچھا۔ اس سیریل کو تیار ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟''

جنید خان کے جواب سے قبل میرے سیل فون پر تیسری مرتبہ جمشید کی مس کال نمودار ہوئی۔ اب کی بار میں نے اسے نظر انداز کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے فوراً اس کے نمبر پر فون کیا۔

اس نے پہلی ہی گھنٹی پر میری کال ریسیو کرلی پھر گھبرائی ہوئی آواز میں اس نے اپنے منہ سے جو پہلا جملہ ادا کیا اسے سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔

میں بیٹھے بٹھائے ایک بڑی پریشانی میں گھر گیا تھا......

امنگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جب مارلن ہیریسن نے فیکٹری کی ملازمت اختیار کی تو اسے امید تھی کہ وہ اپنی قابلیت اور ذہانت کے بل بوتے پر بہت جلد ترقی کی منازل طے کرے گا لیکن دو سال گزر جانے کے باوجود بھی اس کا یہ خواب پورا نہیں ہوا اور اس مرتبہ بھی یہ امید دم توڑتی ہوئی نظر آرہی تھی کیونکہ اس روز درخواست جمع ہونے کی آخری تاریخ تھی اور ابھی تک سپروائزر نے اس پر دستخط نہیں کیے تھے۔ وہ اس سلسلے میں اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔

ہم سفر

شاہ زین رضوان

جس طرح انسان ایک جرم کی پردہ داری میں مزید کتنے ہی جرم کرجاتاہے۔اسی طرح کوئی کسی جرم کا چشم دیدگواہ ہونے کے باوجود اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں خود بھی ظلم وستم کا شکار ہوتا رہتاہے... کچھ یہی حال ان لوگوں کا بھی تھا جن کے سامنے مجرم دندناتا پھر رہا تھا مگر انہیں اپنی زندگی بچانے کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہم سفر کی تلاش بھی پریشان کررہی تھی۔

کٹھن حالات میں بھی خوشی کے متلاشی انسانوں کا ماجرا

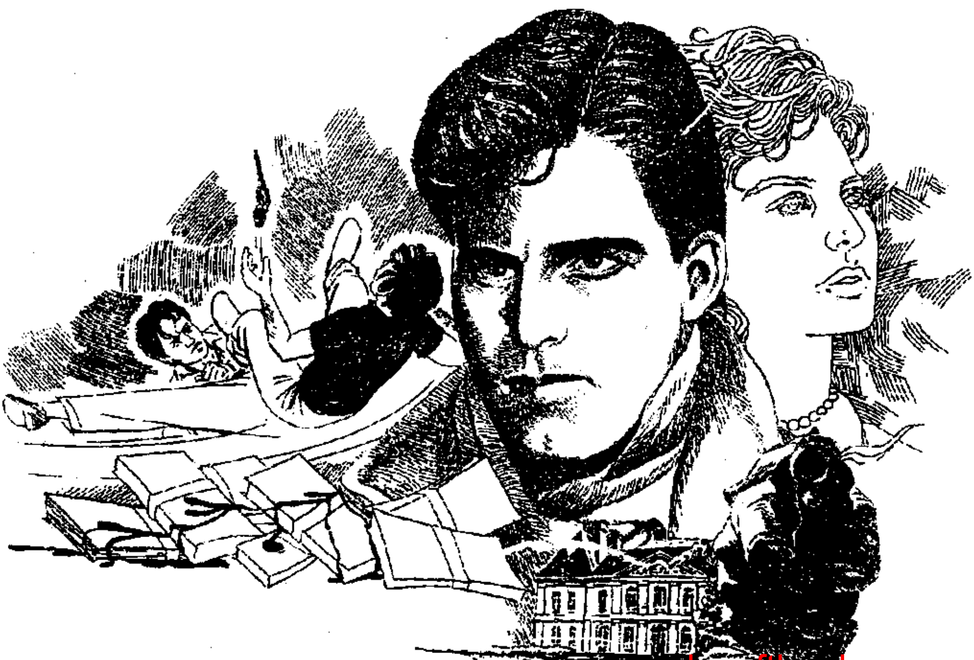

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس کا سپروائزر بھی موت اور ٹیکس کی طرح ناقابلِ اعتبار تھا۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے خوشگوار کہا جاسکے۔ روزانہ شفٹ شروع ہوتے وقت وہ اپنے کمرے میں کافی پیتے ہوئے اپنے ماتحتوں کو اذیت دینے کی منصوبہ بندی کیا کرتا۔ مارلن کی کوشش تھی کہ وہ اسے صبح کی میٹنگ سے فارغ ہوتے ہی پکڑ لے لیکن وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔

مارلن جھجکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ پال کا کپ اپنی جگہ رکھا ہوا تھا لیکن اس میں بچی ہوئی کافی نہیں تھی۔ اسی طرح کمپیوٹر مانیٹر بھی بند پڑا ہوا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا کہ کہیں پال اسے نہ دیکھ لے لیکن وہ موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ پال نے اس کی درخواست پر دستخط کیے یا نہیں جو اس نے پروڈکشن لیڈر کے عہدے پر ترقی پانے کے لیے دی تھی۔ کیونکہ یہ عہدہ منیجر سے کئی درجے نیچے تھا لیکن اسے کم از کم ایک درجہ ترقی مل جاتی۔ مارلن نے پال کی میز پر رکھی ہوئی فائلوں کو کھنگالنا شروع کردیا جن میں مختلف قسم کی رپورٹس، چھٹی کی درخواستیں اور شفٹ شیڈول وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اسی دوران فائل میں سے ایک لاٹری کا ٹکٹ نکل کر زمین پر گر پڑا۔ مارلن نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ اس کی قرعہ اندازی ہوچکی تھی اور اس پر کوئی انعام نہیں نکلا تھا۔ مارلن نے فولڈر کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک درجن لاٹری ٹکٹ پن کیے ہوئے رکھے تھے۔

مارلن کے پاس ان باتوں پر غور کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے فائل میں سے اپنی درخواست نکالی اور اس کے صفحہ دو کو دیکھا، اس پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔ اچانک اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے پال نے اسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہے۔ اس کے پاس اپنی وضاحت میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

''گھبراؤ نہیں، یہ میں ہوں۔'' ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا، جولین کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ ایک جوان عورت اس فیکٹری میں کسی خوشبو یا تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند تھی۔ اسے دیکھ کر مارلن اکثر سوچا کرتا کہ اگر وہ پندرہ سال بڑی یا وہ خود پندرہ سال چھوٹا ہوتا تو ان کی جوڑی کتنی اچھی لگتی لیکن عمر کے اس فرق کو دور کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

''مالکان کا منہ چڑھا ملازم کہاں ہے؟'' جولین نے پوچھا۔

''تعجب کی بات ہے کہ وہ اس وقت اپنے کمرے میں نہیں ہے۔'' مارلن نے جولین کو اس کی درخواست پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے ابھی تک ہماری درخواستوں پر دستخط نہیں کیے ہیں۔''

''اور آج درخواست جمع کروانے کا آخری دن ہے۔'' جولین نے میز کے کنارے پر ٹکتے ہوئے کہا۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گی جب تک وہ احمق شخص میری درخواست پر دستخط نہیں کردیتا۔''

اس نے دروازے کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ''آڈیشن کیسا رہا؟ کیا تمہیں وہ رول مل گیا جو تم چاہ رہے تھے؟''

''ابھی مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

اگر سن شائن سیلز نامی کمپنی میں مارلن کا کیریئر آگے نہیں بڑھ رہا تھا تو اسے اداکاری کے شعبے میں بھی کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اسے کبھی کبھار مقامی تھیٹر پروڈکشن میں چھوٹے موٹے کردار مل جاتے تھے لیکن مرکزی کردار کرنے کے امکانات معدوم ہوتے جارہے تھے۔

''تم نے تو بادشاہ کے کردار کے لیے آڈیشن دیا تھا؟''

''ہاں۔ میں یہ کردار ادا کرنے کا شدت سے خواہش مند تھا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ تیس سال کا تھا اور میں اس سے تھوڑا سا بڑا ہوں۔''

عین اس وقت اس کے پیجر پر ایک آواز ابھری اور وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آتے ہوئے بولا۔ ''بہتر ہے کہ ہم اپنے کام پر چلے جائیں۔''

''ہاں، ایک منٹ رکو۔'' وہ اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یہاں کام کرتے ہوئے تین سال ہوگئے ہیں اور میں نے آج پہلی بار باس کو چھٹی کرتے دیکھا ہے اور وہ بھی اس دن جب ہمیں اپنے کاغذات پر اس کے دستخطوں کی ضرورت تھی۔ مجھے تو اس میں کوئی سازش نظر آرہی ہے۔''

''اس کا ہمیں فائدہ بھی ہوسکتا ہے۔'' مارلن نے کہا۔ ''شاید پال کا ارادہ ہماری درخواستوں پر دستخط کرنے کا نہ ہو لیکن اس کی غیر حاضری میں ہیومن ریسورس والے انہیں قبول کرنے سے کیسے انکار کرسکتے ہیں۔''

''کوشش کرکے دیکھ لو۔''

لوہے کا ایک بھاری دروازہ فیکٹری کو فرنٹ آفس سے جدا کرتا تھا۔ اس سے گزرتے ہی مارلن کو محسوس ہوا کہ وہ کسی دوسری دنیا میں آگیا ہے۔ ٹھنڈے ماحول میں صرف ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن ہیومن ریسورس کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سربراہ اسٹیسی ڈرومنڈ کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔
''وہ یہاں نہیں ہے۔اب کیا کریں؟'' جولین نے کہا۔
''ہم انتظار کرلیتے ہیں۔'' مارلن استقبالیہ کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
جولین کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ چند منٹوں بعد اسٹیسی بھی آگئی۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔''تم دونوں یہاں کیا کررہے ہو؟''
''تمہارا انتظار۔'' مارلن بولا۔
''کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔
جولین اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔''تمہیں یہ درخواست جمع کروانی ہے۔''
اسٹیسی نے اس کے ہاتھ سے درخواست لےکر صفحہ پلٹا اور بولی۔''اس پر تمہارے سپروائزر کے دستخط نہیں ہیں۔''
''پال آج نہیں آیا۔'' مارلن نے کہا۔''اس کی غیر حاضری میں تم دستخطوں کے بغیر بھی یہ کاغذات لے سکتی ہو۔''
اسٹیسی اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے بولی۔''میں سپروائزر کے دستخط کے بغیر یہ درخواست قبول نہیں کرسکتی۔ دوسری بات یہ کہ پال کی کار عقبی پارکنگ میں موجود ہے۔''
''ہم نے اسے نہیں دیکھا۔'' جولین بولی۔''وہ دفتر میں بھی نہیں ہے۔''
''تم نے اس لیے نہیں دیکھا کہ کام پر جانے کے بجائے یہاں آگئی ہو۔''
جولین کچھ بولنے والی تھی لیکن مارلن نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور بولا۔''ہم اس کے کمرے میں رپورٹ کرنے گئے تھے لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ حالانکہ وہ ہم سے پہلے آجاتا ہے۔''
''ہمیں پریشانی ہورہی ہے۔'' جولین نے کہا۔
''اگر تم اس کے معمولات کے بارے میں جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ صبح میٹنگ میں ہوتا ہے۔ تمہارے پاس اس سے دستخط کروانے کے لیے پانچ بجے تک کا وقت ہے۔''
وہ دونوں منہ لٹکائے واپس آگئے۔ انہوں نے پال کے کمرے میں داخل ہوکر ادھر ادھر دیکھا پھر جولین بولی۔
''وہ ابھی تک نہیں آیا۔''
''شاید اسٹیسی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ وہ معمول کے مطابق صبح کی میٹنگ میں ہوگا۔''
جولین بولی۔''مجھے شبہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر غائب ہوگیا ہے تاکہ درخواست دینے کا وقت گزر جائے اور ہم اسی طرح اس شیطان کی ماتحتی میں کام کرتے رہیں۔''
مارلن نے دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف دیکھا جس پر ان کی چھٹیوں اور دیر سے آنے کے نشانات نام کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔
''وہ اپنی حاضری کہیں نہیں لگاتا۔'' جولین نے کہا۔
اور اسے ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ وہ تو کبھی دیر سے آتا ہے اور نہ ہی کبھی چھٹی کرتا ہے۔''
''پھر وہ کہاں ہے؟'' اس نے دو درازوں والے فائل کیبنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''تم ذرا باہر نظر رکھنا۔''
وہ نیچے کی طرف جھکا اور ایک پیپر کلپ سیدھا کرنے لگا۔''مارلن.....'' جولین سرگوشی میں بولی۔''یہ تم کیا کررہے ہو؟ پال کسی بھی وقت آسکتا ہے۔''
''مجھے یقین نہیں کہ وہ کافی پیے بغیر میٹنگ میں گیا ہوگا۔ وہ کبھی معمول سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کرتا۔ شاید اس نے ڈائری میں آج کا پروگرام لکھا ہو۔ وہ یہ کام باقاعدگی سے کرتا ہے اور وہ ڈائری تالے میں بند ہوتی ہے۔''
یہ کہہ کر اس نے پیپر کلپ دراز کے سوراخ میں ڈالا تو تالا کھل گیا۔ اس نے ڈائری نکالی اور میز پر رکھ کر اس کے صفحے پلٹنے لگا۔''صبح میں اس کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔''لیکن دوپہر کا کھانا ٹوڈ کے ساتھ کھائے گا۔''
''تم مذاق کررہے ہو۔'' جولین نے مارلن کے کندھے پر جھکتے ہوئے کہا۔''یہ ٹوڈ کون ہے؟''
مارلن ڈائری کے صفحے پلٹتا رہا۔''اب کیا کررہے ہو؟'' جولین نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔
''تم دروازے پر نظر رکھو۔'' مارلن نے کہا۔ ڈائری کے صفحات کے درمیان میں ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ مارلن نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک کارڈ پر لکھا تھا۔''تم نے پیداوار میں اضافے کے لیے ہر ہفتے اوزار تیز کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی، کمپنی اسے منظور کرتے ہوئے تمہیں پچاس ڈالرز انعام میں دے رہی ہے۔''
''یہ آئیڈیا میرا تھا۔'' مارلن نے کہا۔''اس نے اپنے نام سے جمع کرکے پچاس ڈالرز جیب میں رکھ لیے جو میرا حق بنتا تھا۔''
''ایک منٹ۔'' جولین نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''کوئی آرہا ہے۔''
مارلن نے جلدی سے ڈائری دراز میں رکھی اور دیوار

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پر لگے کیلنڈر کی طرف دیکھنے لگا۔

"سب لوگ کہاں ہیں؟" بک ایلڈر نے اپنا بھاری بھرکم بازو کمرے کی دیوار پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں ورک اسٹیشن پر گیا تھا لیکن وہاں کوئی نہیں ملا۔"

"ہم یہاں ہیں بک۔" جولین نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں تمہیں اور مارلن کو تو دیکھ رہا ہوں لیکن باس نظر نہیں آرہا۔"

"وہ یہاں نہیں ہے۔" جولین نے کہا۔ "تم سگریٹ پیو۔ پال آئے گا تو میں تمہیں فیکٹری پر اطلاع کردوں گی۔"

بک تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ "تم دونوں یہاں کیا کررہے ہو؟ کیا تمہیں کسی چیز کی تلاش ہے؟" وہ باہر جھانکتے ہوئے بولا۔ "پال بھی دیر سے نہیں آتا۔"

وہ مشتبہ انداز میں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مارلن نے ایک بار پھر دراز سے ڈائری نکال لی۔ "کیا تم واقعی کوئی خطرہ مول لینا چاہتے ہو؟ پال کسی وقت بھی یہاں آسکتا ہے۔ اسے یہیں کہیں ہونا چاہیے۔" جولین نے کہا۔

"بالکل......لیکن وہ ہے کہاں؟" مارلن نے پوچھا۔

اس نے ڈائری دراز میں رکھی اور بولا۔

"اگر وہ ہمارے ساتھ کوئی گیم کھیل رہا ہے تو میں قسم کھاتا ہوں کہ اسے جان سے ماردوں گا۔"

"میں نے سن لیا ہے۔" ایک منمناتی ہوئی آواز آئی۔

مارلن اور جولین نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے پر اودون کھڑا ہوا تھا۔

"تم سب سن لیتے ہو۔" جولین نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم سارا دن یہی کام کرتے ہو۔ ادھر ادھر گھومنا اور جاسوسی کرنا۔"

"کسی کو تو تم لوگوں پر نظر رکھنی ہے۔ تم لوگ مسٹر پال کے کمرے میں کیا کررہے ہو؟"

"ہم اس کا انتظار کررہے ہیں۔ میرا خیال ہے تمہیں ضرور معلوم ہوگا کہ وہ اس وقت کہاں ہے کیونکہ تم اس کی جیب میں رہتے ہو۔"

اودون ناک چڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس کی کار پارکنگ میں کھڑی ہے اور وہ جب بھی ملا تو میں ضرور بتاؤں گا کہ تم نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے۔"

"وہ تو میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔" مارلن بولا۔

"یونہی تم نوکری سے بھی فارغ ہوسکتے ہو۔" اودون نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد مارلن بولا۔ "ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ بہتر ہے کہ اپنا کام شروع کردیں۔"

"ہمارا باس یہاں نہیں ہے۔" جولین بولی۔ "کیوں نہ اس کے آنے تک ہم کچن میں بیٹھ کر آرام کریں۔"

"نہیں، یہ مناسب نہیں ہوگا۔" مارلن نے کہا۔

اسٹین لیس اسٹیل کی میز پر رکھے ہوئے کمپیوٹر پر کاموں کی فہرست ظاہر ہورہی تھی۔ مارلن نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور کام شروع کرنے کی تیاری کرنے لگا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ واٹر کلر پینٹنگ یا کیلکولس میں سے کس کا انتخاب کروں۔" جولین بولی۔

"انہوں نے دونوں کی پیشکش کی ہے۔"

"اتنی بڑی ہونے کے بعد بھی تم ابھی تک یہی سوچ رہی ہو کہ کیا بننا ہے؟"

"میرا خیال تھا کہ تم کامیڈین نہیں بلکہ ایکٹر ہو۔" جولین نے کہا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرسکی۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تم نے اداکاری پر پوری توجہ مرکوز کررکھی ہے جبکہ تم فیکٹری میں ترقی پانے کی کوشش کررہے ہو۔"

"میری الماری میں پھٹے پرانے کپڑے لٹکے ہوئے ہیں۔" مارلن نے کہا۔ "ترقی ہوجائے تو میں آڈیشن پر جانے کے لیے نئے کپڑے خرید سکوں گا۔"

اس سے پہلے کہ جولین کوئی جواب دیتی، کونر آگیا۔ اس کا لمبا سفید کوٹ ظاہر کررہا تھا کہ وہ فیکٹری میں نسبتاً اونچے عہدے پر فائز ہے۔

"ان گیسکٹ کی وجہ سے سیل پر اثر پڑ رہا ہے۔" کونر نے کہا۔ "کل اتنا رش نہیں تھا لیکن آج کی میٹنگ میں اچانک ڈیمانڈ بڑھ گئی۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں کس طرح کام ہورہا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ میز کے نیچے جھانکنے لگا۔ "تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟" جولین نے پوچھا۔

"میں ایک پرانا سانچہ تلاش کررہا ہوں کیونکہ اس وقت گیسکٹ کی ڈیمانڈ ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم اس پرانے سانچے کو پالش کرلیں تو دگنی تعداد میں گیسکٹ تیار کرسکتے ہیں۔ یہ ہماری فہرست میں ہے لیکن اسٹور میں نہیں مل رہا۔"

"یہ تو نہیں ہوسکتا کہ وہ گم ہوگیا ہو۔" جولین بولی۔

"اس کا وزن کم از کم ایک ٹن ہے۔"

"بالکل، مجھے بھی اس کے غائب ہونے پر تعجب ہورہا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہے۔'' کونر نے کہا۔

''ہمیں آج شام سے پہلے یہ کیسکٹ تیار کرنی ہیں۔ اگر وہ مل جائے تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔'' جولین بولی۔

''کیا پال صبح کی میٹنگ میں تھا؟'' مارلن نے پوچھا۔

''نہیں جبکہ ہمیں آج اس کی ضرورت تھی۔'' کونر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔ مجھے بیٹی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔''

''ان انجینئرز کے مزے ہیں۔'' اس کے جانے کے بعد جولین نے کہا۔ ''جب چاہیں آئیں، جب چاہے چلے جائیں جبکہ ہم چھوٹے لوگوں کو پورے وقت کام پر رہنا پڑتا ہے۔''

''تمہارے پاس بھی ایک موقع ہے۔'' مارلن نے ایک کیسکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم پینٹنگ کے بجائے کیلکولس کا انتخاب کرلو۔''

''تم چاہتے ہو کہ میں آرٹ کے بجائے کامرس کو ترجیح دوں۔ تم سے اس مشورے کی توقع نہیں تھی۔''

''اگر میرا کوئی سرپرست ہوتا تو میں بھی یہاں کام کرنے کے بجائے تھیٹر کو ترجیح دیتا اور اس عمر میں مجھے کوئی پچھتاوا نہ ہوتا۔ اسی لیے میں نے تمہیں کیلکولس لینے کا مشورہ دیا ہے۔''

جولین نے اس کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ''تمہاری عمر اتنی زیادہ بھی نہیں ہے۔''

مارلن کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اسے یقین ہو گیا کہ جولین کو اس سے تعلق استوار کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ عمر کا فرق اس تعلق کے راستے میں رکاوٹ بن سکتا ہے لیکن جولین کے اس تبصرے کے بعد یہ خدشہ دور ہو گیا۔ وہ اسے ڈنر پر دعوت دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لیوینا وہاں آ گئی۔ گو کہ وہ مارلن سے پندرہ برس بڑی تھی لیکن رنگ دار بالوں اور بھاری میک اپ کی وجہ سے کم عمر نظر آتی تھی۔

''صبح بخیر۔'' اس نے باری باری دونوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہائے لیوینا۔'' جولین نے کہا۔ ''اس طرف کیسے آنا ہوا؟''

لیوینا بولی۔ ''میں تمہارے باس کو دیکھ رہی ہوں۔''

''ہم نے اسے نہیں دیکھا۔'' مارلن نے کہا۔

''ہمیں اس بات کی پریشانی ہے کہ کہیں اس کے ساتھ کچھ ہو نہ گیا ہو۔''

''پریشانی؟'' لیوینا نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس کے ساتھ کچھ بہت ہی برا ہوا ہوگا۔''

''میرا خیال تھا کہ تم پال کو پسند کرتی ہو۔'' جولین بولی۔

''اس زہریلے سانپ نے مجھ سے اپنی کار بیچنے کی بات کی تھی۔''

''وہ چھوٹی ہائی برڈ؟'' مارلن نے پوچھا۔ اب وہ سمجھا کہ پال کی کار پارکنگ لاٹ میں کیوں کھڑی ہوئی تھی۔

''نہیں، پرانی کار۔ اس نے اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیے تھے۔ واقعی دیکھنے میں وہ اچھی لگتی ہے لیکن اس کے انجن سے عجیب عجیب آوازیں آ رہی ہیں۔ جولین! کیا تم مجھے آج شام گھر تک چھوڑ دو گی؟''

''کیا وہ بالکل نہیں چل رہی؟'' جولین نے پوچھا۔

''میرے بھتیجے ریکو نے اسے چیک کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں نے بہت مہنگی کار خریدی ہے۔ ابھی میں نے صرف دو قسطیں دی ہیں۔ میں اس سے پوچھنے آئی ہوں کہ اگر میں کار واپس کر دوں تو کیا وہ میری رقم لوٹا دے گا۔''

''حیرت ہے۔'' جولین نے کہا۔ ''پال نے اپنی پرانی کار ایک ساتھی کارکن کو فروخت کر دی۔ وہ تو حکم چلانے کے علاوہ کسی سے بات بھی نہیں کرتا۔''

لیوینا نے ادھر ادھر دیکھا پھر ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ''پہلے وہ اپنے ملازمین سے بہت قریب ہوا کرتا تھا۔''

''واقعی......!'' جولین نے مارلن کو معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بارہ سال پہلے۔'' لیوینا نے سرگوشی کی۔ ''پال کا کیرول سے معاشقہ چل رہا تھا۔''

''کیرول جو اکاؤنٹنگ میں ہے۔'' جولین نے کہا۔

''ہاں لیکن وہ اس وقت اکاؤنٹنگ میں نہیں تھی بلکہ ہماری طرح فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ پال نے اس سے ترقی کا وعدہ کیا لیکن اس کی درخواست آگے نہیں بڑھائی۔''

''یہ بہت پرانی بات ہے۔'' جولین نے کہا۔

''تمہارا کہنا ہے کہ پال غائب ہے۔'' لیوینا بولی۔ ''اور جب میں اسکریپ رپورٹ دینے گئی تو کارول بھی موجود نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اکٹھے کہیں گئے ہوں۔''

جولین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہم نے ابھی کونر سے سنا ہے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ جہاز کے ذریعے تفریحی سفر پر گئی ہے۔''

اسی وقت پیجر پر لیوینا کا بلاوا آ گیا۔ وہ جاتے جاتے بولی۔ ''اگر تمہیں اپنے باس کے بارے میں علم ہو تو مجھے اطلاع کر دینا۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس کے جانے کے بعد مارلن نے کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آرہا کہ آج پال نے کسے لنچ پر بلایا ہے۔“

”دوپہر ہونے والی ہے۔ ہم صحن میں بیٹھ کر دیکھ سکتے ہیں کہ کس کی کار باہر جارہی ہے۔“

”واقعی اتنا وقت گزر گیا؟“ مارلن نے کہا۔ ”جب تم ساتھ ہوتی ہو تو وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا۔“

جولین اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ”اگر پال کی غیر حاضری مستقل ہو تو شاید یہاں کی سختی اتنی محسوس نہ ہو۔“

”اگر اس نے ہماری درخواستوں پر دستخط نہ کیے تو میں واقعی پاگل ہو جاؤں گا۔ چلو ریستوران چلتے ہیں۔“ مارلن نے کہا۔ ”اگر پال وہاں موجود ہوا تو ہم اسے مجبور کریں گے کہ وہ اسی وقت ہماری درخواستوں پر دستخط کرے۔“

”خیال برا نہیں ہے۔“ جولین دستانے اتارتے ہوئے بولی۔ ”چلو۔“

مارلن نے پرہجوم ڈائننگ ہال میں جھانکا۔ صرف ایک میز ایسی تھی جس پر تنہا شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ ایک بھاری بھر کم شخص تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اپنا سیل فون چیک کرنے لگا۔

”مجھے لگتا ہے کہ یہی وہ شخص ہے۔“ جولین نے کہا۔

وہ دونوں ایک چھوٹی سی گول میز پر بیٹھ گئے۔ مارلن کا کھانا ورک شاپ کے فریج میں رکھا ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے چائے اور سینڈوچ کا آرڈر دیا۔ کافی دیر گزر گئی لیکن پال نہیں آیا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ وہ شخص ویٹر کو بلا رہا تھا۔

”وہ بل منگوا رہا ہے۔“ جولین نے کہا۔ ”اور پال کا کہیں پتا نہیں ہے۔“

”ضروری نہیں کہ یہ وہی شخص ہے جسے پال نے یہاں بلایا تھا۔“

”تمہیں معلوم کرنا چاہیے۔“

”میں اس کے پاس جا کر یہ تو نہیں پوچھ سکتا کہ کیا تم ہمارے باس کا انتظار کر رہے ہو؟“

”تم اسے یہ مت بتانا کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔“ جولین نے کہا۔ ”تم ایکٹر ہو۔ کوئی ڈراما کرو۔“

مارلن نے چند لمحے سوچا پھر اس شخص کی میز پر جا کر بولا۔ ”معاف کرنا۔ میں تمہارا نام بھول گیا۔ پال نے مجھے یہ بتانے کے لیے بھیجا ہے کہ اسے آنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔“

ویٹر نے اس شخص کا کریڈٹ کارڈ اور رسید میز پر رکھ دی۔ ”اس نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟“ وہ شخص بھناتے ہوئے بولا۔ ”اس کے پاس میرا سیل نمبر ہے۔“

”لگتا ہے کہ وہ نمبر اس سے کہیں گم ہو گیا۔ اسے بہت افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔“

”کیا اس نے تمہیں پیسے دیے ہیں؟“

”پیسے؟“ مارلن اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیسے پیسے؟“

”مجھے اندازہ تھا کہ وہ دوبارہ بہانے بازی کرے گا۔“ ٹوڈ اس کے قریب جھکتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنے دوست پال سے کہہ دینا کہ وہ آج شام تک یہ رقم مجھے پہنچا دے ورنہ میں اس کا برا حشر کر دوں گا۔ وہ ایک بڑی رقم ہے۔“

”تم نے کیا معلوم کیا؟“ گاڑی میں واپس آتے ہوئے جولین نے پوچھا۔ ”جاتے وقت ٹوڈ کچھ خوش نہیں لگ رہا تھا۔“

”لگتا ہے کہ وہ ان بدمعاشوں سے جوئے میں ایک بڑی رقم ہار گیا ہے۔“

”اسی لیے وہ آج کام پر نہیں آیا۔“

”میرا اندازہ ہے کہ پال کے پاس اس کی رقم نہیں ہے اور اسی لیے وہ چھپتا پھر رہا ہے۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پال ایک جواری ہوگا۔“ جولین نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔“

مارلن نے گردن گھما کر دیکھا اور بولا۔ ”لگتا ہے کہ یہ ٹوڈ ہی ہے۔“

”وہ ہمارا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟“

”اس امید پر کہ وہ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے پال تک پہنچ جائے گا۔“ مارلن نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ وہ نہیں جانتا، پال کہاں کام کرتا ہے۔“

”میں اسے چکما دے دوں گی۔“

”اگر مجھے پال کے گھر کا پتا معلوم ہوتا تو میں ٹوڈ کو ضرور دے دیتا۔“

”اگر ٹوڈ کو معلوم ہو گیا کہ پال کہاں کام کرتا ہے تو وہ شاید پارکنگ لاٹ میں ہی اسے گولی مار دے گا اور کوئی دوسرا شخص بھی اس کی لپیٹ میں آسکتا ہے۔“

یہ کہہ کر جولین نے اچانک اسٹیئرنگ گھمایا اور تیزی سے گاڑی کو ایک گلی میں لے گئی۔

”کیا میں نے اسے چکما دے دیا؟“

مارلن نے گردن گھما کر عقبی شیشے میں دیکھا۔ ٹوڈ ان کے بالکل پیچھے تھا۔ اس کا ٹرک ایک کوڑے دان سے ٹکرایا اور اس کا کچرا گلی میں پھیل گیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"نہیں، وہ اب بھی ہمارے پیچھے ہے۔" مارلن نے بتایا۔

جولین نے گاڑی گلی سے نکالی اور بڑی سڑک پر ٹریفک کے ہجوم میں گم ہوگئی۔ اب ان کے پیچھے کئی گاڑیاں تھیں اور ٹوڈ کا ٹرک کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ جولین بڑی مہارت اور تیز رفتاری سے کار چلا رہی تھی۔ اس نے کئی بار مڑ کر دیکھا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ ٹوڈ کو جھکما دینے میں کامیاب ہوگئی ہے تو وہ فیکٹری واپس لوٹ آئے۔

جب وہ اندر داخل ہو رہے تھے تو اوون ان کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ "تم دونوں جانتے ہو کہ لنچ کا وقفہ تیس منٹ کا ہوتا ہے۔" پھر اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم پچاس منٹ بعد واپس آئے ہو۔"

"ریستوران میں سروس بہت آہستہ ہو رہی تھی۔" مارلن نے کہا۔

"اسی لیے پال نہیں چاہتا کہ اس کے ماتحت کھانے کے لیے باہر جائیں۔"

"تم پال کو بتا دینا۔" مارلن نے کہا۔ "تاکہ اسے معلوم ہوجائے کہ ہم لنچ کر کے دیر سے واپس آئے تھے اور یہ بھی کہہ دینا کہ ہم سارا دن اسے تلاش کرتے رہے۔"

انہیں کام کرتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی لیکن لگ رہا تھا جیسے گھڑی کی سوئیاں ایک جگہ رک گئی ہوں۔ جولین نے کام روک کر اپنے ہاتھ کی مٹھی بند کی پھر کھولتے ہوئے بولی۔

"میں سارا دن یہاں نہیں رہ سکتی۔ میری کلائی دکھنے لگی ہے۔ میں اپنی جگہ پر بک کو بھیج رہی ہوں۔"

اس کے جانے کے چند منٹ بعد بک آگیا اور مارلن کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اسے ڈرامے میں رچرڈ کا پارٹ ملے گا یا نہیں۔ کیا ٹوڈ، پال کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائے گا اور یہ کہ کن لوگوں کی ترقی ہوگی۔

"اے......" بک نے کہا۔ "تم نے ایک اور کیسکٹ خراب کر دی۔"

مارلن نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کیسکٹ کو دیکھا۔ واقعی اس نے بے دھیانی میں اس پر قینچی چلا دی تھی۔ "تم ترقی پانے کے اہل نہیں ہو۔" بک نے کہا۔ "بلکہ تم تو اس کام کو بھی ٹھیک طرح نہیں کر سکتے۔"

مارلن نے اپنی قینچی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا پریشان ہونا جائز ہے۔ میں نے اپنی ملازمت کے دوران پہلی بار پال کو غیر حاضر ہوتے دیکھا ہے۔ اس نے میری درخواست پر دستخط نہیں کیے اور آج اسے جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔"

"اچھا۔" بک نے کہا۔ "اس نے میری درخواست پر تو دستخط کر دیے۔"

مارلن نے بک کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس نے ہمیں نظرانداز کر دیا اور تمہاری درخواست پر دستخط کر دیے؟"

"شاید اس کی وجہ تمہارا رویہ ہو۔"

اس سے پہلے کہ مارلن کوئی جواب دیتا، جولین آگئی۔

"وقت ختم ہونے والا ہے۔" اس نے کہا۔ "اور ابھی تک پال نے ہماری درخواستوں پر دستخط نہیں کیے۔ میں اسٹیسی کے پاس جا رہی ہوں۔"

مارلن بھی اس کے ساتھ چل دیا لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ گھر جا چکی ہے۔

"کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے۔"

"مجھے شبہ ہے کہ وہ اتنی گہرائی میں جا سکتی ہے۔ بہرحال ہمارا چانس تو ختم ہوگیا۔"

"بہتر ہے کہ اب اگلی بار قسمت آزمائی کی جائے۔" وہ مایوس ہوتے ہوئے بولی۔

بک نے ورکشاپ کی صفائی کر دی تھی لیکن نقص زدہ کیسکٹ کا ٹب وہیں چھوڑ دیا تھا تاکہ اس کا الزام مارلن پر آئے۔

"بہتر ہے کہ میں انہیں اندر رکھ دوں۔" جولین نے کہا۔ "وہ انہیں ری سائیکل کرلیں گے۔"

"اور پال کو ہماری اگلی ترقی روکنے کی ایک اور وجہ مل جائے۔" مارلن نے کہا۔ "یہ مناسب نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ ٹب کھینچ کر لے جانے لگا۔

"تم اسے کہاں لے جا رہے ہو؟" جولین نے پوچھا۔

"ڈمپ اسٹیشن۔"

وہ جگہ فیکٹری کے باہر سڑک پر واقع تھی اور اس پر ایک لوہے کا دروازہ لگا ہوا تھا۔ مارلن نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا لیکن فوراً ہی پیچھے کھینچ لیا۔

"کیا وہاں کوئی چوہا ہے؟" جولین نے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ "مجھے چوہوں سے نفرت ہے۔"

"نہیں۔" مارلن نے آہستہ سے کہا۔ "خون......" وہ ایک سرخ دھبے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔" جولین نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے، دروازہ کھولا اور جھک کر اندر دیکھنے لگی۔ "مجھے تو اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پھر وہ اچانک پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''اندر کوئی ہے، شاید چوہے ہوں۔''

''اس کا ایک راستہ پارکنگ لاٹ کی طرف سے بھی ہے۔'' مارلن نے کہا۔ ''میں ڈھلوان تختے کے ذریعے نیچے نہیں جانا چاہتا۔''

وہ باہر کی جانب لپکے۔ مارلن نے ڈمپ اسٹیشن کے کھلے ہوئے حصے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ بدبو کا جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ اس نے اپنا سانس روکا اور اندر اتر گیا۔ یکا یک ہی اس کے سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ آ گیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''پال! تم ٹھیک تو ہو؟''

پال کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس لیے وہ غوں غاں کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔ مارلن نے اس کے منہ سے بڑے سائز کا موزہ نکالا اور اس کے ہاتھ پاؤں کھولے۔ پال سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ مارلن نے اسے اٹھایا اور جولین اسے باہر کی جانب کھینچنے لگی۔ وہ اسے پارکنگ لاٹ تک لے گئے۔

''تمہارے چہرے کو کیا ہوا؟'' جولین نے کہا۔ ''لگتا ہے کسی نے تمہاری اچھی خاصی مرمت کی ہے۔ میں نو گیارہ کو فون کرتی ہوں۔''

''نہیں، میں کچرا پھینکنے آیا تھا لیکن میں نے دھیان نہیں دیا۔ کسی نے اسی وقت فرش کی صفائی کی تھی۔ میرا پاؤں پھسلا اور میں ڈھلوان راستے سے لڑھکتا ہوا نیچے گر گیا۔''

''یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ تمہارا پاؤں پھسلا اور تم نیچے آن گرے۔'' مارلن نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہارا منہ، ہاتھ اور پاؤں کس نے باندھ دیے تھے؟''

''یہ ذاتی معاملہ ہے۔'' پال نے اس کے چہرے کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا پھر نیچی آواز میں بولا۔ ''تم کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔''

''تم نے تو ہماری درخواست پر دستخط نہیں کیے پھر بھی تم ہم سے یہ توقع رکھتے ہو۔'' جولین بولی۔

''میں کس طرح دستخط کرتا جبکہ یہاں بندھا ہوا پڑا تھا۔''

''لیکن تم نے بک کی درخواست پر تو دستخط کر دیے۔'' مارلن نے کہا۔

''اس کی درخواست میرے پاس پہلے آ گئی تھی۔'' پال نے کہا۔ ''تم اپنی زبان بند رکھنا۔ میں کل اسٹیسی سے بات کروں گا۔ اب مجھے کار تک پہنچا دو۔ جلدی کرو۔ اس سے پہلے کہ پہلی شفٹ کی چھٹی ہو جائے۔''

وہ مارلن کے کندھے کا سہارا لے کر کار تک آیا۔ جولین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور بولی۔ ''تمہیں کم از کم ڈاکٹر کو ضرور دکھانا چاہیے۔''

پال کا جواب فورک لفٹر کی آواز میں دب گیا۔ اسے اوون چلا رہا تھا۔ اس نے فورک لفٹر کو نصف دائرے کی شکل میں گھمایا اور ان کے سامنے آ کر بولا۔ ''تمہارے ساتھ کیا ہوا پال؟''

مارلن کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے پال کا وعدہ یاد آ گیا کہ اگر وہ اور جولین خاموش رہے تو وہ اسٹیسی سے ان کے پروموشن کے لیے بات کرے گا۔ پال نے مارلن کا بازو جھٹکا اور فورک لفٹر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ان دونوں نے مار پیٹ کر مجھے ڈمپ اسٹیشن میں پھینک دیا۔''

''کیا؟'' مارلن غصے سے کانپتے ہوئے بولا۔

''ہم نے تمہاری جان بچائی۔'' جولین بولی۔ ''اگر ہم نہ آتے تو تم ابھی تک وہیں پڑے ہوتے۔''

''میں ان دونوں کا علاج کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اوون نے فورک لفٹر ان کی طرف بڑھا دیا۔

''ہمیں الگ ہو جانا چاہیے۔'' مارلن نے کہا۔ ''میں اسے روکتا ہوں۔''

جولین عمارت کی طرف بھاگی۔ مارلن نے اپنے بازو لہرائے اور پارکنگ لاٹ کے درمیان دوڑنے لگا لیکن یہ حکمت عملی ناکام ہوئی۔ اوون نے مارلن کے بجائے جولین کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ بھاگتے ہوئے ایک آدمی سے ٹکرائی جو فیکٹری سے باہر آ رہا تھا۔ اوون ہچکچایا اور اس نے اچانک ہی فورک لفٹر کا رخ مارلن کی طرف کر دیا۔

مارلن دوڑتا ہوا پال کی کار تک آیا۔ عین اسی وقت پال نے گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کیا۔ گاڑی کے ٹائر چرچرائے لیکن اس نے حرکت نہیں کی۔ مارلن کا خیال تھا کہ اوون اپنے باس کی کار کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس لیے وہ گاڑی کی چھت پر چڑھ گیا۔

''نیچے اترو۔'' پال چلایا۔ ''تم چھت پر ڈینٹ ڈال دو گے۔''

وہ گاڑی سے باہر آیا اور مارلن کی ٹانگ کھینچنے لگا۔

''راستے سے ہٹ جاؤ۔'' اوون نے دونوں بازو لہراتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں رک سکتا۔''

پال ایک جانب لڑھک گیا۔ فورک لفٹر کے کونے کار سے ٹکرائے اور ایک زوردار آواز سنائی دی۔ مارلن کار کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

چھت سے گرا اور سڑک پر لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر اپنے کپڑے جھاڑے۔ جولین اور فیکٹری کے کئی کارکن پارکنگ لاٹ کی طرف دوڑ پڑے۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' جولین نے پوچھا۔

''معمولی چوٹیں آئی ہیں۔'' مارلن نے کہا۔ ''پال کا کیا ہوا؟''

وہ بال بال بچ گیا تھا۔ وہ اوون پر چلاتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ تم نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

جب اوون کو احساس ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے تو اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔ بک نے اس کا پیچھا کرنا چاہا لیکن لیونا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''وہ بچ نہیں پائے گا۔'' لیونا نے اپنا سیل فون لہراتے ہوئے کہا۔ ''پولیس اسے پکڑ لے گی۔ میں نے نو گیارہ کو فون کر دیا ہے۔''

''گڈ۔'' پال نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''اب اس فورک لفٹر کو ہٹاؤ اور مجھے باہر نکالو۔''

''نہیں۔'' بک نے کہا۔ ''میں نے ایک فلم میں دیکھا تھا اگر ہم نے فورک لفٹر کو ہٹایا تو مسٹر پال کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔''

''یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔'' مارلن نے کہا پھر فورک لفٹر پر چڑھ کر اسے پیچھے لے گیا اور بولا۔ ''پال کو کچھ نہیں ہوا۔''

جب ٹوٹے ہوئے پلاسٹک کے ٹکڑے کار سے ہٹائے گئے تو اس کے عقبی حصے سے ایک دو کیوبک فٹ کا لوہے کا پیس ملا۔ جولین بولی۔ ''یہ تو وہی سانچہ ہے جو کونر ڈھونڈ رہا تھا۔''

''تم اس کا کیا کرو گے؟'' مارلن نے پال سے پوچھا۔ ''کیا کسی کباڑیے کو بیچنا چاہتے ہو۔ اس میں اسٹین لیس... اسٹیل کی کافی مقدار ہے۔ اس کے شاید تمہیں ایک ہزار ڈالرز مل جائیں یا کسی دوسری کمپنی کو فروخت کر کے اچھی قیمت وصول کرو گے؟''

تھوڑی دیر میں ایک ایمبولینس، آگ بجھانے والا ٹرک اور دو پولیس کاریں بھی پہنچ گئیں۔ پولیس والوں نے لوگوں سے سوال جواب کرنا شروع کر دیے۔ مارلن اور جولین اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک پرانے ماڈل کی امریکی کار وہاں آئی اور ایک سیاہ بالوں والا شخص اس میں سے باہر آیا۔

''آنٹی لیونا! میں تمہیں گھر لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

مارلن نے پال کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں اس شخص کو دیکھ کر پھیل گئی تھیں۔ لیونا نے اپنے بھتیجے سے سرگوشی میں کہا جسے مارلن نے سن لیا۔

''ریکو! کیا تم نے پال کو مارا ہے؟''

''آنٹی! میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے مجھ سے بدزبانی کی۔ مجھے اس بات کا غصہ تھا کہ اس نے تم سے کار کے سودے میں دھوکا کیا پھر اس نے مجھے اس کی مرمت کے لیے پچاس ڈالر دینا چاہے جبکہ

تکلیف

کسی دشمن کے سو الفاظ بھی تکلیف نہیں دیتے مگر ایک اچھے اور مخلص دوست کی خاموشی بہت تکلیف دیتی ہے۔ اس ایک اچھے اور مخلص دوست کا ایک لفظ، ایک اچھی بات دشمن کے ایک سو الفاظ پر غالب آ جاتی ہے۔

ہونٹ

خاموش ہونٹ بہت ساری پریشانیوں اور مشکلات کو نظرانداز کرتے ہیں لیکن مسکراتے ہوئے ہونٹ ہر مشکل ہر پریشانی کو حل کرتے ہیں۔

لاعلاج

ڈاکٹر مریض کو چیک کرنے کے بعد اس کی بیوی سے۔ ''آپ کا شوہر ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اگر آپ ان کا خیال رکھیں۔ پریشان نہ کریں، لڑائی نہ کریں اور ان کی خدمت کریں۔''

شوہر۔ ''ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

بیوی۔ ''تم لاعلاج ہو۔''

دو لوگ

زندگی میں دو لوگوں کا بہت خیال رکھنا۔

☆ ایک جس نے تمہاری جیت کے لیے بہت کچھ ہار دیا ''تمہارا باپ......''

☆ دوسرا وہ جس کی دعاؤں سے تم نے سب کچھ جیت لیا ''تمہاری ماں۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس کا انجن بالکل ناکارہ ہے۔ تمہیں اس سودے میں سراسر نقصان ہوا۔"

لیوینا نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور بولی۔

"مجھے چاہیے تھا کہ کار خریدنے سے پہلے تمہیں دکھا لیتی۔"

بک نے ریکو کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"شکریہ دوست۔ تم نے وہ کام کر دکھایا جو ہم برسوں سے سوچ رہے تھے۔"

☆☆☆

مارلن کن انکھیوں سے تماشائیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہال کی تمام نشستیں بھر چکی تھیں۔ گو کہ اسے کنگ رچرڈ کا رول نہیں ملا لیکن وہ اس ڈرامے میں ایک اہم ثانوی کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کی حال ہی میں ملازمت ختم ہوئی تھی اور اب وہ اداکاری پر پوری توجہ دے رہا تھا۔ اس کی پروموشن نہیں ہوئی تو اس نے غصے میں آ کر نوکری چھوڑ دی لیکن بعد میں اسے پچھتاوا ہونے لگا۔ اتفاق سے انہی دنوں اسے تھیٹر میں ایک موقع مل گیا اور اس طرح اس کے مالی نقصان کا کسی حد تک ازالہ ہو گیا۔

اس نے آخری مکالمہ ادا کیا تھا کہ ایک عورت اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تالیاں بجانے لگی۔ وہ جولین تھی۔ اس کے برابر میں بیٹھا ہوا شخص بھی کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مارلن کا دل ڈوبنے لگا کیونکہ وہ ہینڈسم ہونے کے ساتھ ساتھ جولین کا ہم عمر بھی تھا۔ پردہ گرا تو رواج کے مطابق مارلن بھی دوسرے اداکاروں کے ہمراہ اسٹیج سے نیچے اتر آیا تا کہ تماشائیوں میں گھل مل جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ جولین تک پہنچتا، سوزی نے اس کا بازو پکڑ لیا اور ایک سفید بالوں والے شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"میں مسٹر مارلن سے تمہارا تعارف کروانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے حال ہی میں ایک پرکشش ملازمت چھوڑ کر ہمارے نئے تھیٹر منیجر کی ذمے داریاں سنبھال لی ہیں۔"

سوزی ایک متحرک اور خوبصورت عورت تھی جس نے بیوہ ہونے کے بعد اپنے آپ کو ضائع نہیں کیا بلکہ مقامی ثقافتی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئی اور کمیونٹی تھیٹر کو بچانے کے لیے کوشش کرنے لگی جو زوال پذیر تھا۔

"معافی چاہتا ہوں۔" مارلن نے کہا۔ "مجھے ایک دوست سے بات کرنی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ چلی جائے۔"

جب وہ جولین کے پاس پہنچا تو اس نے اپنے ساتھی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "یہ ایڈن ہے۔ لیوینا کا بھتیجا لیکن وہ نہیں جس نے پال کی پٹائی کی تھی۔"

ایڈن نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"لیوینا کیسی ہے؟" مارلن نے پوچھا۔

"میں نے اسے ایک قابلِ اعتماد کار دلا دی ہے۔ اس وقت پال جن حالات سے گزر رہا ہے انہیں دیکھتے ہوئے پیسوں کی واپسی مشکل نظر آتی ہے۔"

"کیسے حالات؟" مارلن نے پوچھا۔ "مجھے کچھ علم نہیں ہے۔"

جولین بولی۔ "لیوینا کو ڈر تھا کہ پولیس پال کی پٹائی کرنے کے الزام میں ریکو کو گرفتار کرے گی لیکن پال نے اپنی کہانی اتنی بار بدلی کہ پولیس کو فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا پھر جب ٹوڈ نے بھی پال کی پٹائی کی تو اس نے اپنے الزام پر اصرار نہیں کیا اور دونوں معاملے دب گئے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ پال کو سانچہ چوری کرنے کے الزام میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔"

"اب تم کیا کر رہی ہو؟" مارلن نے پوچھا۔

"میں نے تمہارے مشورے پر کیلکولس کا انتخاب کیا ہے تا کہ انجینئر بن کر ڈھیر سارے پیسے کماؤں اور اپنے بچوں کو سمندری جہاز کی تفریح کراؤں۔" یہ کہہ کر اس نے شرماتے ہوئے ایڈن کی طرف دیکھا اور اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر وہاں سے چلی گئی۔

مارلن ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سوزی اس کے پاس آ کر بولی۔ "کیا تم پارٹی میں جا رہے ہو؟"

مارلن نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو۔"

مارلن کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سوزی جیسی طرح دار عورت اس کے ساتھ پارٹی میں جانے کی خواہش کرے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، سوزی بولی۔ "یہاں جتنے بھی کم عمر مرد ہیں، وہ کیوں ایک ماند پڑتی ہوئی اداکارہ کی رفاقت قبول کریں گے۔"

"کس نے کہہ دیا کہ تمہارا وقت گزر چکا ہے۔ تم صرف پرکشش اور باصلاحیت ہی نہیں بلکہ کئی اداکاراؤں سے بہتر ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ جا کر خوشی ہوگی۔"

سوزی نے فرطِ مسرت سے اس کا بازو تھام لیا اور مارلن کی آنکھوں میں امید کے چراغ جل اٹھے۔ ہم سفر ملنے کی خوشی میں وہ جولین سے بچھڑنے کا غم بھول گیا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام نے تسلیاں دے کر اور اس وعدے کے ساتھ کہ وہ فرعون سے مل کر اسے مجبور کریں گے کہ وہ بچوں کے قتل کا حکم واپس لے لے اُن کے غصے کو ٹھنڈا کیا۔
یہ لوگ واپس تو چلے گئے لیکن یہ گلہ اب بھی ان کے دلوں میں تھا کہ ان پر جو تکلیفیں آئی ہیں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے آئی ہیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی "اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔" سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

چوتھا حصہ

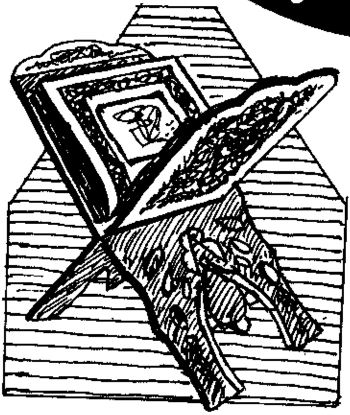

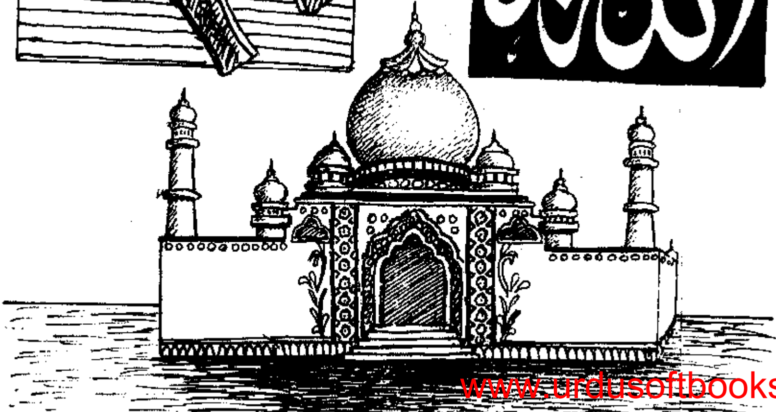

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''باری تعالیٰ! فرعون اور فرعونیوں کو تو نے جو دولت و ثروت عطا فرمائی ہے اس پر شکر ادا کرنے کے بجائے وہ تیرے بندوں پر ظلم و ستم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور تیری راہِ حق کو نہ یہ خود قبول کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے ہیں بلکہ جبر و تشدد سے کام لے کر ان کے آڑے آتے ہیں لہٰذا اب تو ان کو مظالم کا ذائقہ چکھا اور ان کی دولت و ثروت کو تباہ و ہلاک کر دے جس پر یہ نازاں ہیں اور جس طرح یہ ایمان کی سچائی کو ٹھکرا رہے ہیں تو بھی ان کو ایمان کی دولت کے بجائے اب ایسا دردناک عذاب دے کہ ان کی داستان دوسروں کے لیے عبرت بن جائے۔''

فرعون نے اگرچہ اپنے سرداروں کو اطمینان دلا دیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کی تعداد بڑھنے ہی نہیں دے گا جو وہ تمہارے مقابلے پر آئیں لیکن اس کے باوجود وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے روحانی غلبے سے خائف تھا۔ اندر ہی اندر گھلتا رہتا تھا کہ کہیں اس کا اقتدار ہاتھ سے نہ چلا جائے۔ وہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکل جانے کی اجازت دے سکتا تھا لیکن اپنے.... سرداروں کی طرف سے خطرہ لگا رہتا تھا۔ مفت کے مزدور ہاتھ سے چلے گئے تو یہ سردار اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ مصریوں کی طرف سے بھی خطرہ تھا کہ بہت سے مصری حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر ان کے ساتھ چلے جائیں گے۔ اس سے بھی بڑا خطرہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل یہاں سے نکل کر جنگ کی تیاری کریں گے اور مصر پر حملہ آور ہو کر اس کا اقتدار ختم کر دیں گے۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کیے بغیر یہ معاملہ ختم نہیں ہو سکتا۔

ایک روز اس نے اپنے سرداروں کے سامنے اپنے فیصلے کا اظہار کر ہی دیا۔

''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو یونہی چھوڑے رکھا اور اس نے اپنی تبلیغ جاری رکھی تو وہ آہستہ آہستہ تمہارے دین کو بدل ڈالے گا۔ بنی اسرائیل ابھی تک تو اس کے خلاف ہیں لیکن کسی وقت اس کے ساتھ کھڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ میں اسے قتل کرا دوں۔'' سردارانِ فرعون تو پہلے ہی مطالبہ کر رہے تھے اس وقت بھی فرعون کی ہم نوائی کی۔

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں، اس دربار میں ایک مصری ایسا بھی تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا لیکن اس نے اپنے ایمان لانے والی بات کو پوشیدہ رکھا تھا۔ دربار میں موجود تھا اس لیے یقیناً یہ کوئی معزز مصری ہوگا۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ شخص فرعون کے چچا کا بیٹا تھا یعنی خاندانِ فرعون ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

وہ اس وقت خاموش نہ رہ سکا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دفاع میں بول اٹھا۔

''کیا تم موسیٰ علیہ السلام کو صرف اس لیے قتل کر دو گے جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور اپنی سچائی کے ثبوت میں کچھ نشانیاں بھی پیش کرتا ہے۔ اس کا قصور کیا ہے۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اس کے ساتھ، تمہیں اس کے جھوٹ سے کیا نقصان پہنچ رہا ہے اور سوچو کہ وہ اپنے قول میں سچا ہے اور تمہیں عذاب سے ڈرا رہا ہے تو اسے قتل کر کے خدا کا قہر نہیں خرید لو گے؟''

فرعون نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔ ''میں نے جو کچھ کہا ہے، کچھ سوچ کر ہی کہا ہے اور اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔''

اس شخص نے اسے پھر نصیحت کی۔ ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہمارا حال ان قوموں جیسا نہ ہو جائے جو قومِ نوح، عاد اور ثمود کے نام سے مشہور ہیں۔ میں تمہارے لیے اس دن سے ڈرتا ہوں جب قیامت کا دن ہوگا اور سب ایک دوسرے کو پکاریں گے مگر اس وقت تمہیں کوئی خدا کے عذاب سے بچانے والا نہیں ہوگا۔''

پھر وہ قوم کے سرداروں سے مخاطب ہوا۔

''تمہارا حال تو یہ ہے کہ تمہارے باپ دادا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی جھٹلا دیا تھا۔ تمہارا یہی سلوک اب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہے۔''

اس شخص کی یہ باتیں سن کر فرعون کے سرداروں کو بڑا غصہ آیا۔ لہٰذا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اس کا کام تمام کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

''سو اللہ تعالیٰ نے اس کو ان کی تدبیروں کے شر سے بچا لیا۔''

اس کی اس بے باکی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی فرعون کے شر سے بچا لیا۔ اسے یہ شک ہوا کہ ابھی تو ایک شخص ظاہر ہوا ہے۔ میری صفوں میں اور نہ جانے کتنے لوگ ہوں گے جو موسیٰ علیہ السلام سے ملے ہوئے ہوں گے۔ اگر میں نے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

موسیٰ علیہ السلام پر ہاتھ ڈالا تو کہیں میرے ہی لوگ میرے خلاف نہ ہو جائیں۔
اس نے ارادۂ قتل ملتوی کر دیا۔ اب اس نے اپنی دولت اور تدبیروں کو آلۂ کار بنایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توہین کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور دوسری طرف ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو کر اپنی قوم کے لوگوں کو سونے کے کنگن پہناتا۔ سوار ہو کر نکلتا اور سونا اچھالتا ہوا جاتا۔
اس نے اس میدان میں مصریوں کو جمع کیا جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ ہوا تھا اور لوگوں سے مخاطب ہوا۔
''اے قوم! کیا میں مصر کے تاج و تخت کا مالک نہیں ہوں اور میری حکومت کے قدموں کے نیچے یہ نہریں بہہ رہی ہیں۔ کیا تم (میرے اس جاہ و جلال کو) نہیں دیکھتے۔ اب بتاؤ، کیا میں بلند و بالا ہوں یا یہ جس کو عزت نصیب نہیں اور جو بات بھی صاف نہ کر سکتا ہو (اگر یہ اپنے خدا کے ہاں عزت والا ہے) تو کیوں اس پر (آسمان سے) سونے کے کنگن نہیں گرتے یا فرشتے اس کے سامنے پرے باندھ کر کھڑے نہیں ہوتے۔''
فرعون چونکہ سونے کے کنگن تقسیم کرتا تھا، اس کی ظاہری شان و شوکت آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ اس کی قوم کے نزدیک مرتبے اور عزت کا معیار چونکہ یہی تھا اس لیے فرعون کا داؤ ان پر چل گیا.... حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر جو اثرات وقتی طور پر گہرے ہوئے تھے آہستہ آہستہ کم ہونے لگے۔ انہوں نے دنیاوی فائدہ اسی میں دیکھا کہ فرعون کی ربوبیت کو تسلیم کرتے رہیں۔ انہوں نے علی الاعلان فرعون کی ربوبیت اور موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کا اعلان کر دیا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے لوگوں کو برابر تلقین کر رہے تھے کہ تمہیں ایسے متکبر و مغرور سے نہیں ڈرنا چاہیے جو خدا کے یوم حساب سے نہیں ڈرتا۔ میرا پشت پناہ تو وہ ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تم سب کا بھی۔ میں صرف اس کی پناہ چاہتا ہوں۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کے محل کے دروازے بالکل بند ہو چکے تھے۔ شخصی حکومتوں میں حاکم کی نیت بدلتے ہی سب کچھ بدل جاتا ہے۔ وہی پہرے دار جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا احترام کرنے لگے تھے اور انہیں دیکھ کر محل کے دروازے کھول دیتے تھے، اب ان کی آنکھیں بدل گئیں۔ فرعون کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوالوں کے جواب نہیں تھے اس لیے وہ انہیں اجازتِ باریابی نہیں دے رہا تھا۔
فرعون کے مظالم کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کو مصر سے چلے جانے کی اجازت بھی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توہین کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات تک کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی آئی اور اس وحی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں اعلان کیا۔
''خدا کے فیصلے تک تم سرزمینِ مصر ہی میں اپنے گھروں کو مساجد بنالو اور ان کو قبلہ رخ کر کے خدائے واحد کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ کہ خدا کی وحی کا یہی فیصلہ ہے۔''
اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کی کہ...... ''اب تو ان ظالموں (فرعونیوں) کے مظالم کا ذائقہ چکھا اور ان کی دولت و ثروت کو تباہ و ہلاک کر دے جس پر یہ نازاں ہیں۔''
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اب تک اس انداز میں دعا نہیں فرمائی تھی۔ اب گویا مصریوں پر عذاب کا وقت قریب آ گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہدایت کا حق ادا کر دیا تھا لیکن اس کا مطلق اثر نہیں ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد قتل کی جانے لگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تذلیل و توہین ہونے لگی اور فرعون نے اپنی ربوبیت و معبودیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ دولت سے لوگوں کو خریدنے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو پیغام بھجوایا کہ اگر تیرا یہی طور رہا تو عنقریب خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔
فرعون پر اس کا بھی اثر نہیں ہوا بلکہ الٹا یہ ہوا کہ اس نے اپنی قوم کے سربر آوردہ افراد کو جمع کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغام کو دھمکی کے انداز میں بیان کیا۔
''موسیٰ علیہ السلام ایک اَن دیکھے خدا کی بات کرتا ہے جبکہ میں تمہارا رب تمہارے سامنے ہوں۔ اب بتاؤ میں سچا ہوں یا وہ۔ میں تمہیں فائدہ بھی پہنچا سکتا ہوں اور نقصان بھی جبکہ اس کا خدا جس کا کوئی وجود ہی نہیں، تمہیں فائدہ اور نقصان نہیں پہنچا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سکتا جبکہ اس نے اپنے اَن دیکھے خدا کی طرف سے دھمکی دیتے ہوئے مجھے یہ کہلوایا ہے کہ اس کا خدا عنقریب مصریوں کو تباہ وہلاک کر دے گا۔ یہ دراصل اس کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ وہ مجھے قائل نہ کر سکا تو جنگ پر اتر آیا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ کسی ملک کے ساتھ مل کر مجھ پر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن میں اس کے ارادے پورے نہیں ہونے دوں گا۔ عنقریب میں تمہیں حکم دینے والا ہوں کہ بنی اسرائیل کی بستیوں کو آگ لگا دو اور ان کے ایک ایک فرد کو ہلاک کر ڈالو۔ بولو، کیا تم میرا ساتھ دو گے؟''

سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ وہ اس کے ساتھ ہیں۔

''تو پھر میرے حکم کا انتظار کرو۔ سونے کے کنگن تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

ادھر فرعون اپنی تدبیر کر رہا تھا ادھر خدا اپنے قانون کو حرکت دے رہا تھا۔ قانونِ قدرت یہی رہا ہے کہ جب کوئی قوم اس کے احکام سے کھلی بغاوت کرتی ہے تو وہ اس پر عذاب نازل کرتا ہے۔

توریت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

''تب خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ فرعون کا دل متعصب ہے۔ وہ ان لوگوں کو جانے نہیں دیتا۔ اب تو صبح کو فرعون کے پاس جا وہ دریا پر جائے گا۔ سو تو لبِ دریا اس کی ملاقات کے لیے کھڑا رہنا اور جو لاٹھی سانپ بن گئی تھی اسے ہاتھ میں لے لینا۔ اس سے کہنا کہ عبرانیوں کے خدا نے مجھے تیرے پاس یہ کہنے کو بھیجا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ بیابان میں میری عبادت کریں اور اب تک تو نے کچھ ساعت نہیں کی۔''

شام کا وقت تھا۔ دریائے نیل کا ستھرا پانی عجیب دلفریب منظر پیش کر رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جو پانی کے لمس سے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حکم ربی کے مطابق حضرت ہارون کے ساتھ دریا پر گئے۔ دیکھا تو فرعون بھی اپنے مصاحبوں کے ساتھ دریا کی سیر کو آیا ہوا تھا۔ ادھر ادھر گشت کرتا پھر رہا تھا کہ اس کے ایک مصاحب کی نظر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پڑ گئی۔

''خداوند! آپ نے کچھ دیکھا۔ وہ دونوں بھائی بھی یہاں موجود ہیں اور اکیلے ہیں۔ کوئی اسرائیلی ان کے ساتھ نہیں بلکہ ہم بہت سے ہیں۔ ذرا انہیں بلا کر سرزنش تو کی جائے کہ انہوں نے اپنے گھروں کو عبادت گاہیں کیوں بنا لیا ہے اور وہ آپ کے سوا کسی اور کی پرستش کیوں کرتے ہیں۔''

''میں اس وقت اس سے الجھ کر اپنی تفریح خراب کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اکیلا ہے لیکن جادو کی لاٹھی اب بھی اس کے پاس ہے۔ وہ اس سے کوئی جادو بھی دکھا سکتا ہے۔ میں نے تو ایک اور ترکیب سوچی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے بنی اسرائیل پر سختیاں کم کر دی جائیں۔ میں اپنے لوگوں کو ان کے پاس بھیجوں گا اور ان میں دولت تقسیم کروں گا تاکہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ہو جائیں پھر ہمیں اس کے جادو سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور شاید موسیٰ علیہ السلام بھی اپنی قوم کو اچھی حالت میں دیکھ کر مطمئن ہو جائے۔''

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ اندر سے ڈرا ہوا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے بالکل قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''کیا تمہیں خداوند کا اتنا ادب بھی نہیں رہا کہ راستے میں روک کر بات کرتے ہو۔'' مصاحبوں میں سے ایک نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ٹوکا۔

''میں اپنی کوئی بات کہنے نہیں آیا۔ مجھے تو عبرانیوں کے خدا نے اس کے پاس بھیجا ہے۔''

''تو ہمیشہ اپنی بات کرتا ہے اور اپنے خدا کو بیچ میں لے آتا ہے جسے میں جانتا تک نہیں۔'' فرعون نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے جتنی نصیحت کرنی تھی میں کر چکا۔ مجھے لگتا ہے تو ایمان لانے والا نہیں۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ تو ہم اسرائیلیوں کو مصر سے نکل جانے دے تاکہ وہ تیرے خوف سے آزاد ہو کر خدا کی عبادت کریں۔''

''یہ کام تو ایمان لانے سے بھی مشکل ہے۔ میں تیرے لوگوں کو کبھی نہیں جانے دوں گا بلکہ میں ایسا کروں گا کہ وہ خود ہی تیرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوں گے۔''

''کیا تو خدا کے عذاب سے بھی نہیں ڈرتا جو عنقریب تجھے دکھایا جائے گا۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''کیا تو پھر کوئی جادو دکھانے والا ہے؟'' اس مرتبہ ہامان بیچ میں بول پڑا۔
''تمہاری عقلوں میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ میں جادوگر نہیں ہوں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے کرتا ہوں۔''
''تو پھر اپنے خدا سے کہو وہ تمہاری قوم کو یہاں سے نکال لے جائے۔ اس کے لیے ہم سے اجازت کے طالب کیوں ہو۔'' فرعون نے کہا۔
''میں تو حجت پوری کر رہا ہوں ورنہ خدا کے لیے یہ کام مشکل نہیں۔ آخرت میں یہ نہ کہنا کہ تم سے پوچھا نہیں گیا تھا۔''
''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ باقی باتیں دربار میں آ کر کرنا۔''
''مجھے کوئی بحث نہیں کرنی ہے۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ میری قوم کو جانے دو۔''
''میں تم سے صاف کہہ چکا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''
حجت تمام ہو چکی تھی۔ فرعون نے اسرائیلیوں کو اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اپنی لاٹھی کو دریا کے پانی پر مارو۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی دریا کے پانی پر ماری۔ دریا کا پانی خون بن گیا۔ دریا کی مچھلیاں مر گئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا۔ گھر میں رکھے ہوئے برتنوں میں بھی پانی کی جگہ خون بھر گیا۔
اسرائیلیوں کے گھر اس خون سے محفوظ رہے تھے۔ اس پر بھی فرعون نہ سمجھا کہ یہ عذاب صرف مصریوں پر آیا ہے۔ وہ اب بھی اسے موسیٰ علیہ السلام کا جادو قرار دے رہا تھا۔
مصری جب اپنے گھروں میں سو کر اٹھے اور ڈھکے ہوئے برتنوں کو کھولا اور پانی کی جگہ خون دیکھا تو سخت خوفزدہ ہوئے اور فریاد لے کر فرعون کے دربار میں پہنچے اور اپنی بپتا سنائی۔
''یہ موسیٰ علیہ السلام کا جادو ہے جس نے ہمیں آن گھیرا ہے۔ تم لوگ دریا کا پانی پینے سے گریز کرو اور اپنے لیے کنویں کھود لو۔ میں اپنے جادوگروں کو بلاتا ہوں۔''
سب مصریوں نے دریا کے آس پاس پینے کے پانی کے لیے کنویں کھود لیے کیونکہ وہ دریا کا پانی نہیں پی سکتے تھے۔
اس عالم میں سات دن گزر گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پھر وحی آئی کہ فرعون کے پاس جائیں اور ایک مرتبہ پھر اس سے کہیں میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے اور اسے دم (خون) کا معجزہ یاد دلا کر ایک مرتبہ پھر اسے خدا کا پیغام پہنچایا۔
''عبرانیوں کا خدا کہتا ہے اگر تو ان کو نہ جانے دے گا تو میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے بھر دوں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آ کر تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور آٹا گوندھنے کے لگنوں میں گھستے پھریں گے اور تجھ پر اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے۔''
''پچھلی مرتبہ تو نے دھوکے سے اور اچانک دریا کے پانی کو خون بنا دیا تھا لیکن اس مرتبہ اچھا ہوا مجھے پہلے سے باخبر کر دیا۔ میں نے اپنے جادوگروں کو بلا بھی لیا ہے۔ اب تیرا جادو مجھ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔''
''افسوس! تو نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اب اللہ کے عذاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔''
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد فرعون نے ہامان اور اپنے مصاحب رخ نسو کو طلب کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔
''اب تم جادوگروں سے کہو کہ اب وہ موسیٰ علیہ السلام کے جادو کو ناکارہ بنانے کے لیے انتظامات کریں۔ ان کا یہی کہنا تھا نا کہ اگر پہلے معلوم ہو جاتا تو دریا کا پانی خون نہ بنتا۔''
''اب تو یہ کام ان کے لیے آسان ہو جائے گا۔ ہم ابھی انہیں شہر جشن کے پانیوں پر متعین کرتے ہیں۔''
فرعون نے ان سات دنوں میں قریب و دور کے جادوگروں کو بلا کر محل میں رکھ لیا تھا۔ دریا کا پانی اصلی حالت پر لوٹ آیا تھا۔ خدا کی طرف سے یہ ایک رعایت تھی جو دی گئی تھی لیکن جادوگروں کا دعویٰ تھا کہ یہ ان کے جادو کا کرشمہ ہے۔ فرعون اسی دعوے پر پھول رہا تھا اور اسی گھمنڈ میں آ کر اس نے اس دھمکی کی پروا نہیں کی تھی کہ ملک میں مینڈک بھر جائیں گے۔
جادوگر شہر جشن (دارالحکومت) میں نکلے اور دریا، نہروں اور جھیلوں پر پہنچ گئے۔ بڑے بڑے الاؤ روشن کر کے منتر

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پڑھنے لگے۔ جہاں جہاں پانی تھا، اس کے گرد حصار کھینچ دیے۔
یہ کارروائی کئی دن جاری رہی اور مینڈکوں سے نجات بھی ملی رہی۔ فرعون نے ان جادوگروں کو سونے کے کنگن پہنائے اور مزید انعام دینے کا لالچ بھی دیا۔ جادوگر یہی دعوے کر رہے تھے کہ ان کا منتر کامیاب رہا ہے۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادو اثر نہیں دکھائے گا۔
کئی دن گزر گئے تھے، کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ جادوگر اپنے کھینچے ہوئے حصار پر بھروسا کر کے محل میں واپس آ چکے تھے۔ ان کارروائیوں کے بارے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی معلوم ہو چکا تھا۔ وہ انتظار میں تھے کہ خدا کی طرف سے انہیں کیا حکم ملتا ہے۔ دعا بھی کر رہے تھے کہ اگر مینڈکوں کی نشانی نہیں دکھائی گئی تو جادوگروں کی جیت ہو جائے گی۔ یہی سمجھا جائے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جادوگر ہیں۔ اس مرتبہ ان کا جادو نہیں چل سکا۔
خدا کی مصلحت وہی جانے۔ اس کے یہاں نظام بھی مقرر ہے اور وقت بھی۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ پھر ایک روز وحی کے الفاظ موسیٰ علیہ السلام کی سماعت میں اترے۔
"اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر بڑھا اور مینڈکوں کو ملکِ مصر پر چڑھا لا۔"
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی دریائے نیل کے پانی پر ماری۔ پھر جتنی نہریں اور جھیلیں تھیں ان کی طرف گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانیوں کی سطح پر لاکھوں مینڈک ابھر آئے۔
یہ ہرگز جادو نہیں تھا جیسا کہ فرعون کہتا تھا بلکہ یہ وہ نشانیاں تھیں جو اللہ دکھا رہا تھا تاکہ مصری قوم انہیں دیکھ کر خدا پر ایمان لے آئے۔ یہ قہرِ خدا تھا جو وقفے وقفے سے مصریوں پر ٹوٹ رہا تھا کیونکہ وہ حقیقت کے قائل ہونے کے باوجود اس سے دور ہوتے جا رہے تھے اور معجزات کو جادو کہہ کر ٹھکرا رہے تھے۔ فرعون کا غرور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کو تیار ہی نہیں تھا۔
"اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نشانات واضح عطا کیے۔ پس تو بنی اسرائیل سے دریافت کر کہ جب یہ نشانات ان کے پاس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون نے یہ کہا اے موسیٰ علیہ السلام بلاشبہ میں تجھے جادوگر سمجھتا ہوں۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ تو خوب جانتا ہے کہ ان کو بصیرتیں بنا کر آسمانوں اور زمین کے پروردگار کے سوا اور کسی نے نہیں اتارا۔ بلاشبہ اے فرعون میں تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔"
مصری سو کر اٹھے تو حال یہ تھا کہ ان کے گھر مینڈکوں سے بھر گئے۔ کھانا کھانے کے لیے برتن کھولتے تو کہیں سے کوئی مینڈک آ کر گر جاتا۔ پلنگ پر پاؤں رکھتے تو بستر پر ان سے پہلے مینڈک موجود ہوتے۔ جوتا پاؤں میں ڈالتے تو مینڈک پہلے سے موجود ہوتا۔ خود فرعون کے محل کا یہی عالم تھا۔
جو مینڈک مارے گئے ان کے ڈھیر لگ گئے اور ہر طرف تعفن پھیل گیا۔ یہ ایسا کراہت آمیز منظر تھا کہ مصریوں کا کھانا پینا حرام ہو گیا۔ لاکھوں کی تعداد میں مینڈک نکل آئے تھے۔
قرآن کی سورۃ اعراف میں ان نشانیوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔
"انہوں (مصریوں) نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آ، ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں۔ آخرکار ہم نے ان پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سرسریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کیے چلے گئے اور وہ بڑے مجرم لوگ تھے۔ جب کبھی ان پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے اے موسیٰ علیہ السلام! تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دعا کر۔ اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹال دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک مقررہ وقت تک کے لیے ہٹا لیتے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے......"
مینڈکوں کا عذاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ مصری اسے خوب سمجھ رہے تھے چنانچہ جتھے بنا کر فرعون کے پاس پہنچے کہ کسی طرح موسیٰ علیہ السلام سے کہہ کر اس عذاب سے ان کی جان چھڑائیں۔
فرعون اس وقت محل میں موجود جادوگروں کی سرزنش کر رہا تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کا جادو کیسے چل گیا۔
"میرے باپ دادا سے لے کر اب تک تم پر کتنی دولت خرچ ہو چکی ہے۔ تمہیں میں نے اپنی مملکت میں کس شان سے رکھا ہے۔ کیا اسی لیے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنا جادو کرتا رہے اور تم کھڑے تماشا دیکھتے رہو۔ تمہارے ہوتے ہوئے اس کا جادو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کیسے چل گیا؟"

تمام جادوگر کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

"ہماری خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ شاید موسیٰ علیہ السلام بہت بڑا جادوگر ہے کہ ہمارا زور اس پر نہیں چلتا۔ اے فرعون! ہمیں ایک موقع اور دے۔ اس مرتبہ ہم ایسے حربے استعمال کریں گے کہ موسیٰ علیہ السلام لاجواب ہو کر رہ جائے گا۔ یہی بلائیں ہم اس کی طرف بھیجیں گے بس تو ایک موقع ہمیں دے دے۔"

اسی وقت اسے معلوم ہوا کہ اس کے عوام محل سے باہر کھڑے اس کی دہائی دے رہے ہیں۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اب عوام کو اپنی ربوبیت کا یقین کیسے دلائے۔ وہ محل کی چھت پر گیا اور وہیں سے خطاب کیا۔

"میں ہی تمہارا رب ہوں۔ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو کچھ رعایت دے دی تھی کہ شاید وہ راہِ راست پر آجائے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا لیکن اس نے وعدہ خلافی کی اور اپنے وعدے سے پھر گیا۔ اپنے جادو کے زور پر مینڈکوں کو ہمارے ملک پر چڑھا لایا۔ اب کوئی رعایت نہیں، تم دیکھو گے کہ میں اب اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ کوئی بہت بڑا جادوگر ہے جو آسمانوں میں رہتا ہے، موسیٰ علیہ السلام اس کا شاگرد ہے۔ اسی کو وہ اپنا خدا کہتا ہے۔ میں نے اس کے استاد کے قتل کا انتظام کر لیا ہے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام بھی راہِ راست پر آجائے گا۔ اب تم لوگ جاؤ مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

مصریوں کے چلے جانے کے بعد فرعون نے آدمی دوڑائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے پاس بلا لیا۔ اسے کسی نہ کسی طرح مینڈکوں کی بلا کو اپنے سر سے ٹالنا تھا لہٰذا اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حد درجہ نرمی سے پیش آیا۔

"موسیٰ علیہ السلام، تیری وجہ سے مصری بڑے عذاب سے دوچار ہیں۔ تو یہ مصیبت ان کے سر سے ہٹا لے۔ میں فرعون ہوتے ہوئے تجھ سے یہ درخواست کر رہا ہوں۔"

"یہ کام میرے خدا کے لیے کوئی مشکل نہیں لیکن تو بھی میری بات مان لے۔ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ مصر سے نکل جانے دے تاکہ وہ مقدس سرزمین کی طرف جائیں اور اپنے خدا کی عبادت کریں۔"

"مینڈکوں کو مجھ سے اور میری رعیت سے دفع کر۔ میں تیری بات ماننے کو تیار ہوں۔ میں تیرے لوگوں کو جانے دوں گا تاکہ وہ خداوند کے لیے قربانی دیں۔"

"تو اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ یہ نہ ہو کہ عذاب ختم ہوتے ہی تو اپنے وعدے سے پھر جائے۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد رہے گا۔"

"مینڈکوں کا عذاب تجھ پر سے اور تیری رعیت پر سے ہٹا لیا جائے گا تاکہ تو جان لے کہ خدا ہی رب العالمین ہے۔ اگر تو رب ہوتا تو تجھے کسی سفارش کی ضرورت نہ پڑتی۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے وعدہ لے کر چلے آئے اور خدا کے حضور دعا فرمائی۔ دعا قبول ہوئی اور گھروں، صحنوں، کھیتوں کے مینڈک مر گئے یا واپس دریاؤں میں چلے گئے۔

فرعون نے اپنی قوم کو باور کرایا کہ اس کے جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کے جادو کا توڑ کر دیا۔ اسی لیے مینڈک مر گئے اور اب موسیٰ علیہ السلام کوئی اور جادو نہیں کر سکے گا۔

اس عذاب سے چھٹکارا ملتے ہی فرعون کا دل پھر سخت ہو گیا اور اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہ تیری قوم مصر سے باہر رہ کر طاقتور بن جائے گی اور مصر پر چڑھ دوڑے گی۔

دراصل فرعون کو یقین ہو گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگر نہیں لیکن انہیں پیغمبر تسلیم کرتے ہوئے اس کا غرور آڑے آجاتا تھا۔ اس کا تعصب اسے روکتا تھا۔ بنی اسرائیل کو باہر جانے کی اجازت بھی اسی لیے نہیں دے رہا تھا کہ اس کی قوم اسے اس کی کمزوری سمجھے گی۔ جب کوئی عذاب آتا تھا تو نرم پڑ جاتا تھا اور جب چھٹکارا مل جاتا تھا تو اصلی حالت پر لوٹ آتا تھا۔ یہی حال تمام مصریوں کا بھی تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو نوید سنا دی تھی کہ فرعون نے انہیں مصر سے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ چلنے کی تیاری کریں لیکن فرعون اپنے قول سے پھر گیا تھا۔

 www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مصریوں میں فتح کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ فرعون کے حق میں نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ان کے خیال میں فرعون نے انہیں مینڈکوں سے نجات دلائی تھی۔

''فرعون ہی ہمارا رب ہے۔ وہ ہمیں سونے کے کنگن پہناتا ہے۔ وہی ہمیں موسیٰ علیہ السلام کے جادو سے چھٹکارا دلائے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصریوں سے کہتے تھے کہ تم عذاب سے کیوں نہیں ڈرتے۔ کیا تمہیں پچھلی قوموں کا حشر یاد نہیں کہ انہوں نے پیغمبروں کا انکار کیا اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ تم کیوں فرعون کی باتوں میں آ کر اپنی عاقبت خراب کرتے ہو تو وہ ان کا مذاق اڑاتے اور ان سے صاف لفظوں میں کہتے کہ ہمارا نجات دہندہ تو فرعون ہے۔ وہی تمہارے خدا سے جنگ کرے گا اور ہمیں تمہارے جادو سے چھٹکارا دلائے گا۔ ہمیں یہ قبول نہیں کہ تمہاری وحشی قوم کے محکوم بن کر رہیں۔ جو آج تک ہمارے غلام تھے ہمارے حاکم نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ فرعون ٹھیک کہتا ہے، تم تو ٹھیک طرح بات بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تم پر ایمان کیسے لے آئیں۔

جب ان لوگوں کی تازہ وعدہ خلافی پر عرصہ گزر گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے پھر پکارا۔

''اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مارو تا کہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حکم کے مطابق ریت کے بڑے ٹیلے پر گئے اور اس کو عصا سے مارا تو وہ پھٹ پڑا اور اس میں سے جوئیں نکل کر کھانے پینے کی اشیا میں جگہ جگہ گھس گئیں۔ یہ جوئیں انسانوں اور حیوانوں دونوں پر چڑھیں۔

مصریوں کی نیند اور سکون حرام ہوگیا۔ نہ وہ سو سکتے تھے نہ جاگتے میں چین سے رہ سکتے تھے۔ یہی حال فرعون اور اس کے نوکروں کا تھا۔ ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔ مصریوں کو یہ سوچ سوچ کر اور غصہ آرہا تھا کہ ہم آقا ہو کر یہ عذاب سہہ رہے ہیں اور ہمارے غلام بنی اسرائیل مزے میں ہیں۔ ان پر یہ عذاب کیوں نہیں ٹوٹتا۔

ان میں سے بہت سے لوگ تو یہ کہنے لگے تھے کہ یہ جادو نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام ضرور خدا کا رسول ہے۔ اس پر ایمان لے آؤ ورنہ ہماری زندگی اسی طرح عذاب میں مبتلا رہے گی۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ مان کر بنی اسرائیل کو جانے دو تا کہ موسیٰ علیہ السلام کے خدا کا غصہ ٹھنڈا ہو۔

یہ باتیں فرعون تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ اسے ڈر ہوا کہ اس کی قوم کہیں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لے آئے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلوایا اور وعدہ کیا کہ اگر یہ عذاب ٹل جائے تو وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کر دے گا۔

''تو کتنی ہی مرتبہ وعدہ کر کے توڑتا رہا ہے۔ پھر میں کیسے یقین کرلوں۔''

''اس مرتبہ تو میری قوم بھی یہی کہہ رہی ہے کہ میں تمہیں جانے کی اجازت دے دوں۔ اس مرتبہ میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے ایمان لانے میں اتنے حریص تھے کہ وہ جب وعدہ کرتا تھا اس کی بات مان لیتے تھے۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے اس سے عہد کیا کہ وہ خدا سے کہہ کر اس عذاب کو ٹال دیں گے۔

انہی دنوں ہامان نے اسے یہ خوش خبری دی کہ آپ کی فرمائش کے مطابق وہ مینارہ تیار ہوگیا ہے جس پر چڑھ کر آپ موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو تلاش کر سکتے ہیں۔

اس خبر کو سنتے ہی فرعون کا ارادہ بدل گیا۔ عذاب بھی ٹل چکا تھا اور مینارہ بھی تیار ہو چکا تھا۔ اب اس کی مجبوری نہیں رہی تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دیتا۔

اس نے قوم کے سامنے اعلان کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے خدا سے جنگ کرنے کے لیے مینارے پر چڑھنے والا ہے۔ عنقریب اپنی قوم کو خوش خبری دے گا۔

فرعون نے تیر کمان ہاتھ میں لیے اور مینارے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

محل نما یہ مینارہ اتنا بلند تھا کہ زمین سے کھڑے ہو کر اس کی چوٹی نظر نہ آتی تھی۔ اس پر چڑھنا بھی آسان نہیں تھا۔ اس لیے یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ہر منزل پر ایک آراستہ کمرا رکھا گیا تھا۔ ان کمروں میں آسائش اور ضرورتوں کا ہر سامان مہیا تھا تا کہ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد فرعون ان کمروں میں آرام کرے اور پھر سیڑھیاں چڑھے۔

وہ یونہی سیڑھیاں چڑھتا، آرام کرتا کئی مہینوں کی مسافت کے بعد مینارے کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اتنی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بلندی پر آنے کے بعد بھی آسمان اتنی ہی دور نظر آتا تھا جتنا کہ زمین سے نظر آتا تھا۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوا اور کمان میں تیر جوڑ کر پوری قوت سے آسمان کی طرف پھینکا۔ قدرتِ الٰہی کے فیصلے کے مطابق وہ تیر نظروں سے اوجھل ہو کر واپس آیا تو خون آلود تھا۔ اس نے اس تیر کو محفوظ کر لیا اور پھر اسی طرح مینارے کی منزلوں میں بنے ہوئے کمروں میں قیام کرتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اس کی بہکی ہوئی قوم اس کے انتظار میں تھی۔ اس کے نیچے اترتے ہی پوری قوم سڑکوں پر نکل آئی۔ جشن کا سماں تھا۔ سوانگ رچائے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ دیوتاؤں کے بڑے بڑے پتلے بنا کر نکالے جا رہے تھے۔ فرعون نے اپنی قوم کو خون آلود تیر دکھایا اور کہا۔ ''لو آج میں نے موسیٰ علیہ السلام کے خدا کا خاتمہ کر دیا۔ اب تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میری پرستش کرتے رہو۔ اب موسیٰ علیہ السلام کو جادو کا حکم دینے والا آسمان پر نہیں رہا۔ اب موسیٰ علیہ السلام کوئی جادو نہیں کر سکے گا۔''

مصری قوم پچھلے عذابوں کو بھول کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اکڑ کر چلنے لگی تھی۔ خوف سے بے نیاز ہو کر بنی اسرائیل پر مظالم ڈھائے جانے لگے تھے۔ فرعون کا غرور اسے احساس دلا رہا تھا کہ اب کوئی عذاب نازل نہیں ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر ایک شناسا آواز سنی۔

''فرعون کل دریا پر آئے گا۔ تو صبح سویرے اٹھ کر دریا پر جانا اور فرعون کے آگے جا کھڑا ہونا۔ اس سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے کہ وہ میری عبادت کریں۔ اگر تو ان کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تجھ پر اور تیرے نوکروں اور تیری رعیت اور تیرے گھروں میں مچھروں کے غول کے غول بھیجوں گا۔ مصریوں کے گھر اور تمام زمین جہاں جہاں وہ ہیں مچھروں کے غولوں سے بھر جائے گی اور کل تک یہ نشان ظہور میں آئے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام دریائے نیل پر پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کی طرح عصا تھا۔ فرعون نے جیسے ہی انہیں دیکھا تو پہلے کی طرح موسیٰ علیہ السلام سے کترا کر گزر جانا چاہا۔

''یہ جگہ گفتگو کے لیے ہرگز مناسب نہیں ہے۔ تجھے کوئی بات کرنی ہے تو دربار میں آ کر پہلے مجھے سجدہ کرتا اور اس کے بعد مطلب بیان کرتا۔''

''مجھے تجھ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ تو میرے لوگوں کو جانے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟''

''اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تیری قوم میرے لوگوں کی خدمت کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ میں اسے جانے دوں تو خدمت کون کرے گا۔ اور ہاں، یہ یاد رکھنا کہ میں نے تیرے خدا کو ختم کر دیا ہے۔ اب کوئی تیری مدد کرنے والا نہیں۔''

تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مچھروں کے عذاب کی اطلاع دے دی۔ خدا کا پیغام اس تک پہنچا دیا۔

فرعون نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کب تک ہوگا اور اتنے مچھر تو لائے گا کہاں سے۔''

''یہ نشان کل تک ظہور میں آ جائے گا جیسا کہ خداوند نے مجھ سے کہا ہے۔''

فرعون پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنے مصاحبوں کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

وہ دن خیریت سے گزر گیا۔ صبح ایک مصری سو کر اٹھا تو اسے مچھروں کی بھن بھناہٹ سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو پورا کمرا مچھروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہزاروں مچھر اس کی آنکھوں پر حملہ آور ہوئے۔ وہ چیختا ہوا باہر آیا۔ صحن میں بھی مچھروں کے غول تھے۔ وہ گھر سے باہر نکلا۔ کئی اور لوگ بھی سراسیمہ ہو کر باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سیکڑوں مچھر اس کے منہ میں گھس گئے۔ اب حال یہ تھا کہ لوگ مچھروں کو بھگانے کے لیے دونوں ہاتھ چلا رہے تھے اور بہ مشکل باتیں کر پا رہے تھے۔

''یہ بھی موسیٰ علیہ السلام کا کوئی جادو معلوم ہوتا ہے ورنہ کل تک تو ایک بھی مچھر نہیں تھا۔''

''فرعون نے تو دعویٰ کیا تھا اب موسیٰ علیہ السلام کا کوئی جادو نہیں چل سکتا۔''

''فرعون دیوتا ہے کوئی جادوگر نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام بہت بڑا جادوگر ہے۔ وہ اپنے کرشمے دکھاتا رہتا ہے۔ اس کے سامنے مصر کے جادوگر بھی عاجز ہیں۔''

''باتیں ہی کرتے رہو گے، چل کر دیکھنا تو چاہیے کہ ہمارے محلے ہی کا یہ حال ہے یا دوسری جگہوں پر بھی مچھروں نے حملہ کر دیا ہے۔''

یہ لوگ بازار کی طرف گئے۔ یہاں بھی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ عورتیں اس مصیبت سے تنگ آ کر روتی ہوئی بھاگ رہی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھیں۔ بھاگتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح چلا رہی تھیں جیسے بھیڑیں رستہ بنا رہی ہوں۔ دکاندار جلدی جلدی اپنی دکانیں بند کر رہے تھے۔

یہاں بھی کچھ لوگ کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

''بھائیو! یہ جادو نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام ٹھیک کہتا ہے، یہ عذاب ہے جو ہم قبطیوں پر نازل ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ فرعون کی وجہ سے ہے۔ اس کا بس ایک ہی علاج ہے کہ ہم استغفار کریں اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس چل کر اس کی نبوت کا اقرار کرلیں۔''

''خبردار! ایسی باتیں منہ سے بھی مت نکالو۔'' دوسرے شخص نے کہا۔ ''کیا تم ان جادوگروں کا حال بھول گئے جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے رب کا اقرار کیا تھا۔ فرعون کے مخبروں نے ہماری گفتگو فرعون تک پہنچا دی تو ہمارا بھی وہی حشر ہوگا۔''

''تو کیا ہم اس عذاب کو جھیلتے رہیں؟''

''یہ مچھر تو فرعون کے محل پر بھی حملہ آور ہوئے ہوں گے۔ وہ اس کا کوئی نہ کوئی تدارک ضرور کرے گا۔''

ان کا کہنا ٹھیک تھا۔ فرعون کا عالیشان محل بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ یہاں تو اور بھی برا حال تھا۔ فرعون کے خدمت گار اپنا بچاؤ بھی کر رہے تھے اور فرعون کو بھی بچانا پڑ رہا تھا۔ فرعون پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا اور نوکروں کو حکم دے رہا تھا کہ کسی طرح ان مچھروں کو بھگائیں۔ نوکر کوشش ضرور کر رہے تھے لیکن مچھر ان کے قابو میں نہیں آرہے تھے۔ محل میں موجود جادوگروں کا حال بھی یہ تھا کہ ناک کے نتھنوں اور کانوں میں روئی ٹھونسے پھر رہے تھے۔

جب مچھروں پر کسی طرح غلبہ نہ پایا جاسکا تو فرعون کو ایک کمرے میں بند کر کے باہر گیلی لکڑیاں جلا دی گئیں اور کمرے میں ان ملازموں کو بھیج دیا گیا جو بنی اسرائیل سے تھے تاکہ ان کی وجہ سے مچھر کمرے میں داخل نہ ہوسکیں۔ ان کی یہ ترکیب کامیاب ہوئی اور فرعون مچھروں سے محفوظ ہوگیا لیکن باقی محل والوں کا وہی حال تھا۔

مصریوں کے گھروں میں گیلی لکڑیاں جلا دی گئیں۔ اس سے اٹھنے والا دھواں انہیں مچھروں سے محفوظ رکھ رہا تھا لیکن وہ یہ سوچ ضرور رہے تھے کہ اس طرح زندگی کیسے گزرے گی۔

یہ صورت کئی دن رہی تو حال یہ ہوگیا کہ پورا شہر دھوئیں سے بھر گیا۔ لوگ اپنے چہروں پر کپڑے لپیٹے پھر رہے تھے۔ جادوگروں نے صاف کہہ دیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے جادو کا توڑ ان کے پاس نہیں۔ فرعون کا حال یہ تھا کہ وہ کمرے میں بند تھا۔ باہر نکل نہیں سکتا تھا۔ سلطنت کا تمام کاروبار ٹھپ ہوگیا تھا۔ اس وقت تو یہ تشویش اور بھی بڑھ گئی جب ہزاروں مصری منہ پر کپڑے ڈالے، ہاتھوں کا پنکھا جھلتے فرعون کے محل کے باہر جمع ہوگئے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ اگر فرعون نے ان مچھروں کے خاتمے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا تو وہ فرعون کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار بن جائیں گے۔

یہ نعرے اندر پہنچے تو کھلبلی مچ گئی۔ وزرائے مملکت اور بڑے بڑے سردار فرعون کے پاس گئے اور اسے مجبور کرنے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام سے بات کرے اور اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے کوشاں ہو۔

''تم دیکھ رہے ہو باہر کتنے مچھر ہیں۔ میں باہر کیسے نکل سکتا ہوں۔''

''آپ کو نکلنے کی ضرورت نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو یہیں بلوالیں۔''

''اب وہ میری بات نہیں سنے گا۔ میری بات پر اعتبار نہیں کرے گا۔''

''کوئی تدارک تو کرنا چاہیے۔''

''جادوگروں کو سولی پر لٹکا دو جو بڑے بڑے دعوے کر رہے تھے اور اب کچھ بھی کرنے سے قاصر ہیں۔''

''مچھر تو پھر بھی رہیں گے۔''

''ان قبطیوں کو فوراً گرفتار کرو جو میرے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔''

''میں نے یہ حکم پہلے ہی دے دیا تھا لیکن گرفتار کرنے والے اپنی جان بچاتے پھر رہے ہیں۔ مچھروں نے شاہی کارندوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ان مچھروں کو اتنی عقل سکھا دی گئی ہے کہ کس کو کاٹنا ہے کس کو نہیں۔''

''ہامان کہاں ہے۔''

''وہ مجمعے کو سمجھا بجھا کر منتشر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

مشتعل عوام محل کے باہر ہامان کو گھیرے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر وہ محاصرہ ختم

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کردیں تو وہ فرعون سے مل کر کوئی تدارک کرتا ہے۔

ہامان اس طرف سے نمٹ کر فرعون کے پاس آیا۔ ہامان بھی یہی کہہ رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر موسیٰ علیہ السلام کو یہ جھانسا دیا جائے کہ وہ مچھروں کا خاتمہ کردے، ہم اس کی بات ماننے کو تیار ہیں۔

''وہ یہی کہے گا کہ ہم اس کی رسالت پر ایمان لے آئیں۔'' فرعون نے کہا۔

''وہ پہلے بھی یہی کہتا رہا ہے۔ اس وقت مان لینے میں کیا حرج ہے۔ بعد میں ہم پھر انکار کردیں گے۔''

''وہ میری وعدہ خلافیوں سے واقف ہے۔ اس مرتبہ تم اس سے بات کرو اور یہ بھی سوچ لو کہ اس کے بعد وہ کوئی اور جادو دکھادے گا۔''

''اس کی ترکیب میرے ذہن میں ہے، بس آپ مجھے اجازت دیں کہ اس وقت آپ کی جانب سے اس سے وعدہ کرلوں۔''

''میری طرف سے اجازت ہے۔ بس اس مصیبت سے چھٹکارا دلاؤ۔''

اتنا وقت نہیں تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو محل میں بلوایا جاتا۔ ہامان نے مقرب خاص رخ نسو کو اپنے ساتھ لیا اور موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں اسرائیلیوں کی بستی کی طرف چل دیا۔

ہامان کو اس وقت سخت تعجب ہوا جب بستی میں داخل ہوتے ہی مچھر پیچھے رہ گئے۔ بہت دن بعد اس نے کھل کر سانس لی تھی۔ اسے ایسی خوشی ہوئی جیسے آج ہی دنیا میں آیا ہو۔ یہ سوچ کو اسے وحشت سی ہونے لگی کہ جب وہ واپس جائے گا تو پھر انہی مچھروں سے سابقہ پڑے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت اپنی قوم کے چند افراد کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ اس خدائی عذاب کا ذکر ہورہا تھا کہ مصری کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ یہ افراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شکرگزار ہورہے تھے جنھوں نے ان کی طرف سے مصریوں سے بدلہ لیا تھا۔ تمام کام اس طرح ٹھپ ہوئے تھے کہ ان اسرائیلیوں کو بیگار کے کاموں سے فرصت مل گئی تھی۔

فرعون کا خوف دلوں پر ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ ان افراد کی نظر جیسے ہی ہامان پر پڑی وہ خوف زدہ ہوکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہا کھڑے رہ گئے۔ بڑی دیر تک آوازیں دیتے رہے۔ کوئی پلٹ کر نہیں آیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو مخاطب کیا۔ ''تم نے دیکھا مسلسل غلامی نے میری قوم کی کیا حالت بنا دی ہے۔ شجاعت و مردانگی کے جوہر بالکل ختم ہوگئے ہیں۔ یہ جب تک مصر میں رہیں گے ان کی یہی حالت رہے گی۔ ہامان کو دیکھتے ہی کیسے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کا حال بھی مصریوں کی طرح ہے۔ خوش ہوتے ہیں تو میری تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں۔ کوئی مشکل پڑتی ہے تو مجھے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔''

اتنی دیر میں ہامان اور رخ نسو وہاں پہنچ گئے۔

''موسیٰ علیہ السلام تم نے پورے شہر کو مچھروں کے عذاب میں مبتلا کردیا ہے۔''

''میری کیا طاقت۔ یہ تو خدا کا عذاب ہے جو تمہاری قوم کے سامنے آرہا ہے۔''

''تمہارا جھگڑا فرعون سے ہے۔ پوری قوم کو اس کی سزا کیوں مل رہی ہے۔''

''اس لیے کہ تمہاری قوم فرعون کو اپنا خدا کہتی ہے۔ وہ اگر ان عذابوں سے بچنا چاہتی ہے تو فرعون کا ساتھ چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔''

''یہ تو بہت مشکل ہے کہ میں پوری قوم کو قائل کرسکوں لیکن میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ فرعون کو قائل کرلوں گا اور یہ اجازت دلوا دوں گا کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر سے جانے کی اجازت دے دے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں یہ وعدہ لے کر آیا ہوں کہ جو تمہارے ساتھ طے کروں گا فرعون اس پر کاربند رہے گا۔ تم یہ عذاب ٹال دو پھر تم اپنی قوم کو یہاں سے لے کر چلے جانا۔''

''یہ وعدہ تو فرعون مجھ سے کئی مرتبہ کرچکا ہے۔ کام نکل جانے کے بعد ہمیشہ وعدہ خلافی کرتا ہے۔''

''اس مرتبہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''تمہارے کہنے سے میں یقین نہیں کرسکتا۔ فرعون اپنے منہ سے کہے گا تو... میں اپنے خدا سے اس کی سفارش کرسکتا ہوں۔''

''مچھروں کی وبا ایسی ہے کہ وہ کمرے سے نکل بھی نہیں سکتا اور وہ تم سے ملنے کو تیار بھی نہیں۔ تمہارا مقصد پورا ہورہا ہے۔ تمہیں جانے کی اجازت مل رہی ہے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''میں یہ بات اس کے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ اگر وہ یہاں نہیں آسکتا تو میں وہاں چلنے کو تیار ہوں۔''

''اس کے لیے تو فرعون کی رضامندی کی ضرورت ہے۔''

''مجھے بھی کوئی جلدی نہیں۔ وہ جب کہے گا میں آجاؤں گا۔''

''تمہیں جلدی نہیں مگر مجھے تو ہے۔'' ہامان نے کہا۔ ''پوری قوم کی زندگی تنگ ہو کر رہ گئی ہے۔ تم یہ مچھروں کا عذاب ختم کرو، باقی باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔''

''اس کے لیے مجھے بھی خدا کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب وہ کہے گا مچھروں کا عذاب اس وقت ختم ہوگا۔ ہاں اگر فرعون اپنی زبان سے اقرار کرے کہ وہ میری قوم کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے گا تو میں اپنے خدا سے اس کی سفارش کر سکتا ہوں۔''

ہامان نے جب دیکھا کہ بات بگڑنے لگی ہے۔ فرعون سے ملاقات کے بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام عذاب واپس لینے پر تیار نہیں ہوں گے تو وہ ملاقات کرانے کے لیے تیار ہو گیا۔

''میں فرعون سے اجازت لینے کے بعد کل پھر آؤں گا۔''

ہامان اور رخ نسوا اسرائیلیوں کی بستی سے نکلے اور محل پہنچ کر فرعون سے ملے۔ فرعون نے تمام باتیں غور سے سنیں لیکن ملاقات کے لیے تیار نہیں ہوا۔

''مجھے معلوم ہے وہ اس ملاقات میں کیا کہے گا۔ میں بار بار اس سے وعدہ کر چکا ہوں۔ وہ مجھے میرے وعدے یاد دلائے گا اور کہے گا میں اس کی نبوت و رسالت پر ایمان لے آؤں۔ میں اس کی یہ بات کیسے مان سکتا ہوں۔ میں اپنی قوم کا خدا ہوں۔ میں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تو پوری قوم اس پر ایمان لے آئے گی اور قصوروار مجھے ٹھہرائے گی۔ مجھے جھوٹا کہے گی اور الزام دے گی کہ میں نے اسے غلاموں کے حوالے کر دیا۔''

''اس وقت مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس سے ایک مرتبہ پھر وعدہ کر لیں تا کہ وہ اپنا عذاب واپس لے۔ ہمیں اتنی مہلت مل جائے گی کہ ہم کوئی اور ترکیب نکال لیں گے۔''

''کیا اس وعدہ خلافی کے بعد وہ کوئی اور جادو نہیں دکھائے گا؟''

''اس وقت کی اس وقت دیکھی جائے گی۔ ہمیں چاہیے کہ اس وقت تو اس مصیبت کو ٹال دیں۔''

فرعون نے تو ایسا انتظام کر لیا تھا کہ مچھروں سے اسے نجات مل گئی تھی اس لیے اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی قوم کس مصیبت سے دوچار ہے۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات سے انکار کر دیا۔

شہر میں سب کی زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ اس مصیبت سے تنگ آکر بعض لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں اور ان کی نبوت پر ایمان لے آئیں۔ بعض لوگوں کے دل اب بھی کفر سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں سے جھگڑ رہے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سچا ماننے کو تیار تھے۔ ہامان کو یہ خبریں برابر مل رہی تھیں۔ یہ امکان بڑھتے جا رہے تھے کہ قبطیوں میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ وہ ایک مرتبہ پھر فرعون کے پاس گیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''شاہی رعب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ کچھ دن یہی حال رہا تو تمام قبطی (فرعون کی قوم، مصری) موسیٰ علیہ السلام کے خدا پر ایمان لے آئیں گے۔ یہ سب بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل گئے تو ہمارا اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا۔ کسی طرح اس عذاب کو ٹالنے کا انتظام کیجیے۔ اب تو لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ آپ نے انہیں تنہا چھوڑ دیا ہے۔''

فرعون کو بھی یہ سب باتیں سن کر وحشت ہوئی۔ مجبور ہو کر اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات پر ہامی بھر لی۔

ہامان ایک مرتبہ پھر اسرائیلیوں کی بستی میں گیا اور فرعون کا پیغام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہنچا دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام محل میں آئے اور اس مخصوص کمرے میں پہنچا دیے گئے جہاں فرعون نے پناہ لی ہوئی تھی۔ گفتگو کا آغاز ہوا تو فرعون نہایت نرمی سے پیش آیا۔ لگتا تھا اس کا سارا کروفر رخصت ہو چکا ہے۔

''موسیٰ علیہ السلام، تمہارا جھگڑا تو مجھ سے ہے۔ تم نے میری پوری قوم کو کیوں عذاب میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ ان میں شیر خوار بچے بھی ہیں جنہیں تمہارے بھیجے ہوئے مچھروں نے کاٹ کاٹ کر بیمار ڈال دیا ہے۔ ان پر تو رحم کھاؤ۔''

''ان سب کو میں نے نہیں تم نے عذاب میں ڈالا ہے۔ وہ تیرے خوف سے مجھ پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ کی نافرمانی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے انہیں عذاب میں ڈال دیا ہے۔ اگر تو ایمان لے آئے تو وہ سب آزاد ہو جائیں گے۔"

"موسیٰ علیہ السلام یہ وقت بحث کرنے کا نہیں۔ تو فوراً اپنا جادو واپس لے اور میری قوم کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلا۔"

"میں نے تجھ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ یہ جادو نہیں۔"

"کچھ بھی ہے، اسے واپس لے۔"

"تو میری رسالت پر ایمان لے آ اور میرے لوگوں کو مصر سے نکل جانے دے۔"

"اپنے خدا سے کہو اس عذاب کو واپس لے۔ میں تیری رسالت پر ایمان لے آؤں گا اور تیری قوم کو بھی واپس جانے دوں گا۔"

"تو اس سے پہلے بھی یہ وعدہ کر چکا ہے اور پھر وعدہ خلافی کی۔ اب میں کیسے یقین کر لوں کہ تو وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔"

"اگر میں وعدہ خلافی کروں گا تو تیرے پاس تیرا جادو موجود ہے پھر کوئی جادو دکھا دینا۔"

"تیرے دل کی سیاہی ابھی دھلی نہیں، میرے بتانے کے باوجود تو اسے جادو کہہ رہا ہے۔"

"چل یہ معجزہ ہی سہی۔ تو خدا سے کہہ یہ عذاب ختم کر دے۔"

"میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ خلقِ خدا عذاب میں مبتلا ہو۔ میں تیرے وعدے پر یقین کرتا ہوں۔ تجھے ایک موقع اور دوں گا۔ اس کے بعد بھی اگر تو نے وعدہ خلافی کی تو تجھے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

فرعون نے ایک مرتبہ پھر مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے وعدہ کر لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین نہیں تھا کہ فرعون اس مرتبہ بھی اپنے وعدے کا پاس کرے گا لیکن وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ یقین نہیں کرے گا۔ وہ فرعون کو بار بار موقع دے کر حجت پوری کرنا چاہتے تھے۔ گھر آ کر وہ رب ذوالجلال کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔

"الٰہی! فرعون کو توفیق دے کہ وہ ایمان لے آئے۔ قبطیوں کے ایمان لانے میں فرعون سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ ایمان لے آئے گا تو پوری قوم ایمان لے آئے گی۔ مصریوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ مجھ سے ان کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی۔ تو ان کے سروں سے عذاب ٹال دے۔"

دعا قبول ہوئی۔ مچھروں میں کمی آتی چلی گئی اور آہستہ آہستہ وہ بالکل غائب ہو گئے۔

جب دوسرے دن کا بڑا حصہ گزر گیا اور مصریوں کو یقین آ گیا کہ مچھر دوبارہ لوٹ کر نہیں آئیں گے تو وہ بھی اپنی ازلی فطرت پر لوٹ آئے۔ اب تک یہ باتیں کر رہے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنا چاہیے اور اب لوگ یہ باتیں کرتے پھر رہے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام بہت بڑا جادوگر ہے۔ اگر ہمارے پاس بھی کوئی اتنا بڑا جادوگر ہوتا تو ہم موسیٰ علیہ السلام کو مزہ چکھا دیتے۔ اور جب کوئی یہ سوال کرتا کہ فرعون کا زور موسیٰ علیہ السلام پر کیوں نہیں چلتا تو وہ عجیب و غریب منطق یہ پیش کرتے کہ یہ فرعون ہی تو ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو بار بار اپنا جادو واپس لینے پر مجبور کر دیتا ہے کب تک جادو دکھائے گا آخر ایک دن تھک جائے گا۔

مصریوں کی یہی عادت تھی کہ جب کوئی عذاب نازل ہوتا تھا تو وہ ڈر جاتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی باتیں کرنے لگتے تھے اور جب عذاب ٹل جاتا تھا تو پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آتے تھے اور بدعہدی کے مرتکب ہو جاتے تھے۔

"اور ہم نے ان کو عذاب میں گرفتار کیا تاکہ وہ باز آ جائیں اور وہ کہنے لگے اے جادوگر! تو اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعا کر (کہ یہ مصیبت جاتی رہے) تو بلاشبہ ہم ہدایت قبول کر لیں گے۔ پھر جب ہم نے ان سے عذاب دور کر دیا تو پھر وہ بدعہد ہو گئے۔" (سورۃ زخرف)

عذاب دور ہو چکا تھا۔ فرعون کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام آئیں گے اور اپنی قوم کو ساتھ لے جانے پر اصرار کریں گے۔ بدعہدی کے لیے کون سا بہانہ تلاش کرے۔ اس کے دل میں یہ بھی خیال آیا کہ وہ اسرائیلیوں کو جانے دے اور عذابوں سے نجات پا لے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان کے ساتھ ہی چلے جائیں گے تو روز روز کے تقاضوں سے نجات مل جائے گی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے خیال کی تردید بھی کر دی۔ اگر بنی اسرائیل چلے گئے تو مصر کی متمدن زندگی کا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

خاتمہ ہو جائے گا۔ اسرائیلی ہی جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے ہیں۔ وہی عمارتیں بناتے ہیں۔ انہی کے دم سے شاہی مطبخ خانہ روشن ہے۔ جتنے رذیل اور گھٹیا کام ہیں وہ بھی اسرائیلی ہی کرتے ہیں۔ وہ چلے گئے تو یہ کام کون کرے گا۔

وہ بدعہدی کا جواز ڈھونڈنے کے لیے مختلف تدبیروں پر غور کرتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ تنگ آکر اس نے پورے ملک سے ارکان سلطنت کو طلب کر لیا کہ ان سے مشورہ کرے۔ سردارانِ قوم بھی اس کی مدد کے لیے آگئے۔ مصری قوم بھی اس کے ساتھ تھی کیونکہ اسرائیلیوں کا مصر سے چلے جانا ان کے لیے بھی نقصان دہ تھا۔

اراکین کے ہجوم کے سامنے فرعون نے وہ تمام باتیں رکھ دیں جو وہ اب تک سوچتا رہا تھا اور ان سے مشورہ مانگا کہ موسیٰ علیہ السلام کے تقاضوں سے کیسے بچا جائے۔

تمام اراکین نے اس امکان کو قطعی طور پر رد کر دیا کہ اسرائیلیوں کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دی جائے لیکن دوسری صورت ان کی بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

ہامان نہایت گھبراہٹ کے عالم میں فرعون کے پاس پہنچا اور اس سے اصرار کیا کہ وہ بپھرے ہوئے لوگوں سے خطاب کر کے ان سے یہ عہد کرے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں دے گا۔

ہامان کا اس سے مقصد یہ تھا کہ فرعون کہیں موسیٰ علیہ السلام کے دباؤ میں آکر یہ فیصلہ نہ کر بیٹھے۔ وہ ایک مرتبہ مصریوں کے سامنے جو وعدہ کرے گا، وہ اس سے پھر نہیں سکے گا۔

فرعون کی تو خدائی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ مصری کہیں اس کی طرف سے مایوس ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نہ مل جائیں۔ یہ سوچتے ہی وہ ان سے خطاب کرنے کے لیے پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی مجمع سجدے میں گر گیا۔ یہ دیکھ کر فرعون کی کچھ ہمت بڑھی۔ اس نے اپنے لوگوں کو سجدے سے سر اٹھانے کا حکم دیا اور مخاطب ہوا۔

”تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں موسیٰ علیہ السلام جیسے جادوگر سے ہار مان لوں گا۔ وہ مجھ سے باغی ہو گیا ہے۔ میں اسے مہلت دے رہا تھا کہ شاید راہِ راست پر آجائے۔ میری رعایت کا اس نے غلط فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنے جادو کرتا ہے لیکن میں اس کی قوم کو نہیں جانے دوں گا۔ وہ تمہاری غلامی کرنے کے لیے مصر میں رہیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اکیلے جانا ہے تو میں اسے روکوں گا نہیں۔ وہ اس کے بعد بھی جادو دکھاتا رہے گا۔ تم گھبرانا مت جس طرح اب تک میں ہر عذاب کو ٹالتا رہا ہوں اسی طرح آئندہ بھی تمہاری حفاظت کروں گا۔ بس اب تم جاؤ۔ اپنے اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھو۔ میں کب کا موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرا دیتا لیکن دیوتاؤں نے فیصلہ کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو زندہ رکھا جائے۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور مجھے اپنا رب تسلیم کرے گا۔“

وہی مصری جو غصے میں بھرے ہوئے آئے تھے، خوشی میں سرشار ناچتے گاتے واپس چلے گئے۔

ہامان اتنی دیر میں ایک اور فیصلہ کر چکا تھا۔ فرعون واپس آیا تو ہامان اپنے فیصلے کی وضاحت کے لیے تیار تھا۔

”موسیٰ علیہ السلام اب تک یہ کہتا رہا ہے کہ اس کی قوم کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے۔ اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ جو میرے ساتھ جانا چاہتے ہیں، انہیں جانے دیا جائے۔ ہم بھی اس سے یہی کہتے رہے ہیں کہ ہم اس کی قوم کو اس کے ساتھ جانے دیں گے۔“

”ہامان، تو اپنی اس طویل تقریر سے ثابت کیا کرنا چاہتا ہے۔“ فرعون نے بیچ میں دخل دیا۔

”اگر ہم بنی اسرائیل میں ایک ایسا گروہ تیار کر لیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جانے کو تیار نہ ہو تو ہمیں اپنا عہد توڑنے کا جواز مل جائے گا۔ ہم اس سے کہیں گے کہ ہم نے پوری قوم کا وعدہ کیا تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ کو جانے دیں کچھ کو نہ جانے دیں۔“

”کیا اس طرح وہ مصری قوم پر پھر کوئی جادو نہیں کرے گا؟“

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر۔ توریت،......ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

انسان بہت نادان ہے... کیونکہ وہ خدا کی مصلحتوں کو نہیں سمجھ سکتا اور اپنی جلدبازی میں وہ اس نعمت کی قدر نہیں کر پاتا جو اس کی زندگی کے لیے سکون بخش ثابت ہوسکتی ہے بلکہ اس چیز کے پیچھے دوڑتا ہے جس میں اس کی تباہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کی سوچوں نے بھی مفاد پرستی کے جھانسے میں آکر یہی غلط سمت اختیار کی اور عمر بھر کی سیاہی مقدر میں لکھوالی۔

زندگی کی دوڑ میں زندگی کے رموز کو سمجھنے والے اصل کھلاڑی کی پہچان

اصل کھلاڑی

عمیر علی

''ریحان! سنو میں تنگ آ گئی ہوں، آخر کب تک ایسا چلے گا۔''

''بس ماہم! کچھ دن اور صبر کرلو پھر میں تمہیں سب سے چرا کر لے جاؤں گا۔'' ریحان نے نچھاور ہوتے ہوئے کہا۔

''بس رہنے دو۔ تم ہر بار یہی کہہ دیتے ہو۔ تم جانتے ہو اماں نے دل کے دورے کا ناٹک رچا کر مجھے اس شادی کے لیے مجبور کیا۔ میں نے ہر کوشش کی کسی طرح تمہیں بھلا کر نبیل کے ساتھ دل لگا سکوں لیکن کچھ ہی دن میں مجھے اندازہ ہو گیا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کہ یہ جھوٹ اور دکھاوے کے سوا کچھ نہیں اور میں اس جھوٹ کے ساتھ پوری عمر نہیں گزار سکوں گی۔" بات کرتے کرتے ماہم کا لہجہ بھرا گیا۔

"ارے رومت یار۔ اور پھر تمہارا نکاح بھی تو ہوا ہے اس کے ساتھ۔ اس کا کیا کریں گے ہم۔" ریحان نے استفسار کیا۔

"میں نہیں مانتی اس نکاح کو۔ جب شروع دن سے میں نے کچھ قبول نہیں کیا تو کیسا نکاح اور کیسا رشتہ۔"

"اچھا بابا سوچتے ہیں کچھ۔" ریحان نے بات ختم کرنے کو کہا۔ "چلو کچھ پیار کی بات ہو جائے کب مل رہی ہو پھر۔"

"سنو، دستک ہوئی ہے۔ شاید وہ آگیا ہے۔ اب کوئی میسج مت کرنا۔" ماہم نے جلدی سے لکھا اور واٹس ایپ پر موجود تمام گفتگو جو ریحان سے ہوئی تھی اسے ختم کر کے دروازہ کھولنے کے لیے بڑھی۔

دروازہ کھلنے پر نبیل کا روزانہ کی طرح مسکراتا ہوا چہرہ سامنے تھا۔

"کیسی ہو ماہی۔ یہ لو گلدستہ...... خاص تمہارے لیے لایا ہوں۔ چلو کہیں کھانے پر چلیں۔" نبیل اندر آتے ہی چہچہانے لگا۔

"نہیں، میرا موڈ نہیں ہے۔" ماہم نے پہلی فرصت میں عدم دلچسپی کا اظہار کر دیا۔

"کیا بات ہے...... طبیعت تو ٹھیک ہے ماہی؟ کچھ بجھی بجھی سی رہنے لگی ہو۔ کسی بات کی ناراضگی ہے۔" اس کے صاف انکار پر نبیل کچھ گڑبڑا سا گیا لیکن پھر ماتھے کی شکنیں درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بس میرا دل نہیں چاہ رہا کہیں جانے کو۔" ماہم کا لہجہ بدستور روکھا رہا۔

زبردستی رشتہ نبھانے کی تان بالآخر ٹوٹنے لگی تھی یا شاید اب اس نے بھی یہ بازی کھل کر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر یہ اکثر ہونے لگا۔ نبیل اس کی طرف بڑھتا لیکن ماہم کا انداز ہمیشہ روکھا سا رہتا بلکہ بعض اوقات تو وہ ہتک آمیز رویے سے پیش آنے سے بھی گریز نہ کرتی۔ نبیل جانے کس مٹی کا بنا تھا جو ہر بار بات ٹال جاتا۔ شاید اس کا خیال تھا کسی نہ کسی دن تو ماہم کا دل پگھل جائے گا، لیکن اندر ہی اندر وہ کڑھنے لگا تھا۔ دوسری طرف ماہم یہ سوچتی تھی کہ نبیل تنگ آ کر خود کسی دن اس سے دور ہونے کا فیصلہ کر لے گا اور یوں اس پر الزام بھی نہیں آئے گا بلکہ وہ مظلوم ثابت ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں ایک مطلقہ عورت کے لیے جب ریحان کا رشتہ آئے گا تو اس کے گھر والے انکار نہیں کر سکیں گے۔

☆☆☆

اسلم صاحب ایک کاروباری آدمی تھے جن کا کاروبار خوب ترقی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہ ایک خوش اخلاق شخص بھی تھے جس کی وجہ سے انہیں حلقۂ احباب اور محلہ بھر میں معزز ترین سمجھا جاتا تھا۔ ان کی بیگم رقیہ، ایک سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ ماہم اس امیر گھرانے کی اکلوتی اولاد تھی جس پر اسے ہمیشہ مان رہا لیکن پھر بھی وہ ریحان کی باتوں میں جانے کیسے آگئی۔

"ریحان! آپ کب اپنے گھر والوں کو رشتہ لینے بھیج رہے ہیں۔" ماہم اکثر فون پر یہی استفسار کرتی۔

رشتے کی بات پر پہلے تو ریحان گڑبڑا جاتا۔ ایک تو زمانے بھر کا ہڈ حرام اور نکھٹو۔ کوئی کام دھندا نہیں۔ دوسرا محلے بھر میں آوارہ گرد مشہور تھا۔ ایک دن اس نے ماہم کو گلی سے گزرتے ہوئے دیکھا اور بس دوستوں میں کہہ دیا۔ "یہ تمہاری بھابی ہے۔ دیکھنا ایک نہ ایک دن میں اسے اپنا بناؤں گا اور خبردار جو تم لوگوں میں سے اب کسی نے اسے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا۔"

"ارے جا بے، بہت اونچی ناک والی ہے بھئی تیرے ہاتھ نہیں آنے والی۔" اس کے دوستوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔

"چلو بچو، لگی شرط۔" اور پھر لگاتار کوششوں سے اس نے ایک دن اسے شیشے میں اتار ہی لیا۔

"بس میری جان! آج کل میں امی سے بات کرتا ہوں۔" وہ رٹا رٹایا جملہ دہراتا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی اس کا اعتبار نہیں کرتا تھا کوئی عزت نہیں تھی لیکن جب خوبصورت ماہم کو دیکھتا تو پھر سوچتا ایک کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ بیٹھے بٹھائے اگر ایک حسین وامیر بیوی مل جائے تو برا کیا ہے۔ پھر ایک دن اس نے اپنی والدہ کے سامنے اپنی بات رکھ ہی دی۔

"کیسی باتیں کرتے ہو ریحان۔ تم کوئی کام دام تو کرو پہلے۔ لڑکی والے پوچھیں گے تو کیا کہیں گے اور پھر وہ تو بہت بڑے لوگ ہیں۔ مانا کہ رقیہ بیگم میری اچھی دوست ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس رشتے کے لیے راضی ہو جائیں گے۔" نسیمہ بی بی نے بے بسی سے کہا۔

"اماں! آپ بات تو کریں۔ آخر مجھ میں کمی کیا ہے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہٹا کٹا ہوں، جوان ہوں، خوبصورت ہوں۔ کام بھی کرنے لگوں گا نا۔'' ریحان بضد رہا۔

''اچھا چلو میں بات کروں گی مگر مجھے ڈر ہے کہ محلے بھر میں سبکی نہ ہو جائے۔'' نسیمہ بی بی نے ہتھیار ڈال دیے مگر ان کا دل آنے والے وقت کو سوچ کر ہی ڈرنے لگا۔ گو رقیہ بیگم سے ان کی اچھی بنتی تھی لیکن رشتہ وہ بھی ریحان جیسے لڑکے کا۔ بیٹے سے محبت کے باوجود وہ اس کی حقیقت جانتی تھیں اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رقیہ بیگم سنتے ہی بھڑک اٹھیں۔

''ارے نسیمہ...... کیا کہہ رہی ہو۔ تم میری بہت اچھی دوست ہو، جب سے میں اس محلے میں آئی ہوں تم ہی کو اپنا مانا مگر تم ذرا ریحان کو دیکھو۔ محلے بھر میں سب جانتے ہیں اس کو۔ تم سے دوستی کی خاطر میں چپ رہوں گی پر اب یہ بات دوبارہ مت کرنا۔'' انہوں نے گویا بات ختم کر دی۔

''امی! آپ نے نسیمہ خالہ کو کیوں منع کیا؟'' ماہم کے پوچھنے پر رقیہ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے انہیں اندازہ نہ تھا۔ انہوں نے ماہم کو ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ایک دن وہ صبح شور کی آواز سے اٹھی۔ گھر میں عجیب افراتفری تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو سلیم صاحب کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ ''جلدی گاڑی لے آؤ۔ جتنی جلدی ہو سکے پہنچو خدارا۔''

''ابو! کیا ہوا۔ آپ پریشان کیوں ہیں؟'' ماہم نے استفسار کیا۔

''بیٹا! تمہاری اماں کو ہوش نہیں آ رہا۔ میں نے تمہارے خالو کو فون کیا ہے۔ بس آتے ہی ہوں گے پھر اسپتال لے کر جاتے ہیں۔'' انہوں نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

یہ سن کر تو ماہم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ جانتی تھی ضرور اماں نے اسی کی پریشانی کو سر چڑھایا ہوا ہے۔ وہ جلدی سے رقیہ بیگم کے پاس پہنچی۔ انہیں ہوش میں لانے کے جتن کرتی رہی۔ اتنی دیر میں ابا اندر آئے۔

''تمہارے خالو تو دور تھے اس لیے انہوں نے فوری طور پر نبیل کو بھیجا ہے چلو اسے اسپتال لے چلیں۔''

وہ آنا فانا اسپتال پہنچے۔ گھنٹے بھر بعد رقیہ بیگم نے آنکھ کھولی تو قریب بیٹھی ماہم جو مسلسل پشیمانی میں سلگ رہی تھی فوراً قریب آئی اور رونے لگی۔

''امی مجھے معاف کر دیں۔'' وہ مزید کچھ نہ کہہ پائی۔

اتنے میں سلیم صاحب اور نبیل بھی اندر لپکے۔

''کیسی طبیعت ہے۔'' انہوں نے اندر آتے ہی پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' رقیہ بیگم نے بہ مشکل کہا۔ ''ماہم شاید میرا وقت قریب ہے میری آخری خواہش سمجھ کر نبیل کو اپنا لو۔'' انہوں نے دھیرے سے کہا جسے ماہم اور سلیم صاحب نے تو سن لیا مگر قدرے دور کھڑا نبیل نہ سن پایا۔ ماہم جو پہلے ہی پشیمانی کی حدوں کو چھو رہی تھی انکار نہ کر پائی اور یوں کچھ ہی دنوں میں وہ بیاہ کر نبیل کے گھر آ گئی۔ نبیل کے ساتھ نباہ کرنے کی اس نے شروع میں کافی کوشش کی جب دل نہ لگتا تو میکے آ جاتی۔ کبھی گزرتے وقت ریحان سے نظریں مل جاتیں تو ایک کسک سی دل میں اٹھتی۔

''ماہم کے ابو، آپ جانتے ہیں مجھے مکر و فریب پسند نہیں لیکن اس کے مستقبل کے لیے مجھے زندگی میں پہلی بار یہ ڈراما کرنا پڑا۔ اللہ اس کے حق میں بہتر کرے۔''

''تم نے جو کیا ٹھیک کیا بیگم۔ بچوں کے حق میں والدین کبھی برا نہیں سوچتے لیکن انہیں اس بات کا احساس ہو تب نا۔''

وہ ایک دن اور ایک رات جو میکے گزارنے آئی تو اس نے رات گئے رقیہ بیگم اور سلیم صاحب کی سرگوشیاں سنیں اور اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ سب محض ایک ناٹک تھا جس کا سلیم صاحب بھی باقاعدہ حصہ تھے۔ وہ جو پہلے ہی بمشکل نبیل کے ساتھ دل لگانے کی ناکام جستجو کر رہی تھی، مزید بکھر گئی۔ اب اسے اپنے گھر والوں کے ساتھ نبیل بھی اس کا مجرم محسوس ہونے لگا۔ حالانکہ وہ اس تمام واقعے سے یکسر بے خبر تھا۔ البتہ جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی اس نے ماہم کے علاوہ کسی اور کو آنکھ بھر کر نہ دیکھا تھا۔

☆☆☆

''سنو ماہم! کب ملو گی یار...... ایک بار تو مل لو۔ ایک بار تمہیں جی بھر کر اپنا بنا لوں۔'' ریحان کے الفاظ میں اس کا سارا مقصد واضح ہوتا لیکن جانے کیوں اندھے جذبات کا مظاہرہ کرتی لڑکیوں کی طرح ماہم کو بھی وہ ہمیشہ اس کے پیار کا ایک رنگ لگتا۔

''جب تم مجھے یہاں سے لے جا کر اپنا بنا لو گے پھر ہم صرف ایک دوسرے کے ہوں گے۔ میں اسی وقت کے انتظار میں ہوں ریحان۔ بس وہ وقت جلدی لے آؤ۔'' وہ انہی باتوں میں گم تھی کہ دستک ہوئی اور اس نے جلدی سے بات ختم کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"کیسی ہو ماہی، بھئی غصہ جانے دو، ذرا ہمارا خیال بھی کرلیا کرو۔" ماہم کی تمام تر بدمزاجی کے باوجود ایک پراسراری مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقصاں رہتی لیکن وہ سوچتا آخر کب تک وہ یہ کوشش کر سکے گا؟ جس سے بسا اوقات ماہم الجھ کر بھی رہ جاتی۔ کبھی وہ سوچتی کہ ماضی کو بھلا کر ایک مثالی شوہر کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کرے اور کبھی پھر جذبۂ انتقام اور جذبۂ محبت غالب آجاتا اور ان جذبات میں وہ اتنا بھی نہ سمجھ پاتی کہ اس کے والدین نے جو قدم بھی اٹھایا، وہ اسی کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اور اسی کی بہتری کی خاطر اٹھایا۔

گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ اس پر ریحان کی باتوں کا اثر بڑھنے لگا اور جو موہوم سا جذبہ اور لگاؤ جو نبیل کی چاہت کے نتیجے میں اس کے لیے 'اٹھتا تھا' وہ دم توڑنے لگا۔ لیکن نبیل جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا جو اس کا ہر رویہ نظرانداز کردیتا۔ جس کی وجہ سے اسے وہ فیصلہ کرنا پڑا جو وہ نہیں چاہتی تھی۔

"ریحان! اب مزید مجھ میں یہ سب سہنے کا حوصلہ نہیں۔ نبیل پر تو میرے رویے کا اثر ہونے سے رہا۔ بس ہمیں اب یہاں سے دور جانا ہوگا۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ میں تمہاری خاطر کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ فکر نہ کرو میں کچھ انتظام کرنے کے بعد تمہیں بتاؤں گا پھر ہم ہمیشہ کے لیے یہاں سے دور چلے جائیں گے۔" ریحان اسے یقین دلاتا۔

☆☆☆

نبیل کو کسی کاروباری کام کی وجہ سے دو دن کے لیے شہر سے باہر جانا پڑا تو انہیں اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا موقع مل گیا۔ جب اسے تسلی ہوگئی کہ نبیل اب شہر سے کافی دور جا چکا ہوگا تو اس نے ریحان کو آنے کا کہہ دیا۔ تمام انتظامات مکمل ہونے کا اشارہ وہ بہت پہلے ہی دے چکا تھا۔ جاتے جاتے وہ نقدی اور زیورات لینا نہ بھولی کیونکہ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت تو تھی اور یہ بات وہ بخوبی جانتی تھی کہ ریحان کے پاس فی الحال کچھ بھی نہیں۔

"کوئی بات نہیں۔ میرا سب کچھ بھی تو اسی کا ہے اور جب وہ کوئی اچھا سا کاروبار کرلے گا تو وہ سب ہمارا ہی تو ہوگا۔" وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی، اتنے میں موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"تیار ہو؟ میں گلی کے کونے پہ سفید رنگ کی گاڑی میں موجود ہوں، جلدی سے آجاؤ۔" ریحان نے اتنا کہا اور فون بند کردیا۔

رات کے اندھیرے نے وہ منظر دنیا کی آنکھوں سے چھپا لیا جب وہ ایک سوٹ کیس لیے گھر سے نکلی اور جلدی سے گلی کے کونے پر کھڑی گاڑی میں سوار ہوگئی۔ ریحان نے جلدی سے گاڑی بھگائی اور شہر سے باہر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

"ہم کہاں جارہے ہیں ریحان؟" ماہم نے مسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"فکر نہ کرو۔ ہم اپنی نئی دنیا نئے شہر میں شروع کریں گے، میں نے گھر کا انتظام کرلیا ہے۔"

"ہاں اور تم کوئی اچھا سا کام کرلینا تاکہ ہم سکون سے اپنی زندگی گزار سکیں۔" ماہم نے کہا تو ریحان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نظر آئے۔ اسے ہمیشہ یہ نصیحت ایک طعنہ لگتی تھی لیکن پھر کمال مہارت سے وہ اپنے تاثرات چھپا کر شیریں لہجے میں گویا ہوا۔

"میری جان! تم فکر نہ کرو میں کچھ نہ کچھ کروں گا، بس کاروبار کے لیے پیسا چاہیے۔" ماہم نے اسے کئی بار کہا تھا کہ وہ نئی زندگی کے لیے خاطر خواہ رقم ساتھ لائے گی۔ لیکن تصدیق کے لیے ریحان نے براہ راست پوچھنے کے بجائے یوں بات کی اور حسب توقع ماہم بول پڑی۔

"اس کی فکر مت کرو، اس کا انتظام میں کرچکی ہوں۔"

خوبصورت عورت اور ڈھیر سارا مالِ مفت۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ریحان کے پاؤں کا دباؤ ایکسلریٹر پر بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

نئی جگہ، نئی زندگی میں آتے ہی وہ دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے۔ پھر انہیں دن رات زماں و مکاں کا کوئی ہوش نہ رہا۔ صرف ریحان دو تین بار نکلا اور شام تک واپس آگیا۔ تاکہ وہاں کسی کو اس پر شک نہ ہو۔ جانے کتنے دنوں بعد کچھ ہوش میں آنے پر ماہم کو خیال آیا۔

"ریحان! اب تمہیں کوئی چھوٹا موٹا کام کرلینا چاہیے، ورنہ تو ساری رقم جلد ختم ہوجائے گی پھر ہم آگے زندگی کیسے گزاریں گے۔"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ جو رقم اور زیورات ہیں وہ مجھے دے دینا۔ میں کسی کاروبار کا سوچتا ہوں۔ تم فکر مت کرو اور ہاں میں ذرا گھر کا چکر دوبارہ لگالوں تاکہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔ نبیل کا تو کوئی پتا نہیں کہاں ہے، شاید تمہارا مجنوں تمہارے غم میں کہیں جان دینے چلا گیا ہوگا۔ اس لیے ابھی کسی کا دھیان میری طرف نہیں گیا۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ماہم نے مطمئن ہوکر رقم اس کے حوالے کی اور اسے محبت سے رخصت کیا۔ واقعی اس کا شک کے دائرے سے باہر رہنا بھی ضروری تھی اور یہ کام نبیل نے خود آسان کردیا تھا۔ لیکن اس کے غائب ہوجانے کے پیچھے کیا وجہ ہوسکتی تھی یہ خلش اس کے دماغ میں بھی تھی۔ پھر سوچ کے گھوڑے دوڑا کر وہ بالآخر ریحان کے نقطہ نظر کے مطابق ہی سوچتی کہ ضرور وہ بھی مارے شرم یا غم کے کہیں جا چھپا ہوگا۔ بہرحال ان کے حق میں تو اچھا ہی تھا۔

☆☆☆

کئی دنوں تک وہ دونوں گھر کے اندر ہی محصور رہے لیکن دسواں روز آنے پر بھی وہ اس ماہ رخ کی کوئی جھلک نہ دیکھ پایا۔ البتہ ایک لڑکے کو دو ایک بار اس نے وہاں سے نکلتے ہوئے اور شام سے پہلے واپس آتے ضرور دیکھا۔ اس دشمنِ جاں کی اس قدر پُرسکونی کا خیال کر کے اسے گویا تسلی سی ہونے لگی تھی۔ اس نے سوچا اسے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا جب گیارھویں روز ان کا دروازہ کھلا اور وہی قدرے لاابالی سا لڑکا ہاتھ میں ایک بریف کیس لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے رقیب کو رخصت کرتے وقت تاسف کے ساتھ ساتھ بے انتہا محبت بھی وہ اس ظالم کے چہرے پر دیکھ چکا تھا جسے اس نے بہت چاہا تھا۔

رات کے کسی پہر جب اسے یقین تھا وہ سو چکی ہوگی، وہ چپکے سے اس کے گھر کی طرف بڑھا۔

ایک اور اندھیری رات تھی جس میں ایک دل شکستہ شخص شہر کے خارجی راستے پر اپنی گاڑی دوڑا رہا تھا۔ جانے اس آوارہ گرد کی اگلی منزل کیا تھی اور وہ پیچھے کیا نشان چھوڑ آیا تھا۔

☆☆☆

تین دن ہونے کو تھے ابھی تک ریحان کی کوئی فون کال نہیں آئی تھی اور اس کا نمبر بھی مسلسل بند جا رہا تھا۔ اسے تشویش ہونے لگی تھی۔ جانے ادھر کیا حالات ہوں۔ کہیں وہ دھر تو نہیں لیا گیا۔ وہ ڈر کے مارے دروازے تک بھی نہ جاتی حالانکہ وہ ایک اجنبی مقام پر تھی جہاں پہچان لیے جانے کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ اسی ادھیڑبن میں اس نے ایک دن اپنی ماں کا نمبر ملا دیا۔

اس کی آواز سنتے ہی وہ جیسے پھٹ پڑیں۔

”کہاں ہو تم لوگ۔ اچانک کہاں گم ہوگئے ہو۔ پہلے تو مجھے لگا کہ تم نے کوئی کارنامہ دکھا دیا ہوگا لیکن اس آوارہ

موسم گرما کی کروٹیں لیتی انگڑائیاں
اپریل کے شمارے کی نت نئی جاودانیاں
اولین صفحات
گناہوں بھرے خیال سے لبریز چالاک......
چست اور عیار مجرم کی چال...... **امجد رئیس**
کے قلم سے پُرتجسس و سنسنی خیز سوغات
انگارے
دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی
آوارہ گرد
چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت......
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی
سرورق کے رنگ
محبت اور بغاوت کے اصولوں کو توڑتی تیز رفتار کہانی
زن۔ زر اور لالچ کا چنگھاڑتا طوفان...... سرورق کی تیکھی کہانی
چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گرد کو دو ایک بار دیکھا تو دل سے یہ گماں نکل گیا۔ پھر نبیل کا بھی کوئی اتا پتا نہیں۔ آخر ہو کہاں تم لوگ؟ تمہیں پتا ہے میرا اور تمہارے ابا کا کیا حال ہے۔" وہ رونے کے دوران بمشکل بولیں۔

اس نے جھٹ سے فون بند کر دیا۔ والدین تو اس کے لیے گویا دشمن تھے۔ اسے تو صرف ریحان کی خیریت مطلوب تھی جو اسے مل گئی لیکن وہ رابطہ کیوں نہیں کر رہا تھا؟

☆☆☆

"ریحان! تم کہاں ہو؟ کوئی رابطہ نہیں، کسی مصیبت میں تو نہیں؟ لیکن ایسا ہوتا تو امی کے منہ سے ایسا کچھ ضرور نکلتا۔" انہی خیالوں میں گم تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جلدی سے دیکھا تو وہی تھا۔ جلدی سے فون کا سبز بٹن دبایا اور ادا سے بولی۔

"کہاں گم ہو گئے تھے؟ بہت بے مروت ہو گئے ہو۔"

"ماہی! میرا خیال ہے تم نبیل کے پاس واپس لوٹ جاؤ۔"

اس نے گویا بم پھوڑا۔

"کیا بکواس ہے؟ آئندہ ایسا مذاق بھی بھولے سے مت کرنا میری جان نکل جائے گی۔"

"یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ میں نے تمہیں جب پہلی بار دیکھا تھا تو بھی فیصلہ کر لیا تھا ایک دن تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔ اور میں نے ایسا کر لیا۔ اس سے بڑھ کر تم میرے لیے کچھ بھی نہیں۔ اور ہاں، یہاں آ کر مجھ پر الزام لگانے سے پہلے سوچ لینا کہ یہاں میں سب کے سامنے رہا ہوں اور میرے پاس ہر طرح کے ثبوت موجود ہیں اس لیے اس میں تمہاری ہی بدنامی ہوگی اور ہاں دولت کی اس پوٹلی کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہوں گا اتنا احسان فراموش نہیں ہوں میں...... اللہ حافظ۔"

فون کٹنے کی آواز گویا اس کے منہ پر زوردار طمانچہ تھا۔ اس کے آگے کی زندگی وہ کیسے گزارے گی اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ انہی ان گنت سوالوں کے بیچ و خم میں الجھتے جانے کب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆☆☆

"نبیل!"

اس نام کے علاوہ اسے اپنے سوالوں کا کوئی جواب نہ سجھائی دیا۔

"میں کچھ نہ کچھ کہہ کر اسے منا لوں گی۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اسے ماننا ہی ہوگا۔ وہی میری آخری جائے پناہ ہے۔"

انہی سوچوں میں گم وہ بیرونی دروازے کے پاس سے گزری تو ایک لفافے پر اس کی نظر پڑی۔ لپک کر اس نے وہ لفافہ اٹھایا۔

"ہونہہ...... ایک رات میں ہی پگھل گیا۔ نہیں رہ سکا میرے بغیر۔" ریحان کا معافی نامہ اس کے سامنے تھا۔ اسے کھولتے ہی وہ بھونچکا رہ گئی۔

"تاعمر تمہارا نبیل......!

... ماہی تم سوچ رہی ہو گی میرا خط یہاں اس جگہ جہاں تم سب سے چھپ کر آئی ہو کیسے پہنچ گیا۔ فکر مت کرو، تمہارا یہ راز میں کبھی افشا نہیں کروں گا۔ تمہاری خوشی ہی میری خوشی ہے۔

میں تمہیں اس وقت سے چاہتا ہوں جب مجھے چاہت کا مفہوم بھی نہیں معلوم تھا۔ پھر تم سے شادی ہوئی تو گویا میں خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھنے لگا۔ تم بھی کافی خوش دکھائی دیتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ تم اداس رہنے لگیں۔ اور یہ میں کیسے دیکھ سکتا تھا۔ سوچا تم ضرور کسی اپنے سے کہتی ہو گی.... مگر کسی سے ایسا کوئی جواب نہ ملا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے تمہارا واٹس ایپ اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ جوڑ لیا تاکہ میں تمہیں خوش کرنے کا راز جان سکوں۔ آخر کسی سہیلی کسی ہمراز سے تو تم اپنی پریشانی کہتی ہو گی۔ بس وہی جان کر میں اس کا سدباب کر سکوں۔ لیکن یہ جان کر کہ تمہاری خوشی میرے ساتھ نہیں بلکہ کسی اور کے ساتھ ہے، مجھے کرب کے ایسے سمندر سے گزرنا پڑا جہاں میرا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ تھا۔ میں وہ سب جان گیا جو تم مجھ سے چھپاتی رہیں۔ میں نے سب جانتے ہوئے بھی اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ اپنی محبت سے تمہیں اپنا بنا لوں پر جب یہ سب نہ ہوا تو تمہیں جانے کا رستہ دے دیا۔

جب تم لوگوں کی گاڑی اس شہر سے نکلی تو اس کے پیچھے کئی ایک گاڑیوں میں میری بھی ایک گاڑی تھی لیکن میرا مقصد محض تمہیں خوش دیکھنا تھا۔ اب جب تمہیں اپنے رقیب کے ساتھ خوش دیکھ چکا ہوں تو میں نے فیصلہ کیا ہے میں بھی کسی انجانی منزل کی طرف بڑھ جاؤں۔

فقط تمہارا خیر خواہ۔"

خط کے ساتھ اس کی آخری امید بھی ہاتھ سے چھوٹ کر گری اور وہ دھڑام سے فرش پر آ رہی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جرمِ وفا

ثمر عباس

محبت میں نہ تو شراکت قابلِ برداشت ہوتی ہے اور نہ ہی دغا... وہ جو اس کی خاطر ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار رہتا تھا جو اس کی ہمت سے بھی زیادہ ہوتا مگر اس کی جفاؤں نے خود اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا کیونکہ غداری تو جیون کے سفر میں کسی بھی صورت قبول نہیں ہوسکتی۔

محبوب کے لیے جان دینے اور جان لینے والے ایک دیوانے کا قصہ

ایک زوردار آواز نے انیتا کو چونکا دیا اور وہ اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔ ایک بھاری اور بھورے رنگ کا ناریل درخت سے گر کر اس کے سامنے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سکون کا سانس لیا کہ اس کا سر بچ گیا۔

''اوہ۔'' آنٹی مینا دروازے کی طرف لپکتے ہوئے بولی۔ ''یقین نہیں آتا کہ اس درخت پر اتنی جلدی پھل آگیا۔ تمہیں موہن کو بلانا ہوگا۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔''

''وہ کہتا ہے کہ اب درختوں پر نہیں چڑھے گا۔'' انیتا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' مینا نے اصرار کیا۔''میں نے اسے بارکیٹ میں دیکھا تھا۔اس کے کپڑوں سے ویسی ہی بو آ رہی تھی جیسی درخت پر چڑھنے والوں سے آتی ہے۔''

انیتا نے سر اٹھا کر ناریل کے درخت کو دیکھا۔ چاندنی راتوں میں اس کا نظارہ بڑا دلفریب ہوتا ہے لیکن فصل کا موسم گزر جانے کے بعد پکے ہوئے ناریل بہت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اسی لیے انیتا بادلِ ناخواستہ موہن سے ملنے کے لیے تیار ہوگئی۔

اگلے روز صبح سویرے انیتا آٹو رکشا میں سوار ہوکر موہن سے ملنے چل دی۔ اس کا گھر ایک کچی سڑک پر تھا۔ انیتا نے ایک چھوٹے دو کمروں کے مکان کے سامنے رکشا رکوایا۔ موہن کی بیوی روہنی نے انیتا کو آتے دیکھا تو بولی۔

''وہ جا چکا ہے۔ اسے دفتری ملازمت مل گئی ہے۔''

اس نے اپنے کندھے اوپر اٹھائے اور فخریہ انداز میں بولی۔ ''یہ کام درختوں پر چڑھ کر ناریل توڑنے سے بہتر ہے۔''

انیتا نے کچھ کہنا چاہا لیکن روہنی نے اپنی بات جاری رکھی اور بولی۔ ''اب وہ تھوڑے سے پیسوں کے لیے درخت پر نہیں چڑھے گا۔'' لگتا تھا کہ انیتا کو انکار کرکے وہ بہت خوش ہو رہی ہے۔

''یقیناً کوئی اچھی ملازمت ہوگی۔'' انیتا نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ موہن کو ایک چھوٹے بینک میں چپڑاسی کی نوکری مل گئی ہے۔ اس نے نہ صرف یہ کہ ناریل توڑنے کا منافع بخش کام چھوڑ دیا بلکہ اپنی تمام جمع پونجی اس مکان کو خریدنے پر لگا دی۔ وہ دروازے میں جھانک کر دیکھ سکتی تھی کہ اس نے سامانِ آرائش کی خریداری میں کافی رقم خرچ کر دی ہے۔ اس کے بچے نہیں تھے اور اس نے ایک مرتبہ انیتا سے کہا تھا کہ اس کا خیال ہے بہتر گھریلو ماحول ملنے سے اس کے حالات بدل جائیں گے۔

''وہ گھر کب واپس آئے گا؟'' انیتا نے پوچھا۔

''یہ پوچھنے کی زحمت نہ کرو۔'' ایک بوڑھی عورت نے اسے مشورہ دیا جو اپنے ہاتھ میں ایک ٹوکری اٹھائے اس طرف آ رہی تھی۔ ''اسے ہر چیز خوب صورت چاہیے اور اس کا شوہر اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔''

''تم حسد کرتی ہو۔'' موہن کی بیوی نے پڑوسن پر انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کیا برائی ہے اگر میں زندگی میں خوب صورتی چاہتی ہوں؟''

''میں اتنی بے وقوف نہیں کہ تم سے حسد کروں۔''

انیتا جانتی تھی کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ وہ عورتیں ایک دوسرے کی بے عزتی پر کمربستہ تھیں اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے جملے سن کر انیتا لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے دونوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔

''ہم برباد ہوگئے۔'' آنٹی مینا نے انیتا اور روہنی کی گفتگو کا احوال سننے کے بعد کہا۔ ''ستمبر شروع ہو چکا ہے اور جلد ہی سیاح آنا شروع ہو جائیں گے۔ اگر اسی طرح ناریل گرتے رہے تو لوگوں کا سر پھوٹنے اور کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کا خطرہ ہے۔ ہمارا سارا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔''

''میں رات کو گھر جا کر اس سے بالمشافہ گفتگو کروں گی۔'' انیتا نے کہا۔

''یہی کرنا پڑے گا۔'' آنٹی مینا کو پریشانی تھی کہ اگر ناریل نہ توڑے گئے تو کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

لیکن جب انیتا وہاں پہنچی تو اسے گلی کے سرے پر ہی ایک پولیس والے اور کئی لڑکوں نے روک لیا۔ ''موہن کی بیوی مر گئی۔''

''اس کے سر پر بہت زور سے چوٹ لگی۔'' سب سے لمبے لڑکے نے بتایا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟''

پولیس والے نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

وہی لڑکا بولا۔ ''جب موہن کام سے واپس آیا تو اس کی بیوی گھر پر نہیں تھی۔ اس نے پڑوسیوں سے پوچھا کہ شاید وہ انہیں بتا کر گئی ہو لیکن انہیں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے کھانا کھایا اور چائے پی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب روہنی واپس نہیں آئی تو اسے تشویش ہونے لگی۔ محلے کا ایک لڑکا ٹیوشن پڑھ کر واپس آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ روہنی راستے میں مردہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔''

اس نے کیلی زمین کی دوسری جانب اشارہ کیا جہاں درختوں کے جھنڈ میں روشنیاں حرکت کرتی نظر آ رہی تھیں۔ انیتا سمجھ گئی کہ پولیس نے اپنی کارروائی شروع کر دی ہے۔

''کیا پولیس نے کسی کو گرفتار کیا ہے؟'' انیتا نے پوچھا تو سب لڑکوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اگلے روز انیتا ایک بار پھر موہن کے علاقے میں پہنچ گئی۔ اس نے رکشا اس بینک کے سامنے رکوایا جہاں موہن کام کرتا تھا۔ انیتا اندر چلی گئی۔ اس چھوٹے سے ہال میں ایک طرف کیشیئر کے تین کاؤنٹر تھے جبکہ سامنے کی جانب عملے کے دیگر لوگوں کی میزیں تھیں۔ دیوار کے ساتھ رکھی لکڑی کی بنچوں پر کئی لوگ بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ موہن خاکی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

وردی میں ملبوس ایک میز کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ انیتا نے موہن اور میز پر بیٹھے ہوئے شخص سے ہیلو ہائے کی۔

"یہ ایک ہفتے کی چھٹی مانگ رہا ہے۔" اس شخص نے انیتا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اتنے مختصر نوٹس پر چھٹی نہیں دی جاسکتی۔ اس کی منظوری پہلے لی جاتی ہے۔"

موہن چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ اس گفتگو کا حصہ نہیں بننا چاہتا لیکن انیتا نے اس کے بدن سے آنے والی بو محسوس کرلی۔ آنٹی مینا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ اب بھی درختوں پر چڑھ کر ناریل توڑ رہا ہے۔ موہن کے وہاں سے ہٹتے ہی انیتا نے اس شخص سے ایک بڑے نوٹ کا چینج مانگا اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"میری آنٹی کے ہوٹل پر ایک بہت ہی ہوشیار لڑکا کام کرتا ہے۔ وہ اسکول کی تعلیم مکمل کرچکا ہے لیکن اس کے گھر والوں کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ اسے آگے پڑھا سکیں۔ وہ بہت ہی بھروسے والا آدمی ہے اور ہم اس کے لیے کوئی ملازمت دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ بینک میں چپڑاسی کی اسامی کے لیے درخواست دے تو اسے ایک دو سال بعد کتنی تنخواہ ملے گی۔ کیا وہ اس سے گھر والوں کی کفالت کرسکے گا؟"

"اگر وہ ایماندار اور محنتی ہے تو اسے اچھی تنخواہ مل سکتی ہے۔" بینک منیجر نے کہا۔ "لیکن فی الحال اسے کم تنخواہ پر گزارہ کرنا پڑے گا۔"

"کیا اسے دیر تک رکنا ہوگا؟" انیتا نے پوچھا۔

"عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی کی بات اور ہے۔"

اگلے روز وہ موہن کے گھر گئی تو وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ ایک دس بارہ سال کا لڑکا گلی میں کھیل رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے سسرال چلا گیا ہے۔ وہ دراصل موہن سے تعزیت کرنے آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کس قدر غم زدہ ہوگا۔

"کیا پولیس نے کچھ بتایا کہ اس کی بیوی کی موت کیسے واقع ہوئی؟" انیتا نے پوچھا۔

"اسے قتل کیا گیا ہے۔" لڑکے نے لمحے بھر توقف کیا پھر دلدل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہاں۔"

انیتا نے اس جانب دیکھا۔ جائے وقوعہ سے پولیس نے زرد فیتا ہٹا دیا تھا اور وہ وہاں جاکر دیکھ سکتی تھی۔ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اس جانب چل دی۔

"یہاں اس کی موت ہوئی تھی۔" اس نے شاخوں کے نیچے ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ انیتا نے اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں کئی فٹ تک گھاس کچلی ہوئی تھی۔ اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر دیکھا۔ وہاں گھاس پر براؤن دھبے نظر آرہے تھے۔ اسے پورا یقین تھا کہ یہ خون کے دھبے ہیں۔

"کیا تم نے لاش دیکھی تھی؟"

"ہاں۔"

"کیا پولیس نے اس بارے میں کچھ کہا؟"

"ان کا کہنا ہے کہ اس کے سر پر کوئی چیز ماری گئی تھی۔"

"کیا انہیں کوئی ہتھیار ملا؟"

"نہیں۔ قاتل بہت ہوشیار تھا۔" لڑکے نے آواز نیچی کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ہتھیار اپنے ساتھ لے گیا۔"

موہن کے گھر کی طرف واپس آتے ہوئے انیتا نے کہا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب اس کی زندگی میں بہتری آئی تو اسے مار دیا گیا۔"

"بہتری؟" لڑکا حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ دیکھو نا، انہوں نے نیا گھر لیا۔ اس میں نیا فرنیچر اور ٹیلی ویژن رکھا۔ اس کے پاس پالتو پرندے تھے۔ وہ یقیناً خوش اور مطمئن ہوگی۔"

انیتا نے لڑکے کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔ لگ رہا تھا جیسے وہ اس بات سے متفق نہیں ہے۔ اس نے پوچھا۔ "کیا وہ خوش نہیں تھی؟"

لڑکا کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "ان کے درمیان اکثر بحث ہوتی تھی۔"

"کیسی بحث! وہ کس بات پر بحث کرتے تھے؟"

لڑکے نے دائیں بائیں دیکھا اور گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "پیسوں پر۔ موہن اس سے کہتا تھا کہ وہ بہت زیادہ فضول خرچی کررہی ہے اور وہ جواب میں کہتی کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اب اسے اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ موہن کا کہنا تھا کہ اس کی تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہے اور وہ اسے خوش رکھنے کے لیے بہت زیادہ مقروض ہوگیا ہے۔"

"بہت زیادہ مقروض......" انیتا نے دہراتے ہوئے کہا۔ "کیا کوئی ساہوکار اسے تنگ کررہا تھا؟"

"ہاں، ہمیشہ ہی کرتا تھا۔ اس کا تو کام ہی یہ ہے۔"

جب وہ واپس موہن کے مکان پر پہنچے تو لڑکا اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ انیتا کچھ دیر کھڑی مکان کا جائزہ لیتی رہی۔ اسی وقت برابر والے مکان سے پڑوسن باہر نکلی اور کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"کیا تم یہ سوچ رہی ہو کہ موہن گھر واپس آئے تو اسے کام پر لگالو؟"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''میرا خیال ہے کہ اس کی بیوی پہلے ہی اس کے خلاف تھی۔'' انیتا نے کہا۔

''ہاں وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا شوہر درختوں پر چڑھ کر ناریل توڑے۔ یہ اس کی شان کے خلاف تھا۔'' اس عورت کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ موہن کی بیوی کے بارے میں کیا سوچتی تھی۔ ''وہ مغرور ہوگئی تھی لیکن دیکھو... اس کا کیا انجام ہوا۔''

''مجھے شبہ ہے کہ اسی غرور کی وجہ سے اسے قتل کیا گیا۔ اس کے کسی حاسد سے یہ خوش حالی برداشت نہیں ہوئی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے پڑوسی عورت کو غور سے دیکھا۔ اس عورت نے بوسیدہ سی ساڑی پہن رکھی تھی اور چولی کے سامنے والے حصے میں بٹن کے بجائے سیفٹی پن لگی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں میں جوتے تھے اور نہ ہی اس نے کوئی زیور پہن رکھا تھا۔ وہ بے حد غریب دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا تم اسے ناپسند کرتی تھیں؟'' انیتا نے پوچھا۔

''کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ مغرور اور خود غرض تھی۔ ہم غریب ضرور ہیں لیکن پھر بھی اس کا ساتھ دیتے تھے لیکن اس کا رویہ اس کے برعکس تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس قسم کی پڑوسن تھی۔''

''اسی لیے تم اسے بہت زیادہ ناپسند کرتی تھیں۔'' انیتا نے اس عورت کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔ شاید تم یہ سوچ رہی ہو کہ یہ عورت اس سے اتنی زیادہ ناراض تھی کہ اس نے لاٹھی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری لیکن میں اتنی احمق نہیں ہوں۔ اس کے مرنے سے مجھے کیا فائدہ ہوتا۔''

''کیا پولیس نے تم سے پوچھ گچھ کی؟''

''بالکل......'' وہ عورت انیتا کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولی۔ ''وہ ہم سب سے پوچھ گچھ کررہے ہیں اور ہم انہیں وہی کچھ بتارہے ہیں جو ہمیں معلوم ہے۔''

''تم نے انہیں کیا بتایا؟''

''کل دوپہر سے لے کر پوری رات میں اپنے بیمار بچے کی تیمارداری کرتی رہی۔ پورے محلے کے لوگوں کو یہ بات معلوم ہے۔''

''اور تمہارا بیٹا؟'' انیتا نے پوچھا۔ ''وہ اب کیسا ہے؟''

''ہم صبح سویرے اسے اسپتال لے گئے تھے۔ اب وہ بہتر ہے، میرا شوہر اس کے پاس ہے اور میں بھی وہیں جارہی ہوں۔''

انیتا نے اس کے بیٹے کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اس سے ساہوکار کا پتا پوچھنے لگی۔

ساہوکار کا نام اودے نارائن تھا اور اس وقت وہ ایک ٹی اسٹال پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے برابر میں ایک اور آدمی بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا جبکہ دو آدمی قریب کھڑے ہوئے اسٹال کے مالک سے باتیں کررہے تھے۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں سے وہ گزرنا بھی پسند نہ کرتی۔ وہاں بیٹھ کر ساہوکار کے ساتھ چائے پینے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن اسے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔

اودے نارائن نے ایک گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ وہ ایک کاروباری شخص تھا اور متوقع گاہکوں سے اسی طرح پیش آتا تھا، گوکہ انیتا کسی بھی لحاظ سے ضرورت مند نہیں لگ رہی تھی۔

''تم نے صحیح جگہ کا انتخاب کیا۔ یہاں کی چائے بہت اچھی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا خالی گلاس اٹھا کر مالک کی طرف اشارہ کیا۔ ایک لڑکا لپکتا ہوا آیا اور اس نے خالی گلاس اٹھا کر اس کی جگہ بھرا ہوا گلاس رکھ دیا۔ ساہوکار بولا۔ ''سروس بھی اچھی ہے۔''

''وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔'' انیتا نے مسکراتے ہوئے کہا اور چائے پینے لگی۔

''تم اسی علاقے میں رہتی ہو؟'' ساہوکار نے پوچھا۔

''نہیں، میری رہائش کووالام میں ہے۔ میں کل یہاں اپنے ایک جاننے والے سے ملنے آئی تھی لیکن پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی بیوی مرگئی ہے اس لیے آج تعزیت کرنے آئی تھی۔''

''وہ یقیناً تمہارے جذبے کی قدر کرے گا۔'' نارائن نے کہا۔ شاید اس نے انیتا کی بات کا یقین نہیں کیا اور وہ اس کی وجہ بھی جانتی تھی۔ موجودہ دور میں ان باتوں کی اہمیت نہیں رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ یہ بہت دردناک واقعہ ہے کیونکہ ان دونوں نے حال ہی میں ایک خوش حال زندگی شروع کی تھی۔''

''شاید......'' ساہوکار نے اپنا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے وہ خوش حال نہیں لگتا تھا۔''

''کیا تمہیں اس بارے میں کوئی شک ہے؟'' انیتا نے کہا۔

''وہ اپنی بیوی سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔ ایسے لوگ بیوی کو خوش رکھنے کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں۔ عمدہ فرنیچر، آرائشی اشیا اور پالتو پرندے وغیرہ وغیرہ۔''

''ہاں۔'' انیتا بولی۔ ''میں نے وہ سب چیزیں دیکھی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہیں۔اس نے یقیناً تم سے بھی قرض لیا ہوگا۔"

"ہاں اور اب اسے اتارنے کے لیے وہ دو جگہ کام کر رہا ہے۔"

"مجھے تو صرف اس کی بینک کی نوکری کے بارے میں معلوم ہے۔دوسرا کام کیا ہے؟"

ساہوکار کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔"مجھے کیا معلوم لیکن میں نے اسے شام کو بینک کی یونیفارم کے بغیر دیر سے گھر آتے دیکھا ہے۔"

"یونیفارم کے بغیر؟" انیتا تیوری چڑھاتے ہوئے بولی۔"پھر اس نے کیا پہن رکھا تھا؟"

"لنگی۔صرف لنگی قمیص کے بغیر۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انیتا بولی۔"کیا اس کی بیوی کو معلوم تھا کہ وہ دوسری جگہ بھی کام کر رہا ہے؟"

"وہ مغرور عورت تھی۔" اودے نے کہا۔"اسے یہ بات پسند تھی کہ اس کا شوہر دفتر میں کام کرتا ہے۔"

"کیا موہن نے بھی اسے یہی یقین دلا رکھا تھا؟"

"میں نے تمھیں بتایا تو ہے کہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ میں جانتی ہوں، وہ دوسرا کام کیا ہے۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔"میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنے پرانے گھر واپس آجائے گا۔اس طرح وہ کم از کم اپنے دوستوں کے درمیان رہ سکے گا۔"

"شاید......" اودے نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گلی میں چل دیا۔انیتا بھی رکشے میں آکر بیٹھ گئی اور اس نے رکشا والے کو اسی گلی میں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔وہ گلی بل کھاتی ہوئی اونچی کمپاؤنڈ وال کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ان کے احاطے میں ناریل کے درخت لگے ہوئے تھے اور قریب ہی ایک کالونی آباد تھی۔انیتا کا خیال تھا کہ موہن یہیں کہیں رہ رہا ہوگا اگر اس نے روہنی سے شادی نہ کی ہوتی تو وہ یہ جگہ چھوڑ کر نہ جاتا۔کچھ دور جا کر رکشا ایک کھلی جگہ پر رک گیا جہاں نصف دائرے کی شکل میں چھوٹے مکان بنے ہوئے تھے۔

گھروں کے دروازوں کے باہر دھوپ میں سکھانے کے لیے برتن رکھے تھے اور کپڑوں سے لدی ہوئی ایک رسی ایک مکان سے دوسرے مکان کے کونے تک بندھی ہوئی تھی۔انیتا نے رکشا ڈرائیور سے انتظار کرنے کے لیے کہا اور گلی میں آگے بڑھ گئی۔کچھ دور چلنے کے بعد اسے ایک ٹیلا نظر آیا اور وہ اس پر چڑھ کر کمپاؤنڈ وال کی دوسری طرف جھانکنے لگی۔پلاٹ کے آخری کونے پر تین آدمی ایک شخص کو درخت پر چڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ان تینوں میں سے ایک نے سفید قمیص اور نیلی پتلون پہن رکھی تھی اور اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا جبکہ دوسرے دو آدمی لنگی اور بنیان میں ملبوس تھے۔انہوں نے دھوپ سے بچنے کے لیے سر پر تولیا لپیٹ رکھا تھا اور درخت سے ناریل گرنے کا انتظار کر رہے تھے۔اوپر چڑھنے والے نے اونچائی پر پہنچ کر چاقو نکالا اور ناریل کاٹ کر نیچے پھینک دیا۔اس کے بعد وہ دوسرا ناریل کاٹنے کے لیے مزید اوپر جانے لگا۔

نیچے کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے اوورسیئر کی توجہ ایک اور درخت کی جانب دلائی جس کے ناریل پک چکے تھے۔اوورسیئر نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔انیتا واپس چلتی ہوئی ان مکانوں تک آئی تو اسے ایک مزدور مل گیا۔انیتا نے اس سے کہا۔"مجھے امید تھی کہ موہن یہاں مل جائے گا۔"

"وہ اب یہاں نہیں رہتا۔کسی دوسری جگہ چلا گیا ہے۔"

"ہاں، میں وہاں بھی گئی تھی۔"

"وہ اپنی بیوی کا سوگ منا رہا ہوگا۔وہ اسی ہفتے مری ہے۔ہم نے سنا ہے کہ موہن یہاں نہیں آئے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ایک وین وہاں آکر رکی اور وہ تینوں آدمی جمع کیے ہوئے ناریل اس میں رکھنے لگے۔وہ بڑی تیزی سے کام کر رہے تھے۔جب تمام ناریل وین میں رکھ دیے گئے تو اوورسیئر بھی اس میں سوار ہوگیا اور وین واپس چلی گئی۔

"میں موہن کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔" انیتا نے اس آدمی سے کہا جو درخت پر چڑھا ہوا تھا۔

"کیا تمھیں آدمی کی ضرورت ہے؟" اس نے پوچھا۔

انیتا نے اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہا۔"لیکن موہن نے ہمیشہ ہمارے لیے کام کیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں پہلے اس سے بات کرنی چاہیے۔"

"وہ صرف ایک اوورسیئر کے لیے کام کرتا ہے۔" اس آدمی نے کہا۔

"وہی جو ابھی وین میں بیٹھ کر گیا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔"وہ اوورسیئر چند مخصوص جگہوں پر کام کرتا ہے۔"

"شش......" اس کی بیوی نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن اس آدمی نے بیوی کی تنبیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔"وہ اوورسیئر اسے پیرم گیٹ کے پاس پلاٹوں پر بھیجتا ہے۔موہن وہاں کئی دنوں سے کام کر رہا تھا۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

انیتا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جب وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو اس نے سنا کہ اس کی بیوی اپنے شوہر کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

پیرم گیڈ کے قریب پلاٹوں میں بڑے پیمانے پر ناریل کی کاشت کی گئی تھی۔ انیتا نے بورڈ دیکھ کر اس امید پر اس گلی کا انتخاب کیا کہ وہ اسے اوورسیئر کے دفتر تک پہنچا دے گی لیکن اس کے بجائے وہ ایک چھوٹے سے مکان پر پہنچ گئی جو ایک کمپاؤنڈ میں واقع تھا۔ اس نے رکشا گلی میں چھوڑا اور پیدل ہی اس جانب چل دی۔ جب وہ مکان کے قریب پہنچی تو اندر سے اسے رونے کی آواز سنائی دی۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک نوجوان شخص دروازے پر آیا۔ وہ ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کر رہا تھا۔ انیتا نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تمہارے کام میں مداخلت تو نہیں کی؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا پھر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کوئی آدمی چاہیے؟“

”میں یہ سوچ کر آئی تھی کہ شاید اوورسیئر یہاں مل جائے۔“

”وہ یہاں نہیں آتا۔“ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ موہن بھی یہیں کام کرتا ہے۔“

لڑکے نے جواب دینے کے بجائے کمپاؤنڈ وال کے پار ناریل کے درختوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ انیتا نے پوچھا۔

”ہاں، وہی ناریل توڑنے آتا ہے۔“ نوجوان لڑکے نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ پرسوں بھی یہاں آیا تھا؟“

لڑکے نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس سوال پر حیران بلکہ شاید کچھ پریشان بھی ہو گیا تھا۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔“

”کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟“

لڑکے نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، میں اسے دیکھ رہا تھا۔“

”کیا اس نے بھی تمہیں دیکھا؟“

لڑکے نے اسے گھورا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان میں صدمے کی کیفیت تھی۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

اس شام انیتا دوبارہ موہن کے گھر آئی۔ وہ اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے پیروں کے پاس دیسی شراب کی بوتل پڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے انیتا کو دیکھ کر قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں نے شراب نہیں پی ہے مس۔“

اس نے انیتا کو اس طرح مخاطب کیا جیسے وہ ابھی تک وہی چھوٹی بچی ہو جو اس کے پیچھے دوڑا کرتی تھی اور وہ درختوں پر چڑھ کر صرف اس کے لیے ناریل توڑا کرتا تھا۔

”یہ بوتل پرانی ہے اور آدھی خالی تھی۔ میں اسے باہر پھینک رہا ہوں۔ میری بیوی کو بدبودار چیزیں پسند نہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جنہیں اس نے روک لیا اور بولا۔ ”میں تو تمہیں ایک چائے کی پیالی بھی پیش نہیں کر سکتا۔“

”میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں۔“ انیتا بولی۔ ”تم اپنی عزیز ترین ہستی سے محروم ہو گئے ہو۔“

”محروم......“ اس نے عجیب سے لہجے میں دہرایا اور خالی نظروں سے آسمان کو دیکھنے لگا۔

”تم نے اس کام پر واپس آنے کا فیصلہ کب کیا؟“

اس کی حالت دیکھ کر انیتا سوچنے لگی کہ بہتر ہوتا وہ یہاں آنے سے پہلے کسی دوسرے شخص سے ناریل توڑنے کی بات کر لیتی کیونکہ موہن فوری طور پر کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔

”تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟“ موہن نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے درختوں پر چڑھ کر ناریل توڑنے کا کام چھوڑ دیا ہے اور اب صرف دفتری ملازمت کر رہے ہو۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تم دیر سے گھر آتے ہو لیکن میں جانتی ہوں کہ تمہارے بینک میں چپڑاسی کی ڈیوٹی کے اوقات مقرر ہیں اور انہیں دیر تک نہیں رکنا پڑتا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟“

اس نے تائید میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ”تم نے چھٹی کے بعد دوسری جگہ کام شروع کر دیا تا کہ اپنی بیوی کی فرمائشیں پوری کر سکو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”میں اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور میں اسے بہت چاہتا تھا۔“

”ہاں، موہن! اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت خوب صورت اور جوان تھی۔“

”اور میں بوڑھا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے درمیان رکھ دیے۔

انیتا بولی۔ ”تم نے قرض اتارنے کے لیے دوبارہ ناریل توڑنے کا کام شروع کر دیا۔“

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''ہاں، یہ سچ ہے لیکن میں نے اپنی بیوی سے یہ بات چھپائی تھی۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''جب تم مجھے بینک میں ملے تھے تو تمہارے جسم سے وہی بو آرہی تھی جو ناریل کے درخت پر چڑھنے والے کے جسم سے آتی ہے اور آنٹی مینا نے بھی یہی بات نوٹ کی تھی جب تم اسے ایک دن مارکیٹ میں ملے تھے۔''

اس نے تائید میں سر ہلایا اور جھک کر اپنے پیروں کو دیکھنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''ایک نیا اوورسیئر میرے پاس آیا اور بولا کہ وہ لوگ درختوں کو کاٹ کر راستہ بنا رہے ہیں تاکہ چڑھنے والا محفوظ رہے لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس سے درختوں کو نقصان پہنچے گا اور اس کا اثر آئندہ فصل پر بھی ہوگا۔ میں پرانے طریقے سے ہی مطمئن ہوں گو کہ یہ زیادہ خطرناک ہے لیکن اس میں اچھے پیسے ملتے ہیں۔''

''تم نے حال ہی میں یہ کام دوبارہ شروع کیا ہے؟''

''میرا خیال تھا کہ میری بیوی بھی اس بو کا نوٹس لے گی اور مجھے اس کے لیے کوئی بہانہ بنانا پڑے گا۔'' موہن چوکھٹ کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی اور میں نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کیوں ہوا حالانکہ اسے بھی اس بو کو محسوس کر لینا چاہیے تھا۔''

''تمہیں اس کی توقع نہیں تھی؟''

موہن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دوسرے مزدوروں نے اوورسیئر کو قائل کر لیا کہ پلاٹ کے ایک حصے میں کچھ درختوں پر ناریل تیار ہیں اور مجھے وہاں جانا چاہیے۔ لہٰذا مجھے اس کام کے لیے بھیج دیا گیا۔ اونچائی پر پہنچ کر مجھے اردگرد کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا اور کمپاؤنڈ میں بنے ہوئے سبھی مکان نظر آرہے تھے۔ ان میں ایک تو مجھ سے بہت قریب تھا۔ میں نے ناریل اور پتے گرتے ہوئے دیکھے پھر میری نظر رسی پر لٹکی ہوئی ایک ساڑی پر گئی۔''

انیتا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ موہن کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''وہ بہت خوب صورت ساڑی تھی۔ مجھے لگا کہ میں اس ساڑی کو پہچانتا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کو بالکل ایسی ہی ایک ساڑی لا کر دی تھی۔ پھر مجھے ایک قہقہہ سنائی دیا اور مجھے وہ قہقہہ بھی جانا پہچانا لگا۔''

وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''اوورسیئر مجھ پر چلا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔ اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ میں نے اپنا چاقو نکالا اور ناریل نیچے گر پڑے۔ میں دوسرے درخت پر چڑھ گیا۔''

''کیا یہ پرسوں......؟'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ ایک ایسے شخص سے کس طرح یہ بات پوچھ سکتی تھی جس نے قتل کیا ہو۔

''ہاں۔ یہ پرسوں ہی کی بات ہے۔ اگلے روز میں ناریل توڑنے نہیں گیا بلکہ دفتر کے کام کا بہانہ بنا کر بینک سے نکلا اور ایک متبادل راستہ اختیار کیا۔ میں نے دیکھا کہ روہنی دوپہر میں کہیں جا رہی تھی۔ بینک سے چھٹی ہونے کے بعد میں دوسرے راستے سے گھر گیا اور انتظار کرنے لگا۔ میری بیوی اسی خوب صورت ساڑی میں دوپہر والے راستے سے واپس آرہی تھی۔''

''تم نے ناریل سے اس کا سر پھاڑ دیا۔''

اس نے انیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی خاطر میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ میں ناریل توڑنے کے لیے درختوں پر چڑھا جبکہ میری عمر اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں اب بھی تیزی دکھا سکتا ہوں لیکن اگر میرا پاؤں پھسل گیا تو سیدھا موت کے منہ میں جاؤں گا۔ اس کی خاطر میں نے یہ خطرہ مول لیا حالانکہ وہ چاہتی تھی کہ میں درختوں پر نہ چڑھوں اور صرف دفتری ملازمت کروں لیکن وہاں کی تنخواہ سے اس کی فرمائشیں پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کے لیے مجھے قرض لینا پڑا اور اسے اتارنے کے لیے دو جگہ کام کر رہا ہوں لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں بہت بڑا احمق ہوں۔''

''کیا تم نے اس آدمی کو دیکھا ہے جس سے وہ محبت کرتی تھی؟''

اس سوال کا جواب انیتا کو معلوم تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ ''ہاں، میں نے اسے دیکھا ہے اور پولیس بھی اسے جلد ہی دیکھ لے گی اور پھر انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے یہ قتل کیوں کیا۔''

انیتا کی آنکھوں کے سامنے اس نوجوان کا نقشہ گھوم گیا جو اپنے آنسو پونچھتا ہوا گھر سے باہر آیا تھا۔ نہ جانے اسے پچھتاوا تھا یا وہ اپنی محبت کی موت پر رو رہا تھا لیکن انیتا نے موہن کو کچھ نہیں بتایا ورنہ اس سے ایک اور قتل سرزد ہو جاتا۔ انیتا کے اختیار میں ہوتا تو وہ موہن کے بجائے اس شخص کو سزا دیتی جس نے موہن کے گھر میں نقب لگائی۔ موہن کا جرم تو سب کو نظر آ گیا لیکن ایسے چوروں کے لیے بھی کوئی سزا ہونی چاہیے جو دوسروں کی عزت پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔ یہ وہ جرم ہے جو نہ کبھی سامنے آتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی سزا ملتی ہے کیونکہ اس کا کوئی گواہ نہیں ہوتا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

امیدِ صبح

ناہید سلطانہ اختر

امید ایک ایسی نادیدہ لاٹھی کا نام ہے جس کے سہارے انسان جہدِ مسلسل جاری رکھتا ہے اور کبھی بھی ہمت نہیں ہارتا اور بالآخر رفتہ رفتہ حالات کی تیرگی اس کرن کی جھلملاہٹ میں اپنی شدت کھو دیتی ہے۔ زندان میں ایک معمولی روزن سے آنے والی روشنی بھی مُردہ تن میں جان ڈال دیتی ہے... یہی حال اس گھر کے مکینوں کا تھا جو قریب رہنے سے گھٹن میں مبتلا تھے اور دور ہوجانے پر حالات کے قیدی بن گئے کیونکہ باہر سے آنے والے ایک دشمن نے ایسی گھات لگائی کہ اس چاردیواری کی ہر اینٹ ہل کر رہ گئی مگر... صد شکر کہ مضبوط بنیاد نے عمارت کو گرنے نہیں دیا۔ موسم کے بدلتے رنگوں میں کہیں نہ کہیں خوشگوار سی دھنک دکھائی دے جاتی ہے مگر انسان کے بدلنے میں سوائے اذیت کے کوئی احساس نہیں ملتا۔ البتہ اگر کسی کے پاس خاموش دعائیں کرنے والا کوئی ایسا اپنا موجود ہو جو اپنے پیار کے حصار سے آزاد کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہو تو دنیا میں اس سے زیادہ خوش قسمت انسان کوئی نہیں ہوسکتا جو جفاؤں کے بدلے وفاؤں کے طلبگار ہو کر بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔

دل کے سچے رشتوں میں گندھی ایک عبرت اثر داستان..... جس کی ہر سطر سوچنے پر مجبور کر دے

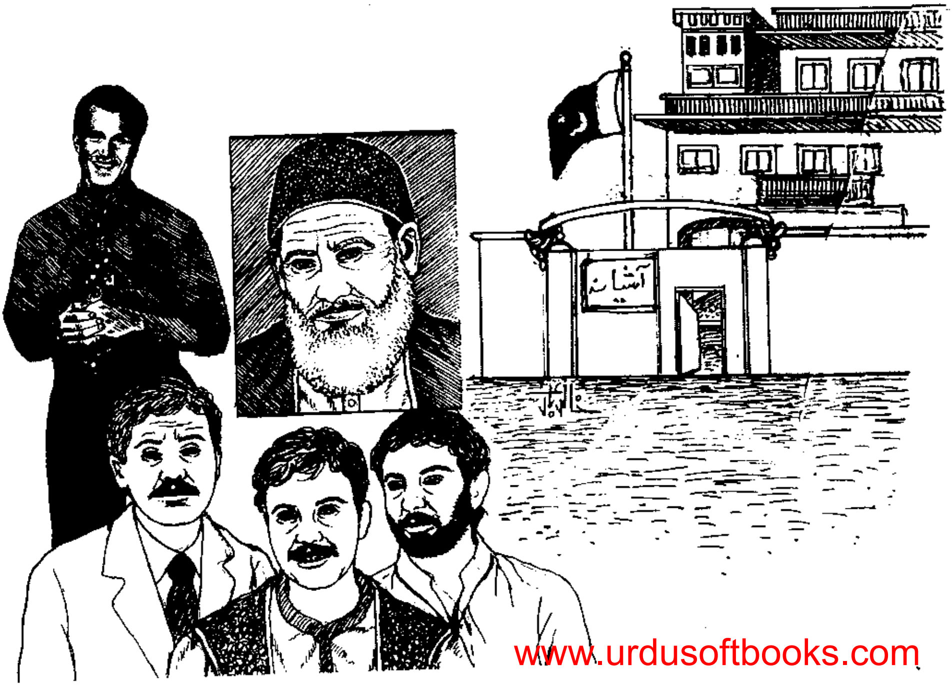

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جھنڈے والا گھر بابا جی نے تنکا تنکا جوڑ کر بنایا تھا۔ اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کے لیے۔ مکان کی تعمیر کے بعد انہوں نے نہایت چاہ سے مکان کے داخلی دروازے کی پیشانی پر ایک مرمریں سنگی کتبہ جڑوا دیا تھا جس پر لکھا تھا "آشیانہ"...... مگر بابا جی کا "آشیانہ" جھنڈے والا گھر کی عرفیت سے زیادہ معروف ہوا۔

بابا جی کے چار بیٹے تھے۔ عبداللہ، عبدالرحمان، عبدالرحیم، عبدالقدوس۔ چاروں بیٹے شادی شدہ اور عیالدار تھے۔ چاروں کا روزگار بھی الگ تھا۔ عبداللہ کی پرچون کی دکان تھی۔ عبدالرحمان کا ان سلے کپڑوں کا کاروبار تھا۔ عبدالرحیم چھوٹے سے ایک ہوٹل میں منیجر تھے۔ عبدالقدوس دواؤں کی ایک کمپنی میں ملازم تھے۔ چاروں بابا جی کے نہایت فرمانبردار بیٹے تھے۔ بہوئیں بھی بابا جی کے سامنے سر جھکائے رہتیں۔ فرمانبرداری کی یہ خو بابا جی کے بیٹوں کی اگلی نسل میں بھی آپ ہی آپ نفوذ کر گئی تھی۔

بابا جی کی پلکوں میں سفید بال دکھائی دیتے مگر وہ کمر کو خم دیے بنا چلتے تھے۔ تہجد گزار تھے۔ محلے کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر پانچوں وقت ان کی صدائے اذاں گونجتی تھی۔ سردیوں میں جب لوگ لحافوں میں دبکے پڑے ہوتے بابا جی گھر سے مسجد کی طرف جاتے ہوئے بہ آوازِ بلند صدائیں لگاتے جاتے۔ "اٹھ جاؤ مومنو...... نماز کی تیاری کرلو...... حاضری کا وقت ہوگیا ہے۔" ماہِ رمضان میں بابا جی کی پاٹ دار آواز گونجتی۔ "روزہ دارو سحری کا وقت ہوگیا ہے۔"

بابا جی کی بہت عزت تھی، گھر میں بھی گھر سے باہر بھی۔ گلی سے گزرتے نوجوان اور بوڑھے تعظیم سے ملتے۔ بچے ان سے ہاتھ ملانے میں فخر محسوس کرتے۔ بابا جی ایک ایک کا حال چال پوچھتے چلے جاتے۔ عورتیں اپنے بچوں کو آگے کرکے بابا جی کا ہاتھ ان کے سر پر پھروانے کو باعثِ برکت سمجھتیں۔ کسی کا بخار نہ ٹوٹ رہا ہوتا، بابا جی سے دم کروانے پہنچ جاتا۔ کسی کے کان میں درد ہوتا بابا جی سے جھاڑ پھونک کرانے آجاتا۔ ہر جمعرات کو بابا جی چھابڑی میں تازہ بھنے چنے اور مرمرے لے کر گھر سے نکلتے اور مٹھی بھر بھر بچوں، بڑوں میں بانٹتے چلے جاتے۔ گلی کے نکڑ تک پہنچتے پہنچتے چھابڑی خالی ہوجاتی۔ خالی چھابڑی کسی بچے کو تھما کر بابا جی اس سے کہتے۔ "جاؤ بیٹا لپک کر گھر تو دے آؤ۔" اور خود گلی کے نکڑ پر بنے چبوترے پر ٹک رہتے۔ آتے جاتے لوگ بابا جی کو سلام کرتے، ان سے ہاتھ ملاتے اور ان کا حال چال پوچھتے گزرتے چلے جاتے۔ "آشیانہ" کے صحن میں بھی بابا جی نے ایسا ہی ایک چبوترا بنوا کر اس پر ایک بلند و بالا، مضبوط آہنی کھمبا گڑوا کر اس کے بالائی سرے پر سبز ہلالی پرچم لہرا رکھا تھا۔ اس نسبت سے ان کا گھر اہلِ محلہ میں "جھنڈے والا گھر" مشہور تھا۔ بابا جی کو یا اہلِ خانہ میں سے کسی اور کو اپنے گھر آنے والے کسی مہمان کو گھر کا پتا سمجھانا ہوتا تو یہی کہا جاتا 'علاقے میں آنے کے بعد جھنڈے والا گھر پوچھ لیں۔

گھر میں بابا جی کے چار بیٹوں کے کنبے رہتے تھے۔ کمرے ضرور بٹے ہوئے تھے مگر اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، دکھ سکھ سب مشترک تھا۔ بابا جی کو گھر میں وہی مقام حاصل تھا جو کسی مملکت میں فرماں روا کو حاصل ہوا کرتا ہے۔ چاروں بیٹے اور بہوئیں ان کے سامنے سر جھکائے رکھتے۔ ان کے بچے بابا جی کا ادب بھی کرتے۔ ان سے پیار بھی کرتے۔ ان کی ناراضگی سے ڈرتے بھی تھے۔

چاروں بیٹے اپنی اپنی کمائی بابا جی کے ہاتھ میں دیتے۔ بابا جی گھر کا نظام چلاتے۔ سب کچھ بابا جی کے ہاتھ میں ہوتا۔ نہ تو تو، میں میں ہوتی نہ بے اعتباری۔ وسائل کی کمی سے بابا جی ذرا نہ گھبراتے۔ انہیں اللہ پر اور گھر والوں کو بابا جی کی نیک نیتی اور غیر جانبداری پر کامل بھروسا ہوتا۔ گزارہ عزت سے ہوتا۔ نہ اہلِ خانہ میں سے کوئی اس حساب کتاب میں پڑتا کہ چاروں کنبوں میں سے کس کے افراد کم ہیں، کس کا خرچہ زیادہ، نہ کسی کو بھی یہ گلہ ہوتا کہ فلاں پر اتنا کیوں خرچ کردیا یا میرے حق میں ڈنڈی کیوں ماری۔ ہر ایک کو جیسے بابا جی پر آنکھ بند کرکے اعتبار تھا۔

☆☆☆

"صبحِ امید" جو، اب صرف امید کہلاتی تھی بابا جی کی جواں مرگ اکلوتی بیٹی کی واحد نشانی تھی۔ بیٹی اور داماد ایک ناگہانی حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ داماد بابا جی کا سگا بھتیجا تھا۔ بڑے بھائی کا بیٹا۔ میاں بیوی دونوں کسی رشتے دار...... کی تدفین میں شرکت کے لیے جارہے تھے کہ ان کی گاڑی کو ایک ٹرالر روندتا ہوا گزر گیا۔ دونوں موقع پر ہی ختم ہوگئے۔ بہت المناک حادثہ تھا۔ صبحِ امید جسے وہ دادا اور پھوپھیوں کے پاس چھوڑ گئے تھے بہ مشکل ڈھائی برس کی تھی۔ اس ننھی سی جان کو پتا ہی نہ چلا کہ موت کا ظالم ہاتھ اسے کن رشتوں سے محروم کر گیا تھا۔

صبحِ امید کو نانا، نانی نے اپنے سینوں سے لگالیا۔ دادا اور نانا ایک ہی ماں باپ کی اولاد تھے۔ دادا کو امید کے ننھیال والوں کے پاس رہنے میں کوئی اعتراض نہ ہوا۔ نانا، نانی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے اسے نہایت محبت سے رکھا۔ نانی جب تک حیات رہیں وہ اور صبحِ امید یک جان دو قالب بنی رہیں۔ نانی دوسرے جہان گئیں تو صبحِ امید نانا کی آنکھ کا تارا بن گئی جنہیں گھر کے دیگر تمام افراد کی طرح وہ بھی بابا جی کہتی تھی۔

اپنی رفیقۂ زندگی کے ساتھ مل کر بابا جی نے صبحِ امید کی پرورش کی تھی۔ اسے پدری شفقت سے آشنا کیا تھا۔ اس کی تربیت کی تھی۔ اسے سبق آموز کہانیاں سنائی تھیں۔ نفس کو مارنے اور سختیوں کو جھیلنے کا قرینہ سمجھایا تھا۔ اپنی ذات کی نفی اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی سوجھ بوجھ دی تھی۔

بابا جی اور ان کی رفیقۂ حیات پرانی اقدار کے امین اور روایتوں کے پاسدار تھے۔ یہ امانت انہوں نے اپنے بچوں کو بتدریج سونپی تھی۔

گھر کا ماحول مثالی تھا۔ افرادِ خانہ میں باہم محبت و یگانگت تھی۔ خواتین تیر، میر کی تخصیص کے بغیر امورِ خانہ داری سرانجام دیتیں۔ جھاڑ پونچھ اور صفائی ستھرائی کرنی ہے تو پورے گھر کی۔ جھوٹے برتن دھونے ہیں تو سب کے۔ کھانا پکانا ہے تو سب کا اکٹھا۔ ایک دوسرے کا کام ہلکا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ چنگیر بھر روٹیاں پکاتے ہوئے ایک پیڑے بناتی، دوسری بیلتی اور توے پر ڈالتی۔ بابا جی کی چاروں بہوئیں مل جل کر ہنسی خوشی کام کرتیں اور گھر کی بچیوں کی تربیت بھی انہی خطوط پر کرتیں۔

گھر کی خواتین کو گھر کے روزمرہ کام دھندے ہی نہ نمٹانے ہوتے۔ کبھی اپنے پرایوں میں کسی غمی، خوشی میں شرکت کرنا ہوتی تو کبھی عید، بقرعید کی تیاری، کبھی بدلتے موسم کے پیشِ نظر کپڑوں کو دھوپ لگانا تو کبھی آتے جاڑوں کے لیے گدوں اور رضائیوں کو ادھیڑ کر دھونا اور دوبارہ بھرائی کروانا۔

بڑوں کی طرح گھر کے بچوں میں بھی تیر میر نہ تھی۔ کھلے دل سے آپس میں ہنسی مذاق کرتے۔ ایک دوسرے کی چیزیں بے دریغ استعمال کرتے۔ بڑے پڑھائی میں اپنے سے چھوٹوں کی مدد کرتے۔ کسی بات پر اختلاف رائے بھی ہوتا تو اخلاق کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

بابا جی کے سب سے بڑے بیٹے عبداللہ کے تین بچے تھے۔ بیٹا مومن اور بیٹیاں مومنہ اور معینہ۔ دوسرے بیٹے عبدالرحمان کے دو بیٹے تھے محسن اور مستقیم اور ایک بیٹی محسنہ۔ تیسرے بیٹے عبدالرحیم کی تین بیٹیاں تھیں۔ مریم، انعم، صنم۔ سب سے چھوٹے بیٹے عبدالقدوس کا ایک بیٹا تھا سلمان اور بیٹی ہانیہ۔

اپنے پرایوں میں ان کے اتفاق و اتحاد کی مثالیں دی جاتیں۔ ”اولاد ہو تو عبدالرب جیسی۔“ بابا جی خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے بلکہ اکثر کہتے۔ ”لوگ پیشانی سے سجدہ کرتے ہیں، مجھے میرے رب نے جتنا نوازا ہے میں اپنی آنکھوں سے بھی سجدے کروں تو کم ہے۔“ بابا جی اللہ کی دین کے بہت شکر گزار تھے کیا ہوا اگر ان کے بچوں کے پاس اعلیٰ عہدے نہیں تھے۔ ایسی خوشحالی اور فراغت کا کیا فائدہ جو انسانوں کو خودغرض بنا دے، ان کے درمیان نفاق ڈال دے۔ بابا جی کا ایمان تھا کہ جو برکت اور سکون کسبِ حلال میں ہوتا ہے وہ غلط طریقوں سے کمائے گئے دولت کے انبار میں بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کی بہت مہربانی تھی۔ دلوں میں اللہ کی یاد تھی۔ توکل تھا اور کیا چاہیے تھا۔

☆☆☆

محلے کی مسجد سے بابا جی کی صدائے اذان بلند ہوتے ہی صبحِ امید اذان کے الفاظ دہراتے ہوئے بستر سے اٹھ بیٹھی۔ یہ اس کا روزمرہ معمول تھا۔ اس عمر میں بھی بابا جی کی آواز کتنی پاٹ دار اور پرسوز تھی۔ اہلِ محلہ کہتے۔ ”بابا جی کی اذان دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔“

دلائی تہ کر کے مسہری کے پائنتی رکھنے کے بعد صبحِ امید کمرے سے باہر نکل آئی۔ حسبِ معمول گھر میں چہل پہل ہو چکی تھی۔ کمروں کے بند دروازے یکے بعد دیگرے کھل رہے تھے۔ بتیاں ایک ایک کر کے روشن ہو رہی تھیں۔ غسل خانوں سے مردوں کے کھانسنے، کھنکھارنے اور ٹونٹیوں سے پانی گرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

روزمرہ معمول کے مطابق سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ بابا جی کے علاوہ گھر کے سارے مرد نماز کے بعد گھر واپس آچکے تھے۔ بابا جی نماز کے بعد واک پر نکل جاتے، ان کی واپسی تک ناشتا دسترخوان پر چن دیا جاتا۔ ناشتے کی تیاری اور دیگر کاموں میں گھر کی لڑکیاں بڑی عورتوں کا خاطر خواہ ہاتھ بٹاتیں۔ صبحِ امید ناشتے کی تیاری میں سب سے بڑی ممانی جمیلہ خاتون اور تیسرے نمبر کی ممانی نفیس جہاں کی مدد کرتی۔ ممانیاں چاروں ہی اسے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتی تھیں مگر مہرالنساء اسے کسی اور نظر سے بھی دیکھتی تھیں۔ شوہر سے انہوں نے اپنے دل کی بات بہت پہلے شیئر کی ہوئی تھی۔ وہ صبحِ امید کو اپنی بہو بنانے کی خواہش رکھتی تھیں۔ اللہ نے انہیں مستقیم کی صورت میں ایسا ہیرا بیٹا دیا تھا کہ وہ اس پر جتنا ناز کرتیں کم تھا۔ بابا جی کو بھی یوں تو اپنے بچوں کے سارے ہی بچے عزیز تھے مگر صبح

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

امید کی طرح مستقیم کی طرف بھی ان کا جھکاؤ کچھ زیادہ تھا۔ تاہم دوسرے بچوں کے خیال سے وہ صبح امید اور مستقیم دونوں کی طرف اپنے غیر معمولی جھکاؤ کے اظہار میں حتی الامکان احتیاط برتتے۔

اہلِ خانہ ناشتے کے لیے دسترخوان کے گرد اکٹھے ہی ہوئے تھے کہ دفعتاً گھر کے آہنی گیٹ پر زوردار کھٹکھٹاہٹ نے سب کو چونکا دیا اور ممانی جمیلہ نے اپنے سینے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ ''الٰہی خیر! جو آیا ہو خیر کی خبر کے ساتھ۔''

عبدالقدوس نے اٹھنے کا قصد کیا۔

''آپ بیٹھیے چھوٹے چچا...... میں دیکھتا ہوں۔'' مستقیم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہ جانے کون بدتہذیب ہے جس نے اتنی زور سے دروازہ دھڑدھڑایا ہے۔'' باباجی بولے۔

مستقیم کے منع کرنے کے باوجود عبدالقدوس بھی اس کے پیچھے چلے گئے۔ ناشتا شروع کرنے کے لیے دونوں کی واپسی کا انتظار کیا جانے لگا۔ دونوں واپس پلٹے تو ایک گورے چٹے، سوٹڈ بوٹڈ شخص کے ساتھ۔ مستقیم نے ایک بڑا سوٹ کیس اور عبدالقدوس نے ایک سفری بیگ اٹھا رکھا تھا۔ گھر کے بڑے چونک کر اشتیاق سے اور چھوٹے حیرانی سے آنے والے شخص کو دیکھنے لگے۔

''گورے میاں!'' باباجی نے بے ساختہ کہا اور دونوں بازو پھیلائے آنے والے شخص کے استقبال کو اٹھے۔

اچھا تو وہ گورے میاں تھے۔

گورے میاں کا گھر میں غائبانہ اتنا تذکرہ رہا تھا کہ گھر کے بچے بھی ان کے صورت ناآشنا ہوتے ہوئے بھی انہیں محض ان کے نام ہی سے پہچان سکتے تھے۔

باباجی نہایت گرمجوشی سے گورے میاں سے بغلگیر ہوتے ہوئے بولے۔ ''یقین نہیں آرہا۔'' پھر گورے میاں کے دونوں شانے پکڑ کر فرطِ مسرت سے گویا ہوئے۔ ''اپنے آنے کی اطلاع تک نہیں دی۔''

باباجی کے بعد چاروں بیٹے باری باری گورے میاں سے ملے۔ گورے میاں نے گھر کی خواتین سے اشاروں میں علیک سلیک کی پھر بچوں پر ایک طائرانہ سی نظر ڈال کر بولے۔ ''ہیلو! یو تھس ہاؤ آر یو؟''

''فائن...... تھینک یو۔'' مستقیم نے تمام چھوٹوں کی نمائندگی کی۔

''یہ انیسہ کی بیٹی ہے صبحِ امید۔'' باباجی نے نواسی کو گورے میاں سے متعارف کیا۔

''آئی سی! لاسٹ ٹائم جب میں آیا تو یہ اتنی سی تھی۔''

گورے میاں نے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی افقاً پھیلا کر اور دائیں ہتھیلی اس پر عموداً سایہ فگن کر کے کہا۔

''اب تو ماشاءاللہ یونیورسٹی جاتی ہے۔'' باباجی نے فخر سے بتایا پھر گورے میاں سے پوچھا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ گھر کیسے یاد رہا تمہیں...... یہاں تو زمین آسمان کی تبدیلی آگئی ہے۔''

''گورے کو راستے ڈھونڈنے آتے ہیں تایا جی۔'' گورے میاں نے گردن اکڑاتے ہوئے زعم سے کہا۔

''بدلے نہیں۔'' باباجی گورے میاں کو دیکھتے ہوئے مسکرائے پھر انہوں نے اہلِ خانہ کو ایک نظر دیکھتے ہوئے گورے میاں کے بچپن کا ایک قصہ اجمالاً سنایا۔ ''چھوٹا سا تھا یہ، ایک روز گھر سے نکلا تو گم ہوگیا۔ سب ڈھونڈتے پھرے، لاؤڈ اسپیکر پر اعلان بھی کروایا کہیں نہ ملا۔ شام ہوئی تو محلے کے چند لوگ اسے ساتھ لیے آگئے۔ باپ نے پوچھا کہاں تھے تو منہ بسور کر بولا...... راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔''

باباجی کی بات سننے والوں میں سے کوئی ڈھیرے سے ہنسا، کسی نے فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''اچھا بھئی ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' باباجی نے کہا اور گورے میاں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ہاتھ منہ تو دھلا دھلایا لگ رہا ہے پھر بھی دھونا چاہو تو دھولو...... ناشتے پر سب کے ساتھ ہی آجاؤ۔''

''سوری! میں تو نیچے نہیں بیٹھ سکتا۔'' گورے میاں نے ترت کہا۔

''میں میز کرسی ڈلوا دیتی ہوں۔'' بڑی بہو جمیلہ خاتون نے گھر آئے مہمان کو سہولت پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔

''اٹس اوکے...... آپ لوگ ناشتا کریں، میں نے پلین میں ٹی اور ایک سینڈوچ لے لیا تھا۔''

''گورے میاں گھر کے پراٹھوں اور بھجیا کا مزہ ہی اور ہوتا ہے۔'' باباجی بولے۔

''نو نو نو تایا جی...... بریک فاسٹ لائٹ اور نرشنگ ہونا چاہیے۔'' گورے میاں نے باباجی کی بات یکسر رد کر دی۔

''کیا مطلب؟'' باباجی نے کہا۔

''باباجی گورے میاں کا مطلب ہے ہلکا پھلکا اور غذائیت سے بھرپور۔'' عبدالقدوس بولے۔

''میں تو ناشتے میں بریڈ، بٹر، جیم، ایگ اور جوس لیتا ہوں۔'' گورے میاں نے کہا اور دسترخوان کے گرد بیٹھے افراد ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''آپ چینج کریں گے؟'' عبدالرحیم نے گورے میاں کو منظر سے ہٹا دینا ہی بہتر جانا۔ مردوں کو کام سے اور بچوں کو اسکول، کالج جانے سے دیر ہو رہی تھی۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا تھا اور اہلِ خانہ ناشتا کرنے کے لیے باباجی کے بسم اللہ پڑھنے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

''آں...... ہاں......'' گورے میاں نے کہا اور اپنے اسباب کو دیکھنے لگے۔

عبدالرحیم اٹھے۔

''ان کا سامان میرے کمرے میں پہنچا دو۔'' باباجی کا یہ کہنا گویا اس امر کا اظہار تھا کہ گورے میاں ان کے کمرے میں مقیم ہوں گے۔

عبدالرحیم اور مستقیم گورے میاں کو مع ان کے اسباب باباجی کے کمرے تک پہنچا آئے۔

باباجی نے بسم اللہ پڑھی اور سب ناشتا کرنے لگے۔

☆☆☆

گورے میاں، باباجی کے ایک جگری دوست کے بیٹے تھے۔ نام تو گورے میاں کا رفیع الشان تھا۔ بچپن میں رفو پکارے جاتے تھے لیکن برسوں پہلے ولایت گئے تو ڈیڑھ دو برس ہی میں ایسے سرخ و سفید ہو کر پلٹے کہ گورے صاحب کہلانے لگے۔ گورے صاحب نے ولایت ہی میں ایک گوری میم سے شادی کی تھی۔ شادی کے بعد صرف ایک مرتبہ وطن آئے اور وہ بھی محض پندرہ سولہ دن کے لیے اپنے والد کے انتقال پر۔ ماں پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔ انہی پندرہ سولہ دنوں میں وہ ایک مرتبہ باباجی کے پاس آئے تھے۔ گورے میاں کا بچپن شرارتوں اور بدتمیزیوں سے عبارت تھا۔ ایسی ایسی حرکتیں کہ بڑے کان پکڑتے۔ بلی کو لنگڑا کر چلتے دیکھا گیا تو شبہ کہ رفو نے تو اس کی ٹانگ مجروح نہیں کر دی تھی اور تو اور گلی میں کوئی پرندہ مردہ پڑا ملا تو رفو مشکوک کہ اس نے غلیل ماری ہو گی۔

لیکن ولایت جا کر جب وہ سرخ و سفید ہو کر واپس لوٹے تو انہیں بچپن کے ہر شبہے ہر الزام سے بری کر دیا گیا اور وہ نہایت عزت و احترام سے پہلے ''گورے صاحب'' کہلانے لگے مگر باباجی جو ان کے والد کے دوست تھے انہیں گورے صاحب کے بجائے ''گورے میاں'' کہتے۔ باباجی اور ان کے گھر والوں کے لیے وہ ''گورے میاں'' تھے۔

باباجی اکثر گھر میں گورے میاں کا ذکر کرتے۔ ان کے بچپن کی شرارتوں کے قصے بچوں کو سناتے۔ جہاں یورپ، امریکا کا ذکر ہوتا باباجی کو گورے میاں یاد آ جاتے۔ غیر مسلموں کی مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں پر باباجی کا دھیان آپ ہی آپ گورے میاں کی طرف چلا جاتا۔

''نہ جانے کہاں ہوگا...... کس حال میں ہوگا۔'' باباجی نہایت اپنائیت سے گورے میاں کے بارے میں سوچتے۔

☆☆☆

گورے میاں، باباجی، چاروں بیٹوں اور بہوؤں کے لیے گرم جرسیاں بطور تحفہ لائے تھے اور بچوں کے لیے چاکلیٹ، ٹافیاں اور چیونگم۔ گرم جرسیاں انہوں نے اپنے چرمی صندوق سے نکال کر باباجی کے تخت پر بچھی توشک پر ڈال دیں کہ جس کو جو پسند آئے لے لے۔ بچوں کی چاکلیٹ، ٹافیاں اور چیونگم انہوں نے خود تقسیم کیں، ہر کنبے میں بچوں کی تعداد کے اعتبار سے۔

ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ گھر میں جو چیز آتی سب یکجا بیٹھ کر کھاتے پیتے۔

''نفیس جہاں بڑی چالاک ہیں۔ فوراً وہی سویٹر اٹھا لیا جس پر میری نظر تھی۔'' جمیلہ خاتون نے رات کو اپنے کمرے میں میاں سے شکوہ کیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' عبداللہ نے بیوی کا دل رکھنے کی کوشش کی۔

''اے واہ! کوئی بات کیسے نہیں بھلا...... میں بڑی تھی پہلے مجھے لینے دیتیں۔''

''آج سے پہلے تم نے کبھی ایسا کوئی شکوہ نہیں کیا۔'' میاں بولے۔

''آج سے پہلے گورے میاں بھی تو پردیس سے کوئی تحفہ نہیں لائے تھے۔''

''بھئی بدل بدل کر پہن لینا...... کبھی تم نفیس جہاں کا سویٹر کبھی نفیس جہاں تمہارا۔'' عبداللہ نے جمیلہ خاتون کو افہام و تفہیم کی راہ سجھائی۔

''میں تو ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی...... نہ گورے میاں روز روز آئیں گے نہ گرم سویٹر لائیں گے۔ میں تو اپنا سویٹر سنبھال کر رکھوں گی۔ ولایت کی سوغات ہے۔'' عبداللہ زیرِ لب مسکرا دیے۔

ادھر مہرالنساء میاں سے گورے میاں کے خلاف شکوہ کناں تھیں۔ ''ہمارے بچوں کو چار چار ٹافیاں پکڑا دیں، امید کو پورا ڈبا۔''

''بھئی امید کے لیے اور کچھ جو نہیں لائے تھے۔''

''تو ہمارے بچوں کے لیے کیا لائے تھے۔'' مہرالنساء تڑخ کر بولیں۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''بھئی تمہیں سویٹر دیا مجھے گرم جرسی دی، بچوں کو ٹافیاں دیں۔''

''بس رہنے دیں...... بھانجی کی زیادہ حمایت نہ آئے آپ کو۔''

''حمایت کی بات نہیں۔ اس کے ماں باپ زندہ ہوتے تو گورے میاں انہیں بھی کچھ دیتے کہ نہیں۔ انہوں نے سوچا ہوگا ماں باپ نہیں تو......''

''بس بس رہنے دیں۔'' مہرالنساء نے شوہر کی بات کاٹ دی۔

باباجی کے گھر کی تاریخ میں پہلی بار ان کی بہوئیں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر شکوہ کناں ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

گورے میاں کی اپنی میم سے اَن بن ہوگئی تھی۔ بقول ان کے اس سے پہلے کہ میم چیزوں کے بٹوارے کا تقاضا کرتی، وہ بڑی ہوشیاری سے اپنا تمام نقد اثاثہ سمیٹ کر وہاں سے نکل آئے تھے۔

''تم نے اسے طلاق دے دی؟'' باباجی نے نہایت تشویش سے کہا۔

''نہیں......ابھی سیپریشن ہوئی ہے۔'' گورے میاں بولے۔

''کیا مطلب؟''

''ناراض ہو کر اس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔''

''ہائیں!'' باباجی نے ہڑبڑا کر گورے میاں کو دیکھا اور بے یقینی سے بولے۔ ''اس نے تمہیں نکال دیا؟''

''جی......وہاں یہی دستور ہے۔ مرد اور عورت کی نہ بنے تو عورت گھر سے مرد کو نکال دیتی ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' باباجی ناگواری سے بولے۔ ''یہ کیسا دستور ہے۔''

''وہاں عورت کی زیادہ چلتی ہے تاباجی۔''

''عورت کی چلے یا نہ چلے، مرد کو گھر سے نکالنے کا اسے کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ دین اسلام تو طلاق کے بعد بھی عورت کو عدت تک گھر سے نہ نکالنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ کیسا دستور ہے بھئی کہ عورت ناراضگی میں مرد کو گھر سے نکال دے۔ مرد تو عورت کا سرتاج ہوتا ہے۔''

''بہرحال میں کسی قانونی کارروائی سے قبل ہی اپنا پیسا سمیٹ کر یہاں آ گیا ہوں۔ اب یہیں رہنے اور بزنس شروع کرنے کا ارادہ ہے۔''

''بچے؟''

''وہ تو کب کے علیحدہ ہو چکے۔'' گورے میاں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا مطلب!'' باباجی چونکے۔

''بیٹی کسی جرمن سے شادی کر کے جرمنی چلی گئی...... بیٹا وہیں دوسرے شہر میں ایک گوری کے ساتھ رہتا ہے۔''

''ساتھ رہتا ہے کیا معنی؟''

''بس اکٹھے رہتے ہیں...... جی چاہے گا دونوں کا تو شادی بھی کر لیں گے ورنہ......''

''ورنہ؟''

''ورنہ یونہی رہتے رہیں گے۔ جب جی چاہے گا اپنے اپنے راستے ہو لیں گے۔''

''لاحول ولاقوۃ...... یہ تو سراسر حرام کاری ہوئی۔'' باباجی نے ناگواری ظاہر کی۔

''وہاں حلال حرام کے چکر میں زیادہ نہیں پڑتے لوگ۔'' گورے میاں بولے۔

''عاقبت خراب کرتے ہیں۔''

''وہاں لوگ دنیا اور عاقبت کے چکر میں بھی نہیں پڑتے۔''

''اپنا نقصان کرتے ہیں۔''

''گورا کہتا ہے...... ایٹ، ڈرنک اینڈ بی میری...... کھاؤ، پیو اور موج مستی کرو۔''

''حیوان اور انسان کے نظریۂ زندگی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے گورے میاں۔'' باباجی نے کہا۔

☆☆☆

گورے میاں ایک دو دن تو مہمان بنے باباجی کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ ان کے سونے، بیٹھنے کا انتظام اسی کمرے میں کر دیا گیا تھا۔ کھانے پینے کے لیے مہمانوں والی چھوٹی گول میز اور کرسی وہیں ڈلوا دی گئی تھی۔ ان کے لیے ڈبل روٹی، مکھن، جام اور انڈوں کا خاطر خواہ اہتمام بھی تھا اور علیحدہ سے کم مرچ والی ہانڈی پکانے کا بندوبست بھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ گورے میاں سالن کو روٹی سے کھانے کے بجائے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں سے کھاتے۔ البتہ کھانا پینا ان کا کم اور نہایت نزاکت اور احتیاط سے تھا۔ گھر میں چمچ تو بہت تھے ان کے لیے چھری، کانٹے کا بندوبست بھی کرنا پڑا۔

ایک دو روز بعد گورے میاں نے کمرے سے نکل کر گھر میں اور گھر سے باہر بھی گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ وہ بے تکلفی سے گھر کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاتے اور جاری امور کا نہ صرف جائزہ لینے لگتے بلکہ کبھی نظامِ امور پر تنقید اور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

1987 ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید داغ قابل علاج مرض ہے

پھلبہری

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر اجمل زیدی کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام

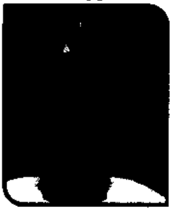

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

G-8/1 فون: (051)32331725
موبائل: 0300-8686186
فیکس: 2281636

لاہور

ہوٹل عامر

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27 اکتوبر

لوئر مال نزد سیشن کورٹ، لاہور
فون: (042) 7115015-19
موبائل: 0300-8686186

ہوٹل ایشیا

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر

جی ٹی روڈ نزد ہشتنگری چوک، پشاور
فون: (091) 2218215-9
موبائل: 0300-8686186

ملتان

28 مارچ تا 6 اپریل
28 جولائی تا 6 اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

فون: (061) 4518061-62
4582803 (0300-8686186)

کراچی

لیب سینٹر

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

K.F.C کراچی
فون: 021-7012068-9
موبائل: 0300-8686186

www.leucodermatologist.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بہتری کے لیے صلاح مشورے بھی دینے لگتے۔ انہیں سینکوں والی جھاڑو سے گھر کی صفائی کرنا دقیانوسی اور جھاڑو لگاتے وقت دھول مٹی کا اڑنا مضرِ صحت محسوس ہوتا۔

''آپ لوگ ہوور کیوں نہیں استعمال کرتے؟''

انہوں نے جھاڑو لگاتی بہو مہر النساء سے پوچھا۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟'' مہر النسا ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھنے لگیں۔

''صفائی کرنے کی مشین ہوتی ہے اور کیا ہوتا ہے۔ نہ ڈسٹ اڑتی ہے نہ چھینکیں آتی ہیں اور کام بھی تیزی سے۔''

''ہائے اللہ! ایک لے آتے نا آپ...... میری تو کمر دوہری ہو جاتی ہے جھک جھک کر۔'' مہر النساء کو خود پر ترس آنے لگا۔

باباجی کی سب سے چھوٹی بہو یاسمین کو گھر بھر کے میلے کپڑوں کے ڈھیر کے ساتھ نلکے کے سامنے بیٹھے اور صابن لگے کپڑوں کو لکڑی کی چھوٹے بلّا نما ''تھاپی'' سے زور زور سے پیٹتے دیکھ کر گورے میاں ورطۂ حیرت میں پڑ گئے۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟''

''کپڑے دھو رہی ہوں۔'' یاسمین قدرے خفیف ہو کر ہاتھ میں پکڑی ''تھاپی'' کی دھمک قدرے آہستہ کر کے بولیں۔

''واشنگ مشین میں کیوں نہیں دھوتیں؟'' گورے میاں بولے۔

''ہے ہی نہیں۔''

''خرید لیں۔'' یاسمین شرمندہ سی ہو گئیں۔ گورے میاں کتنے آرام سے واشنگ مشین خریدنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ انہیں کیا پتا کتنی ضرورتوں اور خواہشوں کو روک کر گزر بسر ہوتی تھی۔ باباجی جیسے دوراندیش منتظم نہ ہوتے گھر میں تو بڑی مشکل ہو جاتی۔

''اور یہ اتنے کپڑے...... کس کے ہیں؟'' گورے میاں نے کپڑوں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''گھر والوں کے ہیں۔'' یاسمین نے جواب دیا۔

''اتنے بہت!'' گورے میاں تعجب سے بولے۔

''سب کے جو ہیں۔''

''سب اپنے اپنے کیوں نہیں دھوتے؟''

''ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''ایسا کیوں ہوتا ہے...... سب کو اپنے اپنے دھونے چاہئیں...... ہمارے ہاں تو ہر آدمی اپنا کام خود کرتا ہے۔ میاں بیوی بچے سب اپنا اپنا کام کرتے ہیں...... کوئی کسی کے گھر مہمان جائے تو مہمان کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔''

''عجیب طریقہ ہے۔'' یاسمین حیران ہوئیں۔

''آسانی ہو جاتی ہے نا...... جب ہر شخص اپنا کام کرے تو کسی ایک پر سارے کام کا بار نہیں پڑتا...... اب دیکھو نا، تمہیں سارے گھر کے کپڑے دھونے پڑ رہے ہیں۔''

''ہمارے ہاں تیرا میرا نہیں ہوتا...... گھر کی ساری عورتیں مل بانٹ کر کام کرتی ہیں...... کسی نے سب کا کھانا پکا دیا۔ کسی نے سب کے جھوٹے برتن کھنگال دیے۔ کسی نے سب کے کپڑے دھو دیے تو کسی نے سارے گھر کی صفائی کر دی۔''

''ہوسکتا ہے کسی کو کسی کے ہاتھ کا پکا کھانا پسند نہ آئے لیکن وہ کھانے پر مجبور ہو...... یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کسی روز کسی کا کچھ کھانے کو دل چاہ رہا ہو مگر وہ، وہ کھانا کھانے پر مجبور ہو جو سب کے لیے پکا ہو۔''

''ہاں ایسا ہوتا تو ہے۔'' یاسمین کے دل کی بات کہہ گئے تھے گورے میاں۔

''اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کسی کو تمہارے ہاتھ کے دھلے کپڑے پسند نہ آئیں مگر وہ پہننے پر مجبور ہو۔''

''خیر کپڑے تو مجھ سے اچھے کوئی نہیں دھوسکتا اس گھر میں۔''

''اسی لیے تو سب نے کپڑوں کی دھلائی تم پر ڈال رکھی ہے...... دوسروں کے میلے کپڑے دھونا تو دور کی بات انہیں چھونے کو بھی دل نہیں چاہتا۔''

''یہ تو ہے۔'' یاسمین نے دل ہی دل میں سوچا۔

گورے میاں نے باباجی کے سامنے بھی ان کے گھر کے مشترکہ نظام خاندان پر بھی تنقید شروع کر دی۔ وہ انگریزی فیملی سسٹم کی تعریف کرتے اور کہتے۔ ''وہاں سب آزادی سے اپنی اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ حتیٰ کہ شوہر، بیوی کے اور بیوی، شوہر کے، والدین اولاد کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ اگر کریں تو انہیں جواب ملتا ہے...... مائنڈ یور اون بزنس...... اپنے کام سے کام رکھو...... اولاد بڑی ہوئی تو ماں باپ کہتے ہیں، جاؤ اپنا بوجھ آپ اٹھاؤ...... ہماری جان چھوڑو۔''

''اور جب ماں باپ بوڑھے ہوتے ہیں تو اولاد کہتی ہے...... اپنی موت آپ مرو۔ ہم سے کچھ امید نہ رکھو۔'' باباجی نے کہا۔

''بوڑھوں کے لیے وہاں اولڈ ہومز ہیں...... علاج معالجے کے لیے بہترین ہاسپٹلز ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے خرچے کی سہولت ملتی ہے۔'' گورے میاں بولے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''ارے میاں اپنوں کی وہ محبت اور احترام تو نہیں ملتا جو ہمارے ہاں ملتا ہے۔ اب دیکھو نا اس گھر میں مجھے میری اولاد اور اولاد کی اولاد سے جو محبت اور احترام ملتا ہے، اس کا تصور تمہارا کوئی بوڑھا گورا کر سکتا ہے بھلا۔''

''آپ کے بچے آپ کے برتھ ڈے پر وش کرتے ہیں آپ کو؟'' گورے میاں بولے۔

''گورے میاں! میں تو بڈھا ٹھڈا آدمی ہوں۔ ہمارے ہاں تو بچوں کی سالگرہ منانے کا بھی رواج نہیں۔''

گورے میاں مسکرائے۔ ''آپ کے بچے عید بقرعید پر آپ کے لیے کیک اور تحفے لاتے ہیں؟ کارڈ دیتے ہیں؟ وش کرتے ہیں؟''

''نہیں...... میں دیتا ہوں سب کو عیدی البتہ تحفے اور کارڈ وغیرہ کا تکلف نہیں ہمارے گھر میں۔''

''وہاں کرسمس پر بچے کہیں بھی ہوں اپنے ماں باپ کو کارڈز اور تحفے ضرور بھجواتے ہیں...... اور ہاں، آپ کے بچے فادرز ڈے پر آپ کے لیے کیا کرتے ہیں؟''

''فادرز ڈے؟''

''ہاں تایا جی...... گورے سال کا ایک دن باپ کے نام کرتے ہیں۔'' گورے میاں نے نہایت فخر سے بتایا۔ ''کہیں بھی ہوں باپ کو محبت بھرا پیغام ضرور بھیجتے ہیں۔''

بابا جی تدبر سے مسکرائے۔ ''الحمدللہ! میرے بچوں نے تو اپنی ساری زندگی ہی میرے نام کر رکھی ہے اور ہاں گورے میاں! سال میں صرف تین دن نہیں ہوتے باپ کو یاد رکھنے کے...... برتھ ڈے، فادرز ڈے اور کرسمس...... سال تین سو پینسٹھ دن کا ہوتا ہے بلکہ ہر چوتھا سال تین سو چھیاسٹھ کا۔ اپنے بچوں کے درمیان میرا تو ہر دن ہی روزِ عید بن کر گزرتا ہے۔''

گورے میاں مسکرائے، ان کی مسکراہٹ میں اہانت تھی۔ اپنے اور بابا جی کے درمیان احترام کے رشتے کو نظر انداز کر کے بولے۔ ''معاف کرنا تایا جی، اپنی عیدوں کے چکر میں آپ نے اپنی اولاد کو غلام بنا رکھا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم!'' بابا جی نے گورے میاں کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

گورے میاں بابا جی کی ٹیڑھی نظروں کو خاطر میں نہ لائے اور بولے۔ ''دنیا بہت بدل گئی ہے تایا جی...... اب ہر شخص اپنی زندگی جینا چاہتا ہے۔ آپ نے اپنے سارے بچوں اور ان کے بھی بچوں کو ایک ہی پنجرے میں قید کر رکھا ہے۔''

بابا جی کو گورے میاں کی بات ناگوار گزری۔ ''لاحول ولا قوۃ...... گورے میاں تم میرے گھر کو پنجرہ کہہ کر اس آشیانے کی توہین کر رہے ہو۔''

گورے میاں مسکرا دیے۔ ''انہیں اڑنے دیں تایا جی...... آزاد چھوڑیں انہیں...... اور انہیں ایک آشیانے میں قید کر کے رکھنے کے بجائے اپنا اپنا علیحدہ آشیانہ بنانے دیں ورنہ ایک دن آئے گا جب آپ کے اس آشیانے میں جگہ کم پڑنے لگے گی اور ان سب کا دم گھٹنے لگے گا۔''

''ایسا نہیں ہوگا...... کبھی بھی۔'' بابا جی نے پورے یقین سے کہا۔

''گھر کتنا ہی بڑا ہو تایا جی...... جب گھر میں رہنے والے لوگوں کی تعداد بڑھتی ہے تو جگہ کم پڑنے لگتی ہے۔ انہیں علیحدہ کر دیں۔ ایک دوسرے سے دور جانے دیں تاکہ یہ اپنی اپنی مرضی کی زندگی گزاریں۔ اپنے اپنے وسائل کے مطابق۔''

''گورے میاں! وسائل یکجا رہیں تو مسائل کم ہوتے ہیں۔ چار گھروں کے چار آنگنوں میں چار بلب جلیں تو بہتر یا ایک آنگن میں جلے ایک بلب کی روشنی میں چار گھروں کے لوگوں کا یکجا بیٹھنا بہتر۔'' بابا جی نے گورے میاں کو قائل کرنا چاہا۔

''تایا جی جس کے بازوؤں میں ہمت ہو وہ اپنے گھر کا آنگن خود روشن کر لیتا ہے۔ آپ کیوں انہیں ایک آنگن میں قید رکھنا چاہتے ہیں...... جانے دیں انہیں...... دوری سے محبت بڑھتی ہے۔''

''نہیں گورے میاں، محبت قریب رہنے سے بڑھتی ہے۔ فاصلہ تو محبت کا دشمن ہے۔''

''آپ پرانے وقتوں کے آدمی ہیں تایا جی۔ آپ کو سمجھانا مشکل ہے۔'' گورے میاں بولے۔

''نئے زمانے کے لوگوں کو سمجھانا بھی آسان نہیں گورے میاں۔'' بابا جی تدبر سے مسکرائے۔

☆☆☆

بابا جی اور گورے میاں کی باتیں گھر کے سبھی افراد کے کانوں میں پڑتیں۔ صبح امید کو گورے میاں کی باتیں ذرا نہ بھاتیں۔ وہ خواہ مخواہ بابا جی سے لمبی لمبی بحثوں میں الجھنے کی کوشش کرتے۔ گھر کا نظام جسے اپنے پرائے سب رشک سے دیکھا کرتے بلکہ مثالیں دیتے، گورے میاں اس پر اپنی نام نہاد فراست کی چھری اتنی بے رحمی سے چلاتے کہ امید کو غصہ آنے لگتا۔

''بابا جی! آپ گورے انکل سے یہ کیوں نہیں کہہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دیتے کہ ہمارے گھر کے معاملات میں دخل نہ دیں۔'' وہ بابا جی سے کہتی۔

''ارے بیٹا بولنے دو...... مہمان ہے...... کب تک بولے گا۔ ایک دن چلا جائے گا۔''

''مجھے اچھا نہیں لگتا جب وہ آپ سے ہمارے گھر کے سسٹم پر بحث کرتے ہیں۔''

''کرنے دو...... کب تک کرے گا۔'' بابا جی اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے۔

مگر امید کے برعکس گورے میاں کی باتیں گھر کی بہوؤں اور ان کے بچوں کے دل کو لگتیں۔ ماسوا مستقیم کے جو گورے میاں کے بارے میں امید کا ہمنوا تھا۔ گھر کی بہوئیں دل ہی دل میں سوچتیں ٹھیک ہی تو کہتے ہیں گورے میاں۔ سب کا علیحدہ علیحدہ گھر ہونا چاہیے اور اپنی اپنی زندگی۔ دل کی سوچ زبان تک بھی آ پہنچی۔ بچوں کو خلل ہوئی اور بہوؤں نے شوہروں کے کان بھرنے شروع کر دیے۔

''خدا بھلا کرے گورے میاں کا...... پہلی دفعہ کوئی حق بات کہنے والا آیا ہے اس گھر میں ورنہ جسے دیکھو بڑے میاں کو مکھن لگانے کو ایک ہی بات...... واہ! کیا مثالی گھرانا ہے بابا جی کا۔'' بڑی بہو جمیلہ نے ایک روز میاں سے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔'' میاں بولے۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ بھرے گھر کے لیے روٹیاں تھاپ تھاپ کر میرے تو بازو ہی شل ہو گئے اور روزانہ دونوں وقت کی یہ فکر علیحدہ کہ آج کیا پکے گا۔ اپنی، اپنے شوہر اور بچوں کی ذمے داری ہو تو آدمی بھی ہوٹل سے نان نہاری منگوا کر ہی خوش ہو جائے۔''

''کھانا ہی تو پکانا پڑتا ہے تمہیں اور اس میں بھی جس کا ہاتھ پڑتا ہے تمہارا ہاتھ بٹا دیتا ہے۔ باقی کام تو تمہارے اور تمہارے بچوں کے بھی گھر کی دوسری عورتوں کو بٹے ہوئے ہیں۔''

جمیلہ خاتون نے اس صاف گوئی پر میاں کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

گھر کی چاروں بہوؤں میں سے کسی کو اپنے اوپر کام کا بار زیادہ ہونے کا گلہ ہونے لگا تو کسی کو وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا شکوہ۔ کوئی شوہر کی آمدنی زیادہ اور اپنے کنبے پر ہونے والے اخراجات کا درونِ گھر راز داری سے حساب کتاب لگا کر دل ہی دل میں گھر کے اس مشترکہ نظام خاندان پر کڑھنے لگی جو اس گھر میں برسوں سے رائج تھا تو کسی کو گھر کے تمام مالی وسائل بابا جی کے تصرف میں ہونے پر درونِ دل گلہ رہنے لگا اور ایک روز مہر النساء بیگم نہایت راز داری سے یاسمین بیگم کے کان میں یہ صور پھونکنے میں کامیاب ہو گئیں کہ بابا جی نے کس قدر ہوشیاری سے اپنا ہی نہیں صبح امید کے مصارفِ زندگی کا بوجھ بھی چاروں بیٹوں پر ڈال رکھا تھا۔

''اپنا گھر ہو اور اپنا پیسا اپنے ہاتھ میں تو ہم اپنی مرضی سے خرچ نہ کریں۔'' مہر النساء نے یاسمین سے کہا اور لگتی پر مزید تیل چھڑکا۔ ''یہاں تو یہ حال ہے کہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے بھی بابا جی کے سامنے بھیک منگا بننا پڑتا ہے...... کیا غلط کہہ رہی ہوں میں۔'' مہر النساء نے یاسمین کو اپنی ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو بھابی۔'' یاسمین کے لہجے میں دل گرفتگی در آئی۔

چاروں بہوؤں اور ان کے بچوں میں کھچڑی پکنے لگی۔ گورے میاں کی آمد ایک غیبی امداد محسوس ہونے لگی۔ بابا جی سے ان کی لمبی لمبی بحثوں کو کان لگا کر نغمۂ آزادی کے سے سرور کے ساتھ سنا جاتا۔ گھر کے مشترکہ نظام خاندان پر ان کی تنقید زیرِ لب مسکراہٹیں بکھیرنے کا سبب بنتیں۔ گورے میاں گویا محمد بن قاسم تھے جو مظلوم خواتین اور ان کے بچوں کو راجا داہر کی قید سے آزاد کرانے آئے تھے۔ گھر کی خواتین اور ان کے بچے گورے میاں کے آرام اور خاطر تواضع کا خوشامد کی حد تک خیال رکھنے لگے۔ البتہ امید اور مستقیم انہیں اپنا مہمان سمجھتے ہوئے ان کا خیال ضرور رکھتے۔ ادب بھی کرتے مگر اوروں کی طرح گورے میاں کے درباری نہ بنتے۔

بابا جی گھر کی بہوؤں کو اپنے اور اپنے بچوں کے دشمن دکھنے لگے جنہوں نے ان سب کو بقول گورے میاں ایک پنجرے میں قید کر کے رکھا ہوا تھا۔ ایک روز چاروں نے گھر سے بابا جی اور ان کی چہیتی اور مخبر صبح امید کی عدم موجودگی میں گورے میاں سے کہا۔ ''گورے بھیا! جب سے آئے ہو ہمارے تو گھر کا ماحول ہی بدل گیا ہے۔ ہمیں اور ہمارے بچوں کو فکر یہ ہے کہ تم چلے گئے تو پھر گھر کا ماحول وہی پرانا جیسا ہو جائے گا۔ آپ کوئی ایسی تدبیر لگا لو کہ ہم لوگ الگ الگ ہو جائیں۔ بقول تمہارے سب کا اپنا اپنا گھر ہو اپنی اپنی زندگی۔''

''بڑے میاں کو سمجھا تو رہا ہوں، سنتے ہی نہیں۔'' گورے میاں نے کہا۔

''ارے بھیا! تمہیں اپنے پیاروں کی قسم کسی بھی طرح ہمیں اس قید خانے سے رہائی دلا جاؤ۔ تم چلے گئے تو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سمجھو ہماری اگلی سات نسلیں بھی بڑے میاں کے اس موئے قید خانے ہی میں قید رہیں گی۔ وہ تو بڑے فخر سے کہتے ہیں ساتھ مل کر رہنے میں بڑی راحت بہت برکت ہوتی ہے...... اللہ جانے کیسی راحت اور کہاں کی برکت۔''

''میں کہیں نہیں جا رہا۔ اب یہیں ہوں۔'' گورے میاں نے مظلوم خواتین کے اس وفد کو جو اس وقت درباری بنا ان کے سامنے موجود تھا، نوید سنائی۔

''جگ جگ جیو...... سدا یہیں رہو۔'' جمیلہ خاتون نے اپنا دامن پھیلا کر وفد کی بھرپور نمائندگی کی۔

''کچھ کریں گورے بھیا۔'' یاسمین کے لہجے میں رقت تھی۔

''پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' گورے میاں نے انہیں دلاسا دیا۔

☆☆☆

گورے میاں نے اعلان کیا کہ وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور کھولیں گے۔ ابتدائی طور پر پھر آہستہ آہستہ طلب کے مدِنظر تعداد بڑھاتے جائیں گے۔ انہوں نے باباجی کے چاروں بیٹوں کو اپنے کاروبار میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ باباجی نے مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ چاروں بیٹے جہاں تھے ٹھیک تھے۔ الحمدللہ عزت سے گزارہ ہو رہا تھا۔ بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور خدا کے فضل سے سبھی اپنی تعلیم پر پوری توجہ مرتکز کیے ہوئے تھے۔ عمدہ نتائج دے رہے تھے۔ پڑھ لکھ کر سبھی کو کچھ نہ کچھ بن جانا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہوجانا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' گورے میاں بولے۔ ''میں تو اپنوں کا بھلا چاہتا تھا تایاجی۔ آپ نہیں چاہتے کہ وہ فائدہ اٹھائیں تو میں باہر کے لوگ رکھ لوں گا...... جسے پیسا دوں گا وہی کام کرے گا میرے لیے۔''

بہوؤں نے باباجی کی مخالفت پر اتفاق رائے کر کے اپنے اپنے شوہروں کے کان بھرنے شروع کیے۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ باباجی اپنا آخری وقت اچھا گزارنے کی خاطر ان سب کو اپنی تحویل میں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ صرف اپنا اور امید کا بھلا سوچتے تھے۔ انہیں بیٹوں، بہوؤں اور ان کے بچوں کے بھلے سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ انہیں خود مختار اور ترقی کرتے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

''خوش نصیبی ہے کہ گورے میاں اتنی بڑی پیشکش کر رہے ہیں۔ کون سوچتا ہے کسی کے لیے اتنی کشادہ دلی سے۔'' جمیلہ خاتون نے ایک مشترکہ رازداری اجلاس میں شوہر اور بچوں سے کہا۔

''امی ٹھیک کہہ رہی ہیں ابوجی۔'' مومن، مومنہ اور معینہ تینوں بچوں نے ماں کی بات کی تائید کی۔

''خاک ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔'' عبداللہ بولے۔

''آخر کب تک بندھے بیٹھے رہیں گے۔ بچوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ بہو گھر لانی ہے۔ اس دڑبے میں کہاں سمائے گی وہ۔''

''اللہ مالک ہے...... دلوں میں جگہ ہونی چاہیے۔''

جمیلہ خاتون منہ پھلا کر بیٹھ گئیں۔

مہرالنساء نے شوہر اور بچوں کو گورے میاں کی پیشکش پر لبیک کہنے کی صلاح دی تو ان کے شوہر سے پہلے بیٹے مستقیم نے بھرپور مخالفت کی۔ ''امی جان! ابو جہاں ہیں ٹھیک ہیں۔ الحمدللہ عزت سے گزارہ ہو رہا ہے۔''

''تم تو اپنے چہیتے دادا کی زبان ہی بولو گے۔'' مہرالنساء نے بیٹے کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی جان! بابا کا اچھا خاصا کام ہے۔ اپنی شاپ ہے، کسی کا احسان بھی نہیں۔ کیا ضرورت ہے چلتے کاروبار کو ختم کر کے نئے کام میں ہاتھ ڈالنے کی جو بابا کا اپنا ہوگا بھی نہیں۔ انہیں گورے چچا کا محکوم اور ملازم بن کر رہنا ہوگا۔'' مستقیم بولا۔

''مستقیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' باپ، عبدالرحمان نے تائید کی۔

''بھائی ٹھیک نہیں کہہ رہا ہے بابا...... انسان کو آگے بڑھنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ آپ کی دکان دس ضرب چودہ کی چھوٹی سی دکان ہے۔ ذرا سوچیے تو ڈیپارٹمنٹل اسٹور کتنا بڑا ہوگا۔ گورے چچا کہہ رہے تھے وہ باہر کا سامان بھی رکھیں گے اسٹور میں۔'' محسن بولا۔

''شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے گورے میاں کو فرشتہ بنا کر بھیج دیا باہر سے ہمارے بھلے کے لیے۔''

''دشمن باہر ہی سے آتا ہے امی جان۔'' مستقیم نے کہا۔

''توبہ کرو...... کیا بک رہے ہو۔'' مہرالنساء نے بیٹے کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا اور مزید کہا۔ ''انسان کو دوست اور دشمن کی تمیز ہونی چاہیے...... تم دوست کو دشمن کہہ رہے ہو...... شرم آنی چاہیے تمہیں...... ارے آج کل کون کسی کا بھلا سوچتا ہے۔ گورے میاں تو انسان نہیں فرشتہ ہیں جو ہم سب کی بہتری کے لیے سوچ رہے ہیں۔ ارے بھئی ان کے پاس تو پیسا ہے جسے پیسا دیں گے وہی ان کے لیے کام

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کرنے کو تیار ہو جائے گا...... آخر باہر والے بھی تو فائدہ اٹھائیں گے ہم ہی کیوں نہ اٹھائیں۔"

"امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" مستقیم کی چھوٹی بہن محسنہ نے اس گفتگو کے دوران پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

عبدالرحیم جو ہوٹل منیجری کے طویل اوقات کار سے عاجز آئے ہوئے تھے، انہیں آمادہ کرنے کے لیے ان کی نصف بہتر نفیس جہاں کو کچھ وقت صرف نہیں کرنا پڑا۔

"میں خود سوچ رہا تھا کہ کوئی موقع ملے تو میں ہوٹل سے اپنی جان چھڑاؤں۔ کتنا ہی کام کرلوں مالک کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ کبھی دیر سے پہنچنے پر ڈانٹ پھٹکار، کبھی جلدی چھٹی مانگنے پر اس کی ناک بھوں چڑھے دیکھنا۔"

"دفع کریں...... کل کے چھوڑتے آپ آج ہی چھوڑ دیں اس کی نوکری۔" نفیس جہاں بولیں۔

"نہیں بھئی ایسے نہیں۔ ذرا دیکھ لوں کہ گورے میاں کس حد تک سنجیدہ ہیں۔"

"قسم اللہ کی بالکل سنجیدہ ہیں۔"

"تم سے کس نے کہا؟"

"مجھے خود پتا ہے۔ آدمی کی نیت اور ارادہ اس کے لہجے سے بھانپ لیا جاتا ہے۔" نفیس جہاں نے دانشمندی بگھاری۔

عبدالقدوس جو دواؤں کی کمپنی میں ملازم تھے، دو بڑے بھائیوں کی طرح گورے میاں کی پیشکش کو قبول کرنے میں کچھ متردد ہوئے مگر بیگم نے انہیں اپنے آنسوؤں سے رام کرلیا۔

"آخر کب تک ہم سسک سسک کر جئیں گے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ دوسری عورتوں کی طرح میں بھی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ گاڑی میں گھوموں پھروں۔ سیر و تفریح کروں۔ اچھا کھاؤں اچھا پہنوں، یہ جبھی ہوگا جب آپ کی آمدنی اچھی ہوگی اور آمدنی بھی اچھی ہوگی جب اپنا کام ہوگا اور کام بھی بڑا۔ چھوٹے موٹے کام میں آج کل کچھ نہیں ملتا۔ گورے میاں بڑے بڑے اسٹور کھولنے کو کہہ رہے ہیں۔ موقع سے فائدہ اٹھائیں، خوش قسمتی بار بار دستک نہیں دیتی۔"

عبدالقدوس قائل اور آمادہ ہوگئے۔

☆☆☆

گھر میں منعقدہ ایک تفصیلی نشست جس میں بابا جی، چاروں بیٹے، بہوئیں اور گورے میاں شریک تھے، گورے میاں نے مستقبل کا لائحہ عمل پیش کیا۔ کسی معروف علاقے میں ایک وسیع و عریض ہال نما عمارت خرید کر اسے چار واضح شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصہ روزمرہ استعمال کی اشیائے خورونوش کے لیے مخصوص ہو، دوسرا حصہ سبزی، پھل اور گوشت کی فروخت کے لیے مخصوص کیا جائے۔ اسٹور کے تیسرے حصے میں سلے سلائے ملبوسات، جوتے، بیگز، جیولری، کاسمیٹکس اور گفٹ آئٹمز، چوتھا شعبہ کراکری کے لیے مخصوص ہو۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا ہر شعبہ بابا جی کے ایک بیٹے کے سپرد ہو۔ چاروں بیٹے اپنا اپنا شعبہ چلائیں اور چاروں شعبوں میں آمدن اور نفع نقصان کا حساب کتاب باہر سے ملازم رکھا جانے والا ایک جنرل منیجر کرے جو بے لاگ ہر شعبے کی کارکردگی پر نظر رکھے اور نگرانِ شعبہ کی مناسب راہنمائی بھی کرے تاکہ کاروبار ترقی کرے۔ جب ایک اسٹور منافع بخش بن جائے تو پھر دوسرا تیسرا اور متعدد اسٹورز کھولے جائیں۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر اس سے آگے گورے میاں کی شرائط کڑی تھیں۔

چاروں بھائیوں کو ماہانہ تنخواہ ملے گی۔ اسٹور کے مجموعی نفع نقصان میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنے اپنے کنبے کا علیحدہ انتظام چلائیں گے اور ہر کنبہ اپنی اپنی آمدن، اخراجات اور بچت کا علیحدہ حساب کتاب رکھے گا حتیٰ کہ یوٹیلیٹی بلز بھی اپنے اپنے حصے کا ادا کیا جائے گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ ایک گھر میں سب کے اکٹھا رہتے ہوئے یہ کس طرح ممکن تھا کہ اپنے اپنے حصے کے یوٹیلیٹی بلز ادا کیے جائیں۔ گورے میاں کے پاس اس سوال کا جواب یہ تھا کہ سب علیحدہ علیحدہ گھر میں رہیں لیکن چار علیحدہ گھر بنتے کیونکر ممکن تھے۔ گورے میاں کے پاس اس کا آسان جواب یہ تھا کہ پہلے چاروں بھائی کرائے پر علیحدہ علیحدہ گھر لے لیں۔ جب وسائل ہو جائیں تو اپنا گھر خرید لیں یا زمین لے کر اس پر گھر بنالیں۔

بابا جی جو پہلے ہی اس حق میں نہ تھے کہ بیٹے اپنا لگا لگایا روزگار چھوڑ کر گورے میاں کے ساتھ نئے کام میں ہاتھ ڈالیں۔ گورے میاں کی اس تجویز سے کہ ان کے چاروں بیٹے علیحدہ علیحدہ کرائے کے مکانوں میں رہیں، سخت چیں بہ جبیں ہوئے۔ "نہیں گورے میاں! یہ نہیں ہوسکتا۔" بابا جی نے صاف کہہ دیا۔

"کیوں؟" گورے میاں بولے۔

"اپنا گھر ہوتے کیا ضرورت ہے کرائے کے مکانوں میں رہنے کی۔"

"علیحدہ رہے بغیر کیسے پتا چلے گا کہ چاروں فیملیز میں سے کس کا کتنا خرچہ ہے۔ کون کتنی بجلی، کتنی گیس استعمال کر

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ پتا کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس گھر میں سب برسوں سے مل جل کر رہ رہے ہیں اور بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ کاروبار تم شروع کرنا چاہتے ہو کرو مگر گھر کا نظام جس طرح چل رہا ہے ویسے ہی چلنے دو۔" باباجی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"معاف کرنا تایا جی، آپ ان سب کو اپنی اپنی زندگی کیوں نہیں جینے دینا چاہتے۔ کیوں انہیں دڑبے میں قید رکھنا چاہتے ہیں۔" وہ بات جو گورے میاں باباجی سے پہلے بھی کہہ چکے تھے انہوں نے پھر دہرائی۔

"گورے میاں! مجھے تمہارے باپ سے اپنے تعلق کا خیال ہے ورنہ....." باباجی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ آپ مجھے اپنے گھر سے چلتا کردیتے۔" گورے میاں نے باباجی کو استہزائیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں شاید اس سے بھی زیادہ کر گزرتا۔" باباجی غصے کی شدت سے کانپنے لگے۔

گورے میاں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

باباجی کی بہوؤں کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ پہلی مرتبہ کسی نے باباجی کے خودساختہ اصولوں سے ٹکرانے کی کوشش کی تھی۔ گورے میاں کے لیے ان چاروں کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔ وہ ٹھیک تو کہہ رہے تھے۔ یہ گھر دڑبا ہی تو تھا جہاں وہ سب برسوں سے قید یکساں زندگی گزار رہے تھے۔ ایک سی صبحیں ایک سی شامیں۔ ہر معاملے میں باباجی کی جی حضوری۔ نہ اپنی مرضی سے جینا نہ اپنی مرضی سے مرنا۔ علیحدہ گھر میں خودمختاری کی زندگی گزارنے کا تصور ہی روح پرور تھا۔ اس گھر میں تو کبھی دن چڑھے تک سو بھی نہ سکتا تھا کوئی۔ باباجی منہ اندھیرے ہانک لگا دیتے۔ "نماز کا وقت ہوگیا ہے۔" علی الصباح بستر چھوڑنے والے رات کو بستر پر جانے تک کولہو کے بیل کی طرح بس چلتے ہی رہتے۔

"تایا جی! دنیا ترقی کرکے کہیں سے کہیں جارہی ہے آپ اپنے بچوں کی ترقی کا راستہ کیوں روکنا چاہتے ہیں۔"

"اپنی حد سے نہ بڑھو گورے میاں۔" باباجی کو پھر غصہ آگیا۔ "کون باپ اپنے بچوں کا برا چاہے گا بھلا۔"

"آپ چاہ تو رہے ہیں۔" گورے میاں نے اسی بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ "ایسا سنہری موقع انہیں کبھی ملے گا

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
900
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
9,000
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
0301-2454188
0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بھلا۔ میں اپنی ایڈ یعنی مدد سے انہیں چھوٹی چھوٹی معمولی نوکریوں سے بڑے کاروبار کا راستہ دکھانا چاہتا ہوں حالانکہ مجھے کوئی غرض یا لالچ نہیں ان سے...... بس ہمدردی ہوئی کہ ساری دنیا عیش کر رہی ہے اور اس گھر کے لوگ ہینڈ ٹو ماؤتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے اتنے بڑے پروجیکٹ میں ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔''

''نوازش، مہربانی! تمہاری ہمدردی کا بہت شکریہ...... ہم جیسے ہیں جس حال میں ہیں خوش ہیں۔'' باباجی بولے۔

''ان سے بھی تو پوچھ لیں کہ یہ خوش ہیں یا نہیں۔'' گورے میاں نے باباجی کے چاروں بیٹوں کو ایک نظر دیکھا۔

''میں نے جو کہہ دیا تم سے کافی ہے...... میرے بچے مجھ سے اختلافِ رائے نہیں کرتے۔''

''ڈکٹیٹر شپ اور کسے کہتے ہیں تایا جی...... کسی شخص سے اختلافِ رائے نہ کر سکنا ہی تو ڈکٹیٹر شپ ہوتی ہے۔'' گورے میاں مسکرائے اور باباجی پہلو بدلنے پر مجبور ہوئے۔

''ہاں بھئی آپ لوگوں کی کیا مرضی ہے؟'' باباجی نے چاروں بیٹوں کو بایقین دیکھا۔

چاروں کسمسائے۔ ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ بیوی بچوں کی ناراضگی کا شعلہ دل میں لہرایا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک نے دوسرے سے کہا۔ ''تم بولو۔''

عبدالقدوس نے عبدالرحیم کو اپنی کہنی سے ہلکا سا ٹہوکا دیا۔ عبدالرحمان نے عبداللہ کو دیکھا پھر باقی دو بھائیوں کی نظریں بھی عبداللہ پر آ ٹھہریں کہ وہی سب سے بڑے تھے، انہی کو چھوٹوں کی ترجمانی زیب دیتی تھی۔ عبداللہ کچھ دیر گومگو کیفیت میں رہے پھر دھیرے سے کھنکھارے اور دھیمی آواز میں بولے۔ ''ہمیں چانس لینے دیں باباجی۔''

بڑے بھائی کی بات پر چھوٹے تینوں بھائیوں نے زور و شور سے اپنی گردنیں ہلا کر تائید کی۔

چاروں بیٹوں پر باباجی کے یقین اور بھروسے کا تاج محل جو برسوں سے نہایت استقامت سے کھڑا اپنی چھب دکھا رہا تھا، یکلخت دھماکے سے زمین بوس ہو گیا۔

صبح امید نے باباجی کو اتنا اداس اور دل گرفتہ اس دن بھی نہیں دیکھا تھا جب وہ اپنی رفیقۂ زندگی کو سپردِ خاک کر کے آئے تھے۔

☆☆☆

گورے میاں نے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے منصوبے پر نہایت برق رفتاری سے کام شروع کر دیا۔ پیسے کی ان کے پاس کمی نہ تھی۔ باباجی کے چاروں بیٹوں نے اپنے اپنے روزگار کو خیرباد کہہ دیا تھا اور گورے میاں کے دست و بازو بن کر ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے جلد از جلد قیام میں ان کی شب و روز مدد کر رہے تھے۔

ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے قیام کے لیے گورے میاں نے شہر کے ایک متوسط اور گنجان آباد علاقے کا انتخاب کیا تھا۔ ان کا خیال تھا ایسے علاقے میں لوگ چمکتے دمکتے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی طرف زیادہ راغب ہوں گے۔ جنہیں کچھ نہیں بھی خریدنا ہوگا، وہ محض دیکھنے کے شوق میں ہی آیا کریں گے اور نت نئی اشیا دیکھ کر ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی ان چیزوں کو گھر لے جانے کی خاطر اپنی جیبیں جھاڑ دیا کریں گے۔

''وہاں یہی ہوتا ہے۔ اسٹورز میں دھڑا دھڑ نت نئی چیزیں آتی رہتی ہیں۔ لوگ منڈے ٹو فرائیڈے مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں اور ویک اینڈ پر ان اسٹورز میں آ کر اپنی جیبیں جھاڑ جاتے ہیں۔'' گورے میاں نے باباجی کے بیٹوں کو بتایا پھر فسوں پھونکا۔ ''ہم بھی اپنے اسٹور کو ایسی ایسی چیزوں سے بھر دیں گے کہ لوگ جیبیں جھاڑ کر ہی نکلیں۔''

''گورے بھائی! یہاں اللہ نے لوگوں کو بہت وسائل سے نواز رکھا ہے۔'' عبدالرحیم بولے۔

''یار! لوٹ سیل کی دھوم مچا کر لوٹنا ہی تو ہے لوگوں کو۔'' گورے میاں مسکرائے۔

ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے لیے ایک عمارت لب سڑک یکمشت ادائیگی کر کے خرید لی گئی اور چاروں مجوزہ شعبوں کی تزئین و آرائش کا کام شروع کر دیا گیا۔ قریبی رہائشی آبادی میں باباجی کے چاروں بیٹوں کے کنبوں کی رہائش کے لیے مکانات بھی دیکھے جانے لگے۔

☆☆☆

چاروں بھائیوں کے لیے اوقاتِ کار کا نقشہ ہی بدل گیا۔ صبح سویرے گھر سے نکلتے، واپسی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ رات کو بارہ ایک بجے سے پہلے واپسی نہ ہوتی۔ گورے میاں چاہتے تھے جلد از جلد تزئین و آرائش کا کام مکمل ہو تو اسٹور کا افتتاح کیا جائے۔ چاروں بھائی صبح سے آدھی رات تک مصروف رہتے۔ گورے میاں تو دن میں ایک چکر لگاتے، کام کا جائزہ لیتے، ہدایتیں جاری کرتے اور واپس روانہ ہو جاتے۔

باباجی خاموش تماشائی بنے بیٹوں کے حالات دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھتے۔ بے چارے نہ ٹھیک سے کھا پی سکتے نہ پہلے کی طرح اپنے بال بچوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سکتے۔ نہ خود باباجی کے پاس بیٹھنے، ان کا حال چال پوچھنے اوران کے ہاتھ پاؤں دبانے کی فرصت رہی تھی انہیں۔ بس ایک ہی فکر سوار تھی ان کے سروں پر کہ کسی طرح اسٹور کے ڈیپارٹمنٹس کی تزئین و آرائش مکمل ہو پھر سامان پڑے اور اسٹور کا افتتاح ہو جائے۔

ایک روز باباجی نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹوں سے پوچھ ہی لیا۔ ''پہلے اچھا تھا جب تم لوگ اپنے بچوں کے ساتھ ناشتا کر کے گھر کا سودا سلف، اچھا برا دیکھنے کے بعد اپنے کام پر نکلتے تھے اور شام کو گھر واپس آ کر اپنے بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان کے ساتھ دسترخوان پر اکٹھے کھانا کھاتے تھے یا یہ بھاگ دوڑ؟''

چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ان میں سے ایک نے دبی زبان سے کہا۔ ''باباجی! بچوں کے مستقبل کے لیے کچھ قربانی تو دینی پڑتی ہے ماں باپ کو۔''

باباجی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور گھائل لہجے میں بولے۔ ''بیٹا! قربانی تو میں نے بھی دی تم چاروں کے لیے مگر تم تو گورے میاں کی لے پر چل پڑے۔ باپ ہوں، دکھ ہوتا ہے جب تم لوگوں کو غیر کی بانسری پہ سر دھنتے دیکھتا ہوں۔''

''گورے میاں ہمارے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں باباجی۔ کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''گورے میاں کو تم مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ میں نے اس کا بچپن اور لڑکپن دیکھا ہے۔ اس کا باپ کہتا تھا کہ میرا یہ بیٹا کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس میں اس کا اپنا فائدہ نہ ہو۔''

''آپ کو گورے بھائی کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے۔''

''مجھے تم لوگوں کی سادہ لوحی کا دکھ ہے۔ اس گھر کا نظام بکھرنے کا افسوس ہے۔ کبھی کبھی انسان اپنے اچھے برے کی تمیز اور دوست دشمن کا فرق کھو دیتا ہے۔ مجھے رنج ہے کہ میں اپنے بچوں کو بھی اس مشکل سے گزرتے دیکھ رہا ہوں۔''

''اوہو باباجی! آپ تو خوامخواہ وہم میں پڑ رہے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔'' عبدالرحمان بولے۔

''خدا کرے تمہارا خیال درست ہو۔'' باباجی نے دل گرفتگی سے کہا۔

دروازے سے کان لگائے کھڑی باباجی کی بہوؤں میں سے ایک نے دروازے کے پاس سے ہٹتے ہوئے باقی تین بہوؤں کو بھی مورچا چھوڑنے کا اشارہ دیا اور دالان میں پہنچ کر بولی۔ ''بڈھے کو اپنی حکومت چھنتے دیکھ کر دورے پڑ رہے ہیں۔''

''ہاں ہمارے اچھے دنوں کا خیال ہضم نہیں ہو رہا انہیں۔'' مہرالنساء نے دیدے مٹکاتے ہوئے کہا۔

چاروں باجماعت مسکرا دیں۔

☆☆☆

اسٹور کی تزئین و آرائش تکمیل کے ... نزدیک تھی کہ گورے میاں نے ایک پڑھے لکھے آدمی کو جنرل منیجر رکھ لیا۔ بقول گورے میاں جنرل منیجر کا تقرر جملہ معاملات کی نگرانی کے لیے کیا گیا تھا۔ چاروں شعبہ جات باباجی کے بیٹے چلائیں گے اور اپنے اپنے شعبے کا حساب کتاب جنرل منیجر کو دیا کریں گے جو نفع نقصان پر نظر رکھے گا۔

ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا نام ''گورے میاں ڈیپارٹمنٹل اسٹور'' رکھا گیا۔ ہر شعبے کو بڑی بڑی کمپنیوں سے سامان کی ترسیل شروع ہو گئی۔ چیزیں سجنا شروع ہو گئیں۔

گورے میاں کے ہاتھوں اسٹور کے شاندار افتتاح کے بینرز آویزاں ہونا شروع ہوئے اور گورے میاں نے باباجی کے چاروں بیٹوں کے لیے اسٹور کے قرب و جوار میں واقع رہائشی آبادیوں میں علیحدہ علیحدہ کرائے کے مکانات کا بندوبست بھی کر دیا جن کا ایڈوانس تو گورے میاں نے خود ادا کیا تاہم ماہوار کرایہ انہیں خود ادا کرنے کی ہدایت کی۔

''گورے بھائی ابھی تو کام بھی شروع نہیں ہوا اور ہماری آمدنی دو تین ماہ سے بند ہے۔ باباجی بے چارے نہ جانے کیسے گھر کا نظام چلا رہے ہیں۔ گھر کا کرایہ کہاں سے دیں گے ہم۔'' عبداللہ بولے۔

''تم نہیں جانتے یہ بوڑھے لوگ کتنے چالاک ہوتے ہیں۔ مہنگائی اور پیسے کی تنگی کا رونا روتے رہتے ہیں اور پیسا دبا دبا کر رکھتے رہتے ہیں۔''

''باباجی ایسے نہیں ہیں۔ نہ تو وہ کبھی مہنگائی اور پیسے کی تنگی کا رونا روتے ہیں اور نہ پیسا دبا دبا کر رکھتے ہیں۔ وہ بے چارے تو سب کچھ ہم پر اور ہمارے بچوں پر ہی خرچ کر دیتے ہیں۔''

''اچھا اگر بچا کر نہیں رکھتے تو یہ بتاؤ پچھلے دو تین ماہ سے جب سے تم چاروں بھائی میرے ساتھ کام پر لگے ہوئے ہو، گھر کا خرچہ کہاں سے ہو رہا ہے۔''

''پتا نہیں بے چارے باباجی ہی چلا رہے ہیں گھر کا نظام۔''

''عقلمندو! یہ وہی پیسا ہے جو تایاجی ان پیسوں میں سے جو تم چاروں بھائی انہیں دیتے رہے ہو بچا بچا کر رکھتے رہے اور اب نکال رہے ہیں۔ ورنہ تایاجی کا اپنا کوئی ذریعہ آمدن ہے جس سے وہ گھر کا نظام چلائیں گے؟''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

”میں نے اس دوران کئی مرتبہ باباجی سے پوچھا کہ گھر کا خرچہ وہ کیونکر چلا رہے ہیں، انہوں نے یہی کہا تم گھر کے خرچ کی فکر نہ کرو، اللہ مالک ہے۔ جس کام میں لگے ہو اللہ تمہارے لیے آسانیاں عطا فرمائے۔“ عبداللہ نے بتایا۔

”میں کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ تم خود سوچو جب آمدنی نہیں تو خرچ کہاں سے ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے بچت سے۔“

چاروں بھائی خاموش رہے۔ وہ بھی گورے میاں سے کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے تھے۔ گورے میاں سے ان کا نیا تعلق آجر اور اجیر کا تھا۔ انہیں مزدوری کرنی تھی۔ اپنے اور بال بچوں کے لیے روزی کمانی تھی۔ انہیں ان کی محنت کی اجرت دینے والے گورے میاں تھے۔ آجر سے بحث میں الجھ کر مزدور کے ہاتھ کیا آتا ہے بھلا! انہیں گورے میاں کا بندۂ بے دام بن کر رہنا تھا۔

انہیں کون بتاتا کہ باباجی ان کی بے روزگاری کے دنوں میں وہ گہنے چپکے چپکے فروخت کر کے گھر کا نظام چلا رہے تھے جو ان کے اچھے برے دنوں کی ساتھی، ان کی مرحومہ مغفورہ رفیقۂ حیات چھوڑ کر مری تھیں اور جنہیں باباجی نے صبح امید کو اس کی شادی پر دینے کی نیت سے محفوظ رکھ چھوڑا تھا لیکن گھر کا نظام چلانے کو انہیں اپنے دل پر پتھر رکھ کر ان زیورات کو یکے بعد دیگرے فروخت کرنا پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

اسٹور کے افتتاح سے چند روز قبل باباجی کے چاروں بیٹے اپنے اپنے بال بچوں کے ساتھ کرائے کے مکانوں میں منتقل ہو گئے۔ وہ بھی کیا منظر تھا... برسوں سے آباد گھر کے باہر گلی میں چار سامان بردار گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ ہر گاڑی میں کچھ سامان لادا جا چکا تھا، کچھ لادنا باقی تھا۔ باباجی کے بیٹے اور پوتے اپنے اپنے حصے کا سامان اپنی اپنی گاڑی میں لدوا رہے تھے۔ گھر کے اندر عورتیں اور لڑکیاں اپنے اپنے سامان کی نشاندہی میں مردوں کی مدد کر رہی تھیں۔ حسب طاقت ہلکا پھلکا سامان اٹھا اٹھا کر انہیں پکڑا بھی رہی تھیں۔ ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ کمروں سے گھر کے دالان اور صحن تک بپا ہو چکی تھی۔

”ارے دیکھنا، وہ گدا ہمارا ہے۔ غلطی سے کسی اور کے ساتھ نہ چلا جائے۔“

”یہ واٹر کولر ہمارے ساتھ جائے گا۔“

”مہرالنساء ساری دیگچیاں تم تو نہ اٹھا لے جاؤ، ہمیں بھی ضرورت ہو گی۔“ جمیلہ خاتون چلا رہی تھیں۔

”یہ دری ہم لے جائیں گے۔“

”چار کرسیاں اپنی گاڑی میں رکھواؤ، ہمیں بھی ضرورت ہو گی۔“

”ائے ہئے یہ سلفچی تو پرانی یادگار ہے، میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“

”اری مریم پیتل کا لوٹا اٹھا کر ابو کو دے۔ کوئی اور نہ جھپٹ لے اسے۔“ نفیس جہاں بیٹی کو ہدایت کر رہی تھیں۔

”یہ آئینہ تو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ آخر ہمیں بھی تو آئینہ دیکھنے کی ضرورت ہو گی کہ نہیں۔“ یاسمین بیگم غسل خانے سے اتارا جانے والا مستطیل آئینہ اپنے سینے سے لگائے کھڑی تھیں۔

گھر کی چیزیں تقسیم ہو رہی تھیں۔ اتفاق و اتحاد کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔

بے غرضی سے چلتا نظام متزلزل ہو چکا تھا۔

باباجی کی اولاد کا مثالی اتفاق پارہ پارہ ہو رہا تھا۔

باباجی کا اپنی اولاد پر یقین آندھیوں کی زد میں تھا۔

صبح امید رنج سے نڈھال تھی۔

گھر چھوڑ کر جانے والوں کی مسرت دیدنی تھی۔

پیچھے رہ جانے والوں کا ملال روح پر ایک چوٹ تھا۔

بسے بسائے گھر کو اجڑتے اور اس کا شیرازہ بکھرتے دیکھنا باباجی کے لیے سوہانِ روح تھا اور اس سے بھی زیادہ اذیت ناک امر یہ کہ گھر چھوڑ کر جانے والوں کو گھر چھوڑنے کا کوئی ملال نہ تھا۔ وہ خوش تھے۔ باباجی نہایت دل گرفتگی سے ہاتھ ملتے چپکے چپکے اپنی آنکھوں کی نمی اپنی انگلیوں کی پوروں میں جذب کرتے اور نہایت ملال سے سوچتے ”بار الٰہا! یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔“

باباجی کو دل گرفتہ اور مضطرب دیکھ کر صبح امید کا دل بھی بیٹھے جاتا۔ اسے ماموؤں پر حیرت ہوتی کہ کیسے انہوں نے اسے اور باباجی کو اکیلے چھوڑ کر جانے کی ہمت کر لی تھی۔ اسے ممانیوں اور کزنز کو خوش دیکھ کر تعجب ہوتا۔ جس گھر میں انہوں نے اتنے سال ہنسی خوشی یکجا رہ کر گزارے تھے، اسے چھوڑنے کا ذرا دکھ نہ تھا انہیں، بلکہ خوش تھے وہ اور باباجی سے ہی نہیں، وہ ایک دوسرے سے بھی بیگانہ دکھائی دے رہے تھے۔

چاروں بیٹے خدا حافظ کہنے باباجی کے پاس آئے تو انہوں نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ ”اب بھی وقت ہے سوچ لو۔“

چاروں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور عبداللہ نے بڑے ہونے کا حق نبھایا۔ ”باباجی! اب کیا سوچنا...... اب تو اسباب بھی گاڑیوں میں لد چکا۔“

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"اتارا بھی جاسکتا ہے۔ ابھی اپنے گھر کی دہلیز پر ہی ہو تم لوگ۔" باباجی نے کہا۔

باہر ایک گاڑی والے نے ہارن بجایا۔

"اجازت دیں باباجی۔" عبدالرحیم کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"میں نے تمہیں متحد رکھنا چاہا تھا۔ یقین اور توکل کی روح تمہارے دلوں میں پھونکنے کی کوشش کی تھی۔ نظم وضبط سے زندگی گزارنے کو تمہارا شعار بنایا تھا مگر تم تو ایک غیر کے بہکائے میں آکر برسوں کی تعلیم وتربیت کو بھول گئے میرے بچو۔" باباجی کی پلکوں پر نمی کروڑوں سال کی مسافت پر واقع دور دراز ستاروں کی طرح ٹمٹمارہی تھی۔

"ہم اب بھی متحد ہیں باباجی۔" عبدالرحمان بولے۔

"بکھر کر بھی کوئی متحد رہا ہے۔" باباجی نے دل گرفتگی سے کہا۔

"باباجی! ہم اپنے اور اپنی آئندہ نسلوں کے بہتر مستقبل کے لیے یہاں سے جارہے ہیں۔" عبدالقدوس نے فراست جھاڑی۔

"خواب مل جل کر دیکھے جاتے ہیں بیٹے۔" باباجی نے عبدالقدوس کو پُرملال نگاہوں سے دیکھا۔

"ہر آنکھ جدا خواب دیکھتی ہے باباجی...... ہم چاروں بھائی علیٰحدہ علیٰحدہ جدوجہد کریں گے۔ جو جتنی محنت کرے گا اتنی ہی اچھی تعبیر پائے گا۔ ہمیں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔" باباجی نے کہا۔

"آپ سے ملنے کے لیے آتے رہیں گے باباجی۔" عبداللہ نے کہا۔

"نہ بھی آؤ گے تو میرے دل کی دھڑکنوں میں تو بسے ہی رہو گے۔" باباجی نے عبداللہ کو نہایت محبت سے دیکھا۔

"اچھا باباجی۔"

"بس ایک بات رکھنا میرے بچو...... پرندے رزق کی تلاش میں کتنی ہی اونچی اڑان بھریں، کیسی ہی طویل مسافت طے کر جائیں۔ شام ڈھلے اپنے آشیانوں کی طرف ہی پلٹتے ہیں...... یہ آشیانہ میں نے تم لوگوں کے لیے بہت محبت اور محنت سے بنایا تھا۔"

"خدا حافظ باباجی۔"

"فی امان اللہ!"

باباجی اور صبح امید لق ودق گھر میں اکیلے رہ گئے۔

"آپ دکھی نہ ہوں باباجی...... میں ہوں نا آپ کے پاس۔" امید نے اپنا نرم ونازک ہاتھ باباجی کے ضعیف وناتواں شانے پر رکھ دیا۔

باباجی نے اپنا بازو دوہرا کرکے اپنی استخوانی انگلیوں سے امید کے نرم ونازک ہاتھ کو تھپتھپایا۔

باہر گلی میں گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دفعتاً گھر کا دروازہ جو گھر سے جانے والے اپنے پیچھے بند کرگئے تھے، کھلا اور مستقیم گھر میں داخل ہوا۔ امید اور باباجی چونک کر اسے دیکھنے لگے...... وہ کیوں آگیا تھا بھلا؟

"باباجی! میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔" مستقیم نے باباجی کے نزدیک آکر کہا۔

"کیوں میرے بچے؟" باباجی نے پوچھا۔

"کیونکہ آپ اکیلے جو ہوں گے۔"

"امید ہے نا میرے پاس۔"

"آپ دونوں اکیلے کیسے رہیں گے...... گھر میں کوئی مرد بھی تو ہونا چاہیے۔" مستقیم بولا۔

"میں ہوں نا۔" باباجی نے کہا۔

"آپ بوڑھے ہیں باباجی۔"

"تو کیا ہوا۔ میری ہمت تو جوان ہے۔ میرا جذبہ توانا ہے میرے بچے۔" باباجی جو کچھ دیر پہلے نہایت دکھی اور ناتواں دکھائی دے رہے تھے، توانا لہجے میں بولے۔

مستقیم نے کچھ کہنا چاہا مگر تبھی باہر سے اس کے باپ کی بلند آہنگ پکار سنائی دی۔ "مستقیم! جلدی آؤ دیر ہورہی ہے۔"

"جاؤ میرے بچے۔" باباجی نے مستقیم کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

مستقیم کشمکش سے دوچار دکھائی دیا۔

"مستقیم!" اب کی بار مستقیم کو اس کی ماں نے پکارا تھا۔

"جاؤ...... تمہاری ماں بلا رہی ہے۔" باباجی نے مستقیم سے کہا۔

"میں ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتا باباجی۔"

"تمہیں ان کے ساتھ ہی جانا چاہیے...... تمہاری پہچان انہی سے ہے...... ان سے الگ ہوکر تم اپنی پہچان کھودو گے بیٹے۔"

"باباجی تو ایسا کررہے ہیں۔"

"تم ویسا کیوں کرنا چاہتے ہو...... غلطی قابلِ معافی ہوسکتی ہے مگر غلطی کو دوہرانا قابلِ معافی نہیں۔"

باہر سے پھر مستقیم کے نام کی پکار سنائی دی۔

"جاؤ شاباش۔" باباجی نے مستقیم کو چمکارا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مستقیم نے باباجی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ کر چوما اور اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ باباجی کو اپنے ہاتھ پر نمی محسوس ہوئی۔

"خداحافظ باباجی۔" مستقیم کی آواز بھرا رہی تھی۔

"خداحافظ۔"

"میں آپ سے ملنے کے لیے آتا رہوں گا۔"

"تم نہ بھی کہتے تو میں اور امید تمہارے انتظار میں رہتے۔"

مستقیم نے امید کو دیکھا اور کہا۔ "خداحافظ۔"

باباجی نے اپنا ہاتھ مستقیم کے شانے پر دھر دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کیا غلطی کر رہے ہو یار! امید کو خداحافظ کون کہتا ہے...... امید تو تمہارے ساتھ جائے گی۔"

"ہمارے ساتھ!" مستقیم بے ساختہ چونکا۔

"ہاں۔"

"آپ کے پاس کون رہے گا؟"

"امید!"

"امید!" مستقیم نے باباجی کو استعجابیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں۔" باباجی مسکرائے اور امید کو نہایت محبت سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"امید کا یہی تو وصف ہے، وہ ہر ایک کا ساتھ دیتی ہے...... کسی کو تنہا اور بے آسرا نہیں رہنے دیتی ...... یہ میرے ساتھ بھی رہے گی...... تم چاہو تو تم بھی اسے اپنے دل میں چھپا کر اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔ میری خواہش ہے کہ امید تمہارے ساتھ رہے...... امید ہی تو زندگی ہے میرے بچے۔" مستقیم شرما سا گیا۔

باہر سے پھر پکار سنائی دی۔ اب کی بار ذرا غصے سے۔

مستقیم نے امید کو دیکھا۔ امید کا دایاں ہاتھ عموداً اٹھا اور افقیاً دھیرے دھیرے ہلنے لگا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی لرزش تھی اور آنکھوں میں نمی۔

مستقیم لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازے تک پہنچا۔ ٹھٹکا اور اس نے پلٹ کر باباجی اور امید کو دیکھا پھر دروازے سے نکل گیا۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز سنائی دی اور پھر گلی میں کھڑی چار گاڑیوں میں سے آخری گاڑی بھی چلی گئی۔

باباجی نے امید کو اپنے سینے سے لگالیا۔ باباجی کو اب اس گھر میں امید کے ساتھ رہنا تھا۔

☆☆☆

گورے میاں کا پروجیکٹ برق رفتاری سے مکمل ہوا اور نہایت شاندار طریقے سے اسٹور کا افتتاح ہوگیا۔ آس پاس کی آبادیوں میں "گورے میاں ڈیپارٹمنٹل اسٹور" کی دھوم مچ گئی۔

"بھئی واہ! کیا ورائٹی ہے گورے میاں اسٹور میں...... ایک سے بڑھ کر ایک چیز۔" لوگ کہتے۔

غریب غرباء اشیائے صرف خرید کر تعیشات کا نظارہ کرتے۔ چھو کر، اٹھا کر دیکھتے اور اپنی بے حیثیتی پر دل مسوستے اسٹور سے چلے جاتے۔ مالدار ٹرالیاں بھر بھر سامان خریدتے اور جیبیں خالی کر کے خوش خوش گھر جاتے۔ خریداروں کو جیبیں خالی کرنے کی ترغیب دینے کے لیے گورے میاں نے اسٹور میں دیسی بدیسی ہر دو قسم کی اشیا پر "رعایتی سیل" لکھوادی تھی۔ کہنے کو تو یہ رعایتی سیل تھی مگر رعایتی نرخوں میں بھی گورے میاں کے ایما پر انتظامیہ نے اپنے منافع کو پورے طور ملحوظ رکھا تھا۔ خریدار کے نفع کو مدِنظر رکھنے والا دکاندار پھلنے پھولنے میں تیز گامی کب دکھا پاتا ہے۔

گورے میاں کی خواہش تھی کہ ان کا کاروبار اتنا ترقی کرے کہ وہ فقط ایک اسٹور تک محدود نہ رہیں۔ ایک سے دو اور دو سے چار اسٹورز کھولتے جائیں۔ باباجی کے بیٹوں سے انہوں نے زبانی کلامی معاہدہ کیا تھا کہ جیسے جیسے اسٹور کی نئی شاخیں کھلتی جائیں گی، وہ انہیں کاروبار میں خودمختار بنانے کے لیے ایک ایک مکمل اسٹور کے سیاہ وسفید کا مالک بناتے جائیں گے۔ جو بہتر کارکردگی دکھائے گا وہی سب سے پہلے اس فائدے کا حقدار قرار پائے گا۔

چاروں بھائی گورے میاں کو اپنی کارکردگی سے مطمئن کرنے کی جان توڑ کوشش کرتے۔ صبح سے رات تک چاروں پھرکی کی طرح گھومتے رہتے۔ اپنے اپنے شعبۂ اسٹور میں زیادہ آمدن کے لیے وہ مختلف کاروباری حربے استعمال میں لاتے مگر گورے میاں کسی صورت مطمئن نہ ہوتے اور نہایت تکبر سے فرماتے۔ "ڈو مور!"

ڈومور کی تگ ودو میں چاروں بھائیوں کا دن کا چین اور رات کی نیند جاتی رہی۔ عبدالرحیم کا تو یہ حال ہوگیا کہ رات کو سوتے میں بھی وہ چیزوں کے دام بتاتے اور گاہکوں سے تکرار کرتے رہتے۔

"نہیں میرے بھائی رعایتی سیل ہے، اب اور کیا کم کریں ہم۔" وہ نیند میں بڑبڑاتے۔

"جی صاحب! کچھ پسند آیا آپ کو؟"

جمیلہ خاتون کچھ خانگی مسائل پر شوہر سے بات کرنا چاہتیں تو عبداللہ لمبی جمائی لیتے ہوئے کہتے۔ "بہت تھکا ہوا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہوں، صبح بات کرنا۔‘‘
صبح ہوتی تو عبداللہ کو اسٹور پہنچنے کی جلدی ہوتی۔
’’کچھ پتا نہیں گورے میاں کس وقت چکر لگانے آجائیں۔‘‘
’’میری بات تو سنیں۔‘‘ جمیلہ خاتون کہتیں۔
’’رات کو بات کرنا ابھی دیر ہو رہی ہے۔‘‘ عبداللہ عجلت دکھاتے۔

میاں کے جانے کے بعد جمیلہ خاتون منہ بسور کر بیٹھ جاتیں اور بڑبڑانے لگتیں۔ ’’جیسے میں نے ہی تو ٹھیکا اٹھا رکھا ہے ساری باتوں سے نمٹنے کا۔‘‘

عبدالرحمان اور عبدالقدوس کا احوال بھی کچھ جدا نہ تھا۔ کاروبار ان کے حواس پر طاری رہتا۔ چاروں بھائیوں میں سے ہر ایک کو یہی دھن، یہی لگن سوار تھی کہ گورے میاں سب سے زیادہ اس کی کارکردگی سے مطمئن ہوں تاکہ چاروں میں وہی سب سے پہلے علیحدہ اسٹور کا استحقاق حاصل کرے۔ خودمختاری میں کام کرنے کا مزہ ہی اور ہوتا ہے۔ یہاں تو ایک نہیں دو دو تلواریں سر پر لٹکی رہتیں...... گورے میاں اور ان کا ایم بی اے پاس نوجوان اور سوٹڈ بوٹڈ انگریزی بگھارتا جنرل منیجر جوشاہ کا وفادار بنا اسٹور کے چاروں سیلز ڈیپارٹمنٹس میں یوں سینہ تانے پھرتا جیسے اسٹور اس کے باپ ہی کا تو تھا۔ ویسے اس کے ایسا سمجھنے میں کوئی مضائقہ بھی نہ تھا۔ گورے میاں اکثر اس کے شانے پر ہاتھ دھر کر نہایت الفت سے کہتے۔ ’’ینگ مین! یوری مائنڈز آف مائی سن۔‘‘ ’’نوجوان! تم مجھے میرے بیٹے کی یاد دلاتے ہو...... گورے میاں کی گوری بیوی جو ادھیڑ عمر میں ان سے ان بن کے بعد علیحدہ ہوئی تھی۔ ان کے دو بچوں کی ماں بھی تھی جن میں سے ایک بیٹی تھی ایک بیٹا۔ دونوں بچے ماں باپ میں ان بن ہونے سے بہت پہلے ہی اپنی اپنی علیحدہ دنیا بسا چکے تھے۔ گورے میاں کا منہ چڑھا جنرل منیجر باباجی کے بیٹوں کو ایک آنکھ نہ بھاتا۔ اس سے نجات کی بس ایک ہی صورت تھی کہ اسٹور کی نئی شاخیں کھلتی جائیں اور اپنی کارکردگی کی بنیاد پر چاروں بھائی ایک ایک کر کے علیحدہ اسٹور حاصل کرتے جائیں۔ گورے میاں کے معیار پر پورا اترنے کے لیے انہیں ’’ڈومور‘‘ کی مہم سر کرنا تھی۔

ادھر گورے میاں چاروں بھائیوں سے کاروبار میں ’’ڈومور‘‘ کا تقاضا کرتے، ادھر گھروں میں ان کی بیویاں اور بچے تعیشات کی فراہمی میں اضافے کے لیے ’’ڈومور‘‘ کی گردان رکھتے۔

بیویاں شوہروں سے گلہ کرتیں۔ ’’گھر اور بچوں کے لیے تو تمہارے پاس وقت ہی نہیں......‘‘ یہ گلہ بھی گویا ’’ڈومور‘‘ کی ویسی صورت ہوتی۔

چاروں بھائیوں کے کنبوں میں نمود و نمائش کا فتنہ جڑ پکڑ چکا تھا اور ایک دوسرے سے رشک و رقابت کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ جمیلہ خاتون کہتیں مہرالنساء نے اپنے ڈرائنگ روم میں نیا صوفہ سیٹ ڈلوایا ہے۔ میں اپنے ڈرائنگ روم میں اس سے بھی اچھا ڈلواؤں گی۔ عبداللہ کہتے کچھ صبر کرلو ابھی اتنی گنجائش نہیں ہے۔ جمیلہ خاتون کے بچے کہتے۔ ’’ڈومور ابا۔‘‘ نفیس جہاں سینہ ٹھونک کر فرماتیں میں تو سیون سیٹر صوفہ ڈلواؤں گی، اپنے ڈرائنگ روم میں۔ یاسمین بیگم کا نیا قالین جیٹھانیوں اور ان کے بچوں کی آنکھوں میں چبھنے لگتا۔ مہرالنساء کو نفیس جہاں کے اوون سے بھی بڑا اوون لینے کی لگن لگ جاتی۔ جمیلہ خاتون اور ان کی بیٹیوں کو ماربل ڈنر سیٹ کے انتخاب میں یاسمین بیگم کی چوائس نہایت گھٹیا لگتی تو نفیس جہاں کو شادی کی ایک تقریب میں ساڑی باندھے دیکھ کر ان کی دیورانی، جیٹھانیوں کے پیٹ میں بل پڑنے لگتے۔ تقریب سے واپسی پر باقی تین گھروں میں ان کا مذاق اڑایا جاتا۔ ’’اللہ امی! نفیس چچی کو دیکھا تھا کارٹون لگ رہی تھیں۔ ساڑی ان سے سنبھالی ہی نہیں جارہی تھی اور اس پر پنسل ہیل سینڈلیں۔‘‘

امی ہنس کر فرماتیں۔ ’’کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔‘‘ صاحبزادی قہقہہ برساتیں۔ ’’ہائے اللہ امی جی، کوا نہیں کوی بولیں۔‘‘

بچوں کے اپنے مسائل تھے۔ برانڈڈ ملبوسات، جوتوں، بیگز اور قیمتی موبائلز کے لیے انہیں والدین سے ’’ڈومور‘‘ کا تقاضا ہوتا۔ کزنز سے چشمکیں چلتیں۔ ایک دوسرے کو رشک و رقابت سے دیکھا جاتا۔ وہ جو بھی شیر و شکر رہا کرتے تھے، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے چکر میں رہتے۔ کوئی کسی کا آئی فون دیکھ کر جلا کٹا جاتا تو کسی کو کسی کے بی بی اے میں داخلہ ہونے کا غم کھائے جاتا۔ ایک دوسرے کی کردارکشی کی جاتی۔ ’’ارے انعم اس کا تو اپنے ایک کلاس فیلو سے چکر چل رہا ہے۔‘‘ بہتان لگائے جاتے۔ ’’مومنہ! وہ تو نہ جانے کتنوں سے عشق لڑا رہی ہے۔‘‘ جمیلہ خاتون مہرالنساء کو اطلاع بہم پہنچاتیں۔ ’’ستا تم نے مریم کا جس لڑکے سے رشتہ آیا ہے، وہ اسکول کے زمانے سے اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ پانچویں جماعت تک دونوں اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔‘‘

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مہرالنساء چونکتیں۔ ''اچھا! تمہیں کس نے بتایا بڑی بھابی۔'' جمیلہ خاتون فراست جھاڑتیں۔

''ایسی باتیں چھپتی ہیں بھلا۔ اِدھر اُدھر سے پتا چل ہی جاتی ہیں۔'' مہرالنساء نہایت گرمجوشی سے ان کی بات کی تائید کرتیں۔

''کچھ اور بھی سنا تم نے دیورانی؟'' نفیس جہاں نہایت رازداری سے یاسمین بیگم سے کہتیں۔

''کیا؟'' یاسمین بیگم کی رگِ تجسس سیکنڈ کی سوئی سے بھی زیادہ تیزی سے دھڑکنے لگتی۔

''مستقیم اور امید کا چکر چل رہا ہے۔''

''سچ کہو۔''

''ہاں ہاں...... میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی بھلا۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''ارے وہ جو اپنے ساتھ والے گھر میں شاہدہ کی امی نہیں رہتی تھیں......''

''ہاں ہاں۔''

''میں بچیوں کے ساتھ شاپنگ کرنے بازار گئی تھی وہ مل گئیں مارکیٹ میں مجھے...... ان سے پتا چلا۔''

''اچھا اچھا...... کیا کہہ رہی تھیں؟''

''کہنے لگیں جب سے تم لوگ گئے ہو محلہ ہی سونا ہوگیا...... انہوں نے ہی بتایا کہ مستقیم تو باقاعدگی سے آتا ہے بابا جی اور امید کے پاس۔''

''ہائے اللہ میں مرگئی۔'' یاسمین بیگم دہل ہی تو گئیں۔

''مریں تمہارے دشمن۔''

''بھابی! بابا جی کا تو زیادہ وقت مسجد میں گزرتا ہے، امید ہی ہوتی ہوگی اکیلی گھر میں۔''

''بس سمجھ لو کیا ہوتا ہوگا اکیلے گھر میں۔''

''اللہ توبہ! اللہ توبہ۔'' یاسمین بیگم نے اپنے گال پیٹ ڈالے۔ پھر بولیں۔ ''مہرالنساء بھابی کو بتایا تم نے؟''

''میں نے اپنے بال نچوانے ہیں کوئی...... تمہیں تو اس لیے بتادیا کہ تم سے میرا دل ملتا ہے۔''

دل کتنا ملتا تھا، یہ نفیس جہاں خود یا ان کی دونوں جیٹھانیاں جانتی تھیں جن سے یاسمین بیگم اور ان کے بچوں کی برائیاں کرتے نفیس جہاں کی زبان نہ تھکتی تھی۔

☆☆☆

مستقیم واحد تھا جس نے آبائی گھر چھوڑنے کے بعد بابا جی اور امید سے اپنا تعلق نہایت استقامت سے قائم رکھا ہوا تھا۔ بلاناغہ نہ سہی، وہ ہر دوسرے دن ان دونوں سے ملنے ضرور جاتا، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتا۔ بازار سے سودا سلف لاکر دینے میں ان کی اعانت کرتا بلکہ اکثر امید سے ٹیوشن پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کو پڑھانے میں امید کی مدد کرنے بیٹھ جاتا۔ اپنی احتیاجات پوری کرنے کے لیے امید نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پوری کلاس بن گئی تھی۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد امید گھر کے کام بھی نمٹاتی۔ بچوں کو بھی پڑھاتی۔ اتنی آمدن ہونے لگی تھی کہ روزمرہ گزربسر کے ساتھ وہ اپنی یونیورسٹی کے اخراجات بھی نکالنے لگی تھی۔ بابا جی اور اس کی روزمرہ ضرورتیں نہایت سادہ اور محدود تھیں۔ سادہ کھانا اور سادہ پہننا اوڑھنا۔ سر چھپانے کو اللہ نے گھر دے رکھا تھا اور امید کو اپنے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے بابا جی سی مشفق، مہربان اور مدبر ہستی میسر تھی۔

بابا جی صبر و رضا کا پیکر تھے۔ چاروں بیٹوں کے جانے کو انہوں نے خدا کی رضا جان کر نہایت تحمل سے اس سانحے کا سامنا کیا تھا۔ ہاں! یہ سانحہ ہی تو تھا، بسے بسائے گھر کا شیرازہ یکلخت بکھر جانا۔ دوست کی صورت دشمن اس طور گھر میں داخل ہوا تھا کہ اس کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ بابا جی کے لیے وہ بہت کڑا وقت تھا مگر وہ جھیل گئے تھے۔ غیور ایسے تھے کہ جانے کے بعد بیٹوں نے مالی اعانت کرنی چاہی تو دعاؤں کے ساتھ ان کی اعانت واپس پھیر دی۔ ''خدا تم لوگوں کو بہت دے، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''آپ کی اور امید کی گزربسر کے لیے بابا جی۔'' دست بستہ کہا گیا۔

''جو اللہ سب کو دے رہا ہے، وہ مجھے اور امید کو کیسے ناامید رکھے گا۔'' بابا جی نے پورے یقین سے کہا۔

''پلیز!''

''شکریہ۔''

اللہ نے راستے بنادیے تھے۔ امید کو ٹیوشنز مل گئی تھیں۔ محلے کی مسجد میں ایک تبلیغی جماعت آکر ٹھہری تو جماعت میں شامل ایک بزنس مین بابا جی سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے بابا جی سے درخواست کی کہ اگر وہ صبح کے اوقات میں ان کی نومسلم بہو کو قرآن مجید اور بنیادی اسلامی احکامات کی تعلیم کے لیے ان کے گھر آجایا کریں تو وہ ان کی خدمت کے پابند ہوں گے۔ مذکورہ کاروباری شخص کی قیام گاہ شہر کے ایک پوش علاقے میں اور بابا جی کے اپنے گھر سے کافی دور تھی۔ بابا جی نے طویل فاصلہ اور اپنے ضعف کے باعث معذرت چاہی تو وہ بولے۔ ''آپ آنے جانے کی فکر نہ کیجیے۔ میرا ڈرائیور آپ کو آپ کے گھر سے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میرے گھر تک لے بھی جایا کرے گا اور واپس بھی چھوڑا کرے گا۔"

"آپ کو زحمت ہوگی۔"

"قطعاً نہیں...... میرے لیے تو باعثِ سعادت ہوگا کہ میری نومسلم بہو آپ جیسے بزرگ سے قرآن اور دینی احکامات کی تعلیم حاصل کرے۔ مقدور بھر آپ کی خدمت کا پابند ہوں گا۔"

صبح کے اوقات میں چونکہ امید بھی یونیورسٹی گئی ہوتی تھی، اس لیے بابا جی نے ہامی بھرلی۔ مہینے کے اختتام پر نومسلم بہو کے سسر نے...... تعلیم کا جو ہدیہ بابا جی کو پیش کیا، وہ بابا جی کو زیادہ لگا سو لینے میں متامل ہوئے اور بولے۔

"نہیں جناب یہ زیادہ ہے۔"

"جو کام آپ کررہے ہیں اس کا بدل تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا...... بس یہ احساس شکر گزاری ہے اسے قبول کیجیے، مجھے خوشی بھی ہوگی اطمینان بھی۔"

سو اپنے متوکل بندوں کے لیے اللہ رب العزت یوں راستے بناتے ہیں۔

اس شام بابا جی نے مستقیم اور امید سے کہا۔ "ہم بندے اسبابِ معاش کے لیے ناحق پریشان ہوتے ہیں۔ کوشش البتہ شرط ہے، رب العزت کا وعدہ برحق ہے۔"

بیٹوں کی اعانت کے بغیر بھی بابا جی ان کے جانے کے بعد کسی رات بھوکے پیٹ نہ سوئے۔ امید تو ان کی زندگی تھی۔ بھلا اسے کیسے بھوکا سونے دیتے وہ۔ زندگی کی تمام احتیاجات کسی کے دستِ نگر ہوئے بغیر عزت سے پوری ہورہی تھیں۔ بیٹے کاروبار میں مصروف تھے۔ ان کی بیویاں اور بچے اپنی نئی دنیاؤں میں گم مگر مستقیم نے جس باقاعدگی اور استقامت سے بابا جی اور ان کے مسکن سے تعلق قائم رکھا ہوا تھا، اس سے بابا جی کو بیٹوں سے دوری اور بہوؤں اور مستقیم کے علاوہ دوسرے پوتے پوتیوں کی بے اعتنائی کا دکھ بھی ماند پڑجاتا۔

☆☆☆

جب بابا جی کے چاروں بیٹے یکجا اور محبت و بے غرضی کی ان دیکھی زنجیر میں بندھے تھے۔ اگلی نسل میں چند رشتوں کے عہد و پیمان بھی بندھ گئے تھے۔ عبداللہ کے بیٹے مومن کی شادی چھوٹے بھائی عبدالرحمان کی بیٹی محسنہ سے ہوگی۔ مومن کی بہن مومنہ کا مقسوم محسنہ کے بھائی محسن سے جوڑا جائے گا۔ چھوٹے بھائی عبدالقدوس اپنے بیٹے سلمان کے لیے عبدالرحیم کی چھوٹی بیٹی صنم کو اپنی بہو بنانے کی تمنا دل میں رکھتے تھے۔ عبدالرحمان اور ان کی بیوی مہر النساء نے اپنے ہونہار بیٹے مستقیم کے لیے امید کی چاہ دل میں پال رکھی تھی۔

مگر نئی دنیاؤں کے باسی بنتے ہی پرانے عہد و پیمان کی گرہیں ڈھیلی پڑکر بالآخر کھل ہی گئی تھیں۔ پسند بدل گئی تھی۔ چاہ دم توڑ گئی تھی۔ معیار بدل گئے تھے۔ جمیلہ خاتون اور ان کی بیٹیوں کو مومن سے محسنہ کا جوڑ بے جوڑ لگنے لگا تھا۔

"امی! بھائی چھ فٹ ایک انچ کے ہیں ان کے لیے کم سے کم ساڑھے پانچ فٹ کی لڑکی ہونی چاہیے۔" معینہ کہتی۔

"ہاں محسنہ تو ٹھگنی ہے۔" جمیلہ خاتون تائید کرتیں۔

"اتنی بھی نہیں امی...... چل جائے گی۔" مومنہ کو محسنہ کے بھائی محسن سے اپنے ادھورے بندھن کی لاج آتی۔

مہر النساء کو اپنے بیٹے محسن کے لیے مومنہ "ہلکی" دکھنے لگی تھی۔

"موٹی بھدی لڑکیوں کو آج کل کون پسند کرتا ہے۔ وہ تو پرانا زمانہ تھا کہ لوگ سوچتے موٹی، کالی، ناٹی جیسی بھی ہے گھر کی ہے۔" مہر النساء فرماتیں۔

"امی جی! بھائی کے لیے کوئی اور لڑکی دیکھیں۔" محسنہ مشورتاً کہتی۔

"اور تمہارا کیا ہوگا ہماری پانچ فٹی بہنا۔" مستقیم بہن کی بات سن کر کہتا۔

"کیا ہوگا۔" مہر النساء بیٹے کو ابرو چڑھا کر دیکھتیں۔ "ایک تمہارے تایا کا بیٹا مومن ہی تو واحد مرد نہیں ہے اس دنیا میں...... ارے لڑکے بہت بس پیسا ہونا چاہیے لڑکی والوں کے پاس۔ قد، بت، رنگ کوئی نہیں دیکھتا۔ ماں باپ مالدار ہوں تو چوم چاٹ کرلے جاتے ہیں لوگ ہر طرح کی لڑکی کو۔"

"بائی دی وے کتنا پیسا آگیا آپ کے اور بابا کے پاس؟" مستقیم ماں کو دیکھتے ہوئے مسکراتا۔

"اللہ کا شکر ہے...... اللہ نے چاہا تو اور بھی ہوگا...... اسی لیے تو تمہارے بابا گورے میاں کو خوش کرنے کے لیے اتنی محنت کرتے ہیں...... کیا پتا پہلا علیحدہ اسٹور وہ تمہارے بابا ہی کو کھول دیں۔"

"جتنا بابا گورے میاں کی خوشنودی کا خیال کرتے ہیں اگر اللہ میاں کو خوش کرنے کے لیے اتنی کوشش کریں تو جانے کہاں سے کہاں جا پہنچیں۔" مستقیم کہتا۔

"کہاں جا پہنچیں؟" مہر النساء بیٹے کو ٹیڑھی نظر سے دیکھتیں۔

"دنیا کا مال آخرت کے مال کے مقابلے میں نہایت حقیر ہے امی جی۔" مستقیم ماں کو پہلو بدلنے پر مجبور کردیتا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''تمہارے لیے تو مجھے کوئی علامہ لڑکی دیکھنی پڑے گی۔'' مہر النساء بیٹے کو گھورتیں۔

''دیکھنی کیوں پڑے گی...... دیکھ تو رکھی ہے آپ نے۔'' مستقیم بے باکی کا مظاہرہ کرتا۔

''کہاں دیکھ رکھی ہے بھلا۔'' مہر النساء انجان پن سے کہتیں۔

''یہ امید کی بات کر رہا ہے امی جی۔'' محسن سن رہا ہوتا تو نوالہ دیتا۔

''دفع کرو امید کو۔'' مہر النساء نہایت نخوت سے ہاتھ جھٹکتیں۔

''کیوں امی!'' مستقیم چونکتا۔

''ارے وہ بھی کوئی لڑکی ہے...... ہر وقت بقراطیوں کی طرح کتابوں میں منہ دیے رکھتی ہے۔'' مہر النساء ناک چڑھاتیں۔

''اس سے بہتر علامہ لڑکی نہیں ملے گی آپ کو میرے لیے۔''

''کالی تو ہے۔'' محسنہ پھلجھڑی چھوڑتی۔

''بلیک بیوٹی ہے!'' مستقیم مسکرا کر محسنہ کو دیکھتا۔

''ہونہہ!'' محسنہ گردن کو جھٹکا دیتی۔

نفیس جہاں کہتیں۔ ''میری صنم کی کون سی کوئی عمر نکلی جا رہی ہے جو میں مریم اور انعم سے پہلے اسے اس کے گھر کی کرنے کا سوچوں۔ عبدالقدوس اور یاسمین کو جلدی ہے تو بیٹے کے لیے کوئی اور لڑکی دیکھیں۔''

غرض چاروں گھروں میں اسی نوعیت کی باتیں اکثر چھڑی رہتیں۔

مہر النساء نے ایک روز مستقیم کو سمجھایا۔ ''دیکھو بیٹا! تم اکیلے بابا جی کے گھر مت جایا کرو۔''

''کیوں امی؟'' وہ چونکا۔

''وہاں امید بھی ہوتی ہے۔''

''تو کیا ہوا۔''

''لوگوں کو باتیں بناتے دیر تھوڑی لگتی ہے۔''

''کیسی باتیں امی؟''

''بابا جی ہر وقت تو گھر میں نہیں ہوتے نا...... امید کے اکیلے پن میں تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں...... لوگ الٹی سیدھی سوچنے لگتے ہیں۔''

''مجھے لوگوں کی کوئی پروا نہیں۔''

''مگر مجھے تو ہے۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں۔'' مستقیم نے شانے اچکائے۔

''تم یہ کر سکتے ہو کہ وہاں جانا چھوڑ دو۔''

''سوری امی...... یہ ممکن نہیں۔''

''کیوں ممکن نہیں۔'' مہر النساء نے ابرو چڑھائی۔

''کتنے بے رحم ہیں آپ لوگ...... ایک بوڑھے شخص کو جس نے تنکا تنکا جوڑ کر آشیانہ بنایا تھا، آپ سب اسے اس عمر میں ایک دھان پان سی کمزور لڑکی کے سہارے چھوڑ کر خود غرضی سے وہاں سے نکل آئے اور اب آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں ان کی خیر خبر بھی نہ لوں۔''

''ان کی خیر خبر لینے کو امید ہے نا ان کے پاس۔''

''اور امید کی خیر خبر لینے کو؟''

''ہماری بلا سے۔''

''اتنی خود غرضی نہ دکھائیں امی۔''

''شرم نہیں آتی۔'' مہر النساء نے مستقیم کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔ ''جس ماں نے تمہیں پال پوس کر جوان کیا اسے خود غرضی کا طعنہ دے رہے ہو۔''

''میں صرف آپ کی بات نہیں کر رہا، سب کی بات کر رہا ہوں۔''

''سب کون؟''

''بابا جی کی تمام اولاد کی...... سب نے بے رحمی اور خود غرضی دکھائی...... ذرا سوچیے تو امی جس شخص نے اپنا خون پسینا ایک کر کے چار بیٹوں کو پالا پوسا انہیں جوان کیا۔ اپنے پیروں پر کھڑا کیا، ان کے گھر آباد کیے، ان کی اولاد کو اپنے سینے سے لگایا۔ انہیں برسوں ایک جگہ رکھا، اکٹھا رکھا، انہیں آپس میں اتفاق، محبت اور بے غرضی سے رہنا اور جینا سکھایا اور اس وقت جب اس بوڑھے شخص کو آپ سب کی ضرورت تھی...... آپ سب باہر بے آئے ایک شخص کے کہنے میں آ کر اس بوڑھے شخص کو صرف امید کے آسرے پر چھوڑ کر اس بے لوث شخص کی زندگی سے نکل آئے......''

''گورے میاں جنہیں تم باہر سے آیا شخص کہہ رہے ہو انہوں نے تو ہم سب کی بہتری سوچی...... ہمیں اس دڑبے سے نکالا، انہی کی مہربانی سے آج ہم اپنی مرضی کی زندگی جی رہے ہیں۔ ورنہ آج بھی بابا جی کی تابعداری میں سر جھکائے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے سب کے سب۔''

''اس تابعداری کی الگ شان، الگ مزہ ہے امی۔''

''تمہی کو مبارک رہے ایسی تابعداری۔''

''ارے امی! آپ کہاں ان سے بحث میں الجھ گئیں۔ جانتی نہیں ہیں کیا انہیں اس سانولی مٹیار امید سے محبت ہے۔'' محسنہ نے مسکراتے ہوئے مستقیم کو دیکھا۔

''امید سے تو مجھ ہی کو کیا سب کو محبت ہونی چاہیے...... امید ہے ہی محبت کیے جانے اور دل میں بسائے جانے کے لائق۔''

''دفع...... دور۔'' مہر النساء تنک کر بولیں۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مستقیم مسکرایا۔ ’’لکھ لیں امی...... ایک دن آئے گا جب آپ امید کو گلے لگائیں گی...... اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوں گی۔ خیر محبت تو آپ اس سے کرتی تھیں...... یہ سارا فساد باہر سے آئے دشمن کا ہے۔‘‘

’’تمہیں دوست دشمن کی تمیز ہی نہیں۔‘‘ مہرالنساء نے ابرو چڑھا کر مستقیم سے کہا۔

’’دشمن ہمیشہ دوست کے پردے میں آتا ہے امی۔‘‘

’’جاؤ...... میرا دماغ خراب مت کرو۔‘‘ مہرالنساء ہاتھ جوڑ کر بیزاری سے بولیں۔

مستقیم خاموش ہو رہا۔

☆☆☆

گورے میاں کو خوش کرنے کے لیے ’’ڈومور‘‘ کے چکر میں باباجی کے چاروں ہی بیٹے دو ڈھائی سال میں اپنی اصل عمروں سے کہیں زیادہ اور تکان سے چور دکھائی دینے لگے۔ شبانہ روز مشقت، گورے میاں کے جنرل منیجر کو ہمہ وقت جوابدہی کے احساس اور گورے میاں کے تقاضائے ’’ڈومور‘‘ نے ان کے قویٰ میں اضمحلال، چہروں پر پژمردگی اور نگاہوں میں بیم ورجا کی کیفیت بکھیر دی۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے شعبے کی کارکردگی دیگر تین شعبوں سے زیادہ بہتر دکھانے کی فکر رہتی۔ بیوی بچوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے شعبے کی آمدن میں ڈنڈی بھی مارنی پڑتی۔ تنخواہ میں عیاشی کہاں ہو پاتی۔ جنرل منیجر کو حساب کتاب میں چکر دینے کے لیے نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے چاروں کو۔

بیوی بچے چاروں کے مگن تھے۔ عمدہ کھانا، اچھا پہننا، رات کو دیر تک جاگنا، صبح لمبی تان کر سوتے رہنا۔ کہاں کی نماز اور کہاں کی یاد اللہ۔ اب ان کے سابقہ مشترکہ جھنڈے والے گھر کے مانند نئے گھروں میں باباجی کی طرح ’’نماز کا وقت ہو گیا ہے‘‘ کی صدا لگا کر انہیں جگانے والا کوئی نہ تھا۔ گھر کے مرد صبح سویرے ناشتا کیے بنا نہار منہ اسٹور جانے کو نکل جاتے۔ بیویاں اور بچے دن چڑھے تک بستروں پر پڑے اینڈتے رہتے۔ موڈ ہوتا تو کالج، یونیورسٹی چلے جاتے، ورنہ جاگنے کے بعد بھی دیر تک موبائل کان سے لگائے پڑے رہتے۔ بچے تو بچے، مائیں بھی آنکھ کھلتے ہی اپنے سرہانے موبائل ٹٹولتیں۔ مہرالنساء اور یاسمین بیگم تو اب فیس بک پر بھی ہوتیں۔ جمیلہ خاتون کسی حد تک واٹس ایپ کا استعمال کرنے لگی تھیں۔ نفیس جہاں نیٹ پر کھانا پکانے کی ترکیبیں اردو میں ڈھونڈ نکالتیں۔ لڑکیاں اپنے کلاس فیلوز سے جن میں زنانہ یا مردانہ کی کوئی تخصیص نہ تھی، کالز یا ٹیکسٹنگ پر لگی رہتیں۔ لڑکوں کی اڑان تو بہت ہی اونچی تھی۔ ہیرو بنے پھرتے، ادھر لارا ادھر جہانسا۔ مومن نے پوش علاقے میں مقیم ایک امیر زادی سے پینگیں بڑھا رکھی تھیں۔ محسن کی منگنی ایک اونچے گھرانے میں ہو گئی تھی۔ سلمان فیس بک پر پریوں کی تلاش میں رہتا۔

باباجی کے جھنڈے والے گھر کے برسوں... سے چلتے نظام کو چوپٹ ہونے اور ان روایات واقدار کا بیڑا غرق ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ باباجی کہا کرتے تھے چیزوں کو بننے میں وقت لگتا ہے، بگڑنے میں صرف ایک پل۔ غنیمت تھا کہ باباجی بیٹوں کے نئے ٹھکانوں کا کبھی چکر نہیں لگاتے تھے ورنہ دل پکڑ کر رہ جاتے۔ مستقیم انہیں صدمے سے بچانے کے لیے کچھ بتاتا نہ تھا۔ باباجی پوچھتے۔

’’ہاں بیٹا! چاروں گھروں میں سب خیریت ہے؟‘‘

’’جی باباجی۔‘‘ وہ نظریں چرا کر کہتا۔

خیریت کہاں تھی۔

آوے کا آوا بگڑ گیا تھا۔

گزرے ہوئے عرصے میں امید نے اپنی یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کر لی تھی اور اب اپنی ہی یونیورسٹی میں بطور معاون استاد تدریس کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ مستقیم ایک مالیاتی ادارے میں عمدہ ملازمت کر رہا تھا۔ باباجی دونوں سے بہت خوش تھے۔

’’امید روشنی ہے...... امید امنگ ہے...... امید خوشی ہے...... امید زندگی ہے۔‘‘ باباجی امید کو نہایت فخر سے دیکھتے ہوئے کہتے۔

’’کچھ میرے لیے بھی باباجی۔‘‘ مستقیم باباجی کو امید بھری نظروں سے دیکھنے لگتا۔

’’تم!‘‘ باباجی مستقیم کا چہرہ اپنے استخوانی ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے۔ ’’تم میرے بچے...... سیدھے ہو...... بے ریا ہو...... استقامت ہو...... امید کی قوت ہو۔‘‘

’’تھینک یو باباجی۔‘‘ مستقیم کن انکھیوں سے امید کو دیکھتا۔

☆☆☆

گورے میاں کا دستور تھا، آغاز ہفتہ میں اپنے کاروباری معاونین کے ساتھ ایک میٹنگ کرتے جس میں گزشتہ ہفتے کے معاملات ومسائل زیر بحث آتے۔ آئندہ بہتری کے لیے اقدامات طے کیے جاتے اور گورے میاں کاروبار کے فروغ کے لیے اپنی آئندہ حکمت عملی سے معاونین کو آگاہ کرتے۔ گورے میاں کے کاروباری

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

معاونین باباجی کے چاروں بیٹے تھے لیکن گورے میاں اپنی ہفتہ وار میٹنگ میں نوجوان جنرل منیجر کو اپنے دائیں جانب ضرور بٹھاتے۔ یہ گویا اس امر کا اظہار تھا کہ وہ جی ایم کو اپنا دستِ راست سمجھتے تھے۔ خیر دستِ راست سمجھتے یا دستِ چپ چاروں بھائیوں کو اس سے غرض نہ تھی۔ ان میں سے ہر ایک کو غرض تھی تو اس سے کہ گورے میاں ان چاروں میں سے کس خوش نصیب کو علیحدہ اسٹور کی چابی تھماتے ہیں۔

وہ سرد موسم کی ایک یخ بستہ صبح تھی۔ آغازِ ہفتہ اور حسبِ دستور گورے میاں کی اپنی کاروباری معاونین کے ساتھ ہفتہ وار میٹنگ کا دن۔ گورے میاں اس روز خلافِ معمول زیادہ ہی خوش نظر آرہے تھے۔ میٹنگ سے قبل وہ اپنے جنرل منیجر کے ہمراہ اسٹور کے مختلف شعبوں کا دورہ کرتے ہوئے اسٹور کے ان معمولی ملازمین سے بھی خوش دلی سے بات چیت کرتے رہے جنھیں وہ قبل ازیں لائقِ اعتنا ہی نہ گردانتے تھے۔ ان کے غیر معمولی خوشگوار موڈ کو چاروں بھائیوں نے اسٹور کی نئی شاخ کی داغ بیل پڑنے کی خوشخبری پر محمول کیا۔

اسٹور کے مرکزی دفتر میں شرکائے میٹنگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے۔ حسبِ معمول جنرل منیجر گورے میاں کے دائیں جانب اور چاروں بھائی ان کے روبرو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو۔ گورے میاں نے دفتر کے باہر تعینات ملازم کو طلب کیا اور کہا۔ ”بہت عمدہ کافی، گرم گرم چکن سینڈوچز اور مٹھائی۔“ چاروں بھائیوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انہیں یقین تھا کہ آج گورے میاں نے نئے اسٹور کا اعلان کیا اور کیا۔

قیمتی گرم سوٹ میں ملبوس گورے میاں نے چاروں بھائیوں کو طائرانہ نظر سے دیکھا پھر گردن موڑ کر اپنے دائیں جانب بیٹھے جنرل منیجر کو دیکھ کر مسکرائے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پیوست کیا اور گویا ہوئے۔ ”آج میں آپ لوگوں کو ایک خوشخبری سنانے جارہا ہوں۔“ چاروں بھائیوں کے دل دھکڑ پکڑ کرنے لگے۔ گورے میاں کے پاس خوشخبری نئے اسٹور کے کام کے آغاز کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی بھلا! چاروں بھائی خوش دکھائی دینے لگے۔ نئے اسٹور کی داغ بیل تو پڑے۔ کام تو شروع ہو۔ اس منحوس جی ایم سے کسی ایک کو تو نجات ملے۔

کچھ توقف کے بعد گورے میاں نے منقطع سلسلۂ تکلم بحال کیا۔ ”یہ خوشخبری میں آپ چاروں بھائیوں سے پہلے اپنے اس نوجوان ساتھی سے شیئر کر چکا ہوں۔“ گورے میاں نے اپنا دایاں بازو میز سے ہٹا کر جی ایم کے شانوں پر دراز کردیا۔

چاروں بھائی دل ہی دل میں جی ایم کو برا بھلا کہنے اور کوسنے لگے۔ گورے میاں سے ملت داری ان چاروں کی تھی اور خوشخبری پہلے اس کمبخت جی ایم کو سنائی تھی گورے میاں نے۔

گورے میاں پھر سنبھل کر بیٹھے۔ چاروں بھائیوں کو دیکھا اور بولے۔ ”مبارک ہو آپ لوگوں کی بھابی صلح پر آمادہ ہے۔“

چاروں بھائیوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ کون سی بھابی! ان میں سے ہر ایک کی بیوی باقی تین بھائیوں بلکہ خود گورے میاں کی بھی رشتے میں بھابی تھی۔ مگر گورے میاں کون سی بھابی کے صلح پر آمادہ ہونے کی بات کررہے تھے۔

چند لمحے تذبذب میں گزرے پھر بڑا ہونے کے ناتے عبداللہ نے سب کی ترجمانی کی۔ ”کون سی بھابی کی بات کررہے ہیں گورے بھائی؟“ جب سے چاروں بھائی گورے میاں کے محکوم بنے تھے، گورے میاں سے نہایت مؤدب اور ملتمس ہوکر بات کرنے لگے تھے۔

”اپنی وائف کی اور کس کی۔“ گورے میاں بولے پھر انہوں نے مزید کہا۔ ”میم صاحب مجھ سے اپنی ناراضگی ختم کرنے کو تیار ہیں۔“

”چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ چاروں نے خوشی کا اظہار کیا اور عبدالقدوس نے دل ہی دل میں فوری فیصلہ کیا کہ بھابی سے جی ایم کی شکایت کرکے وہ سب سے پہلے اس کا پتا صاف کرائیں گے۔

”ہاں اچھا ہوگیا۔“ گورے میاں بولے۔ ”صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے...... میم صاحب صلح کی بات کررہی ہیں تو میں نے بھی واپس جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔“

”کہاں؟“ عبدالرحیم نے بے ساختہ پوچھا۔

”میم صاحب کے پاس...... اپنے گھر...... اور کہاں؟“

چاروں بھائیوں نے سوچا اب گورے میاں اپنی وصیت کا اعلان کریں گے کہ اسٹور وہ ان چاروں بھائیوں کو اپنے تقاضائے ”ڈومور“ اور چاروں بھائیوں کی انتھک شبانہ روز محنت کے عوض انہیں بطور ”گفٹ“ دے جائیں گے اور پھر...... وہ چاروں مل کر منیجر کو دھکے دے کر نکال باہر کریں گے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مگر ان کی توقع کے برعکس گورے میاں نے اعلان فرمایا۔ ''جانے سے پہلے میں نے اسٹور کو کسی مضبوط پارٹی کے ہاتھ فروخت کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو مجھے یہاں کے بجائے وہاں کی کرنسی میں ادائیگی کرے۔''

چاروں بھائیوں نے ہڑبڑا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔عبداللہ کو پھر بڑا ہونے کا حق نبھانا پڑا۔ ''گورے بھائی! ہم لوگوں کا کیا بنے گا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کیا بنے گا۔'' گورے میاں نے ان کے آخری تین الفاظ دہرائے پھر نہایت رکھائی سے کہا۔ ''ہمارے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ اگر تم چاروں میں سے کوئی مجھے چھوڑتا ہے تو اسے ایک ماہ کا نوٹس یا پھر ایک ماہ کی تنخواہ دینی ہوگی اور اگر میں فارغ کرتا ہوں تو ایک ماہ کی تنخواہ مجھے دینی ہوگی۔''

''یہ تو اچھی بات نہیں ہے گورے بھائی۔'' عبدالرحمان نے ناگواری سے کہا۔

''اچھی بات تم ہی بتا دو کیا ہوسکتی ہے۔'' گورے میاں کے لہجے میں طنز و استہزا تھی۔

عبدالرحمان نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے پہلو بدلا اور قدرے خجل ہو کر بولے۔ ''آپ اسٹور فروخت نہ کریں۔''

''تو کیا تم بھائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں؟'' گورے میاں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

عبدالرحمان نے مدد طلب نگاہوں سے بڑے بھائی کو دیکھا۔

''ہم آپ کو منافع بھجواتے رہیں گے گورے بھائی۔'' عبداللہ بولے۔

گورے میاں طنز سے مسکرائے۔ ''جن بیٹوں نے بوڑھے باپ کو منافع نہ پہنچایا تو مجھے کیا منافع بھجوائیں گے۔''

چاروں بھائی شرمندہ ہو گئے۔ گورے میاں کے منہ چڑھے جنرل منیجر کی موجودگی نے ان کی شرمندگی کو دوگنا کر دیا۔

''تم لوگوں سے اچھا تو میرا یہ نوجوان منیجر ہے۔'' گورے میاں نے جی ایم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس نے مجھے اسٹور کی ایک ایک بات سے باخبر رکھا ہے۔ یہاں جو گھپلے ہوتے رہے ان سے مجھے آگاہ کرتا رہا۔ اس نوجوان نے مجھے کاروباری حربے سمجھائے اور سب سے اہم بات یہ کہ مالک کے ساتھ وفاداری ہے۔ اس لیے میں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے اکاؤنٹ میں میں اتنا پیسا ڈلوادوں گا کہ اسے ویزا کے حصول میں کوئی دشواری نہیں ہوگی...... میں اپنی میم صاحب کے پاس واپس جا کر وہاں ایک اسٹور کھولوں گا اور یہ نوجوان میرے کاروبار میں میرا قابلِ اعتماد ساتھی ہوگا۔''

کافی، سینڈوچز اور مٹھائی آ گئی تھی مگر بابا جی کے چاروں بیٹوں کو اپنے پیروں تلے سے اسٹور کا فرش نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔

''آؤ ہم سب مل کر...... میم صاحب کی واپسی سیلیبریٹ کریں۔'' گورے میاں نے چاروں کو کافی پر مدعو کیا۔

''گورے بھائی! ہم تو آپ کی وجہ سے اپنا گھر بھی چھوڑ آئے تھے۔'' کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے عبدالقدوس نے آہستگی سے کہا۔

''میری وجہ سے......'' گورے میاں انجان پن سے چونکے پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''نہیں نہیں نہیں...... میری وجہ سے نہیں اپنی نیت کی وجہ سے...... نیت مستحکم ہوتی تو گورے میاں کیا دنیا کی کوئی طاقت تم سے تمہارا گھر نہیں چھڑوا سکتی تھی۔ گھر ہی تو انسان کی پہچان، سائبان اور قوت ہوتا ہے...... اپنے گھر کو کون بے وقوف کسی کے لیے چھوڑتا ہے۔''

''منجدھار میں چھوڑ دیا ہے گورے بھائی۔'' عبدالرحیم بولے۔ ''آپ تو اپنے گھر چلے جاؤ گے ہم چاروں بھائی مکانوں کا کرایہ اور گھر کا خرچ کہاں سے پورا کریں گے۔''

''یہ تم لوگوں کا مسئلہ ہے۔'' گورے میاں نہایت بے اعتنائی سے بولے اور اپنی میم صاحب کی واپسی کا جشن منانے کو پلیٹ سے رس گلہ اٹھا کر انہوں نے اپنے منیجر کے منہ کی طرف بڑھا دیا اور زور سے ہنسے۔

بابا جی کے چاروں بیٹے نہایت بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

☆☆☆

چاروں گھروں میں میت کی سی کیفیت ہوگئی، گورے میاں کو برا بھلا کہنے کے دفاتر کھل گئے۔

''اللہ ہی سمجھے گا گورے کو۔''

''کیسا بے فیض نکلا یہ منحوس گورا۔''

''بڑا بے مروت نکلا گورا...... خبیث نے اچانک آنکھیں بدل لیں۔''

''ہاں بھئی جس دیس کا گورے نے پانی پی رکھا ہے، وہاں لوگوں میں مروت ہوتی ہی نہیں۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''ارے کیسا بے حیا ہے یہ موا گورا، جو عورت اسے لات مار کر گئی اسی کی خاطر انہیں لات مار کر جا رہا ہے جنہوں نے برے وقت میں اس کا ساتھ دیا۔''

''ارے وہاں یہی ہوتا ہے، عورت کو چھوڑا پھر گلے لگا لیا۔ وہاں مردوں کی غیرت جاتی رہتی ہے۔''

گورے میاں کی میم صاحب کو منہ بھر بھر کے بددعائیں دی جانے لگیں، کوسا پیٹا جانے لگا۔

''منحوس ماری کیوں واپس آگئی۔''

''اللہ کرے مر جائے بڑھیا۔''

''سوتی کی سوتی رہ جائے۔''

''بس کے نیچے آ کر مرے۔''

''ارے ہاتھ پاؤں ٹوٹیں اس کمبخت کے۔''

''اس عمر میں میاں کو چھوڑ کر گئی۔ کمینی کو حیا تو نہ آئی موت ہی آجاتی۔''

''جیسے وہ ہمارا رزق چھیننے کو آگئی ہے، اللہ کرے میاں بیوی دونوں روٹی روٹی کو محتاج ہو جائیں۔ بے گھر پھریں۔''

گورے میاں کو برا بھلا کہنے اور ان کی میم صاحب کو کوسنے پیٹنے اور انہیں روٹی روٹی کو محتاج اور بے گھر ہونے کی بددعا دینے والی باباجی کی بہوؤں کو کون یہ بتاتا بھلا کہ جس دیس سے گورے میاں آئے تھے، وہاں لوگوں کو روٹی اور سر چھپانے کو مکان دینا ''ریاست'' کی ذمے داری ہوتی ہے بلکہ روٹی اور مکان کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

باباجی کی بہوؤں نے گورے میاں اور ان کی میم صاحب کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ایک دوسرے سے رابطے کرنا شروع کیے۔

''اے جمیلہ بھابی سنا تم نے گورے میاں جا رہے ہیں۔''

''ہاں سن لیا..... میں بھی اسی فکر میں بیٹھی ہوں نفیس دلہن۔''

''اب کیا ہوگا مہرالنساء بھابی؟''

''یاسمین یہی سوچ مجھے کھا رہی ہے۔''

نئی نسل کو فکر تھی کہ آئے روز پیزا کیسے آرڈر کیا جائے گا..... انڈ ڈ چیزیں کیونکر خریدی جا سکیں گی..... دوستوں کے ساتھ گلچھرے کہاں سے اڑائے جائیں گے..... چوبیس گھنٹے نیٹ کی سہولت سے مستفید ہونے کے لیے ماہانہ پیکیج کیسے لیا جائے گا۔

نئی نسل بھی گورے میاں اور ان کی بیگم پر صلواتیں بھیجنے میں پیچھے نہ تھی۔

''کتنے سیلفش ہیں گورے انکل۔''

''مجھے تو گورے انکل پہلے ہی برے لگتے تھے۔''

''گورے انکل کی میم کو کیا پڑی تھی واپس آنے کی..... ڈیوورس لیتیں اور کسی اور سے شادی کر لیتیں۔''

''ارے یہ گوریاں ایسی ہی ہوتی ہیں..... فلرٹی ایک آدمی کو بار بار چھوڑتی ہیں پھر اسی کے ساتھ۔''

''باباجی کو نہ بتاتا۔'' مہرالنساء نے مستقیم کو تاکید کی۔

''کیا نہ بتاتا؟''

''یہی جو چکر چل رہا ہے۔''

''کون سا چکر؟'' مستقیم جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

''گورے میاں کے جانے اور اسٹور بکنے کا۔''

''کیوں نہ بتاؤں؟''

''وہ ہنسیں گے کہ چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیری رات۔''

''وہ کیوں ہنسیں گے بھلا۔''

''ان کی تو خواہش تھی نا کہ ہم ان کے جھنڈے والے گھر ہی میں مرے رہیں..... ارے مجھے تو یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ اب تک تو تمہارے بابا اسٹور کی آمدنی میں سے ہی اس گھر کا کرایہ نکال رہے تھے اب کوئی نئی نوکری پکڑی بھی تو گھر کا خرچہ پورا کریں گے یا مکان کا کرایہ دیں گے۔''

''محسن بھائی اور میں بھی تو جاب کر رہے ہیں امی..... فکر کیوں کرتی ہیں، ہو جائے گا گزارہ۔''

''محسن کا گھر نہیں بسانا ہے کیا..... لڑکی والے جلدی کر رہے ہیں۔ انہیں تو یہی بتایا تھا نا کہ اسٹور میں تمہارے بابا اور ان کے بھائیوں کا گورے میاں کے ساتھ ساجھا ہے۔ میں تو یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوئی جا رہی ہوں کہ جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ تمہارے بابا اور ان کے بھائیوں کی گورے میاں کے ساتھ کوئی ساجھے داری واجھے داری نہیں تھی تو کہیں وہ رشتہ ہی نہ توڑ دیں۔''

''میں نے اس وقت بھی کہا تھا آپ لوگوں سے کہ بھائی کا اس گھر میں رشتہ ہو یا نہ ہو، جھوٹ مت بولیں۔ غلط بیانی ایک نہ ایک دن کھل ہی جاتی ہے۔''

''غیر لوگوں میں بچوں کے رشتے ناتے کرتے وقت اپنا بھرم رکھنے کے لیے تھوڑا بہت دکھاوا کرنا پڑتا ہے۔'' مہرالنساء نے توجیہہ دی۔

''ضرورت کیا تھی غیر لوگوں میں رشتہ کرنے کی..... بھائی کی بات تو تایا ابو کے ہاں طے تھی۔ وہ اپنے تھے، سب کچھ جانتے تھے۔''

''اچھا تم ہمارے بڑے بننے کی کوشش مت کرو۔'' مہرالنساء چڑ گئیں۔

''بڑا بننے کی بات نہیں امی..... آپ کو پریشان دیکھ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔''
''اپنا افسوس اپنے پاس رکھو...... سمجھے۔'' مہرالنساء نے بیٹے کو آنکھیں دکھائیں پھر خفا سی ہو کر بولیں۔ ''بڑے میاں سے کچھ مت کہنا۔''
''بڑے میاں کون۔'' مستقیم جانتے بوجھتے انجان بنا۔
''تمہارے دادا حضور۔''
''بری بات ہے امی...... بابا جی کے لیے آپ اس لہجے میں بات کررہی ہیں۔''
''اب تم مجھے سکھاؤ گے کہ کس کے لیے کس طرح بات کرنی ہے۔'' مہرالنسا نے مستقیم کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔
''خدانخواستہ۔''
''لگتا تو یہی ہے۔''
''آپ پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' مستقیم نے ماں کو تسلی دی۔
''اللہ دین کا چراغ مل گیا ہے نا جیسے۔'' مہرالنساء تنک کر بولیں۔
''آپ مایوس کیوں ہوتی ہیں۔''
''تو کیا شادیانے بجاؤں کہ اسٹور فروخت ہو رہا ہے۔ گورے میاں واپس جارہے ہیں۔ محسن کی ہونے والی سسرال پر ہمارا پول کھلے گا۔''
''گورے میاں نعوذ باللہ ہمارے خدا تو نہیں ہیں۔''
''ہاں خدا نہیں ہیں مگر وسیلہ تو بنے ہیں نا...... چاروں گھروں نے جو کچھ عرصہ خوشحالی دیکھی، انہی کے دم سے۔''
''معاف کیجیے گا امی، بدحالی تو ان سے پہلے بھی نہیں تھی۔''
''بدحالی نہیں تھی تو فراغت بھی نہیں تھی۔''
''انسان صرف وسیلہ بنتے ہیں امی اور اگر اللہ کی مرضی نہ ہو تو کوئی انسان بھی کسی دوسرے کے لیے وسیلہ نہیں بن سکتا...... قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بہت واضح طور پر فرمادیا ہے کہ وہ جس کی چاہتا ہے روزی نپی تلی رکھتا ہے اور جس کی چاہتا ہے کشادہ اور فراخ کردیتا ہے۔''
''اچھا میں نے کیا کہا...... سنا تم نے۔''
''کیا کہا!''
''اپنے دادا سے کچھ مت کہنا۔''
''میرے دادا آپ کے کیا لگتے ہیں؟''
''سسر۔''
''اور آپ بلکہ ہم سب انہیں احتراماً کیا کہا کرتے ہیں؟''
''بابا جی۔''
''تو سیدھا سیدھا بابا جی کہیں نا۔''
''بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔''
مستقیم کو مذاق سوجھا۔ ''بیٹا کس کا ہوں۔''
''بہت ماروں گی۔'' مہرالنساء نے اسے آنکھیں دکھائیں۔
مستقیم نے نہایت مؤدبانہ انداز میں اپنا سر جھکا کر مہرالنساء کے سامنے کردیا۔

☆☆☆

آئندہ حکمتِ عملی وضع کرنے کے لیے عبداللہ نے چاروں کنبوں کا ایک ہنگامی اجلاس اپنے گھر میں طلب کرلیا۔ یہاں بھی بابا جی کی تربیت کام آرہی تھی۔ بابا جی کہا کرتے تھے۔ ''گھر پر کوئی برا وقت آپڑے تو گھر کے تمام مکینوں کو آپس میں مشاورت سے اور سیسہ پلائی دیوار کی طرح پہلو بہ پہلو جڑ کر برے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔''
اس مشترکہ ہنگامی اجلاس میں گھر کے مرد، عورتیں، چھوٹے، بڑے سب گزشتہ دو ڈھائی برسوں کے دوران اپنی اپنی چشمکیں اور ناراضگیاں بھول کر شریک ہوئے۔
''گورا تو بہت ہی طوطا چشم نکلا۔'' عبداللہ جو گورے میاں کو نہایت ادب واحترام سے گورے میاں، گورے بھائی یا گورے بھیا کہا کرتے تھے، اب انہیں نہایت حقارت سے گورا کہہ رہے تھے۔
''بڑے بھائی آپ نے اس سالے کی رعونت دیکھی تھی۔ اپنے چھچے منیجر کے سامنے ہمیں ذلیل کررہا تھا۔'' عبدالرحیم نے توقف کیا اور گورے میاں کے لب ولہجے کی نقل اتارنے کی کوشش کی۔ ''ہمارے درمیان معاہدہ یہ ہوا تھا کہ اگر تم چاروں میں سے کوئی مجھے چھوڑتا ہے تو اسے ایک ماہ کا نوٹس یا ایک ماہ کی تنخواہ دینی ہوگی اور اگر میں فارغ کرتا ہوں تو ایک ماہ کی تنخواہ مجھے دینی ہوگی۔''
''سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟'' عبداللہ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔
''کیا کیا جاسکتا ہے بڑے بھائی سوائے اس کے کہ ہم اسٹور فروخت ہونے تک کام کرتے رہیں اور اس دوران اپنے لیے کوئی نوکری ووکری دیکھ لیں یا اگر اپنا کوئی کاروبار کرنا ہو تو اس کی تیاری کرلیں اور اپنا اپنا موجودہ گھر چھوڑ کر کہیں کم کرائے والی آبادی میں مکان ڈھونڈیں۔'' عبدالرحمان نے رائے دی۔
''یعنی اسٹور فروخت ہونے تک ہم گورے میاں ہی کے لیے کام کرتے رہیں۔'' عبداللہ بولے۔
''ظاہر ہے۔ اس میں کم سے کم ایک ماہ کی تنخواہ دینے کا پابند تو ہوگا گورا...... ورنہ اگر ہم نے چھوڑا تو ہمیں دینی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پڑے گی اسے اپنی ایک ماہ کی تنخواہ۔‘‘ عبدالرحمان نے کہا۔

’’ہوں۔‘‘ عبداللہ تائید میں گردن ہلاتے ہوئے سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے باقی دو بھائیوں سے بھی ان کی رائے پوچھی۔ ’’عبدالرحیم، عبدالقدوس آپ دونوں کیا کہتے ہو؟‘‘

’’ٹھیک ہے بڑے بھائی...... عبدالرحمان بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔‘‘

’’میں کچھ عرض کرسکتا ہوں تایا ابو۔‘‘ مستقیم نے نہایت مؤدبانہ انداز میں عبداللہ سے کہا۔

’’ہاں ہاں۔‘‘ عبداللہ گرمجوشی سے بولے۔ ’’ہم نے تم بچوں کو اسی لیے تو بلایا ہے کہ تم بھی اپنی رائے دو۔ ہم تو اپنی گزار چکے اب تم ہی لوگوں کو باگ ڈور سنبھالنی ہے۔‘‘

’’کہیں اور کرائے کے مکان دیکھنے کے بجائے ہم لوگ اپنے ہی گھر میں جاکر کیوں نہ رہیں۔‘‘ مستقیم نے دبی زبان سے کہا۔

’’تمہارا مطلب ہے جھنڈے والا گھر؟‘‘

’’جی۔‘‘

خواتین اور بچے کسمسائے، بڑبڑائے، جو مزہ اور لطف خودمختار زندگی گزارنے میں ہے وہ جھنڈے والے گھر کی تنگ بندھی، پابند زندگی میں کہاں تھا۔

عبداللہ نے تینوں بھائیوں کو مشورہ طلب نظروں سے دیکھا۔

’’خیال برا نہیں بلکہ معقول ہے مگر شرمندگی کا سامنا ہوگا۔‘‘ عبدالرحیم نے کہا۔

عبدالرحمان نے اپنی بیوی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں مستقیم کی بات یکسر رد کیے جانے کا اشارہ دیتے پاکر عبدالرحیم کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ’’ہاں ہوگی تو شرمندگی...... باباجی کہیں گے گئے تھے بڑے زعم سے، گورے نے دھکا دیا تو پھر یہیں پلٹ آئے۔‘‘

عبدالقدوس کے پہلو میں بیٹھی یاسمین بیگم نے ان کے زانو میں چٹکی بھری اور ان کے کان میں صور پھونکا۔ ’’تھوکے کو چاٹنے والی بات ہوگی میاں جی۔‘‘

’’رحمان بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔‘‘ عبدالقدوس نے نہایت پُرجوش انداز میں کہا اور یاسمین بیگم کو اپنی کارکردگی سے مطمئن کردیا۔

مشاورتی اجلاس کا لب لباب یہ ٹھہرا کہ بے فیض اور خودغرض گورا اب اگر ’’ڈومور‘‘ کہے تو جواب میں ’’نومور‘‘ کہا جائے اور اس کا بوریا بستر گول ہونے تک اپنے مستقبل کی معاشی منصوبہ بندی پر توجہ دی جائے۔

☆☆☆

بدلہ

لڑکیاں ہر موڑ پہ ڈرتی ہیں
اکیلی ہوں تو سنسان راہوں سے ڈر
بھیڑ میں ہوں تو لوگوں سے ڈر
ہوا چلے تو دوپٹا اڑ جانے کا ڈر
کوئی دیکھے تو ان کی آنکھوں سے ڈر
بچپن ہو تو ماں باپ کا ڈر
جوان ہوں تو بھائیوں کا ڈر
وہ ڈرتی ہیں اور تب تک ڈرتی ہیں
جب تک ان کو جیون ساتھی نہیں مل جاتا
اور یہی وہ شخص ہوتا ہے جس سے وہ سب کا بدلہ لیتی ہیں۔

مرسلہ: محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

فرماں برداری

ایک بوڑھا جوان سے بس میں سفر کرتے ہوئے بولا۔

’’بیٹا جب جی پی او آئے تو بتا دینا۔‘‘

جوان۔ ’’بزرگو! بس آپ مجھے دیکھتے رہیے۔ جہاں میں اتروں، اس سے ایک اسٹاپ پہلے اتر جائیے گا۔‘‘

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

مستقیم نے ماں کی بات رکھنے کا سامان یوں کیا کہ باباجی کو براہِ راست خود تو نہ بتایا۔ امید کو بتادیا۔

’’ارے اتنی بڑی بات...... فوراً باباجی کو بتاؤ۔ وہ سب کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔‘‘ امید بولی۔

’’باباجی کو میں نہیں بتاؤں گا۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ امید چونکی۔

’’امی نے سختی سے منع کیا ہے مجھے کہ باباجی کو پتا نہ چلے۔ میں خود تو انہیں نہیں بتاؤں گا۔ تمہیں اسی لیے بتایا ہے کہ تم باباجی کو بتادو۔‘‘

’’تم بتاؤ یا میں، ایک ہی بات ہے۔‘‘ امید بولی۔

’’ایک بات نہیں ہے نا۔ جب تم بتاؤ گی باباجی کو تو میں ضرورت پڑنے پر امی سے یہ تو کہہ سکوں گا کہ باباجی کو میں نے نہیں بتایا۔‘‘

’’بہت چالاک ہو۔‘‘

’’آدمی امید سے رابطے میں رہے تو چالاکی، عقل،

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ذہانت، شعور سب آجاتا ہے۔'' مستقیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

گورے میاں نے اسٹور کی مع تمام سامان فروختگی کا اشتہار اخبار میں دے دیا۔

چاروں بھائی اب گورے میاں سے بہت لیے دیے انداز میں رہنے لگے تھے۔

گورے میاں کا چہیتا جنرل منیجر جو پہلے تو پھر بھی چاروں بھائیوں کا کچھ لحاظ کرلیا کرتا تھا، اب بات بات پر انہیں ذلیل کرتا اور تبدیل شدہ منظرنامے میں گورے میاں کے ساتھ ان کی میم صاحب کے دیس جانے کا خمار آنکھوں میں لیے جھومتا، ڈولتا اسٹور میں پھرتا۔

اس روز بھی معمول کے مطابق گورے میاں صبح دس بجے کے لگ بھگ اسٹور آچکے تھے۔ اخبار میں اسٹور کی فروختگی کا اشتہار شائع ہونے کے بعد خریدار پارٹیاں اسٹور دیکھنے اور مالک سے گفت وشنید کے لیے مسلسل آجا رہی تھیں۔ گورے میاں اسٹور کے مرکزی دفتر میں شام تک موجود رہتے۔

بابا جی کہا کرتے تھے۔'' خریدار اور موت کا کچھ پتا نہیں ہوتا کب آجائے۔''

☆☆☆

اسٹور میں روزمرہ اشیائے ضرورت کا شعبہ عبداللہ کے ذمے تھا۔ صبح سے رات تک وہ اپنے شعبے میں نگرانی کا کام کرتے۔ کبھی گاہکوں پر نظر، کبھی سامان کی کمی بیشی کی فکر، کبھی صارفین کی شکایات، کبھی سیکشن کے اہلکاروں کی حکایات، کبھی اسٹاک کی وصولی، کبھی ملازمین کی باہمی چشمکوں کا تصفیہ۔ غرض صبح سے رات تک عبداللہ گھن چکر بنے رہتے۔ باقی تین بھائیوں کا بھی کم وبیش یہی منظرنامہ تھا۔

اس روز بھی عبداللہ معمول کی مصروفیات میں تھے کہ دفعتاً انہوں نے بابا جی کو دیکھا۔ وہ اسٹور کے ایک کارکن سے کوئی بات کررہے تھے۔ مذکورہ کارکن نے اپنی انگلی سے اس طرف اشارہ کیا جہاں اسٹور کا مرکزی دفتر واقع تھا۔ گورے میاں وہیں بیٹھتے تھے اور جتنی دیر وہ اپنے دفتر میں موجود رہتے، اسٹور منیجر بھی زیادہ وقت وہیں براجمان رہتا۔ اس وقت بھی وہ وہیں تھا۔

بابا جی کو دیکھ کر عبداللہ جہاں کے تہاں رہ گئے۔ ذرا دیر کو تو انہیں اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔ بابا جی اور وہاں! جب سے ان چاروں بھائیوں نے جھنڈے والا گھر چھوڑا تھا، بابا جی نے بھولے سے بھی ان میں سے کسی کے گھر یا اسٹور کا راستہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ خود ہی بابا جی سے ملنے اور ان کی خیر خبر لینے جاتے تو خیر، بابا جی پلٹ کر دیکھنے کی زحمت نہ کرتے۔ آج اسٹور میں ان کی آمد معنی خیز تھی۔ عبداللہ نے بابا جی کی پذیرائی کو آگے بڑھنا چاہا مگر ایک صارف نے ان کا راستہ روک لیا۔

''سر! آپ کے اسٹور میں آٹا آج کل اچھا نہیں آرہا۔'' اس نے شکایت کی۔

'' کیوں؟ کیا ہوا؟'' عبداللہ کی نظریں بابا جی پر تھیں۔

''گھر والی بتاتی ہے آٹا گوندھو تو ٹھیک سے گندھتا نہیں۔''

''انشاء اللہ دیکھ لیں گے۔ آپ کی شکایت فلور مل والوں تک پہنچ جائے گی۔'' عبداللہ نے اپنی نظریں بابا جی پر مرکوز رکھتے ہوئے صارف کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور اپنے سامنے سے صارف کے ہٹتے ہی بابا جی کی طرف لپکے مگر وہ تب تک گورے میاں کے دفتر میں جاچکے تھے۔

عبداللہ نے دفتر میں جانا مناسب نہ سمجھا البتہ ان کا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ بابا جی اسٹور آئے تھے تو سیدھے گورے میاں کے دفتر کیوں گئے تھے۔

عبداللہ نے فوراً ہی تینوں بھائیوں کو مطلع کیا۔ چاروں سر جوڑے کھڑے تھے کہ گورے میاں کا پیغام رساں یہ سندیسہ لے کر پہنچا کہ گورے میاں چاروں بھائیوں کو یاد فرما رہے تھے۔ چاروں نے فکرمندی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور گورے میاں کے دفتر کی جانب چل دیے۔

گورے میاں اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ منیجر دستِ راست بنا ان کی میز کے دائیں جانب پڑی کرسی پر اور بابا جی کمرے کے دروازے کی جانب پشت کیے گورے میاں کے روبرو بیٹھے تھے۔ عبداللہ اگر بابا جی کو دیکھ نہ چکے ہوتے تو چاروں بھائی شاید یہی سمجھتے کہ گورے میاں کے روبرو بیٹھے بزرگ بابا جی نہیں کوئی اور تھے۔ چاروں نے سلام کیا۔

گورے میاں نے اپنے سر کی خفیف سی جنبش سے نہایت متکبرانہ انداز میں سلام کا جواب دیا۔ منیجر کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی۔ بابا جی نے البتہ نہایت وضع داری کے ساتھ ان کے سلام کے جواب میں کہا۔'' وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔'' پھر منیجر کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔'' جب کوئی تمہیں سلام کرے تو اس سے بڑھ کر جواب دو۔''

منیجر کچھ شرمندہ سا دکھائی دینے لگا۔

''تایا جی آگئے...... آج تو اس اسٹور کی قسمت جاگ گئی۔'' گورے میاں بولے پھر انہوں نے اپنے منیجر سے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کہا۔ ''چائے کا بندوبست کرواؤ۔''

''کچھ نہیں۔'' باباجی اپنا دایاں ہاتھ انقاً ہلاتے ہوئے بولے۔

''ٹھنڈا؟'' گورے میاں نے پوچھا۔

''نہ ٹھنڈا نہ گرم۔'' باباجی نے اپنا ہاتھ کُرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''گورے میاں آپ سے یہی معاہدہ ہوا تھا نا ان چاروں کا کہ اگر یہ آپ کو چھوڑ کر جائیں گے تو انہیں ایک ماہ کا نوٹس دینا ہوگا یا ایک ماہ کی تنخواہ۔''

''جی ہاں۔'' گورے میاں کچھ تعجب کچھ تذبذب سے باباجی کو دیکھنے لگے۔

''ویسے آپ نے آئی ایم ایف کی طرح باندھا خوب تھا انہیں۔''

''میں سمجھا نہیں تایا جی۔'' گورے میاں بولے۔

باباجی نے وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور بیٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ہاں بھئی کتنی بنتی ہے تم چاروں کی ایک ماہ کی مجموعی تنخواہ؟''

''ایک لاکھ ساٹھ ہزار۔'' عبداللہ نے بتایا۔

''صرف!'' باباجی نے کچھ تعجب، کچھ حقارت سے کہا اور کُرتے کی جیب میں پڑا ہاتھ نکال کر ہزار ہزار کے نوٹوں کی دو گڈیاں گورے میاں کی میز پر ان کے سامنے نہایت بے اعتنائی سے ڈالتے ہوئے بولے۔ ''اپنے ایک لاکھ ساٹھ ہزار لیجیے، باقی مجھے واپس کریں۔''

''کیا مطلب تایا جی؟'' گورے میاں سٹپٹا کر بولے۔

''آپ ان چاروں کی ایک ماہ کی تنخواہ لیں...... میں انہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔'' باباجی کے چاروں بیٹے حیرانی سے باباجی کو اور میز پر پڑی نوٹوں کی گڈیوں کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ ایسے نہیں جاسکتے۔'' گورے میاں نے نظریں بگاڑ کر کہا۔

''کیوں نہیں جاسکتے...... ایک ماہ کے نوٹس کی جگہ آپ کو ان کی ایک ماہ کی تنخواہ دی جا رہی ہے۔''

''میں یہ اسٹور فروخت کر رہا ہوں۔ جب تک یہ بک نہیں جاتا یہ لوگ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔''

''کیوں بھئی، ایسا بھی کوئی معاہدہ ہوا تھا تمہارا ان سے کہ جب یہ اسٹور فروخت کرنا چاہیں تو جب تک اسٹور بک نہ جائے تم لوگ انہیں چھوڑ کر نہیں جاسکو گے؟''

چاروں نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس گڈی میں سے ساٹھ نوٹ الگ کر کے مجھے دو۔'' باباجی نے نوٹوں کی دو گڈیوں میں سے ایک عبداللہ کو تھمائی۔ وہ نوٹ گننے لگے۔

''ان کے جانے کے بعد اسٹور کون چلائے گا تایا جی۔'' گورے میاں پریشان دکھائی دینے لگے تھے۔

''یہ آپ کی دردسری ہے گورے میاں...... آپ تو مالدار آدمی ہیں، ساری دنیا کو اپنے اشاروں پر نچا سکتے ہیں۔ پیسا پھینکتے ہیں اور غریبوں کا تماشا دیکھتے ہیں...... بہت مل جائیں گے آپ کو آپ کی خدمت بجالانے والے۔''

''کچھ تو خیال کیجیے تایا جی۔'' گورے میاں لجاجت سے بولے۔

''آپ کو بھی کچھ خیال کرنا تھا نا گورے میاں، جب آپ میرے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ رہے تھے...... میرے بچوں کو ورغلا رہے تھے۔''

''دودھ پیتے بچے نہیں تھے آپ کے بچے۔'' گورے میاں کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

''گورے میاں! آپ نے وہی شیطان والا کام میری بہوؤں اور بیٹوں کو ورغلا کر کیا۔''

''آپ مجھے شیطان کہہ رہے ہیں۔'' گورے میاں نے ابرو چڑھائی۔

''اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن آپ کا جرم یہ ہے گورے میاں کہ آپ نے مجھ جیسے بوڑھے اور ناتواں شخص کو جس نے تنکا تنکا جوڑ کر اپنا آشیانہ بنایا تھا، جس کی عمر بھر کی جمع پونجی اس کی اولاد تھی، آپ نے اسے اس کی عمر بھر کی پونجی سے محروم کر دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔''

عبداللہ نے ساٹھ نوٹ گن کر باباجی کی طرف بڑھائے۔ ''یہ ساٹھ ہیں باباجی۔'' باباجی نے نوٹ لیے اور نہایت بے اعتنائی سے گورے میاں کی میز پر پڑی نوٹوں کی گڈی کے ساتھ ڈال دیے اور بقیہ نوٹ عبداللہ سے لے کر اپنے کُرتے کی جیب میں ڈال لیے۔

''بڑے میاں۔'' باباجی کے ساتھ گورے میاں کا لہجہ اچانک انتہائی اہانت آمیز ہوگیا۔ ''زیادہ ڈراما بازی نہ کرو...... تمہاری عمر بھر کی پونجی اولاد نہیں، یہ نوٹ ہیں جو تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے بچا بچا کر رکھتے رہے، اب نکال کر لائے ہو...... مجھے بلیک میل کرنے کے لیے۔''

باباجی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور وہ گورے میاں کو نہایت حقارت سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''دشمن کا المیہ یہ ہے کہ ہارنے لگتا ہے تو اپنے نکیلے پنجوں سے دوسروں کا چہرہ نوچنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔'' باباجی نے ایک پل کو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

توقف کیا پھر درد آمیز لہجے میں بولے۔ ''بیوقوف آدمی! یہ رقم مجھے میری نواسی نے دی ہے اپنے ماموؤں کی جان چھڑانے کے لیے۔''

باباجی کے چاروں بیٹے جو حیران تھے کہ باباجی اتنی رقم کہاں سے لے آئے تھے، یہ سن کر ہڑبڑا سے گئے تھے کہ یہ رقم انہیں امید نے دی تھی...... مگر امید کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی تھی؟

اس سوال کا جواب بھی باباجی نے خود ہی دے دیا۔

''نوکری کرتی ہے، گھر پر ٹیوشن بھی پڑھاتی ہے بچوں کو...... اسے پتا چلا کہ ماموں پریشانی میں ہیں تو اس نے اپنی جمع پونجی بینک سے نکال کر میرے ہاتھ میں لاکر تھما دی...... گورے میاں! تم سے تو بھلی وہ کمزور اور ناتواں سی لڑکی ہے...... تم نے مجھے اکیلا کر دینے کی کوشش کی مگر امید نے مجھے اکیلا نہیں ہونے دیا۔''

باباجی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے چاروں بیٹوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''چلو بچو...... معاہدے کی شق پوری ہوگئی، اب تم آزاد ہو...... میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ گورے میاں کو خدا حافظ کہو۔ شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی جس کا نمک کھالے اس کا ممنونِ احسان رہے۔''

چاروں بھائیوں نے گورے میاں کو دیکھا۔

''اجازت؟'' عبداللہ نے کہا۔

گورے میاں چپ رہے۔

''اجازت مانگ رہے ہیں عبداللہ آپ سے۔''

باباجی نے گورے میاں کو دیکھا۔

گورے میاں نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''اپنے منیجر صاحب کو بھی خدا حافظ کہو...... شریفوں کا قاعدہ ہے کہ تعلق جوڑتے ہیں تو وضع داری سے، توڑتے ہیں تو حلم سے۔''

چاروں بھائیوں نے منیجر سے باری باری ہاتھ ملایا۔

''اچھا گورے میاں! چلتا ہوں۔ اپنے بچوں کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ویسے ہی خالی ہاتھ جیسے یہ آپ کے پاس آئے تھے...... کہا، سنا اور کھایا پیا معاف۔''

باباجی اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لیے گورے میاں کے دفتر سے نکل گئے۔ اب گورے میاں تھے اور ان کا چھوٹا منیجر۔

☆☆☆

اگلے چند دنوں میں غیر معمولی خوشگوار حیرتیں ظہور پذیر ہوئیں۔

باباجی کے چاروں بیٹے نادم و شرمسار باجماعت باباجی اور امید کا شکریہ ادا کرنے جھنڈے والے گھر آئے۔

''امید میرے کڑے وقت میں بہت کام آئی۔'' باباجی نے کہا۔

''شکریہ بیٹی۔'' عبداللہ نے اپنے سمیت چاروں بھائیوں کی ترجمانی کی۔

''شکریہ کی کیا بات ماموں...... مجھے تو غیروں کے کام آکر خوشی ہوتی ہے، آپ لوگ تو میرے اپنے ہیں۔'' امید نے کہا۔

چاروں ماموں شرمسار تھے کہ اس گھر میں رہتے ہوئے جس لڑکی کو وہ کمزور و ناتواں اور اپنی اعانت کا مستحق گردانتے رہے تھے وہ خود ان کی اعانت کا سبب بن گئی تھی۔

''اب کیا پروگرام ہے تم چاروں کا؟'' باباجی نے بیٹوں سے پوچھا۔ چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر عبداللہ نے کہا۔

''باباجی! نیا روزگار ڈھونڈنا ہے اور موجودہ مکانوں کو چھوڑ کر سستے کرائے کے مکانوں میں شفٹ ہونا ہے۔''

''خبردار!'' باباجی نے ڈپٹ کر کہا۔ ''اپنا گھر ہوتے کسی کو کرائے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہیں۔''

ہر ماہ مکان کے کرائے کی علت سے تنگ آئے چاروں بھائیوں کے مایوس چہروں پر یکبارگی رونق ہویدا ہوئی۔

''تو کیا...... ہم...... پھر سے...... اس گھر میں...... رہ سکتے ہیں...... باباجی؟'' عبداللہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' باباجی بولے۔ ''اپنے گھر میں رہنے کے لیے کس کو اجازت کی ضرورت ہے...... اپنے گھر میں تو آدمی کبھی بھی، کسی بھی وقت، کسی بھی حال میں آسکتا ہے۔''

''شکریہ باباجی۔''

چاروں بھائیوں کے چہرے کھل اٹھے۔

مگر چاروں کنبوں کی عورتوں اور بچوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کوئی دوبارہ اس گھر میں واپس جانے کو تیار نہ تھا۔

''اس کا بک میں پھر سے!''

''ارے اس وڑبے میں...... جہاں کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔''

''نہیں بھئی...... سڑک پر جا پڑیں گے ہم مگر اس گھر میں ہرگز نہیں۔''

''اتنی مشکل سے تو وہاں سے نکلے تھے کیا پھر سے وہاں جا کر پھنس جائیں جہاں نہ نیند اپنی نہ آرام اپنا۔''

''ہم میں سے کوئی وہاں واپس نہیں جائے گا۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مگر چاروں مرد اپنی بیویوں اور بچوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ گئے۔ جھنڈے والے گھر کی اہمیت اور باباجی کی سربراہی کی فضیلت تو انہیں اس گھر سے نکل کر اور باباجی کی سربراہی سے محروم ہو کر آشکار ہوئی تھی۔

اس گھر میں باباجی کی سرپرستی میں رہتے ہوئے تو ان میں سے کسی کو پتا ہی نہ چلتا تھا کہ کون سا کام، کون سا خرچ، کون سی ذمے داری باباجی کی بابرکت ہستی کے ہاتھوں کب اور کیونکر نمٹ گئی۔ نہ گھر میں رہنے کا کرایہ دینا پڑتا تھا نہ بجلی، پانی اور گیس کے بلوں کی فکر ہوتی۔ باباجی خود ہی سارے معاملات دیکھتے نہ صبح خالی پیٹ کام پر جاتے ہوئے آیتیں قل ھواللہ پڑھ رہی ہوتیں نہ عورتوں اور بچوں کی بے مروتی اور خودغرضی پر رونے کو جی چاہتا۔ جھنڈے والے گھر میں تو باباجی علی الصباح نماز کا وقت ہو جانے کی صدا لگاتے اور ان کی ایک صدا پر بچے بڑے سب بستر چھوڑ دیتے۔ کرائے کے گھروں میں تو گھر کی عورتیں اور بچے راتوں کو جاگتے اور دن چڑھے تک لمبی تان کر سوتے۔ نہ نماز کی فکر نہ خدا کو منہ دکھانے کی پروا۔ جھنڈے والا گھر چھوڑنے اور باباجی کی سرپرستی سے محروم ہو جانے کے بعد چاروں بیٹوں کو پتا چلا تھا کہ ایک بے چارے باباجی ہی تھے جو ساری فکریں اپنی جان پر لے کر انہیں ہر فکر سے بے نیاز رکھتے تھے ورنہ کیا بیویاں، کیا بچے اور کیا گورے میاں سبھی "ڈمور" کا تقاضا بنے انہیں ہراساں و پریشان رکھتے تھے۔

"جسے جھنڈے والے گھر واپس نہیں جانا وہ اپنا بندوبست خود کرے۔" چاروں مردوں نے اپنے اپنے اہل وعیال کو وارننگ دے دی۔

عورتیں اور بچے منہ لٹکا کر بیٹھ گئے، مرد کے بنا گزارہ کہاں تھا، ناچار اسی گھر میں واپسی پر آمادہ ہونا پڑا۔

حسن اتفاق گورے میاں کے اسٹور کا سودا اسی کاروباری شخصیت کے ساتھ طے پا گیا جس کی نومسلم بہو کو قرآن مجید پڑھانے اور دینی احکام کی تعلیم کے لیے باباجی اتالیقی کر رہے تھے۔ مذکورہ کاروباری شخصیت کو جب یہ معلوم ہوا کہ جوڈیپارٹمنٹل اسٹور اس نے خریدا تھا، اس کے چار شعبہ جات باباجی کے بیٹے چلاتے رہے تھے تو اس نے باباجی کے بیٹوں سے گورے میاں کی طوطا چشمی سے آگاہ ہونے پر چاروں کو نہایت عزت سے دوبارہ ان کے شعبوں کا نگراں مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ چاروں بھائیوں کے لیے یہ گویا غیبی مدد تھی۔

اس سے بھی زیادہ خوشگوار امر یہ ہوا کہ مستقیم کو جو ایم بی اے کرنے کے بعد ایک مالیاتی ادارے میں ملازمت کر رہا تھا اور باباجی کے توسط سے اس کی اسٹور کے نئے مالک سے دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی۔ اسٹور کے نئے مالک نے اسے اسٹور کی منیجری کی پیشکش کر دی۔ مستقیم نے باباجی سے کہا۔

"مجھے اچھا نہیں لگے گا باباجی کہ میں اپنے بابا، تایا اور چچاؤں کے کام کی نگرانی کروں۔" باباجی تدبر سے مسکرائے اور مستقیم کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولے۔

"میرے بچے! مستقبل کے عنان گیر تو تم نئی نسل ہی ہو۔"

"اور باباجی اسٹور کا مستقبل بھی آپ ہی ہیں صاحبزادے۔" اسٹور کے نئے مالک نے کہا۔

"باباجی اسٹور!" مستقیم نے چونک کر کہا۔

"میاں! باباجی کی شخصیت نے مجھے اتنا متاثر کیا ہے کہ میں نے گورے میاں اسٹور کا نیا نام باباجی اسٹور رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔" اسٹور کے نئے مالک نے کہا۔

"جناب! ناگوار خاطر نہ گزرے تو ایک بات کہوں۔" باباجی نے کہا۔

"آپ کی بات اور ناگوار خاطر گزرے...... یہ تاب، یہ مجال یہ جرأت نہیں مجھے۔" باباجی کے مخاطب نے کہا۔

"میں اپنے حصے کا کام کر چکا...... نہ ستائش کی تمنا رکھتا ہوں نہ نام و نمود کی طلب...... آپ کا اسٹور اس ملک کی عوام کے لیے ہے تو اس کا نام عوامی اسٹور رکھیے...... خدا مبارک کرے۔"

گورے میاں اسٹور کا نیا نام "عوامی اسٹور" پڑ گیا۔

☆☆☆

سامان بردار گاڑیاں باباجی کے جھنڈے والے گھر کے باہر گلی میں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ ایک وہ منظر تھا کہ سامان گاڑیوں میں لادا جا رہا تھا، ایک یہ منظر کہ گاڑیوں سے سامان اتارا جا رہا تھا۔ آس پاس گھروں کے رہائشی اپنے گھروں کی کھڑکیوں اور چوباروں سے تاکا جھانکی کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ "محلے کی رونق بحال ہو گئی...... جھنڈے والے گھر کے لوگ اپنے گھر میں واپس آگئے۔"

"ارے! ایک دن اپنے ہی گھر واپس آنا پڑتا ہے۔" چٹے سر والی ایک بڑی بی بولیں۔

باباجی گھر کا دروازہ وا کیے کھڑے تھے۔ عورتیں گھر کے اندر جا چکی تھیں۔ نہ سامان اتارنے میں کوئی شور شرابا، نہ کوئی چیخ پکار نہ تیرا میرا۔

"جو سامان جہاں فٹ ہوتا جائے رکھتے جاؤ۔"

باباجی سامان گھر کے اندر لے جانے والوں اور......

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

رکھوانے والوں سے کہہ رہے تھے۔

''مبارک ہو باباجی۔'' گلی سے گزرتے باباجی کے ایک شناسا نے کہا۔

''خیر مبارک!'' باباجی نہایت خندہ پیشانی سے اپنا دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جاکر بولے۔

''واپسی کیسے ہوگئی باباجی؟'' مبارک باد دینے والے نے پوچھا۔

باباجی تدبر سے مسکرائے پھر بولے۔ ''پرندے رزق کی تلاش میں بھٹک کر کتنی ہی دور نکل جائیں، شام کو اپنے آشیانے کی طرف ہی لوٹتے ہیں۔''

''بے شک!'' سننے والے نے تائید کی۔

گھر کے اندر امید اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے جنتِ گم گشتہ میں پلٹ آنے والوں کی واپسی کا روح پرور منظر دیکھ رہی تھی۔ عورتیں اور بچے جو اس گھر میں واپس آنے کے لیے بمشکل آمادہ ہوئے تھے، اب خوش تھے مسکرا رہے تھے۔ گھر کے احاطے میں بنے پختہ چبوترے میں گڑے بلند وبالا آہنی کھمبے کے بالائی سرے پر لہراتا جھنڈا اس تیزی سے پھڑپھڑا رہا تھا جیسے گھر لوٹ آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔

مستقیم کانچ کے ایک شفاف ڈبے میں بند اپنے محور پر ٹکا گلوب لیے کمرے میں داخل ہوا۔ آہٹ سن کر امید نے پلٹ کر دیکھا۔

''یہ گلوب میں نے تمہارے لیے خریدا تھا...... تمہیں کسی خاص موقع پر تحفہ دینے کے لیے۔'' مستقیم نے کانچ کا ڈبا نہایت احتیاط سے امید کے بیڈ سائڈ بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھنا میں نے تمہیں پوری دنیا تحفے میں دی ہے۔''

''شکریہ۔'' امید مسکرائی۔ ''اس سے زیادہ خاص موقع اور کیا ہوسکتا ہے۔'' اس نے کہا اور کھڑکی سے دوبارہ باہر دیکھتے ہوئے بلند وبالا آہنی کھمبے کے بالائی سرے پر لہراتے، پھڑپھڑاتے جھنڈے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے اپنے عقب میں آکھڑے ہوئے مستقیم کو پلٹ کر ایک نظر دیکھنے کے بعد پھر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ دیکھو...... ہمارا جھنڈا بھی آج خوش دکھائی دیتا ہے۔''

''جھنڈے والے گھر کے مکین جو لوٹ آئے ہیں۔''

مستقیم اس کے پہلو میں آکھڑا ہوا۔

گھر کے احاطے میں ایستادہ کسی درخت پر کوئی خوش گلو پرندہ چہکا۔

''باباجی کہتے ہیں، بہار آنے کی خبر سب سے پہلے پرندوں کو ہوتی ہے۔'' امید نے کہا۔

''ہاں...... مگر امید بہار پرندوں سے بھی پہلے صبح امید کو ہوتی ہے۔'' مستقیم نے سرگوشی کی۔

امید مسکرادی۔ مستقیم نے اسے وارفتہ نگاہوں سے دیکھا۔

تبھی مہرالنساء کمرے میں داخل ہوئیں اور انہوں نے مستقیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم تھا تم یہیں ہوگے۔'' وہ آگے بڑھیں اور انہوں نے امید کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی کو چوما اور اپنے گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ ''ابھی تو تمہیں پیار کرنے آئی ہوں۔ اطمینان سے آکر بیٹھوں گی تمہارے پاس...... باہر سامان پھیلا پڑا ہے وہ رکھوادوں ذرا۔''

''میں نے آپ سے کہا تھا نا امی۔'' مستقیم نے ماں کو جتایا۔

مہرالنساء نے اسے آنکھیں دکھائیں اور مزید کچھ نہ بولنے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی۔ کیسے بھول سکتی تھیں وہ کہ مستقیم نے ان سے کہا تھا۔ ''ایک دن آئے گا جب آپ امید کو گلے لگائیں گی۔''

''امید! میں ذرا سامان سمیٹوالوں۔'' مہرالنساء نے کہا اور عجلت میں دروازے کا رخ کرتے ہوئے بولیں۔ ''مستقیم! ذرا تم بھی آجاؤ میرے ساتھ۔''

''آپ چلیں میں آتا ہوں۔'' مستقیم نے کہا۔

مہرالنساء دروازے تک پہنچ گئی تھیں۔

''میں بھی آرہی ہوں ممانی جان۔'' امید نے کہا اور کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کی جانب چلی۔

''اچھا بیٹا۔'' مہرالنساء یہ کہتے ہوئے دروازے سے نکل گئیں۔

مستقیم نے اپنا بازو امید کی راہ میں حائل کر دیا۔ ''وہ دیکھو...... کتنا خوش ہے۔'' اس نے امید کو کھڑکی سے باہر چبوترے پر لہراتے جھنڈے کو پھر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

امید مسکرائی اور اپنا دایاں بازو عموداً بلند کرکے اس نے نہایت جذباتی انداز میں نعرہ لگایا۔ ''پاکستان...... زندہ باد۔''

مستقیم برجستہ نعرہ زن ہوا۔ ''امید صبح...... پائندہ باد۔''

امید اسے دیکھنے لگی۔ مستقیم کے ہاتھ اس کے شانوں تک جاپہنچے۔ اسے اپنے روبرو کر کے انتہائی وارفتگی سے اسے دیکھتے ہوئے وہ سرگوشی میں بولا۔ ''تم...... تم میری صبح امید بھی ہو...... شام امید بھی...... شب امید بھی۔''

کھڑکی کے راستے ان کا محبوب پرچم انہیں نہایت وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔

www.urdusoftbooks.com